ایک غلطی کی تصحیح

نگار

جلد ۴۱

ملاحظات

واقعہ قرطاس

اس نے کہا کہ وہ آیندہ جون تک دس رم ماہوار سے زیادہ کاغذ نہیں دے سکتی اور جون کے بعد کے لئے وہ کوئی وعدہ نہیں کرسکتی کیونکہ کناڈا سے کاغذ پہونچتے رہنے کا کوئی یقین نہیں ہے۔ دس رم ماہوار کسی طرح ہمارے لئے کافی نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ اس بُرے وقت کے خیال سے ہم نے لڑائی شروع ہوتے ہی کئی سو رم کاغذ اسٹاک کر لیا تھا جس میں سے اب بھی کچھ بچا ہے، اس لئے اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی تھیں، ایک یہ کہ نگار میں کوئی اور دبیز چکنا کاغذ لگایا جائے یا پھر دس رم ماہوار کے راشن اور اُس اسٹاک کو سامنے رکھ کر جو ہمارے باقی رہ گیا، حجم کم کر دیا جائے۔ صورت اول پر عمل کرنے کے معنی یہ تھے کہ دو سو روپیہ ماہوار کا زاید خرچ برداشت کیا جاتا اور یہ ممکن نہ تھا۔ اس لئے دوسری صورت اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، چنانچہ نگار کا حجم نصف کر دیا گیا اور جب تک کاغذ راشن کے مطابق ہم کو ملے گا، یہی حجم رہے گا

اس صورت میں قدرتاً آپ کو یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ جب حجم کم ہوا ہے تو رسالہ کی قیمت میں بھی کمی ہونا چاہئے، لیکن آپ کا یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ نگار کا مسطر اتنا گنجان اور خط اس قدر باریک کر دیا گیا ہے کہ ۴۸ صفحات میں پورے ۸۰ صفحات کا مواد آپ کو ملے گا اور اس طرح جہاں تک مضامین کا تعلق ہے نگار کا حجم وہی ۸۰ صفحات کا باقی رہا جو لڑائی سے پہلے تھا اور گویا پچھلے سال نہ میں مطالعہ کا اتنا ہی سامان ہم پہونچا جو پہلے ملتا تھا

امید ہے کہ قارئین نگار ہماری ان دشواریوں کا خیال کر کے اس عارضی انتظام کو گوارا فرمائیں گے اور موجودہ مسطر کی باریک و گنجان تحریر کے پڑھنے میں انھیں جو دقت ہوگی، اُسے ہماری مجبوریوں کا لحاظ کر کے کسی نہ کسی طرح کچھ دن اور برداشت کر لیں گے

سنگاپور کے بعد؟

موجودہ جنگ میں اس وقت تک تین نقصانات اتنے بڑے ہوئے ہیں کہ ان کی تلافی آسان نہیں۔ ایک، پچھلے اگست میں جرمن حملہ روکنے کے لئے روس کا دریائے ڈنیپر کے بند کو توڑ دینا، دوسرے سنگاپور کا برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جانا اور تیسرے جاپانی قبضہ سے پہلے ہی پلمبانگ کے ذخایر پٹرول میں آگ لگا دینا۔ ان نقصانات کا اندازہ روپیہ آنہ پائی میں کیا جائے یا سیاسی حیثیت سے دونوں طرح ان کی اہمیت بڑی زبردست ہے۔ دریائے ڈنیپر کا بند طیار کرنے میں روس نے اتنی دولت، اتنی محنت اور اتنا وقت صرف کیا تھا کہ اگر ہم ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ لگائیں تو اس سے شاید کئی سلطنتیں خریدی جا سکتی ہیں، اسی طرح سنگاپور کی قلعہ بندیوں میں جتنا روپیہ اور جتنی ذہانت برطانیہ نے صرف کی تھی وہ بھی تمام برطانوی مستعمرات کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی اور پلمبانگ میں جتنا پٹرول ضایع کیا گیا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آج تک شاید ہی کسی حکومت نے اتنی بڑی دولت کو اپنے ہاتھ سے برباد کیا ہو جتنا ڈچ حکومت نے

اب دوسری حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دریائے ڈنیپر کا بند ٹوٹنے کے بعد روس کا خوشگوار اقتصادی مستقبل کم از کم ۲۵ سال زیادہ دور ہو گیا، پلمبانگ کے ذخایر پٹرول ضایع ہو جانے سے بحر پاسفک میں اتحادیوں کی بحری قوت کا ایک بڑا چشمۂ حیات خشک ہو گیا اور سنگاپور کے سقوط نے مشرق بعید کی جنگ میں سخت خطرناک پیچیدگیاں پیدا کر دیں

اس میں شک نہیں کہ ملایا پر جاپانی قبضہ ہو جانے سے سنگاپور کی مدافعانہ اور جارحانہ دونوں حیثیتیں بہت گر گئی تھیں اور اگر جاپانی فوجیں وہاں داخل نہ ہوتیں تو بھی برطانیہ اب اس بحری مرکز سے کوئی فایدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ تاہم یہ واقعہ لڑائی کے مستقبل پر غیر معمولی اثر ڈالنے والا ہے اور اس لئے اب سنگاپور اور ملایا کی ناکامی پر واویلا مچانے کی جگہ ہمیں جنگ کے مستقبل پر غور کرنا چاہئے۔ جو خطرہ آنے والا تھا وہ آچکا، لیکن جو آیندہ آنے والے ہیں وہ ابھی نہیں آئے ہیں اور انھیں کے مقابلہ کی فکر ہم کو کرنا چاہئے

سنگاپور کے سقوط کے بعد قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جاپان اب کیا کرے گا۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے ہندوستان کا سوال آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برما میں اس کا اقدام جاری ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو چین اور ہندوستان کے درمیان جو سلسلۂ اتحاد قایم ہے اس کو کافی صدمہ پہونچے گا، لیکن حملۂ ہندوستان کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے حملہ و دفاع کے اُن دونوں پہلوؤں کو سمجھ لینا ضروری ہے، جن کا تعلق سنگاپور سے تھا

سب سے پہلے تو اس پہلو کو لیجئے کیونکہ سنگاپور مع اپنے بحری اڈے کے (تنہا جزیرۂ سنگاپور یا اس کی قلعہ بندیاں نہیں) جاپان پر حملہ کرنے کے لئے بہ نسبت دفاعی کام لینے کے بہت اہم مقام تھا۔ ظاہر ہے جنوبی پاسفک میں جاپان کے حملوں کی بنیاد اس کی بحری طاقت پر قایم ہے اور جب تک پاسفک کے اس حصہ میں اس کی بحری قوت زبردست ہے وہ ہر مقام پر جہاں حملہ کرنا چاہے اپنی فوجیں اور سامان جنگ بہ آسانی پہونچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جاپان کے اس بحری تفوق کو کمزور کرنے کی صرف ایک یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اتحادی اُس سے بحری بیڑوں سے کام لیں لیکن بحری بیڑوں سے کام لینا منحصر ہے اس بات پر کہ اُن کے قیام ان کی مرمت اور ایندھن کی فراہمی کا معقول انتظام ہو اور مشرق میں سنگاپور ہی ایسا بحری اڈا تھا جہاں ایک درجۂ اول کے بیڑے کو یہ تمام آسانیاں حاصل ہو سکتی تھیں

پھر چونکہ سنگاپور ہاتھ سے نکل گیا ہے اس لئے اتحادیوں کو مجبوراً چھوٹے چھوٹے اور دور دور واقع ہونے والے اڈوں سے کام لینا پڑے گا اور اس کا اثر اتحادیوں کی جا

رروائیوں پر پڑنا یقینی ہے۔ اگر سنگاپور ہاتھ سے نہ جاتا تو یہاں سے جاپان کی بحری نقل وحرکت کو آسانی سے روکا جا سکتا تھا۔ لیکن اب حملے کے لئے اس وقت کا انتظار کرنا پڑیگا جب
ئی دوسرا مضبوط بحری اڈا ہاتھ آجائے اور اسی لئے ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ سنگاپور کے نکل جانے نے لڑائی کو زیادہ طویل کر دیا ہے

اب آپ دفاعی پہلو کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ سنگاپور برطانیہ کا سب سے پہلا خط دفاع تھا اور اس کے نہ رہنے سے برما، آسٹریلیا، لنکا، ہندوستان سب کی پوزیشن
زد سے قریب ہو گئی ہے۔ لیکن زیادہ مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آیئے اس وقت ہندوستان ہی کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ اگر جاپان نے اس پر حملہ کیا تو وہ کیا طریقے
اختیار کریں گے

ہندوستان پر جاپانی حملہ کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ خشکی سے براہ برما حملہ کرے یا براہ ملایا جہازوں کے ذریعہ سے خلیج بنگال تک پہونچے — پہلے بحری حملہ کو لیجئے۔
ظاہر ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بڑی زبردست فوج درکار ہوگی اور اس فوج کی نقل وحرکت اور اس کے لئے رسد وسامان جنگ پہونچانے کے لئے جاپان کو بہت سے جہازوں سے
کام لینا پڑے گا اور اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ سنگاپور کی مرمت کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ بحری بیڑوں کا محفوظ اڈا بن سکے اور دوسرے یہ کہ جاپان اپنے
بڑے بڑے جہاز دوسرے مقامات سے ہٹا کر اس طرف لا سکے۔ اور یہ دونوں باتیں آسان نہیں۔ سنگاپور کی مرمت ... اب اسے معمولی نہیں ہیں کہ انھیں اتنی جلد درست کیا جا سکے۔ اگر
جاپان نے بہت عجلت سے کام لیا تو بھی دوبارہ اس کا بحری اڈا بنانے کے لئے مہینوں درکار ہوں گے اور بڑے بڑے جہازوں کو دوسرے مقامات سے ہٹا کر ہندوستان کی طرف لانا سو بھی
اس وقت تک آسان نہیں جب تک امریکہ کا بیڑا پاسفک میں موجود ہے۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اتحادیوں کی موجودہ دفاعی پوزیشن بُری نہیں ہے۔
چونکہ جاوا اور سماٹرا پر ابھی تک جاپانی قبضہ نہیں ہوا اور جب تک یہ اتحادیوں کے پاس ہیں آبنائے ملاکا سے جاپانی جہازوں کا گزر کر ہندوستان، برما یا لنکا پہونچنا آسان نہیں۔
انڈیمان جزیروں میں اتحادیوں کی اتنی فوج نہیں ہے کہ وہ جاپان کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کر سکے، لیکن وہ اس کی راہ میں حایل ہو کر اتحادیوں کو وقت سے فایدہ اٹھانے کا
موقعہ ضرور دے سکتی ہیں

اسی کے ساتھ یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ بحر ہند اور خلیج بنگال میں بھی برطانیہ کی بحری قوت اتنی موجود ہے کہ وہ یہاں جاپانی جہازوں کی نقل وحرکت کو روک سکتی ہے۔ اسلئے
ہندوستان پر کسی زبردست باقاعدہ بحری حملہ کا امکان اس وقت بہت ضعیف ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کی آبدوز کشتیاں اور اس کے ہوائی جہاز ہندوستان کے
پاس نہ آسکیں گے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ سلسلۂ رسل ورسایل منقطع کرنے، لوگوں میں بے چینی پھیلانے اور برطانوی بیڑوں کو دوسری طرف توجہ دینے سے روکنے کے لئے وہ
ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات مثلاً کلکتہ و مدراس وغیرہ پر بمباری کی کوشش کرے گا کیونکہ اگر اس کے طیارہ بردار جہاز بحر ہند یا خلیج بنگال میں نہ آسکے تو بھی اس نوعیت کے حملوں کو
کسی طرح نہیں روکا جا سکتا خواہ بحری قوت کسی کی کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو

کسی ملک پر حملہ ہونے کی صورت میں سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اس ملک کے ذرایع کیا اور کتنے ہیں اور دوسرے یہ کہ اسے باہر سے کمک پہونچ سکتی ہے یا نہیں۔ اور ان دونوں
باتوں کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اول تو وہ خود اتنا بڑا ملک ہے کہ جاپان کے مقابلہ میں چین سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ضرور عسکری قوت فراہم کر سکتا ہے اور
بیرونی کمک کے متعلق بھی اسے پورا اطمینان ہے کیونکہ برطانیہ اور امریکہ بحر روم کی طرف سے ہر طرح کی مدد فراہم کر سکتے ہیں اور جاپان ان کی راہ میں حایل نہیں ہو سکتا

اس میں شک نہیں کہ بحر پاسفک میں جاپان نے ۸ دسمبر سے اس وقت تک غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ان کامیابیوں پر جنگ کا فیصلہ ہونا ممکن نہیں۔ وہ
جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ عرصہ سے بحر پاسفک میں جنگ کی طیاریاں کر رہا تھا اور اتحادیوں کی طیاریاں اس کے مقابلہ میں بہت کم تھیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جب
امریکہ اور برطانیہ نے اپنی طیاریاں پوری کرنے کے بعد بحر پاسفک میں اس کو چیلنج دیا تو مقابلہ آسان نہ ہوگا

یہ درست ہے کہ سنگاپور کے واقعہ نے وقت کے سوال کو اتحادیوں کے لئے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اس لئے ہم کو اگر کوئی نقصان پہونچا ہے تو صرف اتنا کہ نتیجہ کا انتظار ہم کو زیادہ
مدت تک کرنا پڑے گا اور انتظار کی گھڑیاں سخت ہوتی ہی ہیں۔

روس کا محاذ جنگ

جاڑوں کے آغاز میں روس کے محاذ پر جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی، اس کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جرمن فوجیں برابر پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں
بعض کا خیال ہے کہ یہ تغیر صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ روس اپنی طیاریاں مکمل کر چکا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شدید برفباری اس کا سبب
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روس نے جس پامردی کے ساتھ جرمن فوجوں کا مقابلہ کیا اور جس ہمت وولولہ کے ساتھ اس نے اپنی طیاریاں جاری رکھیں، اس سے یہ تو ضرور ظاہر ہوتا
ہے کہ باوجود ناکامیوں کے وہ اپنے اور اتحادیوں کے ذرایع سے پوری طرح فایدہ اٹھانے کا اہل ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہاں کے محاذ جنگ پر موسم نے بھی تبدیلی

نتیجے میں شدید سردی اور برفباری بھی بڑی حد تک شامل تھی اور اب کہ سردیاں ختم ہو رہی ہیں، اس میں تغیر ضرور رونما ہوگا، جیسا کہ ہٹلر کی تازہ ترین تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے

سردیوں سے پہلے جرمن فوجیں، اوکرائن، سفید روس اور کریمیا کے علاقہ پر قابض ہو کر ایک طرف بحر آزوف تک پھیل گئی تھیں اور دوسری طرف ماسکو اور لینن گراڈ کی دیواروں کی توپوں کی آواز پہونچنے لگی تھی، لیکن سردیوں کے آغاز کے بعد ہی جرمن اقدام کمزور ہو گیا اور روس نے جارحانہ کارروائی شروع کر دی

اس وقت تک روس کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ اس لحاظ سے ضرور قابل ذکر ہے کہ اس نے جرمن سیلاب کو روک کر شدید خطروں سے نجات حاصل کر لی ہے لیکن جماعت کے قدموں سے ابھی تک وہ اپنی زمین کو پاک نہیں کر سکا

اوکرائن، کریمیا اور سفید روس کے علاقہ میں جتنے اہم مقامات پر جرمن قبضہ ہو چکا تھا، وہ اب تک بدستور قایم ہے اور ماسکو کی طرف اسمولنسک بھی ابھی تک روسیوں کے نہیں آیا۔ اسی طرح لینن گراڈ کا محاصرہ بھی بدستور قایم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جرمنی موسم بہار کے حملے کے لئے تازہ فوجیں فراہم کر رہا ہے، بلکہ ان میں سے بعض فوجیں روس کو بھیجی بھی جا رہی ہیں، اس لئے یہ امید رکھنا کہ آیندہ بھی روس کا نقشہ جنگ یہی رہے گا صحیح نہیں۔ پندرہ بیس دن کے اندر جرمنی کا حملہ روس پر پھر شروع ہوگا اور دنیا کی توجہ بیک وقت مشرق و مغرب دونوں طرف مبذول ہو جائے گی

ہر چند جرمنی کو اب وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں گی جو اس سے پہلے حاصل تھیں، کیونکہ روس کو جاڑوں میں اپنی طیاریاں مکمل کرنے کا بھی موقع مل گیا ہے اور اسوقت تک اُسے جرمن فوجوں کی لڑائی کا تجربہ بھی ہو چکا ہے، تاہم نازی خطرہ سے روس کو نجات ملنا فی الحال ممکن نہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ سرما تک کوئی تازہ پیچیدگی جنگ کے نقشہ میں کوئی اہم تبدیلی پیدا نہ کر دے گی

مغرب میں بحر اٹلانٹک، بحر روم، افریقہ، جبرالٹر، انگلش چینل اور مشرق میں ہندوستان، آسٹریلیا، سب کے سب خطرہ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ روس کے محاذ کے علاوہ کسی اور تازہ محاذ پر بھی جنگ شروع ہو جائے

افریقہ میں اب بھی لڑائی جاری ہے اور پلہ جرمنی کی طرف کا بھاری ہے، اس لئے برطانیہ ادھر سے اپنی توجہ نہیں ہٹا سکتا۔ اسی طرح انگلش چینل پر جو تازہ حملہ جرمنی نے کیا تھا، وہ اس کا مقتضی ہے کہ سواحل انگلستان کو اور زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ بحر اٹلانٹک سے جرمنی کے تین جہازوں کا بھاگ کر محفوظ نکل آنا ایسا معمولی واقعہ نہیں کہ اس سمندر کی طرف سے اتحادی غافل ہو جائیں اور سنگاپور پر جاپانی قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان اور آسٹریلیا کی طرف سے جو خطرے پیدا ہو گئے ہیں وہ بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اتحادی ساری توجہ صرف روس کی طرف مبذول کر سکیں گے اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے، ہم روسی محاذ کے متعلق بہت زیادہ امیدیں قایم نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر امریکہ کی طیاریاں اس حد تک ہو گئیں کہ وہ اٹلانٹک اور پاسفک میں اپنے بحری بیڑے کافی تعداد میں پہونچا سکا، تو برطانیہ کی بحری قوت پر جو غیر معمولی دباؤ اسوقت پڑ رہا ہے، وہ یقیناً ہلکا ہو جائے گا اور اُس وقت حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکے گی

تخئیل و محاکاۃ

فن شعر و شاعری پر اردو زبان میں آج تک جو کتابیں یا دیوانوں کے مقدمے اور تبصرے لکھے گئے ہیں ان سب میں تخئیل و محاکاۃ کی بحث اور تعریف مخصوص الفاظ اور خاص عبارتوں سا بیان کی گئی ہے۔ نیز ادبی و علمی رسایل و اخبارات میں کبھی کبھی اس کے متعلق مضامین نظر سے گزرے ہیں مصنفین کتب اور مضمون نگار اہل قلم نے جہاں شاعری کی بحث پر قلم اٹھایا ہے اور مروجہ تعریف کی ہے وہاں تخئیل و محاکاۃ کا بیان بھی ان کو لازمی طور پر کرنا پڑا ہے۔ غالباً اردو میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ اس بحث کو مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں لکھا ہے اس کے بعد سے دیوان عجم اور شعر الہند وغیرہ میں شعر العجم کی تحقیق کو چراغ راہ بنا کر اسی کی روشنی میں اشعار پر نقد و انتقاد کیا ہے اور اس تقلید جامد کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر کچھ بھی تحقیق سے کام لیا جاتا تو شعر العجم کے غلط مبحث کی گتھیاں سلجھ جانے کی امید ہو سکتی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم سیر و تاریخ و ادب میں قابل قدر تصنیفات کے مالک تھے ان کے طرز تحریر کا حسن ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں شعر العجم ان کے مذاق سلیم کا دلچسپ کارنامہ ہے اہل ذوق نے اس سے فوائد حاصل کئے ہیں لیکن مولانا نے تخئیل و محاکات کے مبحث کو ایک عقدۂ لاینحل بنا دیا ہے کہیں ان کو شعر کے اجزا بتاتے ہیں اور کہیں ان کو شعر کی دو صنفیں ثابت کرتے ہیں اور کہیں تخئیل کو خود شعر میں شمار کرتے ہیں اور پھر ان کے مواقع استعمال جدا جدا بتاتے ہیں۔ شعرائے ہند میں شعرا کے کلام کو اسی معیار پر پرکھا ہے اور تخئیل کو ایک ناقابل عفو گناہ سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان سہو و خطا سے بری نہیں ہو سکتا سچ ہے ”الصمارم قد ینبو والجواد قد یکبو“ بربنائے تقلید و حسن ظن تخئیل و محاکاۃ کی غلط تعبیر عام ذہنوں میں راسخ ہو گئی ہے اور اب تک کسی نے اس بحث میں محققانہ نظر سے کام نہیں لیا اس لئے شعر العجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ کو اس بحث پر قلم اٹھانا پڑا اور اس سے مقصود صرف عام غلط فہمی کا ازالہ اور تقلید کی خرابی کو رفع کرنا ہے۔ چونکہ عام طور سے کو ابتک صرف تخئیل، محاکات، اور تخئیل کی تعریف صحیح معلوم نہ ہونا ہے اس لئے ہم اصلی الفاظ کا صحیح مفہوم بیان کر کے اغلاط عامہ کی توضیح کرتے ہیں۔

تخیل : جو محسوسات و مدرکات انسانی کے خیال میں موجود ہیں قوت متخیلہ دماغی ان میں تصرف کرتی ہے۔ مختلف اشیا کو جمع کر کے طرح طرح کی صورتوں میں ترکیب دیتی ہے اور کبھی مجتمع اشیا کو منتشر کرتی ہے کبھی ان کی ہیئت و صورت بدل دیتی ہے کبھی قلب ماہیت کر کے حقیقت شے کو متغیر کر دیتی ہے انھی تصرفات دماغی کو تخیل کہتے ہیں اور یہ قوت تمام افراد انسانی میں یکساں نہیں ہوتی کسی میں کم کسی میں زیادہ پائی جاتی ہے لیکن اس کے اختراعات و تصرفات غیر محدود اور لا انتہا ہیں ایک شاعر نے قوت متخیلہ کی اسی حالت کو پیش نظر رکھ کر کیا خوب کہا ہے :

صد سال میتوان سخن از زلف یار گفت ، — در بند آں مباش کہ مضمون نماند است

یہاں صد سال سے غیر محدود زمانہ مراد ہے۔ غیر ذی روح کو ذی روح غیر ناطق کو ناطق معدوم کو موجود غیر ممکن کو ممکن بنا دینا تخیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ محاکات اور تخئیل سب اسی کے افعال ہیں۔

محاکاۃ : باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کی نقل اتارنا۔ اور چند چیزوں میں مشابہت قائم کرنا ہیں۔ اسی کو تشبیہ و تصویر کہتے ہیں قوت متخیلہ جب اپنے محسوسات میں چند چیزوں کو باہم مشابہ پاتی ہے اور ان کو ایک سلک میں منسلک کر دیتی ہے تو ان کو متحد ثابت کرتی یا قریب باتحاد پہونچا دیتی اور ایک کا حکم دوسرے پر لگاتی ہے اس کا نام محاکاۃ ہے۔ شاعر اس کو تشبیہ استعارہ کنایہ وغیرہ میں دکھاتا ہے۔

تخئیل : باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں کسی کے دل میں کوئی خیال غیر واقعی پیدا کرنا اسی کو ایہام کہتے ہیں۔ شاعر جہاں کسی غائب یا غیر ذی روح یا غیر ناطق سے خطاب کرتا ہے تو سامع کو اس شے کے حاضر یا ذی روح یا ناطق ہونے کا تخیل ہو جاتا ہے اور یہ تخئیل سامع کے ذہن میں بعض موقعوں پر یقین کا رتبہ پیدا کر لیتا ہے۔ تخئیل اگرچہ ایک فریب و مغالطہ کی صورت ہے لیکن سامع کو تسلیم کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور اس سے طبیعت کو ذہنی طور پر انقباض و انبساط ہوتا ہے۔ جب کلام میں بذریعہ محاکات کوئی تخئیل پیدا کی جاتی ہے تو اس کو شعر کہتے ہیں۔ محاکاۃ یا صرف تخئیل کا نام شعر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں شعر کے جز لاینفک ہیں جن کا وجود ہر حال میں شعر کے لئے ضروری ہے۔

تخئیل شاعرانہ محاکاۃ کے ذریعہ ہوا کرتی ہے یعنی تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور استعارہ تخئیلیہ تخئیل کا قوی سبب ہو تو اس سے سامع کا خیال مشبہ یا مستعار منہ سے مشبہ یا مستعار لہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ نقل کو اصل سمجھ کر اصل کا ظاہرہ نقل سے حاصل کرتا ہے۔

بانسری، ستار، ہارمونیم وغیرہ میں سازندہ جب محاکاۃ سے کام لیتا ہے یعنی موزوں کلمات کے مشابہ نغمات ادا کرتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش گلو انسان گا رہا ہے۔ یہاں بھی محاکات تخییل تک پہونچا دیتی ہے اور نقل پر اصل کا گمان حد یقین تک پہونچ جاتا ہے لیکن یہ خود شعر نہیں بلکہ شعر یا کلام کی محاکات ہے ۔ ارسطو نے کتاب الشعراء میں لکھا ہے : " والاقاویل الشعریۃ ھی الاقاویل المخیلۃ "۔ یعنی اقوال شاعرانہ ہی کا نام اقوال مخیلہ ہے ۔ ارسطو اسی کو کہیں محاکاۃ کہتا ہے اور کہیں تخییل ۔ کیونکہ محاکاۃ موجب تخییل ہوتی ہے ۔ مولانا شبلی مرحوم نے ارسطو کا مطلب نہیں سمجھا اور شعر العجم میں اس پر اعتراض کر دیا۔

بعض سطحی نظر اردو مصنفین نے تحقیق سے چشم پوشی کر کے مطلقاً تخییل او ر شعراء کی خیال بندی و دقت آفرینی کو تخییل اور محض حکایت و واقعہ نگاری کو محاکاۃ سمجھا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے جو شعر العجم کی بحث تخییل و محاکاۃ کی تقلید سے رونما ہوئی ہے ۔ شعر العجم جلد ۴ بحث تخییل و محاکاۃ کی عبارت ذیل پر نظر کرنا چاہئے :

" ارسطو کے نزدیک یہ چیز (شعر) محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخییل ہو اور محاکاۃ نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخییل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کئے جاتے ہیں ...... حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخییل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا"

مولانا نے اس کے بعد دوسرے مقام پر اپنے خیال کی مزید توضیح فرمائی ہے اور شعر کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

" تخییل اور محاکاۃ اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن بلحاظ اکثر دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں ۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے مثلاً مناظر قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے ۔ مثلاً اگر بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار، آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہئے یعنی اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے ۔ متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخییل سے کام لیتے ہیں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخییل اور محاکات کا صحیح مفہوم مولانا کے ذہن میں نہ تھا ورنہ یہ نہ لکھتے کہ " ان چیزوں کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے " کیونکہ اسی کو تخییل کہتے ہیں اور محاکات کسی حالت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتی ۔ محاکاۃ اور تخییل کے موقعے الگ الگ سمجھنا اور ان کے باہم تفرقہ کرنا ایک نغمہ خارج از آہنگ ہے ۔ منشا غلط یہی ہے کہ تخییل کو دور از کار تخییل اور محاکاۃ کو تخییل سے جدا مان لیا ہے حالانکہ یہ کہ تخییل و محاکاۃ کو شاعری کا عنصر بھی تسلیم کیا اور پھر کل یا مجموعہ کو اپنے اجزاء سے مستغنی بھی ثابت کیا ۔ آپ نے تمام بحث میں فرضی، ذہنی، خیالی اور غیر ممکن و معدوم اشیا کی محاکاۃ کو تخییل سمجھ کر اس کو عیب قرار دیا ہے اور درحقیقت یہ محاکاۃ کی بے اعتدالی ہے اسی طرح صرف حکایت و وقوع گوئی کو محاکاۃ بتا کر اس کو تخییل سے (بزعم خود) خالی سمجھا ہے اور درحقیقت کوئی محاکاۃ تخییل سے خالی نہیں ہوتی ۔ بنائے فاسد علی الفاسد کے مثالیہ اشعار جو اپنے دعوے کے ثبوت میں درج کئے ہیں وہ دعوے کے خلاف شہادت دیتے ہیں مثلاً خالص محاکات کی مثال میں اشعار ذیل پیش کئے ہیں ؎

ز رنگ تر کہ نسیم زہر کنار ہی خیزد   بجنبد این می کلہ عارض آب می مزد

سنبل این می کشد گردن این میگزد   گہ بچہرہ می پیچد گہ بہ سمن می وزد

گاہ بشاخ درخت گہ بلب جوئبار

مولانا کے خیال میں یہ محاکات ہے جس میں تخییل کا نشان نہیں ۔ لیکن ایک سطحی نظر انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ شاعر نے ایک عاشق و معشوق کے باہمی اختلاط کا نقشہ کھینچ دیا ہے نسیم کو عاشق اور گل کو معشوق بنا دیا ہے اور ان کے افعال و حرکات صاف بتاتے ہیں کہ یہ انسانی خواص ہیں ۔ کیا یہ ایک زبردست تخییل نہیں ہے اور کیا سامع کا ذہن اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ انسانوں کے حرکات ہیں ۔ اسی طرح خالص تخییل کی مثال میں یہ شعر لکھا ہے :

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال   کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

شاعر نے فروتنی کو دلیل کمال بتایا ہے اور اس کے ثبوت میں منزل پر پہونچکر سوار کا پیادہ ہو جانا پیش کیا ہے ۔ یعنی منزل پر پہونچنے کو کمال سے تشبیہ دی ہے اور پیادہ پائی کو فروتنی سے یہ تمثیل بعینہ محاکاۃ اور نقل مطابق اصل ہے مصرعۂ ثانی میں حرف تشبیہ "چوں" بھی موجود ہے ۔ مولانا نے خود بھی لکھا ہے کہ " محاکاۃ کا بڑا آلہ تشبیہ ہے " پھر خدا جانے شعر مذکور کو محاکاۃ سے کیوں خالی بتایا ۔ اسی طرح ؎

بسوئے آتش گل در گرفت است   کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

اس شعر میں آتش گل کو جو محض استعارہ تھا شاعر نے حقیقت قرار دیکر بلبل کو پانی میں آشیانہ بنانے کے لئے مجبور کر دیا یہ بالکل محاکاۃ ہے لیکن غیر معتدل اور دور از کار لیکن آتش گل کی تخییل اس محاکاۃ کی محتاج تھی ۔ اس کو محاکاۃ سے خالی کون کہہ سکتا ہے ۔ شعر العجم اور اس کی مقلد شعر الہند دونوں نے محاکاۃ کی بے اعتدالی یعنی ذہنی و معدوم و غیر ممکن اشیاء کی محاکات کو تخییل کہکر شعراء کے فنا کو عیب و مردود ٹھیرایا ہے اور اسی کو حسن و قبح اشعار کا معیار قرار دیا ہے اگر تخییل و محاکاۃ کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہوتا تو اسی غلطی کا امکان نہ تھا ۔ تخییل اور محاکاۃ میں تو فرق ثابت ہوتی

یہ شعر محاکاتی و تخئیلی کی تقسیم ہوتی ۔ تعریفات میں مجمل و مبہم الفاظ سے کام نہیں چلتا ۔ محاکات کو صرف تصویر کشی و بیان واقعہ سے تعبیر کرنے اور تخئیل کو رنگ بھرنے اور موقلم کو جنبش دینے سے تخئیل و محاکات کی تعریف مطلق نہیں ہو سکتی ۔ اردو مصنفین کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں وہ انھی بے معنی و مبہم الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں ۔ اہل قلم نے بے سمجھے بوجھے انھی الفاظ میں محاکات و تخئیل کی تعریف بیان کی اور جس شعر میں دقت آفرینی و نازک خیالی کی جھلک دیکھی اس کو تخئیلی شعر کہہ دیا اور جس میں واقعہ نگاری نظر آئی اس کو محاکاتی شعر سمجھا ۔ اصناف سخن میں غزل قصیدہ مثنوی کو محاکاتی شاعری کا میدان بتایا گیا اور اس میں تخئیل کو بدترین عیب سمجھا ۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کی صحیح تعریف بھی کوئی نہیں بیان کر سکتا ۔ اس کو خطابت و مصوری و فلسفہ سے ممیز کر سکتا ہے ۔ اہل قلم شعر کی تعریف میں جذبات کا لفظ لازمی طور پر ذکر کرتے ہیں چنانچہ شعر العجم میں بھی شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں "

معلوم نہیں جذبات سے کیا مراد ہے اور شعر کی تعریف اس کے ذریعہ سے کیونکر ہو گئی ۔ ایک خطیب ایک فلسفی بلکہ ہر ایک علم و فن کا امام اپنی تقریر و تحریر الفاظ میں ادا کرتا ہے اور سب میں جذبات شامل ہوتے ہیں بعض حضرات نے زیادہ غائر نظر سے اس کو یوں رنگین و دلکش بنایا ہے کہ "جذبات و احساسات جب برانگیختہ ہوتے ہیں اسوقت اضطراری طور پر جو کلام موزوں انسان کی زبان پر جاری ہوتا ہے اس کا نام شعر ہے" یہ بھی بالکل مہمل بات ہے شعر اختیاری چیز ہے نہ کہ اضطراری ۔ اور موزوں کلام کو بے اختیار کہہ دینا بھی ایک ذہنی و فرضی بات ہے

اگر محاکات و تخئیل کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو تو شعر کی تعریف یہی ہونا چاہئے کہ "جس کلام میں تخئیل و محاکات ہو وہ شعر ہے" مصوری سے بھی امتیاز ہو جاتا ہے کیونکہ تصویر میں الفاظ اور کلام نہیں ہیں ۔ سائنس یا فلسفہ چونکہ دلائل یقینی پر مبنی ہوتے ہیں ان میں مغالطہ و فریب نہیں ہوتا اس لئے وہ بھی شعر سے خارج ہیں کیونکہ تخئیل ایک فریب ہے ۔ وہ شعر کا عنصر ہے ۔ اسی نے کہا گیا ہے کہ "بچوں الکذب احسن او" ۔ خطابت میں لوگوں کے مسلمات و مشہورات سے کام لیا جاتا ہے نہ کہ بجائے تخئیل و محاکات کے ۔ دلائل خطابیہ اور قوم کے ذہنی و مذہبی مسلمات کو اپنے دعووں کی شہادت میں پیش کر کے ترغیب و ترہیب کا فرض ادا کرتا ہے لیکن شاعر کے مقدمات کا ذخیرہ محض تخئیل و محاکات پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ بالکل بے حقیقت و غیر واقعی تخیلات ہیں ۔ جو لوگ شعر کی صحیح تعریف سے ناآشنا ہیں وہ ان مباحث کی تفصیل میں دفتر کے ورق سیاہ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی حقیقت منکشف نہیں ہوتی ۔

شعر العجم کا یہ فقرہ کہ "خطابت مخاطبین و سامعین پر اثر دکھاتی ہے اور شعر خود شاعر کے نفس پر" عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے کہ شعر سے سامعین کے جذبات میں تلاطم نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا اثر شاعر ہی تک محدود رہتا ہے ۔ یہ حقیقت کے خلاف اور غرض شعر کے بالکل منافی ہے شعر کی تاثیر کے یہی معنی ہیں کہ سامع کے جذبات کو بھڑکا دے عرب کے ایک نقاد کا قول ہے کہ "اشعر الناس من انت فی شعرہٖ" ۔ یعنی بڑا شاعر وہی ہے جس کے شعر میں سامع ہمہ تن محو ہو جائے ۔

ارسطو نے کتاب الشعر میں محاکات شاعرانہ کے محاسن و معائب دونوں کی تفصیل بیان کی ہے ۔ اردو کی بدقسمتی سے ہمارے مصنفین و ارباب قلم نے محاکات کے عیوب کو تخئیل کی بے اعتدالی بتایا ہے یہ غلطی بھی محاکات و تخئیل کے معنی نہ جاننے کے باعث ظہور میں آئی ہے ۔ کتاب الشعر سے چند عمدہ محاکات کے انواع یہاں لکھے جاتے ہیں لیکن ہم نے بطور توضیح مثالوں کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔

(۱) محسوسات کی محاکات محسوسات سے کیجائے تو بہتر ہے مثلاً ستاروں کی ایک خاص شکل کو تشبیہ کی بنا پر سرطان (کیکڑا) کہا جاتا ہے ۔ آنکھ کو نرگس زلف کو سنبل کہنا اسی قبیل سے ہے ۔

(۲) امور عقلیہ و ذہنیہ کی محاکات بھی امور محسوسہ سے ہونا چاہئے جیسے قید محبت ، طوق احسان ، دام فریب وغیرہ لیکن اس میں ایک خاص مناسبت ہونا چاہئے ۔ دام مسرت ، ساغر محرومی کہنا صحیح نہیں ہے

(۳) جمادات کو ناطق تسلیم کر کے درخت پتھر زمین آسمان وغیرہ سے خطاب کرنا ۔ "اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسی داری" ۔ اب محاکات غیر مقبول پر بھی نظر کیجئے ،

(۱) کسی موجود شئے کو ایک غیر ممکن و ممتنع الوجود سے تشبیہ دینا محاکات کی بے اعتدالی ہے لیکن وہ محاکات جو غلو کا ذب میں سوفسطائی شعرا کرتے ہیں مقبول محاکات ہے مثلاً ؎

در عدم ہم ز عشق شورے ہست ۔۔۔ گل گریباں دریدہ می آید

(۲) ایسی سادہ واقعہ نگاری جو صرف یقین و تصدیق کا فائدہ دیتی ہے محاکات غیر مقبول ہے البتہ اگر معانی شعریہ اس میں شامل ہوں تو وہ مستحسن ہے ۔ اسی وجہ سے قصص و مثنویات شاعرانہ داخل شعر ہیں اور محض تاریخ شعر سے خارج ہے ۔

(۳) اصل شے میں تحریف پیدا کرنا مثلاً دو کان کے بجائے کسی کے تین کان ثابت کرنا ۔ محاکات نامقبول ہے ۔ اسی طرح ایسے الفاظ میں محاکات کرنا جو محتمل الضدین ہوں ۔ یعنی ۔ معنی ایسے ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں مدح اور ذم دونوں پر دلالت ہو ۔ مثلاً کیوان (زحل) نحس ستارہ ہے لیکن اوج و رفعت میں بھی ضرب المثل ہے ۔

چونکہ تخئیل ہر محاکات کو لازم ہے اس لئے تخئیل کے متعلق حسن و قبح کی کوئی بحث نہیں ہو سکتی ۔ نقل پر اصل کا گمان ہونا بلکہ نقل کو اصل کی طرح مخاطب کے ذہن میں اتار دینا اور اس کو اصل باور کرانا تخئیل ہے اور سامع کا فریب میں آ کر نقل کو اصل سمجھنا اور اس سے متاثر ہونا تخئیل کی قوت کا نتیجہ ہے اسی کو تاثیر شعر کہتے ہیں ۔

معجز سہسوانی

محمودی رسم خط

(محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کے تبصرے کا جواب)

مارچ ۱۹۶۱ء کے نگار میں مولوی محمود علی خاں صاحب نے اُردو رسم خط پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے، اپنا ایجاد کیا ہوا ایک نیا رسم خط پیش کیا تھا جس پر ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۱ء کے نگار میں جناب محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کا ایک اختلافی تبصرہ شایع ہوا۔ اب مولوی محمود علی خاں صاحب نے ان اعتراضات سے بحث کی ہے جو شروانی صاحب کی طرف سے انکے رسم خط پر وارد کئے گئے۔

اُردو رسم خط کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جب اُردو داں طبقہ مجبور ہو گا کہ وہ موجودہ رسم خط کو بدلے لیکن شاید وہ زمانہ وہ ہوگا جب وقت گزر چکا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ اُردو داں طبقہ کے تمام اہل فکر و بصیرت اس طرف توجہ کریں اور اگر انھیں محمودی رسم خط میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اسے ظاہر کریں۔ یہ خالص علمی مسئلہ ہے جو آپس کی بحث و گفتگو ہی کے بعد خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے اور جس میں ذاتیات کو دخل دینے کی مطلق ضرورت نہیں۔

نیاز

ستمبر ۱۹۶۱ء اور اکتوبر ۱۹۶۱ء کے رسالہ نگار میں محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم۔اے کے مضمون کی دو قسطیں میری نظر سے گزریں، مضمون خاصہ طویل ہے اور بقول اڈیٹر نگار فاضلانہ بھی ہے، مگر بقول اڈیٹر موصوف "کاش اس کا انداز بیان زیادہ سلجھا ہوا ہوتا" تو مجھے اس سے استفادہ کرنے کا اور زیادہ موقعہ ملتا، بہر حال مقالہ نگار کا فاضلانہ مضمون جس کے لکھنے میں اُنھوں نے بڑی کاوش کی ہے ضرور قابل داد ہے، خاصکر اس لحاظ سے کہ اُس کی وجہ سے اُردو رسم خط میں کسی مفید انقلاب کے پیدا ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے جاتا رہا، جزاک اللہ!

مجھے شریف صاحب سے یہ شکایت ضرور ہے کہ اُنھیں میرے ایجاد کئے ہوئے رسم خط میں کہیں بھی کوئی خوبی یا آسانی نظر نہیں آئی بلکہ اُن کی کوشش یہی رہی کہ اس پر جتنے زیادہ سے زیادہ اعتراضات ہو سکیں وہ کئے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے رسم خط کے لفظ اور محمودی رسم خط کے نام ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا، یہ اعتراضات بالکل اسی قسم کے ہیں جس طرح کہ عربی قواعد کی کتاب میں میری نظر سے گزرے۔

اعتراض ۔ بداں نگفت اعلم چرا نگفت

جواب ۔ زیرا کہ کتاب بہ فارسی است

اعتراض ۔ باز اسعدک اللہ تعالیٰ چرا گفت

جواب ۔ زیرا کہ دعا بہ عربی مستجاب است

مصنف نے کتاب کی ابتدا اس عبارت سے کی تھی "بداں اسعدک اللہ تعالیٰ" غریب بس اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ حاشیے پر سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی، اسی طرح سر سید مرحوم نے جب قرآن شریف کی تفسیر لکھی تو ایک مولوی صاحب نے ابتدا ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے لکھا کہ سر سید نے سلف صالحین کے خلاف بسم اللہ کا ترجمہ با محاورہ اُردو میں لکھ دیا ہے حالانکہ ہمارے بزرگ یوں لکھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں کہ "شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا"۔

مجھے ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت پر افسوس ہے کہ اُن کا جمود اُن کو زندگی کے کسی شعبے میں بھی ایک اِنچ آگے بڑھنے نہیں دیتا، اور زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہر مفید تجویز کی مخالفت میں پرانے خیال کے علما سے زیادہ انگریزی داں طبقہ زیادہ پیش پیش نظر آتا ہے، دوسری چیزوں پر بحث کرنے کا تو یہ موقعہ نہیں، صرف رسم خط کے مسئلے کو لیجئے کہ وہ ایک عرصہ سے بزرگوں کا میدان کارزار بنا ہوا ہے، اور آج تک کسی مفید نتیجے تک پہونچنے میں کامیابی نہیں ہوئی اور نہ آیندہ اس کی توقع ہے، دُنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر یہ ہیں کہ ابھی تک لکیر کے فقیر

سرمایہ رہا ہیں، دوسری طرف دیکھئے کہ محض ٹائپ کی آسانی کی وجہ سے ہندی مطبوعات کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اُس کے اثر سے ہندی زبان اور ہندو تہذیب روز افزوں ترقی پر ہے اور ہماری آنکھیں ان تمام چیزوں سے بند ہیں اور ابھی تک ہم نے یہی طے نہیں کیا ہے کہ نستعلیق ہی قائم رکھا جائے، نسخ اختیار کرلیا جائے، یا اگر یا رومن میں اُردو لکھی جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ اور کوئی بات طے بھی کیونکر ہو جبکہ ہمارے اختلافات کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو ص۔ ث۔ ظ اور ذ کے حذف کردینے سے اسلام خطرہ میں آجاتا ہے، کبھی رسم خط بدلنے سے ماضی سے رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، کبھی ٹائپ کو رواج دینے سے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ لیتھو پریس والوں کو بڑا نقصان پہونچے گا اور تمام کاتب بیکار ہوجائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام خطرات میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز خطرہ رشتۂ ماضی کے منقطع ہونے کا ہے کیونکہ ان کے نزدیک رسم الخط ہی وہ رشتہ ہے جو ہم سب کو خیر القرون سے مربوط کئے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ کسی اور رشتہ کی ضرورت ہی نہیں، آلِ رسول، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا خلف الصدق ہونے کے لئے صرف رسم الخط ہی کافی ہے، حالانکہ ان کو یہی نہیں معلوم کہ جس خط میں صحابہ عربی لکھتے تھے وہ ہمارے مروجہ خط سے اس درجہ مختلف تھا کہ ہم اُس میں لکھی ہوئی عبارت ہرگز نہیں پڑھ سکتے۔ اس خط میں نہ نقطے تھے اور نہ دائرے جن کے حذف کردینے کا جناب شریف صاحب کو بڑا صدمہ ہے۔

رسم خط ہی پر منحصر نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی ایک مسئلہ پر متفق ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اور اختلافات کی کثرت سے ذہنیت اس درجہ فاسد ہوچکی ہے کہ کسی قسم کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قدرت ایک ایسی ہستی کو پیدا نہ کردے جو اپنی ذہنی طاقت سے ان تمام اختلافات کو کچل کر سب کو راہ راست پر لگا دے۔ دراصل ہمارے ہندوستان کو بھی ایک مصطفےٰ کمال کی ضرورت ہے جو ان کرم خوردہ دماغوں کے بوسیدہ خیالات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی طاقت سے اصلاحات نافذ کردے۔ ملک کو ایک انسان کی ضرورت ہے نہ کہ صدہا انسان نما حیوانات کی "کہ از صد ہزار و صد تن فکر انسانے نمی آید"

ترکی میں جب رسم خط بدلنے کا خیال پیدا ہوا تو وہاں بھی قدیم ذہنیت نے مخالفت شروع کردی، کچھ لوگوں نے "ماضی سے رشتہ منقطع ہونے" "عالم اسلامی سے تعلق قائم نہ رہنے اور آج تک کا کل ذخیرۂ کتب بیکار ہوجانے" کا خطرہ ظاہر کیا۔ بعض نے کہا کہ عربی الفاظ کو ترکی تلفظ کے مطابق لکھنا جائز نہیں کیونکہ ترکی کے سیلخ کو عربی کی حدود میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے، علماء نے بھی اسے ناجائز قرار دیا اور سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ ث، ص، ظ اور ذ کے اُڑا دینے سے اسلام خطرہ میں آگیا اور ہمزہ وصل اور لام تعریف کے حذف کردینے سے سیبویہ، ابن حاجب اور ملا جامی کی ارواحِ طیبہ کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوا، ورنہ تمام باتیں قربِ قیامت کی علامتیں سمجھی گئیں، مگر مصطفےٰ کمال کہ اُس نے کسی ایک احمق کی بھی نہ سنی اور ایک دم رسم خط کو بدل کر ترکی زبان کو رومن حروف میں لکھنے کا حکم دیدیا۔ اس انقلاب کے بعض اہم اور مفید نتائج یہ نکلے:

۱- ترکی زبان ترکی تلفظ کے عین مطابق لکھی جانے لگی، خواہ اصل ترکی کے الفاظ ہوں یا عربی اور فارسی وغیرہ سے مستعار لئے گئے ہوں اور اس طرح پر املا میں غلطی واقع ہونے کا امکان تقریباً نوے فیصدی باقی نہیں رہا۔

۲- کسی لفظ میں کوئی حرف صحیح یا حرف علت زائد نہیں لکھا جاتا بلکہ جو حرف بھی ہوتا ہے وہ اپنی مقررہ آواز رکھتا ہے اور اس لحاظ سے ترکی کا موجودہ رسم خط انگریزی، جرمن اور وغیرہ سے زیادہ مکمل اور باقاعدہ ہے۔

۳- اُردو کی طرح پہلے ترکی بھی بغیر زیر زبر اور پیش کے لکھی جاتی تھی اور نگاہ عادی ہوجانے کی وجہ سے تصویر دیکھکر لفظ کی مجموعی عبارت صحیح پڑھ لی جاتی تھی لیکن رسم خط میں اس قسم کے بنیادی نقائص پائے جانے سے ایک مبتدی بچے، ایک بالغ انسان اور غیر اہل زبان کو اس کے سیکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور اشکالِ حروف کی کثرت اور س اور ص وغیرہ کا اس پر مزید تھا۔ انقلاب کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی، مبتدی ہو یا منتہی، اہل زبان ہو یا غیر اہل زبان، تھوڑی سی مشق کے بعد صحیح عبارت پڑھنے لگتا ہے۔

۴- قدیم رسم خط میں سادے زبر زیر اور پیش کی علامتیں تھیں اور وہ بھی اُردو کی طرح عام طور پر نہیں لگائی جاتی تھیں، چونکہ ترکی زبان میں حرکات کی مرکب آوازیں بھی ہیں اس لئے مشکل الفاظ پر زبر زیر اور پیش لگا دینے کے باوجود اُن کا صحیح پڑھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اب یہ کمی پوری کردی گئی، ہر لفظ حروف علت کے ساتھ جو حرکات کا کام دیتے ہیں لکھا جاتا ہے، اور مفرد و مرکب آوازوں کے ظاہر کرنے کے لئے رومن حروف علت کسی علامت یا بغیر کسی علامت کے اس طرح لکھے جاتے ہیں:

(a) فتحہ اور الف ü ، u ، ö ، o ، e ، î ، i ، ı ، â ،

(â) کھنچے ہوئے الف، (ı) بغیر نقطہ والی (i) کسرہ معروف (î) یائے معروف ذرا کھنچی ہوئی، (e) زبر اور زیر کی درمیانی آواز (o) واؤ مجہول اور ضمہ مجہول (ö) ضمہ مجہول مائل بہ یائے مجہول (u) ضمہ معروف اور واؤ معروف (ü) ضمہ معروف مائل بہ یائے معروف کا کام دیتا ہے۔

ج کی آواز کے لئے C، چ کے لئے Ç اور ش کے لئے Ş اور ژ کے لئے J س، ص، ث کی جگہ صرف S ز، ذ، ظ اور ض کی جگہ Z ت، ط کی جگہ T ق اور ک کی جگہ K رکھا گیا، غ کا تلفظ موجودہ ترکی میں نہیں ہے اس لئے ہ، ح، خ کی جگہ صرف H سے کام لیا گیا۔ اس رسم خط کی علامات زیادہ تر ہنگری رسم خط سے اخذ کی گئی ہیں۔

ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند عربی اور فارسی الفاظ ترکی اخبارات سے نقل کر کے لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو گا کہ ترکوں نے اپنے تلفظ اور کتابت کو کس طرح مطابق کر دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی ترکی میں عربی الفاظ کس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں:

مخابر (muhabir) مدہش (müthiş) حکومت (hukümet)
اہمیت (ehemmiyet) بلدیہ (belediye) مساعدہ (müsaade)
منازع فیہ (münazaünfih) تشبث (teşebbüs) تضاد (tezat)
چونکہ (çünkü) خیلے (hayli) ہنوز (henüz)

میں نے اس موقعہ پر ترکی رسم خط کے متعلق بظاہر کچھ غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو محمد شریف خاں صاحب شروانی کے بہت سے اعتراضات اس تفصیل کو پڑھ لینے کے بعد خود بخود رفع ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو فاضل معترض کے لفظی اعتراضات ہیں اور دوسری طرف مصطفےٰ کمال کے تاریخی کارنامے کے عملی نتائج۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے موجودہ رسم خط میں اصلاح کی ضرورت ہے، خواہ موجودہ حروف اور اُن کی شکلوں میں کچھ اصلاحی تغیر کر دیا جائے، خواہ کوئی دوسرا رسم خط اختیار کیا جائے، دیوناگری حروف کا اختیار کرنا تو میرے نزدیک خودکشی کا مترادف ہے۔ رومن حروف کے اختیار کرنے میں اگرچہ یہ فایدہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی ہر وہ قوم جو رومن حروف سے آشنا ہے مجبوراً اردو پڑھنے لگے گی اور اس طرح پر اردو کی اشاعت بڑھ جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے مخصوص حالات کی بنا پر اس میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، لہذا بہتر صورت یہی ہے کہ موجودہ رسم خط ہی میں ایسی اصلاح کر دی جائے کہ وہ آسانی کے اعتبار سے کسی طرح رومن اور ہندی سے کم نہ ہو، اس صورت میں چیز بھی اپنی رہے گی اور رشتہ ماضی بھی منقطع نہ ہو گا۔ چنانچہ میں نے یہی آخری صورت اختیار کی اور ایسا رسم خط ایجاد کر کے پیش کر دیا جس میں نہ تو نئے سرے سے حروف شناسی کی ضرورت ہے اور نہ اس میں ترکیبی مشکلات و اشکال کی کثرت ہے، اور سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ حرکات جزو حروف ہو جانے سے غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اب رہے اعتراضات تو دنیا کی ہر چیز پر صدہا اعتراض ہو سکتے ہیں اور اُن کے صدہا جوابات بھی دئے جا سکتے ہیں۔

محمد شریف خاں صاحب شروانی نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے جوابات نہایت تفصیل سے دئے جا سکتے ہیں لیکن میں اس کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اور صرف مختصر جوابات لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسم خط اگرچہ حقیقت میں "وہ معین حروف ہیں جن میں تصرف کرنے سے اس کی کتابت غلط ہو جاتی ہے"، لیکن اب عام طور پر اردو میں "صنعت کتابت" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لہذا اصطلاح پر جھگڑنا بے معنی ہے۔

میرے ایجاد کردہ رسم خط کا "خط قومی" نام رکھنا فاضل معترض کے "حدود اختیار" سے باہر ہے اس کا نام محمودی رسم خط ہے اور یہی رہے گا۔

میں نے لکھا تھا (۱) اُردو حروف کا پیچیدہ اختلاف (۲) خط کی ترکیبی صورت (۳) حرکات کا محض سیاق عبارت سے پڑھا جانا، موجودہ رسم خط کے خاص خاص نقائص ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نقائص ہیں جن کو میں نے "وغیرہ وغیرہ" کے لفظ سے تعبیر کیا تھا، اس پر شریف صاحب لکھتے ہیں "وغیرہ وغیرہ سے جو نقائص مراد ہیں وہ تو سوچنے سے ذہن میں نہیں آتے"، شریف صاحب اگر ذرا غور سے کام لیتے اور ذرا زیادہ سوچتے تو اور نقائص بھی اُن کے ذہن میں آ جاتے، مثلاً (۴) نستعلیق کے باریک جوڑوں کا تھوڑے عرصہ کے بعد ٹائپ میں ٹوٹ جانا۔ (۵) حرفوں کا ایک دوسرے پر سوار ہونا، اور یہی وہ ایسی خرابیاں ہیں جو اس خط کو ٹائپ میں منتقل ہونے سے مانع ہیں، اور اسی بنا پر حیدرآباد کا بنایا ہوا نستعلیق کا ٹائپ باوجود لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے کامیاب نہ ہو سکا۔

شریف صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس میں عقل کام نہیں کرتی کہ حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو خط کے ٹائپ منتقل ہونے سے کیا لگاؤ ہے"، شریف صاحب کو یہاں یا تو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا انھوں نے دیدہ و دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے، میرے مضمون کی عبارت یہ ہے: "اشکال کا پیچیدہ اختلاف اور اُن کی کثرت، خط کی ترکیبی صورت، یہ ایسی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے اس کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو بغیر پوری مہارت کے صحیح پڑھ سکتے ہیں، بچوں کے پڑھانے میں زیادہ

یہ صرف ہوتا ہے، غیر زبان والے اُسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے .....“ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ میں نے حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو صرف ٹائپ میں منتقل ہونے کا سبب قرار دیا ہے یا ایک طرف چند اسباب اور ایک طرف اُن کے نتائج لکھ دئے ہیں۔

شریف صاحب فرماتے ہیں ”خط نسخ میں بھی وہی پیچیدہ و کثیر اشکال ہیں لیکن اس کا ٹائپ اندرون و بیرون ہند کام دے رہا ہے اور آپ کے ہوتے ہوئے دلیل پیش کرنا بدیہیات سے انکار “ مجھے افسوس ہے کہ شریف صاحب نے میری عبارت غور سے نہیں پڑھی میرا یہ دعویٰ صرف نستعلیق سے متعلق ہے کہ وہ ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتا، اور یہ بیان بالکل درست ہے، اور اس سے انکار کرنا البتہ بدیہیات سے انکار ہے، رہا نسخ تو اس کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں کچھ نہیں لکھا، لیکن اب یہ کہتا ہوں کہ نسخ اگرچہ ٹائپ میں منتقل ہو گیا ہے مگر اس میں دوسرے نقائص بدستور باقی رہ جاتے ہیں یعنی اشکال کی کثرت اور عبارت کا سیاق کلام سے صحیح پڑھنا۔ مکمل رسم خط وہی ہے کہ جس زبان کا وہ رسم خط ہو اس کی تمام آوازوں کے لئے اس میں علامتیں موجود ہوں اس میں زیر زبر پیش کو علیحدہ سے لگانے کی ضرورت نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے حروف تہجی کی شکلیں کم سے کم ہوں اور یہ دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہوں ورنہ کثرت اشکال کی اگر پرواہ نہ کی جائے تو پھر چینی خط پر کیوں اعتراض ہوتا ہے جس میں سرے سے حروف تہجی ہی نہیں بالکل ہر چیز اور ہر مفہوم کے لئے ایک علیحدہ شکل ہے، اور ٹائپ تو اس کا بھی بن گیا ہے۔

حیدر آباد کے بعض ”اہل ہمت کے مساعی“ یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ”ایک صاحب“ کے اعلان کرنے سے اگر کوئی عملی نتیجہ برآمد ہوتا تو اسے ”منصۂ ظہور“ پر آ جانا چاہئے تھا کیونکہ کوئی مفید چیز بغیر رواج پائے نہیں رہ سکتی، مگر ایسا ہوا نہیں، اور مشکل بدستور باقی ہے۔

آگے چل کر معترض صاحب فرماتے ہیں: ”اگر نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو چکی ہے تو اس سے قریب تر خط نسخ ہے یا خط قومی (رسم خط محمودی)“ شریف صاحب یہ تو واقعہ ہے کہ نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہے، اب رہی یہ بات کہ نسخ کو اختیار کیا جائے یا کسی جدید رسم خط کو تو اس کا فیصلہ مستقبل خود کر دے گا۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاہلا ویاتیک بالاخبار من لم تزود۔

عنقریب زمانہ وہ (چیزیں) تمھارے سامنے پیش کر دے گا جن کو تم نہیں جانتے۔ اور تمھارے پاس خبریں لیکر وہ (قاصد یعنی زمانہ) آئیگا جس کو تم نے زادِ سفر نہیں دیا ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ ”بالغوں کی تعلیم اس خط کے ذریعہ سے تو کسی طرح ممکن نہیں“ فاضل معترض فرماتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ”اس کے ذریعہ سے ان کی تعلیم ہو رہی ہے“ ممکن کے لفظ سے میرا مطلب امکان منطقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ موجودہ رسم خط سے بھی زیادہ مشکل اگر کوئی رسم خط ہو تو اس کے ذریعے سے بھی بالغوں کی تعلیم ہو سکتی ہے مگر سوال تو دشواری اور آسانی کا ہے۔ جس کا جواب آگے چل کر معترض صاحب خود دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”اس کا الزام اصل خط پر عائد نہیں ہوتا، اس کی مستعمل صورت پر ہوتا ہے“

بندہ نواز! یہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل حروف کی شکلیں قائم رکھی جائیں اور مستعمل صورت بدل دی جائے، بجائے ترکیبی صورت قائم رکھنے کے حروف الگ الگ کر دئے جائیں اور حرکات کو حروف کا جزو بنا دیا جائے جیسا کہ محمودی رسم خط میں کیا گیا ہے۔

شریف صاحب فرماتے ہیں کہ ”اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈھالنے میں تقریباً اتنی ہی سہولت ہوگی جتنی رقوم حسابی کے ڈھالنے میں اور ٹکڑوں کی تعداد بھی خاص طور پر کم ہو سکے گی“ شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں صرف یہی ایک آسانی نظر آئی اگرچہ اس کو بھی ”تقریباً“ کا لفظ بڑھا دینے سے اُنھوں نے کچھ مشکل کر دیا، خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک آسانی کے تو قائل ہوئے مگر اسی سلسلۂ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں:

”لیکن اس نفع سے زیادہ نقصان ہے،

۱۔ حسن خط تو بالکل مفقود ہو جائے گا،

۲۔ پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی“

شریف صاحب! اگر حسن خط کے یہی معنی ہیں کہ ایک خوشنویس اطمینان سے بیٹھ کر نوک پلک سے درست ایک قطعہ یا ایک عبارت زیب دیوار کرنے کے لئے لکھ دے، تو اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہاں تو رونا یہ ہے کہ اگر کاتب صاحب کو اچھا ناشتہ مل گیا اور بیوی اُن کی سے لڑائی نہیں ہوئی تو انھوں نے ایک آدھ صفحہ ذرا اچھا لکھ دیا، اور اگر بھوکے آ گئے، بیوی سے لڑ بیٹھے یا تنخواہ وقت پر نہیں ملی تو جیسا بنا ویسا گھسیٹ دیا اور اگر بیمار پڑ گئے، یا نوکری چھوڑ کر چلے گئے تو اُن کے قائم مقام نے اپنے مخصوص انداز میں دوسری طرح لکھنا شروع کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ حسن خط کا وہی معیار ہو جو جناب کی نظروں میں ہے۔ پھر یہ رائے کس بنا پر قائم کر لی گئی کہ محمودی رسم خط حسین نہیں ہے حالانکہ آپ نے اُس کا سب سے پہلا نمونہ اور وہ بھی نستعلیق کے کاتب کا لکھا ہوا ملاحظہ فرمایا ہے، جس کی کرسی تک درست نہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ ایک شخص سے رومن حروف آڑھے ٹیڑھے قلم سے لکھوالیں پھر یہ فرمائیں کہ رومن حروف میں حسن نہیں پایا جاتا، ماشاء اللہ کیا طریقۂ استدلال ہے۔

ج کی آواز کے لئے C ، چ کے لئے Ç اور ش کے لئے Ş اور ژ کے لئے J س ، ص ، ث کی جگہ صرف S ز ، ذ ، ظ اور ض کی جگہ Z ت ، ط کی جگہ T ۔ ق اور ک کی جگہ K رکھا گیا ، خ کا تلفظ موجودہ ترکی میں نہیں ہے اس لئے ہ ، ح ، خ کی جگہ صرف H سے کام لیا گیا ۔ اس رسم خط کی علامات زیادہ تر ہنگری رسم خط سے اخذ کی گئی ہیں ۔

ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند عربی اور فارسی الفاظ ترکی اخبارات سے نقل کرکے لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ترکوں نے اپنے تلفظ اور کتابت کو کس طرح مطابق کر دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی ترکی میں عربی الفاظ کس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں :

مخابر (muhabir)	مدہش (müthiş)	حکومت (hükümet)
اہمیت (ehemmiyet)	بلدیہ (belediye)	مساعدہ (müsaade)
متنازع فیہ (münazaünfih)	تشبث (teşebbüs)	تضاد (tezat)
چونکہ (çünkü)	حیلے (hayli)	ہنوز (henüz)

میں نے اس موقعہ پر ترکی رسم خط کے متعلق بظاہر کچھ غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو محمد شریف خاں صاحب شروانی کے بہت سے اعتراضات اس تفصیل کو پڑھنے کے بعد خود بخود رفع ہو جاتے ہیں ، کیونکہ ایک طرف تو فاضل معترض کے لفظی اعتراضات ہیں اور دوسری طرف مصطفےٰ کمال کے تاریخی کارنامے کے عملی نتائج ۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ۔

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہوں ۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے موجودہ رسم خط میں اصلاح کی ضرورت ہے ، خواہ موجودہ حروف اور اُن کی شکلوں میں کچھ اصلاحی تغیر کر دیا جائے ، خواہ کوئی دوسرا رسم خط اختیار کیا جائے ، دیوناگری حروف کا اختیار کرنا تو میرے نزدیک خودکشی کا مترادف ہے ۔ رومن حروف کے اختیار کرنے میں اگرچہ یہ فائدہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی ہر قوم جو رومن حروف سے آشنا ہے مجبوراً اردو پڑھنے لگے گی اور اس طرح پر اردو کی اشاعت بڑھ جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے مخصوص حالات کی بنا پر اس میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی ، لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ موجودہ رسم خط ہی میں ایسی اصلاح کر دی جائے کہ وہ آسانی کے اعتبار سے کسی طرح رومن اور ہندی سے کم نہ ہو ۔ اس صورت میں چیز بھی اپنی رہے گی اور رشتۂ ماضی بھی منقطع نہ ہوگا ۔ چنانچہ میں نے یہی آخری صورت اختیار کی اور ایسا رسم خط ایجاد کرکے پیش کر دیا جس میں نہ تو نئے سرے سے حروف شناسی کی ضرورت ہے اور نہ اس میں ترکیبی اشکال اور اشکال کی کثرت ہے ، اور سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ حرکات جزو حروف ہو جانے سے غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا ۔ اب رہے اعتراضات تو دُنیا کی ہر چیز پر صدہا اعتراض ہو سکتے ہیں اور اُن کے صدہا جوابات بھی دئے جا سکتے ہیں ۔

محمد شریف خاں صاحب شروانی نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے جوابات نہایت تفصیل سے دئے جا سکتے ہیں لیکن میں اس کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اور صرف مختصر جوابات لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں ۔

رسم خط اگرچہ حقیقت میں " وہ معین حروف ہیں جن میں تصرف کرنے سے اس کی کتابت غلط ہو جاتی ہے " لیکن اب عام طور پر اردو میں " صنعت کتابت " کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ، لہٰذا اصطلاح پر جھگڑنا بے معنی ہے ۔

میرے ایجاد کردہ رسم خط کا " خطِ قومی " نام رکھنا فاضل معترض کے " حدود اختیار " سے باہر ہے اس کا نام محمودی رسم خط ہے اور یہی رہے گا ۔

میں نے لکھا تھا (۱) اردو حروف کا پیچیدہ اختلاف (۲) خط کی ترکیبی صورت (۳) حرکات کا محض سیاق عبارت سے پڑھا جانا ، موجودہ رسم خط کے خاص خاص نقائص ہیں ، علاوہ اور بھی نقائص ہیں جن کو میں نے " وغیرہ وغیرہ " کے لفظ سے تعبیر کیا تھا ، اس پر شریف صاحب لکھتے ہیں " وغیرہ وغیرہ سے جو نقائص مراد ہیں وہ تو سوچنے سے ذہن میں نہیں آئے " شریف صاحب اگر ذرا غور سے کام لیتے اور ذرا زیادہ سوچتے تو اور نقائص بھی اُن کے ذہن میں آ جاتے ، مثلاً (۴) نستعلیق کے باریک جوڑوں کا تھوڑے عرصے کے بعد ٹائپ میں ٹوٹ جانا (۵) حرفوں کا ایک دوسرے پر سوار ہونا ، اور یہی دو ایسی خرابیاں ہیں جو اس خط کو ٹائپ میں منتقل ہونے سے مانع ہیں ، اور اسی بنا پر حیدر آباد کا بنایا ہوا نستعلیق کا ٹائپ باوجود لاکھ روپیہ صرف کرنے کے کامیاب نہ ہو سکا ۔

شریف صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ " اس میں عقل کام نہیں کرتی کہ حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو خط کے ٹائپ منتقل ہونے سے کیا لگاؤ ہے " شریف صاحب کو یہاں یا تو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا انھوں نے دیدہ و دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے ، میرے مضمون کی عبارت یہ ہے : " اشکال کا پیچیدہ اختلاف اور اُن کی کثرت اور ترکیبی صورت ، یہ ایسی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے ان کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کو بغیر پوری عبارت کے صحیح پڑھ سکتے ہیں ، بچوں کے پڑھانے میں نا

لیکن صرف ہوتا ہے، غیر زبان والے اسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے......" اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ میں نے حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو صرف ٹائپ میں منتقل ہونے کا سبب قرار دیا ہے یا ایک طرف چند اسباب اور ایک طرف اُن کے نتائج لکھ دئے ہیں۔

شریف صاحب فرماتے ہیں، "خط نسخ میں بھی وہی پیچیدہ وکثیر اشکال ہیں لیکن اس کا ٹائپ اندرون و بیرون ہند کام دے رہا ہے" ان باتوں کے ہوتے ہوئے جو دلیل پیش کرنا بدیہیات سے انکار ہے" مجھے افسوس ہے کہ شریف صاحب نے میری عبارت غور سے نہیں پڑھی میرا یہ دعویٰ صرف نستعلیق سے متعلق ہے کہ وہ ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتا اور یہ بالکل درست ہے [illegible] انکار کرنا البتہ بدیہیات سے انکار ہے، رہا نسخ تو اس کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اب یہ کہتا ہوں کہ نسخ اگرچہ ٹائپ میں منتقل ہو گیا ہے مگر اس میں دوسرے نقائص بدستور پائے جاتے ہیں، یعنی اشکال کی کثرت اور عبارت کا سیاق کلام سے صحیح پڑھنا۔ مکمل رسم خط وہی ہے کہ جس زبان کا وہ رسم خط ہو اس کی تمام آوازوں کے لئے اس میں علامتیں موجود ہوں اس میں زیر زبر پیش کو علٰحدہ سے لگانے کی ضرورت نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے حرف تہجی کی شکلیں کم سے کم ہوں اور دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہوں ورنہ کثرت اشکال کی اگر پرواہ کیجائے تو پھر چینی خط پر کیوں اعتراض ہوتا ہے جس میں سرے سے حروف تہجی ہی نہیں بالکل ہر چیز اور ہر مفہوم کے لئے ایک علٰحدہ شکل ہے، اور ٹائپ تو اس کا بھی بن گیا ہے۔

حیدرآباد کے بعض "اہل ہمت کے مساعی" یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں "ایک صاحب" کے اعلان کرنے سے اگر کوئی عملی نتیجہ برآمد ہوتا تو اسے "منصۂ ظہور" پر آجانا چاہئے تھا کیونکہ کوئی مفید چیز بغیر رواج پائے نہیں رہ سکتی، مگر ایسا ہوا نہیں، اور مشکل بدستور باقی ہے۔

آگے چل کر معترض صاحب فرماتے ہیں: "اگر نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو چکی ہے تو اس سے قریب تر خط نسخ ہے یا یہ خط رقومی (رسم خط محمودی)" شریف صاحب یہ تو مانتے ہیں کہ نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہے، اب رہی یہ بات کہ نسخ کو اختیار کیا جائے یا کسی جدید رسم خط کو تو اس کا فیصلہ مستقبل خود کر دے گا۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاہلا و یاتیک بالاخبار من لم تزود۔ | عنقریب زمانہ وہ (چیزیں) تمہارے سامنے پیش کر دے گا جن کو تم نہیں جانتے۔ اور تمہارے پاس خبریں لیکر وہ (قاصد یعنی زمانہ) آئیگا جس کو تم نے زاد سفر نہیں دیا ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ "بالغوں کی تعلیم اس خط کے ذریعہ سے تو کسی طرح ممکن نہیں"، فاضل معترض فرماتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ "اس کے ذریعہ سے ان کی تعلیم ہو رہی ہے" ممکن کے لفظ سے میرا مطلب امکان منطقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ موجودہ رسم خط سے بھی زیادہ مشکل اگر کوئی رسم خط ہو تو اس کے ذریعے سے بھی بالغوں کی تعلیم ہو سکتی ہے مگر سوال تو دشواری اور آسانی کا ہے۔ جس کا جواب آگے چل کر معترض صاحب خود دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس کا الزام اصل خط پر عائد نہیں ہوتا اس کی مستعمل صورت پر ہوتا ہے۔"

بندہ نواز! یہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل حروف کی شکلیں قایم رکھی جائیں اور مستعمل صورت بدل دی جائے، بجائے ترکیبی صورت قایم رکھنے کے حروف الگ الگ کر دئے جائیں اور حرکات کو حروف کا جزو بنا دیا جائے جیسا کہ محمودی رسم خط میں کیا گیا ہے۔

شریف صاحب فرماتے ہیں کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈھالنے میں تقریباً اتنی ہی سہولت ہوگی جتنی رقوم حسابی کے ڈھالنے میں اور ٹکڑوں کی تعداد بھی خاص طور پر کم ہو گی" شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں صرف یہی ایک آسانی نظر آئی اگرچہ اس کو بھی "تقریباً" کا لفظ بڑھا دینے سے اُنھوں نے کچھ مشکل کر دیا، خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک آسانی کے تو قائل ہوئے مگر اسی سلسلۂ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن اس نفع سے زیادہ نقصان ہے،

۱۔ حسن خط تو بالکل مفقود ہو جائے گا،

۲۔ پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی"

شریف صاحب! اگر حسن خط کے یہی معنی ہیں کہ ایک خوشنویس اطمینان سے بیٹھ کر نوک پلک سے درست ایک قطعہ یا ایک عبارت زیب دیوار کرنے کے لئے لکھ دے تو اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہاں تو رونا یہ ہے کہ اگر کاتب صاحب کو اچھا ناشتہ مل گیا اور بیوی اُن کی سے لڑائی نہیں ہوئی تو انھوں نے ایک آدھ صفحہ ذرا اچھا لکھ دیا، اور اگر بھوکے آگئے، بیوی سے لڑے یا تنخواہ وقت پر نہیں ملی تو جیسا بنا ویسا گھسیٹ دیا اور اگر بیمار پڑ گئے، یا نوکری چھوڑ کر چلے گئے تو اُن کے قائم مقام نے اپنے مخصوص انداز میں دوسری طرح لکھنا شروع کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ حسن خط کا وہی معیار ہو جو جناب کی نظروں میں ہے۔ پھر یہ رائے کس بنا پر قایم کر لی گئی کہ محمودی رسم خط حسین نہیں ہے حالانکہ آپ نے اس کا سب سے پہلا نمونہ اور وہ بھی نستعلیق کے کاتب کا لکھا ہوا ملاحظہ فرمایا ہے، جس کی کرسی تک درست نہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ ایک شخص سے رومن حروف آڑے ٹیڑھے قلم سے لکھوالیں پھر یہ فرمائیں کہ رومن حروف میں حسن نہیں پایا جاتا۔ ماشاء اللہ کیا طریقۂ استدلال ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی" یہ اعتراض تو سراسر غلط ہے، خط کے حروف مرکب کرنے یا مفرد رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ تجربہ تو اس کے خلاف شہادت دیتا ہے، انگلستان میں اس کے متعلق عملی تجربے کئے گئے، ایک اسکول میں ابتدا سے بچوں کو بجائے انگریزی کے مرکب خط تحریر کے رومن کے علحدہ علحدہ حروف کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کی مشق کرائی گئی، پھر مقابلہ میں دیکھا گیا تو وہ مرکب حروف لکھنے والوں سے زیادہ تیزی سے لکھنے اور پڑھنے کے قابل ثابت ہوئے۔

بات یہ ہے کہ خط کے حروف مفرد ہوں یا مرکب الفاظ تصویروں کا کام دیتے ہیں، اور نظریں عادی ہو جانے سے اُن کی مجموعی صورت پر نظر پڑتی ہے اور فوراً انسان لفظ کو پڑھ لیتا ہے لہذا یہ خصوصیت صرف آپ کے مرکب خط کی نہیں ہے، بلکہ سے لے انگریزی لفظ کی تصویر بار بار پڑھنے سے ذہن میں جم جاتی ہے اور اُس کو انسان آسانی سے پڑھ لیتا ہے، اور اگر آپ کا ایمان راسخ یہی ہے کہ مرکب نسخ یا نستعلیق میں پڑھنے کی آسانی زیادہ رہے تو پھر آپ نے انگریزی بھی اس خط میں لکھنا شروع کر دیں اور انگریزوں کو بھی یہی مشورہ دیں۔

شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں دائروں کے حذف کرنے پر بڑا غصہ آیا ہے اور وہ فرماتے ہیں "موجودہ خط کے مقابلے میں یہ جدت بہت بھونڈی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ دائرے اور کششوں کے ساتھ حرف ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتا ہے، اور یہ ہمیشہ اُس کے اختتام کی خبر دیتے ہیں"

شریف صاحب معاف فرمائیں یہ جدت تو بھونڈی نہیں بلکہ جناب کا اعتراض نہایت بھونڈا ہے اس لئے کہ اگر ہر لفظ کے اختتام پر دائرے یا کشش کا وجود لازمی ہو تا تو یہ مصلحت بھی سمجھ میں آتی۔ اس کے علاوہ دنیا کے اور خطوں میں الفاظ کے آخر میں دائرے یا کشش کا وجود نہیں ہے لیکن پھر بھی الفاظ ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ چھوڑ دینے سے علحدہ علحدہ رہتے ہیں۔۔ حروف کے ساتھ حرکات کو ملا کر اُن کا جزو لازمی قرار دینا ہی محمودی رسم خط کی سب سے بڑی خوبی ہے اور افسوس ہے کہ یہی فاضل محترم محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم اے کی سمجھ میں نہیں آئی، اور صاحب یہی تو وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عبارت کو غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ جب انسان ابتدا ہی سے حروف کو مشمول حرکات پہچان لے گا تو پھر غلط کیونکر پڑھ سکتا ہے، اب رہا یہ امر کہ موجودہ رسم خط میں علامات اعراب ہی کو قرآن شریف کی کتابت کی طرح کیوں نہ استعمال کریں، تو ایسا کرنے سے اول تو وہ مصلحت حاصل نہیں ہوتی کہ حروف اعراب کے ساتھ ایک بسیط شکل کی طرح ذہن میں نقش ہو جائیں، دوسرے عام طور پر ایسا کرنا ممکن یا کم از کم سہل العمل نہیں ہے اور اس میں اعراب کے غلط لگ جانے اور چھوٹ جانے کا احتمال بھی ہر وقت غالب رہتا ہے اور اسی طوالت کی وجہ سے عربی زبان جس میں اعراب کے بدل جانے سے معنے بھی بدل جاتے ہیں، عام طور پر بغیر اعراب کے لکھی جاتی ہے۔

ہمزۂ وصل اور لام تعریف کے حذف کرنے یا قائم رکھنے کے متعلق میری رائے یہی ہے کہ اُردو کے جدید رسم خط میں وہی حروف لکھے جائیں جو بولے جاتے ہیں، اور اگر کوئی حرف بولنے سے حذف ہو جاتا ہے تو اُسے لکھنے سے بھی حذف کر دینا چاہئے، جیسا کہ ترکی کے موجودہ رسم خط میں کیا گیا ہے۔ اب رہا حرف تعریف کے معدوم ہو جانے کا ماتم تو اس کا حق آپ کو نہیں پہونچتا بلکہ عربوں کو پہونچتا ہے اور وہ بھی اُس صورت میں جبکہ عربی کا رسم خط زیر بحث ہو اور اُس میں حرف تعریف کو اُڑا دینے کی تجویز پیش کی جائے۔ اُردو زبان میں اُس کے قایم رکھنے یا حذف کر دینے سے عبارت کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ س۔ ص اور ث کے یکساں تلفظ کرنے سے اُردو میں کوئی معنوی فرق نہیں ہوتا۔

واؤ مخلوط کے متعلق یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تیرا اور ہوا وغیرہ میں واؤ یقیناً مفتوح ہے لیکن ایسے الفاظ میں واؤ کا تلفظ نصف ہوتا ہے اور پہلے حرف کے ساتھ کچھ ملا ہوا سا معلوم ہوتا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام واؤ مخلوط رکھا گیا، نام رکھنے کے لئے تھوڑی سی مناسبت کافی ہوتی ہے، اس پر لڑنے کی کیا ضرورت ہے، آپ چاہیں تو اس واؤ کا نام آدھا واؤ رکھ سکتے ہیں، لیکن شریف صاحب کا یہ کہنا کہ در اصل یہ ہمزہ ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ ایسے الفاظ بولتے وقت ہمزہ کا تلفظ پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال یائے مخلوط کا ہے لہذا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ہائے مخلوط پر فاضل معترض نے اصطلاحات کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بڑے زور شور کا حملہ کیا ہے، اس کے متعلق میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ در اصل اُردو میں ہندی کی طرح ایک بھ اور ایک تھ، ایک پھ اور ایک چھ وغیرہ کی علحدہ علحدہ شکلیں ہونی چاہئے تھیں لیکن محض اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو حرفوں کو ملا کر کام چلایا گیا ہے، اب رہی اس کے متعلق آپ کی علمی تحقیقات تو میں اس کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں۔

شریف صاحب نے کسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ میں تو اس (محمودی رسم خط) کو نستعلیق کی مدد سے پڑھ سکا، گویا آپ کا نہ پڑھ سکنا اس بات کی قطعی دلیل ہو گئی کہ اس خط کے ذریعے پڑھنا نستعلیق سے زیادہ مشکل ہے، واہ صاحب کیا بات کہی، جس رسم خط کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا ہو اور پھر اُس کے ساتھ آپ کو "ہمدردی" بھی نہ ہو اُس میں آپ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں یا اُس خط کو جس سے آپ کی نظریں، اور آپ کا حافظہ عرصے سے عادی ہو گیا ہے، سوال تو یہ ہے کہ محمودی رسم خط جس میں غلط پڑھنے کا امکان نہیں جس میں اعراب جزو حروف بن گئے ہیں جس میں ہر حرف کی ایک ہی شکل ہے اور ہر حرف علحدہ لکھا جاتا ہے اور حروف کے سرے وہی ہیں جو موجودہ حروف کے ہیں، اصولاً اُس کو آسان ہونا چاہئے یا موجودہ رسم خط کو جس کے نقائص تفصیل سے اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب غالباً آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ جب نظریں اس خط سے عادی ہو جائیں گی تو موجودہ خط کے مقابلہ میں اس میں بہت زیادہ سہولت

ندا ہم خط کا مقصد یہی ہے ۔

محمد شریف خاں صاحب کے مضمون کا سب سے زیادہ اہم حصہ وہ ہے جو انھوں نے اُردو کی حرکات اور یائے معروف و مجہول اور واؤ معروف و مجہول اور ہائے مخلوط کی تحقیق کے لئے وقف کیا ہے حرکات کے متعلق وہ لکھتے ہیں :۔

" زبان اُردو کی حرکات پر اب تک کسی نے توجہ نہیں کی قواعد کی سب کتابیں اس سے خالی ہیں اس سے جو کچھ میں بیان کروں گا وہ بالکل نئی بات ہے ۔ پھر آئے چل کر زیر کی دو قسمیں فتحہ مستقیم اور فتحہ مائل اور زیر اور پیش کی بھی دو دو قسمیں معروف و مجہول قرار دی ہیں ۔ اس لئے اب بجائے تین کے چھ حرکتیں ہوئیں ۔ پھر آپ نے " زبان کی صحیح ترجمان کے لئے ہر ایک کے علٰحدہ علامتی نشان " کی ضرورت محسوس کی ہے ۔ اس ایجاد بندہ کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ ایسی حرکتوں سے کیا فائدہ ۔ اول تو ان کے تلفظ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جس کے لئے نئی علامتیں مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئے اور اسی وجہ سے متقدمین نے بھی اس کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ زیر زبر اور پیش کی تین علٰحدہ علٰحدہ علامتیں لگانا ہی کیا کچھ کم طوالت ہے ۔ بلکہ اس پر تین مزید غیر ضروری علامتوں کا اضافہ کیا جائے ۔

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ " اس تقریر سے واضح ہے کہ معروف و مجہول واؤ اور یا کی اصطلاحیں سراسر لغو ہیں " میں کہتا ہوں کہ آپ اپنی تحقیق سے کچھ بھی ثابت کریں فرق ایسا ہو یا کیفیت کا معروف و مجہول کی آوازیں واؤ اور یے سے پہلے حرف کی حرکت کی کیفیت اور نوعیت پر منحصر مانی جائیں یا واؤ اور یے کے تلفظ میں معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کا وجود سمجھا جائے نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ، واؤ اور یے معروف و مجہول کے فرق تلفظ کو ہر ایک محسوس کرتا ہے اور امتیاز کے لئے معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ علامتیں رکھی گئی ہیں ، یا صورت کا فرق قائم رکھا گیا ہے ۔ اب اس مصیبت برپا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر حقیقت میں یہ تنازع للبقا کا کوئی اہم مسئلہ ہے تو وہ میرے موضوع میں کوئی خرابی نہیں ڈالتا ۔ میں نے تو اردو لکھنے کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے اور جس طرح پہلے سے معروف و مجہول کی اصطلاحیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں میں نے اپنے رسم خط میں بھی اُن کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نشانات رکھے ہیں ۔

اس کے بعد شریف صاحب نے تا نہ دم ہو کر ہائے مخلوط اور ہائے مخلوط پر خامہ فرسائی فرمائی ہے اور اس ذیل میں خدا جانے کیا کیا لکھ گئے ہیں جو میں تو سمجھ میں آتا ہے اور نہیں تو بات آتا ۔ اس بحث کے جوابات کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں لہٰذا اب اس پر وقت ضائع کرنا وقت کا بیجا اسراف ہے ۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو رسم خط پیش کیا ہے اس کے متعلق میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ اس میں اصلاح کی قطعی ضرورت نہیں ۔ یا اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو وہ پوری نہیں کی جا سکتی ، یا اس کے حروف کی شکلوں میں کسی قسم کے اصلاحی تغیر کرنے کی گنجائش نہیں ، میں نے تو چند خاص اصول کے پیش نظر یہ تجویز پیش کی ہے اور وہ اصول میرے خیال میں بجائے خود صحیح اور درست ہیں ، بلحاظ آسانی اور تکمیل کے اردو کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا رسم خط نہیں ہو سکتا ۔

محمود علی خاں بی ۔ اے

نگار کے پچھلے پرچے

سنہ ۲۶ء : جنوری عہ ۔ سنہ ۲۷ء : اگست ۸ر ۔ سنہ ۲۸ء : مئی ۸ر ۔ سنہ ۳۱ء : جولائی ، اگست ۸ر فی پرچہ ، ستمبر عہ ۔ اکتوبر ۱۲ر نومبر ، دسمبر ۸ر فی پرچہ ۔ سنہ ۳۲ء : جنوری ۸ر ۔ فروری ۱۲ر ۔ مارچ عہ ۔ سنہ ۳۳ء : فروری عہ ۔ سنہ ۳۴ء : فروری تا دسمبر عہ فی پرچہ ۔ سنہ ۳۶ء : دسمبر عہ فی پرچہ ۔ سنہ ۳۸ء : فروری عہ ، مارچ تا اگست ۱۲ر فی پرچہ ، اکتوبر عہ فی پرچہ ۔ سنہ ۳۹ء : فروری ۶ر ۔ اپریل عہ ۔ مئی تا دسمبر عہ فی پرچہ سنہ ۳۹ء ؛ فروری تا جولائی ۸ر فی پرچہ ۔ اکتوبر ، نومبر ۱۲ر فی پرچہ ، اگست تا دسمبر عہ فی پرچہ ۔ سنہ ۴۰ء : فروری تا مئی ۶ر فی پرچہ جون ۱۲ر فی پرچہ ، ستمبر تا دسمبر ۶ر فی پرچہ ۔

منیجر نگار لکھنؤ

شادی کی رسمیں اور اُنکی عمرانی اہمیت

شادی محض ایجاب وقبول کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی چند رسمیں ادا کرنا ضروری ہوتی ہیں جن کا سلسلہ ہر سوسائٹی میں قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہر چند کہ یہ رسمیں تکمیل شادی کے لئے ناگزیر نہیں ہیں لیکن سوسائٹی کا زور اور دباؤ لوگوں کو اُن کی ادائگی پر مجبور کرتا ہے۔

عمرانی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اِن رسوم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو تعلقاتِ صحیحہ کا علم ہوجائے۔ بقول مس برآن کے اِن رسوم میں یہ شہرت ہی کا عنصر ہے جو جائز اور ناجائز رشتوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے اور اس کا اہتمام صرف مہذب ہی لوگوں میں نہیں ہے بلکہ غیر مہذب لوگ بھی اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ قومیں جو تہذیب وتمدن سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اُن میں قبیلہ کا سب سے بڑا آدمی شادی (یعنی جائز جنسی تعلقات) کا اعلان کرتا ہے۔ مسلمانوں میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ رومیوں میں شادی کے وقت پورے دس گواہوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یونانی ملکوں میں اب تک بعض بعض جگہ یہ رسم ہے کہ دولہا دلہن گواہوں کے سامنے ایک چادر کے اندر لیٹتے ہیں اور جب تک یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں شادی مکمل نہیں ہوتی۔ مشرقی افریقہ کی بنتو قوم میں دولہا دلہن کی پہلی خلوت، جلوت ہی ہوتی ہے۔ اور اس موقع پر قبیلہ کی عورتوں اور لڑکیوں کی موجودگی ازبس ضروری سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر دعوتوں اور ضیافتوں کا ایک مقصد (مسرت اور اتحاد سے قطع نظر) یہ بھی ہے کہ اس طرح شادی کا زیادہ سے زیادہ اعلان کیا جائے۔

شادی فریقین کے اختلاط واتحاد کی مظہر ہے اسی وجہ سے بعض ملکوں میں دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھوں میں دیدیا جاتا ہے۔ بلغاریہ، پرتگال، پولستان اور ہندوستان کے بعض حصوں میں محض ہاتھ کے ملانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں ہاتھوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ یوپی کے بعض شہروں میں دونوں کے دامن میں گرہ لگا دیجاتی ہے۔ برطانوی مشرقی افریقہ میں دونوں کلائیوں پر کسی پودے کی ٹہنی باندھ دیجاتی ہے۔ شاید انگوٹھی کی رسم کا بھی ابتدائی مقصد یہی ہوگا۔ عہد متوسط کے درمیان یورپ میں انگوٹھیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ جو بہت سے توہمات وابستہ ہیں وہ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہ اتحاد کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اسکاچستان کے شمالی مشرقی اضلاع میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی عورت انگوٹھی کھودے گی تو وہ اپنے محبوب شوہر سے بھی محروم ہوجائے گی۔

ایک اور عام رسم دولہا دولھن کے ساتھ کھانے کی ہے جو مہذب اور غیر مہذب دونوں میں یکساں طور پر مروج ہے۔ ہندوستان اور یونان میں ایک ہی رکابی یا پتہ میں کھانے کی رسم بہت قدیم ہے ان مواقع پر یورپ میں ایک چمچہ سے کھانے یا ایک ہی چیز میں شرکت کرنے یا ایک ہی پلیٹ میں شامل ہونے کی رسم اب تک جاری ہے۔ سوئیڈن میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر لڑکا لڑکی ساتھ کھالیں گے تو ان میں محبت پیدا ہوجانے کی۔ مسلمانوں میں بھی میاں بیوی کا ساتھ کھانا مستحسن ہے۔ کھانے کے علاوہ ساتھ پینے کی بھی رسم ہے۔ جین میں تعلقات زناشوئی سے قبل دولہا دلھن شراب یا شہد پیتے ہیں اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ دونوں کے پیالے ایک سُرخ ڈوری سے باندھ دئے جاتے ہیں۔ دولھا اپنے پیالہ میں سے پینے کے بعد دلھن کو دیدیتا ہے اور دُلھن اپنا جھوٹا پیالہ دولھا کو دیدیتی ہے اور یہ عمل کئی بار دوہرایا جاتا ہے۔ جاپان میں یہ تبادلہ کی رسم نو مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ یہودیوں اور روس، اطالیہ، ناروے اور اسکاچستان کے باشندوں میں بھی ساتھ پینے کی رسم پائی جاتی ہے۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر مٹی سے شیشہ کی چیزیں یا مٹی کے برتن توڑے جاتے ہیں۔ پروفیسر وسٹرمارک اور دوسرے محققین کا یہ خیال ہے اس سے زفاف کی سہولت مقصود ہوتی ہے۔ یورک میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا دلہن جب موخر الذکر کے مکان سے رخصت ہوتے ہیں تو دولھا کے سر پر ایک پلیٹ توڑی جاتی ہے۔ سالفلڈ (Seafeld) میں دولہا شراب کے گلاس کو خود سر کے پیچھے پھینک کر توڑ دیتا ہے۔ اگر کسی اتفاق سے نہ ٹوٹے تو اسے بڑا بُرا خیال کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں بھی بعض بعض جگہ یہ رسم موجود ہے وہاں چینی کے برتن دلہن کے مکان کے سامنے توڑے جاتے ہیں اور اُن کا جتنا بڑا ڈھیر ہوگا اتنی ہی یہ خوش نصیبی کی علامت سمجھی جائے گی۔ یہودیوں میں آج تک شادی کے موقع پر شیشے توڑے جاتے ہیں۔

متذکرۂ بالا رسم کے صحیح معنی آج تک نہیں معلوم ہوسکے لیکن بعض ملکوں کی رسمیں وسٹرمارک کے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ سربی قوم میں یہ رسم ہے کہ خاندان کا بزرگ آدھی رات کے وقت دلہن کو دولہا کے کمرہ میں پہونچا دیتا ہے اور کمرہ باہر سے بند کردیتا ہے۔ اس کے بعد فریقین کے لئے جام صحت پی کر اسے دروازہ پر توڑ دیتا ہے جو اختتام دوشیزگی کا اعلان ہوتا ہے۔ پروفیسر مارک لکھتا ہے کہ وسط مراکش کے (Aith y ndsu) لوگوں میں یہ قاعدہ ہے کہ دلھن اپنے نئے گھر کو گھوڑی پر سوار ہوکر جاتی ہے اور اپنے سامنے ایک بید کا ٹکڑا رکھتی ہے جلوس کے ختم ہونے پر بید کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے یہ کیوں کیا تو انھوں نے جواب دیا "اس لئے کہ دولھا کو بھی پہلی شب میں ایسی ہی فتحیابی نصیب ہو" شادی کے

...لوں پر سُرخ رنگ کا استعمال بھی اسی غرض سے ہوتا ہے۔ کیتھولک چینی مسہری سے سُرخ کاغذکی دھجیاں باندھ دیتے ہیں اور اُن پر اس قسم کا کوئی دعائیہ جملہ لکھ دیتے ہیں کہ "خدا کرے تمہارے ... اِردوں بچے اور پوتے ہوں" ہندوستان اور افغانستان میں عموماً عروسی کپڑے سُرخ ہوتے ہیں۔

عام طور پر شادی وہی کامیاب سمجھی جاتی ہے جس میں بچے پیدا ہوں اولاد نرینہ اور بھی خوش نصیبی کی علامت سمجھی جاتی ہے چنانچہ بعض رسمیں محض اسی مقصد کے لئے ادا کی جاتی ہیں۔ مراکش میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا کی ماں اپنے بیٹے کے پُرانے کپڑوں کی گٹھری اس طرح لٹکتی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ ایک چھوٹے بچہ کو کھلا رہی ہے۔ کبھی کبھی دولھن کی ماں ایک ... میں اٹھا دیجاتی ہے اور اسے بالکل اس طرح ہلایا جاتا ہے جیسے ایک شیرخوار بچّے کو ہلاکر سلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دولھن اپنی سسرال کو گھوڑے پر بیٹھ کر جاتی ہے ... اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ اُس کے بہت سے بچّے ہوں اور اس کی گود ہمیشہ بھری رہے۔ کبھی کبھی دولھن کے پیچھے ایک بچّہ بٹھا دیا جاتا ہے اس سے اولاد نرینہ کی تمنا مقصود ہوتی ہے ... بعض حصّوں میں رخصتی سے ایک روز قبل دُلہن کے پاس ایک بچّہ سلایا جاتا ہے تاکہ پہلوٹی کا بچہ لڑکا ہی ہو۔ قدیم ہندوستان میں بھی دولھن کی سسرال میں قدم رکھتے ہی ایک بچہ ... لوگوں کے گود میں رکھدیا جاتا تھا۔

بعض ملکوں میں دولھا دولھن پر اناج یا پھل پھینکنے کا رواج ہے۔ قدیم یونان میں دولھن پر سسرال کے اندر کھجوریں انجیر وغیرہ کی بارش کی جاتی تھی۔ روم میں بھی کسی ... لیہ ہوتی تھی۔ فرانس کے بعض اضلاع میں گیہوں نچھاور کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں بھی سترھویں صدی تک دولھن پر گیہوں برسائے جاتے تھے من ہارٹ (Maunhardt) لکھتا ہے کہ یہ رسمیں دراصل اسی تعلق کا پرتو ہیں جو انسان اور پھل پیدا کرنے والے پودوں کے درمیان پایا جاتا ہے یا نتیجہ ہیں اُس مماثلت کا جو غلہ اور بعض اعتقاد سے جسمانی میں پائی جاتی ہے"۔ بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان رسموں سے محض "بارآوری" مقصود ہے لیکن فی الحقیقت ان رسموں میں کئی مقاصد اس طرح مل گئے ہیں کہ اُن کو الگ کرنا مشکل ہے بعض وقت ان سے خوشحالی اور بارآوری مقصود ہوتی ہے اور بعض وقت دولہا دُولہن کو نظر بد سے بچانا اصل مدعا ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ان رسموں کے مختلف سبب بتلائے جاتے ہیں اس سے آسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا اصلی مقصد فراموش کیا جا چکا ہے اور بعد میں مختلف قسم کے معنے پہنا دئے گئے ہیں۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر انڈے کا بھی کسی نہ کسی طرح استعمال ضرور ہوتا ہے۔ مراکش کا یہودی دولھا دُولہن پر ایک انڈا پھینکتا ہے اس سے ایک محقق کے نزدیک اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کی بیوی کو وضع حمل میں آسانی ہو۔

روس کے یہودی دُلھن کے آگے صرف انڈا رکھ دیتے ہیں اور اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جس طرح مرغی کو انڈا دینے میں دشواری نہیں ہوتی ویسے ہی خدا اس کی منزل کو بھی آسان کرے۔ اس کے علاوہ انڈا کثرت اولاد کی نشانی ہے۔ سویڈن میں دُلہن کے تسمے کھلے رہتے ہیں تاکہ جس آسانی سے وہ جوتا اُتار سکتی ہے ایسے ہی ولادت میں بھی سہولت ہو۔

مرد نے عورت پر اپنا ذاتی تفوق قایم رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے چنانچہ بعض ملکوں میں اس قسم کی رسمیں ہیں جو اس جذبۂ حکمرانی کی غمازی کرتی ہیں۔ کردستان میں دولھا ... کے آہستہ آہستہ کے لگاتا ہے اور اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آیندہ وہ حاکم ہے اور بیوی محکوم۔ روس میں دُلہن کا باپ ایک نیا کوڑا لیکر آہستہ آہستہ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تجھے آخری بار مارا ہے اب کبھی نہ ماروں گا" اس کے بعد وہ دولھا کو کوڑا دیکر اپنے اختیارات اُسے سونپ دیتا ہے۔ ہنگری کی سلاف قوم میں یہ دستور ہے کہ دولھا دُلھن کو تین دفعہ پیٹتا ہے اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دُلہن اپنے پچھلے دوستوں کو بھول جائے اور آیندہ سے شوہر کو اپنا مالک اور آقا سمجھے۔

بعض رسمیں اس کشمکش کی آئینہ دار ہیں جو دولہا دُلہن کے درمیان ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جرمنی کے بعض علاقوں میں جب پادری دونوں فریق کے ہاتھ ملاتا ہے اسوقت دولھا دُلھن دونوں اپنا ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بعض وقت یہ بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پادری مرد کا ہاتھ اوپر رکھ کر فیصلہ کر دیتا ہے۔ روس میں دولہا دُلہن دونوں کو جام شراب پیش کیا جاتا ہے اور دونوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے چند قطرے دوسرے گلاس میں ڈالدیں۔ جو اس کوشش میں پہلے کامیاب ہو جاتا ہے وہی ... عقیدہ کے مطابق ازدواجی زندگی میں باثر اور با اختیار رہتا ہے۔ مراکش کے بعض اضلاع میں دُلہن مینڈھے پر جو شوہر کا قایم مقام ہوتا ہے سوار کی جاتی ہے۔ ... بیٹھنے سے قبل اسکے گلے میں ایک طوق یا ہار ڈالدیتی ہے جس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر مطیع و فرمانبردار رہے۔ اس کے بعد مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے اور جب اس کی انتڑیاں نکال لیجاتی ہیں تو عورت اس پر اپنا پیر رکھدیتی ہے۔ اس ملک میں یہ رسم بھی ہے کہ جب دولھا حجلۂ عروسی میں داخل ہوتا ہے تو دُلہن اُس پر اپنا سلیپر اُٹھا کر پھینکتی ہے اور کبھی کبھی اُسے باقاعدہ پیٹتی ہے اگر وہ فریاد کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بیوی کا غلام رہے گا۔ اسی قسم کی رسمیں ہندوستان کے بھی بعض حصوں میں پائی جاتی ہیں۔

دولھا دُلھن کو آسیب سے بچانے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانہ کے لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان دونوں کو نظر لگ سکتی ہے اور اُن پر بھوت پریت کا بھی اثر ہو سکتا ہے اسلئے بعض رسمیں ایسی وضع کی گئیں جن کا مقصد محض تحفظ ذاتی ہے۔ روس میں تمام دروازے کھڑکیاں اور روشن دان بند کر دئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر جادو اور سحر کا اثر نہ ہو۔ شادی کے موقع

...یں اور ہندو قبیلیں اسی مصلحت کی بنا پر چھوڑی جاتی ہیں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بھوت پریت شور وغل اور آگ وغیرہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ مراکش میں دلہن جس جانور پر سوار ہو کر آتی اس کے ... نہایت زور سے باجہ بجایا جاتا ہے اور دلہن کو ... قریب توپیں داغی جاتی ہیں کہ وہ دھوئیں سے ڈھک جاتی ہے۔ کبھی کبھی خاص اُس کے کمرہ میں کوئی پٹاخہ چھوڑا جاتا ہے تاکہ وہ جن اور پری کے ... ہو جائیں۔ سلاو قوم کے لوگ، جب دولہا دلہن خلوت میں ہوتے ہیں تو حجلۂ عروسی کے باہر خوب شور و غوغا کرتے ہیں۔ بعض قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواحِ خبیثہ لوہے سے ڈرتی ہیں اسلئے ... دلہن اپنے پاس لوہے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں۔ عیسائی ملکوں میں کچھ دیر کے لئے دلہن کے اوپر تلواروں کی صلیب بنا دیجاتی ہے۔ پروفیسر ویسٹر مارک کا خیال ہے کہ ان مواقع پر ... کرنے اور مہندی لگانے کی رسمیں بھی حفظ ما تقدم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں اور اُنکا مقصد اصلی محض احتیاطی یا طہارتی ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مہندی خیر و برکت کی نشانی ہے ... کے موقعوں پر روشنی کا اہتمام بھی اُس کے نزدیک زیادہ تر اسی ... کی بنا پر ہوتا ہے۔ بھوت پریت روشنی سے ڈرتے ہیں اور تاریکی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کے ڈرانے کے لئے تمام محفل کو ... نور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں دولہا دلہن کے سر پر چراغ کو گھمایا جاتا ہے۔ چین میں دلہن تیز اور روشن آگ کو پھلانگتی ہے۔ جرمنی میں دلہن تین مرتبہ تیز آگ کے گرد طواف ... بعض یورپی ملکوں میں اسے کلیسا کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ یہ سب رسمیں دافع آسیب خیال کی جاتی ہیں۔ من آرٹ کہتا ہے کہ دولہا دلہن کو بٹھانے کی رسم بھی دراصل خراب اثرات سے ... غرض سے ہے ... آئی ہے تاکہ ارواحِ خبیثہ بچوں کے پیدا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ارواحِ خبیثہ کو دھوکا دینے کے لئے دلہن، دولہا کا اور دولہا، دلہن کا لباس پہن لیتا ہے۔ ... لوگوں میں یہ رسم اب تک موجود ہے۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ کوس میں بھی اسی قسم کی رسم رائج تھی۔ اسپارٹا میں جب دلہن حجلۂ عروسی میں شوہر کا انتظار کرتی تھی تو اس کو مردانہ کپڑے اور جوتے پہنا دئے جاتے تھے۔ مراکش کے بعض دیہاتوں میں دلہن کے مونچھیں لگا دی جاتی ہیں۔ ڈنمارک کے بعض مواضعات میں دولہا دلہن ایک دوسرے کے کپڑے پہن کر آنکھ مچولی کی مشق کرتے ہیں۔

پروفیسر ویسٹر مارک کہتا ہے کہ ان تمام رسموں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صرف بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ اور بھی مقاصد شامل ہوں۔ کرالے (Crawley) کا خیال یہ ہے کہ جانبین ایک دوسرے کا لباس جنسی ڈر اور خوف کم کرنے کی غرض سے پہن لیتے ہیں اس طرح وہ "من و تو" کا فرق مٹا کر منزلِ مباشرت کو آسان کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا ڈر کم و بیش دونوں فریق کو ہوتا ہے۔ بعض قوموں میں بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹ موٹ کی دلہن یا جھوٹ موٹ کا دولہا بنا دیا جاتا ہے۔ یہ رسم سلاو، ٹیوٹانی اور رومانی لوگوں میں رائج ہے۔ بویریا میں ایک ریش دار آدمی کو دلہن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مصنوعی شادی کا بڑا رواج ہے۔ شمالی ہند میں پیڑوں سے شادی کی جاتی ہے اور اس سے مقصود عموماً آسیب یا "نظرِ بد" سے بچانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک گھڑے کو مردوں کے کپڑے پہنا دئے جاتے ہیں۔ اور لڑکی کی شادی اس سے کر دیجاتی ہے بعد میں یہی تمام رسمیں "اصلی" موقع پر بھی دہرائی جاتی ہیں۔ مصر میں جب دولہا رخصتی سے پہلے مسجد کو جاتا ہے تو اس کے دو ساتھی اُسی کے سے کپڑے پہنے رہتے ہیں اور دولہا اُن کے بیچ میں ہوتا ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اسی قسم کی رسم دلہن کے لئے رائج ہے۔ اسکی ساتھ والیاں بالکل ویسا ہی لباس پہنتی ہیں کہ دلہن میں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ بعض جگہ ساتھ والوں کو بغیر کچھ بدلے ہی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ شٹ لینڈ میں دولہا کا ساتھی، دولہا کے ساتھ سوتا ہے۔ بعض قوموں میں دلہن کے ساتھی، شبِ زفاف میں بھی موجود رہتے ہیں۔

پروفیسر ویسٹر مارک کہتا ہے کہ دلہن کے چہرہ کو ڈھکنے کا آغاز بھی آسیب کے ڈر سے ہوا ہے۔ مراکش کے اطراف و جوانب میں خود دلہن کی نظر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اپنی آنکھ اُس وقت تک بند رکھتی ہے جب تک کہ دولہا کو نہ دیکھ لے۔ ہندوستانِ قدیم میں دولہا، دلہن کی "نگاہِ فتنہ انگیز" سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ عہدِ عتیق میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دولہا دلہن پر آفت آسمان اور زمین دونوں طرف سے آسکتی ہے۔ اسی وجہ سے سلاٹ قوم میں دولہا اپنے سر کو ہر وقت ڈھکے رہتا ہے اور سریانی دلہنیں اپنی کلاہ عروسی رات کو بھی نہیں اُتارتی ہیں۔ غالباً اسی سبب سے بعض ملکوں میں خصوصاً ویلس، چین وغیرہ میں دلہن زمین پر پیر نہیں اُتارتی ہے اسے دولہا یا کوئی اور شخص گود میں لیکر پلنگ تک پہونچا دیتا ہے۔ موخر الذکر رسم میں ممکن ہے حجاب دوشیزگی کو بھی دخل ہو جو نئے گھر کے اندر چلنے میں مانع آتا ہے لیکن ویلس، اسکاٹ لینڈ، اور چین کے بعض حصوں میں دلہن کا زمین پر قدم رکھنا قطعی طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بعض قوموں میں دولہا دلہن کو آسیب سے نجات، خاموشی، کم خوراکی، فاقہ کشی یا کچھ دنوں کی "پرہیزگاری" سے ملسکتی ہے۔ جرمنی اور سوئزر لینڈ اور فرانس کے بعض اضلاع میں شادی کے بعد تین راتوں تک زفاف کی نوبت نہیں آتی۔ یورپی ملکوں میں اس رسم کی ترویج میں عیسائیت نے بھی مدد دی ہے۔ لیکن یہ رسم قدیم ہے اور عیسائیت سے پہلے سے رائج ہے۔ اس "رسمِ اجتناب" کا ایک ابتدائی سبب جنسی حجاب بھی ہے جو فریقین میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر ویسٹر مارک اسکی قوی تر وجہ توہم پرستی قرار دیتا ہے۔ اولڈن برگ کہتا ہے کہ ویدک عہد میں لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ ہم بستری کے وقت کہیں ارواحِ خبیثہ عورت کے جسم میں داخل نہ ہو جائیں اور اسے حاملہ نہ کردیں لیکن یہ بے وقوف روحیں پرہیزگاری کے دام فریب میں آجاتی ہیں اور پھر اس جانب توجہ نہیں کرتیں۔"

ہر ملک و ہر رسم کی بڑی پرانی شکل ہے۔ ہر ملک کی ازدواجی رسموں پر ایک مبسوط کتاب طیار ہو سکتی ہے لیکن اوپر کی چند سطروں میں مختصراً کچھ رسوم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جن میں انسان کی زندگی کے خط و خال نمایاں ہیں۔ یہ جواہر ... ... کیفیات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں، جبکہ اسکی دلچسپیاں محدود تھیں، یہ رسمیں بڑی اہم اور نشاط انگیز سمجھی جاتی تھیں لیکن نئی روشنی نے عہدِ ماضی کی بہت سی یادگاریں مٹا دی ہیں۔ چنانچہ ... ... نے ان ازدواجی رسموں کو بھی ... ... ہے۔ یہ جہاں باقی بھی ہیں وہاں بھی اُن پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے اس لئے کہ موجودہ انسان کی گوناگوں زندگی اس درجہ وسیع، ہنگامہ خیز اور عقلیت پسند ہو گئی ... ... ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ ... انبساطِ زندگی کا سوال ہے سو اُسکے لئے اُس نے پہلے سے زیادہ دلکش طریقے ایجاد کر لئے ہیں اور مستی اور خوش عیشی کا یہ عالم ہے کہ "نازبرفلک و حکم بر ستارہ کنم" کی روایتیں حقیقت بنکر سامنے آگئی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

اب سے ساٹھ سال بعد

آنے والی نئی دُنیا!

آنے والی نئی دُنیا سائنس کی کن ترقیوں کی حامل ہوگی؟ سنہ ۱۹۴۶ء سے لیکر سنہ ۲۰۰۰ء تک فطرت کے کتنے نئے رازوں سے ہم واقف ہو چکے ہوں گے اور اس واقفیت کو ہم اپنی مادی اور ذہنی زندگی کی تعمیر میں کس حد تک استعمال کر چکے ہوں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کو معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مستقبل جس کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے بہت زیادہ دور نہیں ہے اور سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہونے والے بہت سے انسان اس نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر عصر حاضر کے رجحانات اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو مستقبل کے متعلق دو باتیں قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال ہماری تمدنی زندگی کی بہتری کے لئے ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ سنہ ۲۰۰۰ء کے بعد جو زندگی ہم بسر کریں گے اس کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوگا۔

اسوقت تک سائنس کی تمام ترقی محض انفرادی کوششوں کا نتیجہ رہی ہے۔ حکومت نے ان کوششوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومتوں نے تخریبی ایجادات کی ہمت افزائی ضرور کی ہے مگر ان ایجادات کی ہمت افزائی کو علمی ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ دُنیا کے وہ تمام سائنسداں جو ہمیشہ استعماری سیاست سے الگ رہے ہیں اور جنھوں نے انسانی تخریب کے لئے اپنے ذہن و دماغ کو وقف کرنے سے انکار کیا، وہ ہمیشہ مصیبت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ جرمنی سے عصر حاضر کے سب سے بڑے مفکر آئنسٹائن کا اخراج اس بیان کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اسوقت تک حکومت نے اپنی دولت انھیں کوششوں کے لئے وقف کی ہے جن کا مقصود ہمارے تمدن کی تخریب سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ حکومتوں نے سائنس کی ترقی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ انھوں نے سائنس کی کوششوں کو برباد کرانے کے لئے خود سائنس کو استعمال کرنے کی ترکیب ضرور اختیار کی۔ مگر آنے والی سائنس کی نئی دنیا غالباً ایسی نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکے خلاف سائنس کی دنیا میں احتجاج کی بنیاد شروع ہو گئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ حکومتوں کو ایک خاص محکمہ "وزارت مفکرین" کے نام سے قایم کرنا پڑے۔ اس وزارت کے اراکین وہ ہوں گے جو سائنس، صنعت اور ایجادات کی مختلف شاخوں کے ممتاز افراد ہوں گے۔ یہ وزارت اُن تمام افراد کی کوششوں میں جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر کام کرتے ہیں، ارتباط پیدا کرے گی اور اس طرح وقت و محنت کا بیکار استعمال ناممکن ہو جائے گا۔ موجدین کی سرکاری امداد بھی ہو سکے گی جو عصر حاضر میں صرف روس میں ممکن ہو سکی ہے اور امریکہ میں میلان انسٹیٹیوٹ نامی جماعت بھی اس سلسلہ میں ایک حد تک مصروف عمل ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جماعتوں کی بقاء کا انحصار منظم ذہنی قوت پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کی ترقی کا یہ نیا نظام، انسانی حیات کو بہتر بنانے کا دوسرا نام ہوگا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا مستقبل کے نظام میں دو باتیں یقینی پائی جائیں گی۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال حیات انسانی کی بہتری کے لئے ہوگا اور دوسرے یہ کہ تمدن انسانی کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہو جائے گا۔ کیونکہ جس "وزارت مفکرین" کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ اسی وقت کام کر سکے گی جب سیاسی طور پر ہم اپنے موجودہ نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کریں۔ ہماری آیندہ زندگی بلاشبہ ایک جمہوری تنظیم سے وابستہ ہوگی اور اس جمہوری تنظیم اور موجودہ پارلیمنٹری نظام حکومت میں بڑا فرق ہوگا۔ آج دنیا کے اُن تمام ممالک میں جہاں پارلیمنٹری نظام پوری طرح سے جاگزیں ہو چکا ہے، ہر بالغ رائے دے سکتا ہے اور پارلیمنٹ کے انتخاب میں کھڑا ہو سکتا ہے، گویا پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے علم اور تجربہ کی کوئی قید نہیں اور صحیح نمایندگی کا معیار علمی ارتقاء سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے آج ایک شخص خود کو کسی خاص مفاد کا محافظ بتلا کر پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے اور پھر اس منصب کو نہایت غلط طرح سے استعمال کرتا ہے مگر آیندہ جو جمہوری تنظیم قایم ہوگی اس کی پارلیمنٹ کے اراکین مختلف پیشوں، شعبوں اور تحریکوں کے نمایندوں کی حیثیت سے منتخب ہوں گے اور ہر پیشہ کے لئے ایک خاص امتحان کا پاس کیا جانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ انتخابات بھی مختلف طبقوں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوں گے اور خاص مسئلہ میں رائے

پر ہیں اور ہندو قیں اسی مصلحت کی بنا پر چھوڑی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بھوت پریت شور وغل اور آگ وغیرہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ مراکش میں دلہن جس جانور پر سوار ہوکر آتی اس کے سامنے بہت زور سے باجے بجایا جاتا ہے اور دلہن کے قریب توپیں داغی جاتی ہیں کہ وہ دھوئیں سے ڈھک جاتی ہے۔ کبھی کبھی خاص اُس کے کمرہ میں کوئی پٹاخہ چھوڑا جاتا ہے تاکہ وہ جن اور پری کے اثر سے پاک ہوجائے۔ سلاو قوم کے لوگ، جب دولہا دلھن خلوت میں ہوتے ہیں تو حجلۂ عروسی کے باہر خوب شور وغوغا کرتے ہیں۔ بعض قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواحِ خبیثہ لوہے سے ڈرتی ہیں اسلئے دولہا دلھن اپنے پاس لوہے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں۔ عیسائی ملکوں میں کچھ دیر کے لئے دُلھن کے اوپر تلواروں کی صلیب بنادی جاتی ہے۔ پروفیسر وسٹرمارک کا خیال ہے کہ ان مواقع پر غسل کرنے اور مہندی لگانے کی رسمیں بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں اور انکا مقصد اصلی محض احتیاطی یا طہارتی ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مہندی خیر وبرکت کی نشانی ہے شادی کے موقعوں پر روشنی کا اہتمام بھی اُس کے نزدیک زیادہ تر اسی وجہ کی بناپر ہوتا ہے۔ بھوت پریت روشنی سے ڈرتے ہیں اور تاریکی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کے ڈرانے کے لئے تمام محفل کو بقعۂ نور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں دولہا دُلھن کے سر پر چراغ کو گھمایا جاتا ہے۔ چین میں دلہن تیز اور روشن آگ کو پھلانگتی ہے۔ جرمنی میں دلھن تین مرتبہ تیز آگ کے گرد طواف کرتی ہے۔ بعض یورپی ملکوں میں اسے کلیسا کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ یہ سب رسمیں دافع آسیب خیال کی جاتی ہیں۔ من آٹ کہتا ہے کہ دولہا دلھن کو پٹینے کی رسم بھی دراصل خراب اثرات سے پاک کرنے کی غرض سے عمل میں آئی ہے تاکہ ارواحِ خبیثہ بچوں کے پیدا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ارواحِ خبیثہ کو دھوکا دینے کے لئے دُلھن، دُولہا کا اور دولہا، دلہن کا لباس پہن لیتا ہے۔ یہودی لوگوں میں یہ رسم آج تک موجود ہے۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ کوس میں بھی اسی قسم کی رسم رائج تھی۔ اسپارٹا میں جب دلہن حجلۂ عروسی میں شوہر کا انتظار کرتی تھی تو اس کو مردانہ کپڑے اور جوتے پہنادئے جاتے تھے۔ مراکش کے بعض دیہاتوں میں دلہن کے مونچھیں لگادی جاتی ہیں۔ ڈنمارک کے بعض مواضعات میں دولہا دلہن ایک دوسرے کے کپڑے پہنکر آنکھ مچولی کی مشق کرتے ہیں۔

پروفیسر وسٹرمارک کہتا ہے کہ ان تمام رسموں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صرف بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ اور بھی مقاصد شامل ہوں۔ کراؤلے (Crawley) کا خیال یہ ہے کہ جانبین ایک دوسرے کا لباس جنسی ڈر اور خوف کم کرنے کی غرض سے پہن لیتے ہیں اس طرح وہ "من و تو" کا فرق مٹاکر منزلِ مباشرت کو آسان کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا ڈر کم وبیش دونوں فریق کو ہوتا ہے۔ بعض قوموں میں بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹ موٹ کی دلہن یا جھوٹ موٹ کا دولہا بنادیا جاتا ہے۔ یہ رسم سلاف، ایسٹونیائی اور روماتی لوگوں میں رائج ہے۔ بویریا میں ایک ریش دار آدمی کو دلہن کے کپڑے پہناکر بٹھادیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مصنوعی شادی کا بڑا رواج ہے۔ شمالی ہند میں پیڑوں سے شادی کی جاتی ہے اور اس سے مقصود عموماً آسیب یا "نظرِ بد" سے بچانا ہوتا ہے کبھی کبھی ایک گھڑے کو مرد کے کپڑے پہنادئے جاتے ہیں۔ اور لڑکی کی شادی اس سے کردیجاتی ہے بعد میں یہی تمام رسمیں "اصلی" موقع پر بھی دھرائی جاتی ہیں مصر میں جب دولہا رخصتی سے پہلے مسجد کو جاتا ہے تو اس کے دو ساتھی اُسی کے سے کپڑے پہنے رہتے ہیں اور دولہا اُن کے بیچ میں ہوتا ہے انگلستان کے بعض حصوں میں اسی قسم کی رسم دلہن کے لئے رائج ہے۔ اسکی ساتھ والیاں بالکل ویسا ہی لباس پہنتی ہیں کہ دلہن میں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتی ہے بعض جگہ ساتھ والوں کو بغیر کپڑے بدلے ہی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ شٹ لینڈ میں دولہا کا ساتھی، دولھا کے ساتھ سوتا ہے بعض قوموں میں دلہن کے ساتھی، شب زفاف میں بھی موجود رہتے ہیں۔

پروفیسر وسٹرمارک کہتا ہے کہ دُلہن کے چہرہ کو ڈھکنے کا آغاز بھی آسیب کے ڈر سے ہوا ہے۔ مراکش کے اطراف وجوانب میں خود دلہن کی نظر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اپنی آنکھ اُس وقت تک بند رکھتی ہے جب تک کہ دولھا کو نہ دیکھ لے۔ ہندوستان قدیم میں دولہا، دلہن کی "نگاہِ فتنہ انگیز" سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ عہدِ عتیق میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دولہا دلہن پر آفت آسمان اور زمین دونوں طرف سے آسکتی ہے۔ اسی وجہ سے سلاف قوم میں دولھا اپنے سر کو ہر وقت ڈھکے رہتا ہے اور سریانی دلہنیں اپنی کلاہِ عروسی رات کو بھی نہیں اُتارتی ہیں۔ غالباً اسی سبب سے بعض ملکوں میں خصوصاً ویلس، چین وغیرہ میں دلہن زمین پر پیر نہیں اُتارتی ہے اسے دولھا یا کوئی اور شخص گود میں لیکر پلنگ تک پہونچادیتا ہے۔ موخر الذکر رسم میں ممکن ہے حجاب دوشیزگی کو بھی دخل ہو جو نئے گھر کے اندر چلنے میں مانع آتا ہے لیکن ویلس، اسکاٹ لینڈ، اور چین کے بعض حصوں میں دلہن کا زمین پر قدم رکھنا قطعی طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بعض قوموں میں دولہا دلہن کو آسیب سے نجات، خاموشی، کم خوراکی، فاقہ کشی یا کچھ دنوں کی "پرہیزگاری" سے ملسکتی ہے۔ جرمنی اور سوئزرلینڈ اور فرانس کے بعض اضلاع میں شادی کے بعد تین راتوں تک زفاف کی نوبت نہیں آتی۔ یورپی ملکوں میں اس رسم کی ترویج میں عیسائیت نے بھی مدد دی ہے۔ لیکن یہ رسم قدیم ہے اور عیسائیت سے پہلے سے رائج ہے۔ اس "رسم اجتناب" کا ایک ابتدائی سبب جنسی حجاب بھی ہوسکتا ہے جو قریقین میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر وسٹرمارک اسکی قوی تر وجہ توہم پرستی قرار دیتا ہے۔ اولڈن برگ کہتا ہے کہ "ویدک عہد میں لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ ہم بستری کے وقت کہیں ارواحِ خبیثہ عورت کے جسم میں داخل نہ ہوجائیں اور اسے حاملہ نہ کردیں لیکن یہ بے وقوف روحیں پرہیزگاری کے دام فریب میں آجاتی ہیں اور پھر اس جانب توجہ نہیں کرتیں"۔

ہر ملک اور ہر رسم کی بڑی پرانی مثل ہے۔ ہر ملک کی ازدواجی رسموں پر ایک مبسوط کتاب طیار ہوسکتی ہے لیکن اوپر کی چند سطروں میں مختصراً ان رسوم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جن میں انسان کی زندگی کے خط وخال نمایاں ہیں۔ یہ جواہر مختلف کیفیات وجذبات کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں، جبکہ اسکی دلچسپیاں محدود تھیں، یہ رسمیں بڑی اہم اور نشاط انگیز سمجھی جاتی تھیں لیکن جتنی مدنیت نے عہدِ ماضی کی بہت سی یادگاریں مٹادی ہیں۔ چنانچہ "پرتو خورشید" مٹ گیا ان ازدواجی رسموں کو بھی درس فنا دیا ہے۔ یہ جہاں باقی ہیں وہاں بھی اُن پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے اس لئے کہ موجودہ انسان کی گوناگوں زندگی اس درجہ وسیع، ہنگامہ خیز اور عقلیت پسند ہوگئی ہے کہ اس میں ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ رہا نشاطِ زندگی کا سوال، سو اُسکے لئے اس نے پہلے سے زیادہ دلکش طریقے ایجاد کرلئے ہیں۔ اور مستی اور خوش عیشی کا یہ عالم ہے "کنارِ ابر فلک وحکم بر ستارہ کنم" کی روایتیں حقیقت بنکر سامنے آگئی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

اب سے ساٹھ سال بعد

آنے والی نئی دُنیا!

آنے والی نئی دُنیا سائنس کی کن ترقیوں کی حامل ہوگی؟ ۱۹۴۲ء سے لیکر ۲۰۰۰ء تک فطرت کے کتنے نئے رازوں سے ہم واقف ہوچکے ہوں گے اور اس واقفیت کو ہم اپنی مادی اور ذہنی زندگی کی تعمیر میں کس حد تک استعمال کرچکے ہوں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کو معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مستقبل جس کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے بہت زیادہ دور نہیں ہے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہونے والے بہت سے انسان اس نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر عصر حاضر کے رجحانات اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو مستقبل کے متعلق دو باتیں قطعی طور پر واضح ہوجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال ہماری تمدنی زندگی کی بہتری کے لئے ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ ۲۰۰۰ء کے بعد جو زندگی ہم بسر کریں گے اس کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوگا۔

اسوقت تک سائنس کی تمام ترقی محض انفرادی کوششوں کا نتیجہ رہی ہے۔ حکومت نے ان کوششوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومتوں نے تخریبی ایجادات کی ہمت افزائی ضرور کی، بے شک ان ایجادات کی ہمت افزائی کو علمی ترقی نہیں کہا جاسکتا۔ دنیا کے وہ تمام سائنسداں جو ترنیس استعماری سیاست سے الگ رہتے ہیں اور جنھوں نے انسانی تخریب کے لئے اپنے ذہن و دماغ کو وقف کرنے سے انکار کیا، وہ ہمیشہ مصیبت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ جرمنی سے عصر حاضر کے سب سے بڑے مفکر آئنسٹائن کا اخراج اس بیان کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اسوقت تک حکومت نے اپنی دولت انھیں کوششوں کے لئے وقف کی ہے جن کا مقصود ہمارے تمدن کی تخریب سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ حکومتوں نے سائنس کی ترقی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ انھوں نے سائنس کی کوششوں کو برباد کرانے کے لئے خود سائنس کو استعمال کرنے کی ترکیب ضرور اختیار کی۔ مگر آنے والی سائنس کی نئی دنیا غالباً ایسی نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکے خلاف سائنس کی دنیا میں احتجاج کی بنیاد شروع ہوگئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ حکومتوں کو ایک خاص محکمہ "وزارت مفکرین" کے نام سے قایم کرنا پڑے۔ اس وزارت کے اراکین وہ ہوں گے جو سائنس، صنعت اور ایجادات کی مختلف شاخوں کے ممتاز افراد ہوں گے۔ یہ وزارت اُن تمام افراد کی کوششوں میں جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر کام کرتے ہیں، ارتباط پیدا کرسکے گی اور اس طرح وقت و محنت کا بیکار استعمال ناممکن ہوجائے گا۔ موجدین کی سرکاری امداد بھی ہوسکے گی جو عصر حاضر میں صرف روس میں ممکن ہوسکی ہے اور امریکہ میں میلان انسٹیٹیوٹ نامی جماعت بھی اس سلسلہ میں ایک حد تک مصروف عمل ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جماعتوں کی بقاء کا انحصار محض منظم ذہنی قوت پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کی ترقی کا یہ نیا نظام، انسانی حیات کو بہتر بنانے کا دوسرا نام ہوگا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، مستقبل کے نظام میں دو باتیں یقینی پائی جائیں گی۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال حیات انسانی کی بہتری کے لئے ہوگا اور دوسرے یہ کہ تمدن انسانی کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوجائے گا۔ کیونکہ جس "وزارت مفکرین" کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ اسی وقت کام کرسکے گی جب سیاسی طور پر ہم اپنے موجودہ نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کریں اسلئے ہماری آیندہ زندگی بلاشبہ ایک جمہوری تنظیم سے وابستہ ہوگی اور اس جمہوری تنظیم اور موجودہ پارلیمنٹری نظام حکومت میں بڑا فرق ہوگا۔ آج دنیا کے اُن تمام ممالک میں جہاں پارلیمنٹری نظام پوری طرح سے جاگزیں ہوچکا ہے، ہر بالغ رائے دے سکتا ہے اور پارلیمنٹ کے انتخاب میں کھڑا ہوسکتا ہے، گویا پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے علم اور تجربہ کی کوئی قید نہیں اور نہ صحیح نمایندگی کا معیار علمی ارتقاء سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے آج ایک شخص خود کو کسی خاص مفاد کا محافظ بتلا کر پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے اور پھر اس منصب کو نہایت غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے مگر آیندہ جو جمہوری تنظیم قایم ہوگی اس کی پارلیمنٹ کے اراکین مختلف پیشوں، شعبوں اور تحریکوں کے نمایندوں کی حیثیت سے منتخب ہوں گے اور ہر پیشہ کے لئے ایک خاص امتحان کا پاس کیا جانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ انتخابات بھی مختلف طبقوں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوں گے اور خاص مسئلہ میں رائے

[illegible] نظام حکومت کے لحاظ سے بالکل دوسری چیز ہوگی [illegible] ایک بہت بڑی تبدیلی [illegible] اسی طرح [illegible] میں بھی تفصیلی تبدیلیوں کے علاوہ کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں [illegible] موٹر کار [illegible] اگر موٹر کار [illegible] ممکن ہو گا تو [illegible] انجن بہت ہی مختصر ہو گا [illegible] کیونکہ پٹرول سے [illegible] بلکہ چھوٹے مگر زیادہ طاقتور انجنوں کو ابھی [illegible] ہوائی جہازوں کے [illegible] ہمارے انجینیروں اور موجدوں [illegible] زیادہ طاقت کا حصول ممکن [illegible] کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ موٹر کار [illegible] طاقت کا حصول [illegible] ایک ریڈیو اسٹیشن سے [illegible] ترقی کے منافی نہ ہو گا؟ ایک ریڈیو اسٹیشن [illegible] ریڈیو سیٹ [illegible] اور اگر مقدار طاقت [illegible] کافی ہو گی [illegible] طاقت کے بے شمار خزانے [illegible] موٹر [illegible] کے لئے بھی۔

[illegible] طاقت کا اثر بھی انتہائی [illegible] طاقت کو [illegible] استعمال ہونے والے مقامات پر پہنچا دیا جائے گا جیسے کہ آج پانی [illegible] کیا جاتا ہے۔

[illegible] بات ثابت ہو چکی ہے کہ دشمن [illegible] اس ملک کو [illegible] ایک بڑی [illegible] عمارتوں [illegible] اور ان میں کنکریٹ [illegible] ایک مرکزی مقام سے حرارت پہنچائی جائے گی۔

[illegible] ہوائی جہازوں [illegible] آج بھی دنیا [illegible] ہزاروں [illegible] تعمیر ہو چکے ہیں اور [illegible] جنگ کے ختم ہونے کے بعد [illegible] وقت پر فتح حاصل ہو رہی ہے [illegible] مختلف مقامات [illegible] دوسری جگہ جا سکیں گے [illegible] اتنی ہی زیادہ امن کی [illegible] تیز رفتاری کا حصول بہت زیادہ [illegible] Streamline [illegible] موجودہ صدی کے خاتمہ سے پہلے ہی [illegible] کا معمول ہو جائیگا [illegible] مسافروں کے لئے [illegible] اسباب و سامان [illegible] کی تعمیر وغیرہ [illegible] جس میں "حفاظت" اور [illegible] رفتار میں اضافہ کا باعث بھی ہوں گے [illegible] Proteins [illegible] Vitamins [illegible] Biological evolution [illegible] شروع ہو جائے۔

سے بڑے بڑے چشمے اُبل پڑتے ہیں چنانچہ ۔۔۔۔ میں باکو کے پٹرولی علاقہ کے اندر ایک بہت بڑا چشمہ پھوٹ نکلا تھا جس سے تیل اور ریت وغیرہ کے اجزاء بڑی تیزی کے ساتھ اوپر کو بلند ہوئے اور اسی کے ساتھ ایک عجیب وغریب اور خوفناک قسم کی آواز بھی پیدا ہوئی جو وہاں سے میلوں کی دوری پر سُنی گئی اس چشمے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس کا فوارہ تقریباً ۳۰۰ فٹ کی بلندی تک پہونچتا تھا اور اس کی قوت سے برت تا آکر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ، بھی اکھڑ گیا تھا مگر چونکہ یہ کام ایک چھوٹی سی ارمنی کمپنی نے شروع کیا تھا اس لئے وہ تیل کے اس عظیم الشان خزانہ سے استفادہ نہ کرسکی۔

ایسا ہی ایک واقعہ مصر میں بھی ہوا تھا، وہاں بھی ۱۹۱۰ء میں ایک چشمہ اُبل پڑا تھا جس سے تقریباً چار سو ٹن روزانہ پٹرول خارج ہوتا تھا لیکن یہ سارا تیل راستے کے ٹیلوں کو طے کرتا ہوا بحیرۂ متوسط میں گر جاتا تھا۔ اس کے روکنے کے لئے بہت کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

خام پٹرول خام پٹرول چونکہ مٹی دار، ورمتعدد مواد کا امتزاج ہوتا ہے، اس لئے وہ روشنی کے استعمال کے قابل نہیں ہوتا اور اسے صرف ریلوے انجنوں اور جہازوں میں کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ بعض پٹرول تو سیاہ اور بہت زیادہ بھاری اور زمین دار ہوتا ہے اور بعض بگنی رنگ کا قدرے سیال اور بنزین (Benzing) اور کیروسین (Kerosene) کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ اختلاف مختلف ممالک کی زمینوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایک کنوئیں میں بھی لحاظ عمق یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

پٹرول مختلف کیمیائی مرکبات سے مخلوط مانا جاتا ہے اور یہ مرکباتی اجزاء خود دو عنصر ہیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہوتے ہیں جنھیں کیمیائی اصطلاحات میں ہیڈرو کاربنس (Hydrocarbons) کہتے ہیں مگر ان میں گندھک، نائٹروجن اور آکسیجن کے اجزاء بھی کچھ مقدار میں شامل ہوتے ہیں۔ پٹرول کو کیمیاوی لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں :

۱ ۔ وہ پٹرول جس کا بنیادی جزو پیرافین (Paraffin) ہوتا ہے اس میں اسفلٹ (Asphalt) کا حصہ کم ہوتا ہے اور ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکبات بہت کافی حد تک موجود ہوتے ہیں، اس سے جو تیل نکلتا ہے وہ سب سے قیمتی تیل مانا جاتا ہے۔

۲ ۔ وہ پٹرول جس کا بنیادی جزو نفتھین ہوتا ہے۔

۳ ۔ وہ پٹرول جو مذکورہ بالا دونوں اجزاء اساسیہ سے مخلوط ہوتا ہے۔

پٹرول کی صفائی جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں خام پٹرول جبکہ وہ زمین سے نکالا جاتا ہے استعمال کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے دوسری ترکیبوں اور مشینوں سے صاف کیا جائے اور بنزین اور کیروسین جیسے پٹرولی مواد کے اجزاء اصلیہ اور جو ہر کو اور دوسرے مخلوط اجزاء سے الگ کرکے نکالا جائے۔

پٹرول کی صفائی کے کارخانے میدانوں سے دور سواحل پر تعمیر کئے جاتے ہیں جہاں خام پٹرول نلوں کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے۔ یہ نل کنوؤں کے منھ پر لگے ہوتے ہیں۔ ان نلوں کی لمبائی کبھی میلوں تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ مصری میدان کے نل ۔۔۔ کیلومیٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ولایات متحدہ کے میدانوں میں یہ نل ۔۔۔۔۔ میل تک چلا جاتا ہے جن سے روزانہ ۔۔۔۔ بیپا (Barrel) تیل گزرتا ہے۔

پٹرول کے صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے مخروطی شکل کے کنڑوں میں بھر لیتے ہیں جن میں ہر ایک ۔۔۔۔ یا ۔۔۔۔ گیلن کا ہوتا ہے۔ ان کنڑوں میں نالیاں لگی رہتی ہیں جن میں پٹرول کا جوہر گرم ہوکر بھاپ کی شکل میں منتقل ہونے لگتا ہے۔ یہ نالیاں آگے چلکر بہت زیادہ ٹھنڈے پانی سے گزرتی ہیں جہاں پہونچکر پٹرولی بھاپ سردی کی وجہ سے رقیق مادے کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور اس کے بعد یہ رقیق پٹرولی مادہ الگ الگ ڈبوں میں آگرتا ہے جہاں پھر اسے تیزاب اور کاسٹک سوڈا وغیرہ سے صاف کرتے ہیں۔

پٹرول کو جن مختلف درجات حرارت میں رقیق اور صاف کیا جاتا ہے ان درجوں کے اختلاف کے لحاظ سے پٹرول کی بھی مختلف قسمیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

۱ ۔ ۴۰ اور ۷۰ ڈگری حرارت میں جو پٹرول صاف ہوتا ہے اس سے ایک بہت رقیق تیل نکلتا ہے جسے پٹرول کا جوہر کہتے ہیں، یہ جراحی اور سرجری وغیرہ کے کاموں میں اعضاء کو شل کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲ ۔ جو ۷۰ اور ۹۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے، اس سے گیسولین (Gasoline) نکلتا ہے۔

۳ ۔ جو ۸۰ اور ۱۲۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے اس سے بنزین (Benzine) خارج ہوتا ہے۔ گیسولین اور بنزین دونوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کے انجنوں میں استعمال ہوتے ہیں، بنزین سے کپڑا وغیرہ بھی صاف کیا جاتا ہے۔

۴ ۔ جو ۱۲۰ اور ۱۵۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے اس سے جو سیال مادہ نکلتا ہے اسے نفتھا کہتے ہیں۔

جو ۱۵۰ اور ۳۰۰ ڈگری حرارت میں صاف جاتا ہے، اس سے کیروسین تیل طیار ہوتا ہے۔
اور ۳۰۰ ڈگری حرارت سے جو اجزا مجتمع ہوتے ہیں ان سے بعض جلانے کے تیل اور ویسلین وغیرہ طیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو باقی رہتا ہے [illegible] ایک [illegible] مادہ
ہے جو سڑکوں کی تعمیر میں کام آتا ہے۔

سویز میں جو کارخانہ ہے وہ محض پٹرول سے بنزین اور کیروسین نکالتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ مازوت [illegible] یا جلانے کے تیل کے کام [illegible]
[illegible] کردیا جاتا ہے۔ سویز کا کارخانہ روزانہ جتنا پٹرول صاف کرتا ہے اس کی مجموعی تعداد ۱۰۰۰ ٹن ہے جس میں سے نصف یعنی ۵۰۰ ٹن مازوت کا [illegible] ہوتا ہے اور بقیہ
[illegible] ٹن بنزین اور ۲۵۰ ٹن کیروسین کا۔ ولایات متحدہ میں تقریباً صفائی کے ۲۶۰ کارخانے ہیں جن میں لاکھوں پیپے تیل روزانہ تیار ہوتا ہے۔
پہلے پٹرول کی قسموں میں کیروسین کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی آج چونکہ موٹروں اور طیاروں کی حیرت انگیز ترقی ہوتی جارہی ہے اس لئے گیسولین و بنزین [کی]
طلب بہت زیادہ ہوتی جارہی ہے۔

[پٹ]رول اور جدید علمی تحقیقات

باوجود ان تمام کامیابیوں کے پٹرول کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ مشہور عالم [illegible] ولفلر نے
نصف ملین ڈالر صرف اس لئے دئے ہیں کہ پٹرول کے متعلق علمی تحقیقات کو ترقی دی جائے۔ اس کے لئے کمیٹیاں اور [illegible]
[قائ]م کی گئی ہیں تاکہ اس موضوع پر علمی و کیمیاوی اور طبقاتی تحقیق کی جائے اور اس سلسلہ میں وہ یہاں تک پہونچ چکے ہیں کہ انھوں نے پٹرول سے متعدد قسم کے [illegible] (Al-
cohols) طیار کئے ہیں جن سے تیزاب، ربڑ اور دوسرے مختلف مرکبات بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مسٹر مورس کے ایک بیان کی تلخیص پیش کرتے ہیں [illegible]
[illegible] جو توقعات دنیا نے قایم کی ہیں ان کی ہلکی سی جھلک سامنے آسکے۔ لکھتے ہیں:۔

"خیال کرو کہ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی ہے۔ فضا نہایت خوشگوار ہے، اس وقت تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم موٹر پر سوار ہوکر تفریح کے لئے کہیں سیر کو جاؤ، [illegible] موٹر کے انجن کو
دیکھتے ہو تو اس میں تمھیں تھوڑا سا تیل نظر آتا ہے لیکن تمھیں یہ توقع ہے کہ یہ کافی ہوگا۔ کیونکہ محض ایک گیلن تیل میلوں کی مسافت طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر تم [illegible] تیل کی طرف
ملتفت ہوتے ہو جو پہیوں پر صفائی کے لئے لگایا جاتا ہے، تو تم اسے بھی حسب منشا کافی پاتے ہو حالانکہ بہت دنوں سے تم نے اس پر دوسرا روغن نہیں چڑھایا ہے۔ اس کے بعد تم موٹر
کی پالش کو دیکھتے ہو تو اسے بھی سمجھتے ہو کہ یہ بھی درست ہے۔ لیکن کیا تم کچھ سمجھے اس کا اصل راز پٹرول ہے! اسی طرح تم پہیے کے ٹائر پر نظر ڈالتے ہو تو اس کے ربڑ کو بھی بالکل صحیح وسالم
پاتے ہو حالانکہ یہ لاتعداد میلوں کی مسافت طے کرچکا ہے، اس کا بھی راز پٹرول ہے! اس کے بعد تم اس کے گدوں پر ٹیک لگاتے ہو تو اسے بھی باوجود اس کے کہ وہ دیر تک [illegible] ہے کافی
آرامدہ اور نرم پاتے ہو، اس کی بھی اصلیت پٹرول ہے!

ان چیزوں سے قطع نظر پھر تم موٹر میں کہیں کہیں کچھ چربی سی چیز لگی دیکھتے ہو تو اسے اپنے ہاتھوں سے رگڑ دیتے ہو جس سے وہ تمہارے ہاتھ میں لگ جاتی ہے، اب تم اسے دھونا چاہتے
ہو تو اس کے لئے تمھیں سب سے بہتر وہی صابون ملتا ہے جو پٹرول کے ذریعہ سے طیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تم موٹر اسٹارٹ کرتے ہو، کچھ دور پر جاکر ایک وادی کے موڑ سے تمہاری موٹر گزرتی ہے، تم وہاں پر دیکھتے ہو کہ اس موڑ کو وسیع کرنے کے لئے مزدور بڑے بڑے پتھروں کو
اکھاڑنے میں مصروف ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہو رہی ہے بالآخر پٹرول نکالنے والی کلوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آگے چلکر ایک کارخانہ نظر آتا ہے جو زمین کی
کھاد طیار کرتا ہے، اس میں بھی ہیڈروجن پایا جاتا ہے جو پٹرول سے بنتا ہے۔ پھر جب دیر تک تم سیر کر لیتے ہو تو تمھیں کچھ تھکان سی محسوس ہوتی ہے، تم موٹر روک کر ایک دواخانہ کے
پاس اتر پڑتے ہو اور سکون بخش دوا مانگتے ہو تو تمھیں ایک بیحد خوش مزہ چیز ملتی ہے لیکن اس میں بھی پٹرول کا امتزاج ہے، اس کے بعد تم وہاں کی مختلف چیزوں اور عرقوں اور دواؤں
پر نگاہ ڈالتے ہو تو ہر چیز میں پٹرول کا امتزاج نظر آتا ہے۔"

اسی طرح سے فاضل موصوف نے ایک بہت ہی تفصیلی منظر پیش کرکے ثابت کیا تھا کہ دنیا کے تمدن میں پٹرول نے کتنا عظیم الشان درجہ حاصل کرلیا ہے جس سے ایک سکنڈ کیلئے
الگ ہونا ممکن نہیں۔

پٹرول کی اصلیت

علماء کیمیا پٹرول کا اصل مادہ دریافت کرنے میں پوری سرگرمی سے منہمک ہیں، پتھر کے کوئلہ کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ اس کی اصلیت نباتات
ہیں جو طبقات ارض کے تہ بہ تہ جم جانے کی وجہ سے اندر دب کر رہ گئے اور جب ہزاروں سال تک حرارت سے دوچار ہوتے رہے تو کوئلہ کی شکل میں تبدیل
ہوگئے۔ لیکن پٹرول کی اصلیت اور اس کی کیفیت پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں دو اہم رائیں پیش کی جاتی ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مکتوبات نیاز

سنئے صاحب ، جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں ۔ مرنا برحق سہی، لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فایدہ بھی کیا ہے ، آخرت کے خیال کو آپ "مابعد الموت" سے کیوں متعلق کرتے ہیں۔ آخرت سے مُراد انجام ہے ــــ ہر اُس کام کا انجام جو ہم آپ اس دُنیا میں کرتے ہیں، ورنہ

مردِ آخر بیں مُبارک بندہ ایست !   کے معنے کیا ؟

خدا کے لئے اس خیال کو ترک کیجئے، آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کرکے بیکار بنادیں گے ــــ لاحول ولا قوۃ ۔ آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے ۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے، اس سے جنگ کی ہے اور ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جا رہے ہیں !

اگر بُرا نہ مانئے تو عرض کروں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کوئی گُناہ بھی کرلیا کیجئے۔ کیونکہ زندگی کا احساس گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے ــــ پہلے چھوٹے چھوٹے اور جب کچھ جان بدن میں آجائے تو بڑے بڑے !

جوانی ختم ہونے کے بعد جوانی کا اعادہ ممکن ہے "کایا پلٹ بوٹی" سے بھی ہو جاتا ہو، لیکن آسکر وائلڈ کا نسخہ یہ ہے کہ "جوانی کے گُناہ کرنے لگو، جوانی خود لوٹ آئے گی"

اگر آپ اس کے لئے طیار ہوں تو مطلع کیجئے، تاکہ ہم آپ دونوں ایک ہی ساتھ اس کا تجربہ شروع کریں ــــ واقعی ذرا دیکھئے تو سہی ہوتا کیا ہے ؟

بجا ہے ۔ صرف ایک بار گلہ کیا تھا اور وہ بھی "طاتام" کہ آسمان زمین آپ نے ایک کردئے اور اب چاہتی ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے دل کھول کر کہدوں ــــ معقول !

طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بام تو !

اگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اخیر میں آپ مجھے، موردِ الزام قرار دیں، تو یہ کاوش بیکار ہے کیونکہ "آپ سے دور ہوں

اور جی رہا ہوں"۔ یہی ایک جُرم اتنا بڑا ہے کہ آپ جس قدر ملامت کریں کم ہے — زیادہ چھان بین کی ضرورت کیا ؟

میں نے تو صرف پوچھا تھا کہ "آشنا کا ہے، مجھے ناآشنا" یہ ادا آپ کی عام ہے یا صرف میرے لئے مخصوص! آپ نے اس کے جواب میں "فلسفۂ محبت" اور "نکاتِ عشق" پر ایک لکچر دے ڈالا۔ حالانکہ :-

گر گفتۂ زعشق بگے حرف آشنا

آں ہم حکایتے ست کہ از ما شنیدۂ!

میں نے اس پر آپ سے پوچھا کہ "کیا عورت زیادہ پڑھ لکھ کر صرف بقراط ہی بن سکتی ہے ؟"— اس کا جواب در اصل یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ ہنس دیتیں — اور باور کیجئے اسی خیال سے میں نے لکھا بھی تھا — لیکن خلاف امید آپ اور سنجیدہ بن گئیں —— اگر آپ برہم ہوتیں، تو بھی میں اس سے لطف اُٹھا لیتا، لیکن اس "روٹھے پن" کو کیا کروں، آپ ہی بتایئے؟

دیکھئے اس کے جواب میں آپ چاہے پورا قرآن لپیٹ کر بھیج دیں، لیکن خاموشی کی سند نہیں — ورنہ پھر میری "بُت پرستی" کا مظلمہ سارا آپ کی گردن پر ہوگا !

میرے عزیز دوست — آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں خفا ہوں — یقیناً میں خطاوار ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اب تک نہیں کر سکا، لیکن مجبوری اور برہمی میں تو بڑا فرق ہے۔ میں شاید اب بھی خط نہ لکھتا، لیکن اتفاقاً آپ سے سرخرو ہونے کا موقعہ ہاتھ آگیا، اس لئے معذرت و مبارکباد دونوں پیش کر رہا ہوں

میں اُن سے مل لیا، آپ کوئی اندیشہ دل میں نہ لائیں اور جو کچھ ہو چکا ہے، اسے کالعدم سمجھ لیں —— آپ کو کسی نے غلط خبر دی۔ وہ تو نہایت معقول انسان ہیں !

حضرت — اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ وہاں کیا گزری، بس یوں سمجھئے کہ

ہم اُٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

معاذ اللہ، تلوّن سا تلوّن ! بیقراری سی بیقراری ! بس یوں سمجھئے کہ ذوالفقار کی تعریف میں میر انیس کا یہ بند سامنے تھا

وہ جوڑ توڑ یاد تھے اُس تیغ تیز کو — سر سے گری جُدا کیا پائے گریز کو

اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو — برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو

بُو گُل نے، رنگ لالہ نے، سرعت ہوا نے دی

— یہ کیا ہے، اپنی نیابت قضا نے دی !

مجھ میں تو اب دوبارہ وہاں جانے کی ہمت نہیں، ہاں اگر آپ ساتھ ہوئے تو خیر چلا چلوں گا !

ماشاء اللہ، کیا نظم لکھی ہے، کیا تیور ہیں۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ اس سے لطف اُٹھانے کے لئے "وارنات" کو کہاں ڈھونڈھوں۔ ڈاکٹر اشرف الحق حیدر آبادی نے بھی "اعادۂ شباب" کا آپریشن شاید اب ترک کر دیا ہے!

آپ کیوں نہ "کوک شاستر" کو نظم کر ڈالیں۔ کیا اس سے بہتر ترقی پسندانہ لٹریچر کوئی اور ہو سکتا ہے؟

بندہ نواز، عُریانی بُری چیز نہیں بشرط آنکہ وہ "نیم عریانی" سے آگے نہ بڑھے۔ بدن چُرا کر چلے جانے میں، سینہ نکال کر سامنے آجانے سے شاید زیادہ لطف ہے

کنایہ و استعارہ وغیرہ کو چھوڑئے، شاعرانہ ڈھکوسلے سہی، لیکن انسان کے نفسیاتی رجحان کو آپ کیونکر بدل سکتے ہیں۔ آرٹ کا کمال یہ نہیں کہ وہ اپنے سامنے دیوار حایل کر دے، وہ اپنی جگہ بالکل بیکار چیز ہے اگر دوسروں کو اس تک پہونچنے کی رغبت نہ ہو۔ لباس تار تار ہو جانے کے بعد لباس نہیں رہتا۔ موسیقی نام سُر کے ٹکڑے کر دینے کا نہیں بلکہ مختلف سُروں کو ہم آہنگ کر دینے کا ہے۔ آپ کی شاعری ایسی "جراحی" ہے جس کے زخم سے فاسد مادہ ہمیشہ رستا رہے گا اور سوائے عفونت پھیلانے کے اس کا کوئی نتیجہ نہیں

دُنیا میں ہر چیز کی ایک تہذیب ہوتی ہے اور شاعری کی بھی ایک تہذیب ہے۔ آپ نہ مانیں یہ اور بات ہے لیکن جب تک ساری دُنیا غیر مہذب نہ ہو جائے آپ کو رنج ناکامی اُٹھانا ہی پڑے گا

عتاب نامہ ملا، لیکن مجبوری دیکھئے کہ اسے "عتاب" کہنے کی بھی تاب مجھ میں نہیں!

چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتادست!

اگر مقصود صرف "معذرت" سے لطف اُٹھانا ہے تو پہلے کوئی گناہ تو کر لینے دیجئے۔ "عذر بیگناہی" میں کیا رکھا ہے؟ باور کیجئے میں نے کبھی اُن سے رسم و راہ بڑھانے کا اقدام نہیں کیا۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ اگر دل خون کرنے کی فرصت نصیب ہو، تو کیا آپ سے بہتر کوئی دوسرا اور ہو سکتا ہے؟

منزل پر تھک کر بیٹھ چکا ہوں۔ نہ اُٹھنے کی تاب، نہ چلنے کی ہمت، اور صرف اس امید پر جی رہا ہوں کہ

روزے بہ شکار خواہی آمد

لیکن آپ کو اس کی بھی فرصت نہیں — خیر جانے دیجئے ابھی اتنا سہارا باقی ہے کہ

چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسیدنہا!

مکرمی۔ مکرمت نامہ کا شکریہ۔ مجھے معلوم ہے کہ جنوری کے نگار سے بعض شعراء خوش نہیں ہیں۔ لیکن میرا مقصود بھی تو صرف "قصیدہ خوانی" نہ تھا — اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ اظہارِ رائے کے لئے آزاد ہے اور نگار کے صفحات حاضر

ہیں ـ مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ ہر علمی یا فنی گفتگو کو "ذاتی" حربہ سمجھنے لگتے ہیں ـ بہر حال کوئی لکھے یا نہ لکھے، آپ ضرور تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھ بھیجئے، اشاعت کے لئے نہ سہی، میری رہنمائی کے لئے!

جی ہاں، میں نے بھی سُنا ہے کہ عبدالماجد دریابادی آج کل مودودی سے برسرِ جنگ ہیں

یا علی مدد ـــ!

افسوس ہے میرے پاس نہ ترجمان القرآن آتا ہے نہ صدق، ورنہ دیکھتا کس کے "ناخن و چنگال" زیادہ تیز ہیں ـ ایک وقت تھا کہ عبدالماجد، ہر گمراہ کو آستانۂ مودودی پر حاضری کا مشورہ دیتے تھے، لیکن اب شاید انھیں اپنی اس گمراہی کا پتہ چل گیا ہے ـ مجھے تو کچھ خبر نہیں، لیکن اگر آپ کو معلوم ہو تو بتائیے کہ "استخوانِ جنگ" کیا چیز ہے

مکرمی ـ ابھی ابھی گرامی نامہ ملا ـ امید ہے جواب روانگی سے پہلے آپ تک پہونچ جائے گا ـــ آپ زحمت نہ فرمائیے، میں اس قابل نہیں، کہ آپ کی پذیرائی کر سکوں ـ مہمانی و میزبانی کا اُصول میرے یہاں بالکل جُدا ہے ـ آپ سے اگر اتنی بے تکلفی ہوتی کہ میں جو چاہتا آپ کے سامنے کر سکتا تو مضایقہ نہ تھا، لیکن چونکہ میں ایسا نہ کر سکوں گا، اسلئے مجھے تکلیف ہوگی اور جس مہمان سے تکلیف ہو وہ مجھ پر بار ہو جاتا ہے

لیکن ایک صورت اور ہے، وہ یہ کہ ہوٹل میں آپ کے قیام کا انتظام کرا دوں اور مصارف میں ادا کر دوں ـــ اس طرح آپ کو بھی آرام پہونچے گا اور مجھے بھی کوئی زحمت نہ ہوگی ـ اگر یہ شرط منظور ہو تو شوق سے تشریف لایئے اور جب تک جی چاہے قیام فرمایئے ـ میں حاضری بھی دیا کروں گا، لیکن کبھی کبھی ـ کھانا بھی آپ کے ساتھ نہ کھا سکوں گا، کیونکہ میں جس آزادی یا بدتمیزی کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں وہ آپ کے ساتھ مجھے میسر نہ آئے گی

مطبوعاتِ طاق بستاں

(بہترین انتقادی لٹریچر)

خواب کی دُنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے ـ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے، جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرئیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے ـ قیمت علاوہ محصول عہ

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی تاریخی تبصرہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ [illegible]

مقام محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ قیمت پانچ روپیہ (عہ)

اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ـ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور [illegible] ـ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا ـ قیمت ۱۰ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

وقت کی باتیں

جاپان کے آلات حرب

اس لڑائی میں سب سے بڑی غلطی جمہوریتوں نے یہ کی کہ دشمنوں کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکیں۔ جرمنی کی بابت تو خیر انھیں کچھ اندازہ تھا بھی، لیکن جاپان کے متعلق وہ سمجھے ہوئے تھیں کہ چین نے اس کی قوت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

جاپانی حکومت نے ہمیشہ اپنی قوت کو چھپایا اور اسے ایک سخت راز کی صورت میں رکھا۔ دوسرے ممالک کے لوگ وہاں پہونچکر بھی کوئی صحیح اندازہ جاپان کی قوت کا نہ کر سکتے تھے کیونکہ صورت اور وضع کے اختلاف کی وجہ سے وہ الگ پہچان لئے جاتے تھے اور ان کی نقل و حرکت کی سخت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ اطلاعات انھیں ملیں وہ حکومت کے ذریعہ سے ملیں اور وہ خود کوئی تحقیق چل پھر کر نہ کر سکے۔

نازی جماعت کے عروج کے وقت ہی سے جاپان، جرمنی سے بہت متاثر تھا اور اپنی فوجی تنظیم کے لئے اس نے جرمنی ہی سے آدمی بلائے اور جب وہ محوری مرکز میں شامل ہو گیا تو اس نے پیسفک کی جنگ کے لئے بڑی زبردست طیاریاں شروع کر دیں اور پچھلی جنگ میں جرمنی کے جو جزائر بحر پاسفک میں اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو بحری اڈوں میں تبدیل کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکتوبر ۴۱ء تک اس کی بحری قوت امریکہ کی پاسفک قوت کے برابر ہو گئی۔

جاپان کے چودہ بڑے جنگی جہازوں میں سے چار بالکل نئی قسم کے ہیں جو ۴۳، ۴۴ ہزار ٹن کے ہیں اور جن میں سے ہر ایک پر ۱۶ انچ دہانے کی بارہ بارہ توپیں نصب ہیں۔

ان کے علاوہ جاپان کے پاس چار آہن پوش جہاز بھی ہیں جو بہت قوی ہیں اور ۲۲ ہلکے کروزر بھی۔ ان کے علاوہ آٹھ طیارہ بردار جہاز اور ۱۰۰ سے زیادہ آبدوز کشتیاں بھی ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے یقیناً برطانیہ اور امریکہ کی بحری قوت زیادہ ہے، لیکن جاپان کی قوت بھی ایسی نہیں کہ اسے ہیچ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اس نے بحری قوت کے ساتھ اپنی فضائی و بری طاقت کو بھی بہت بڑھا لیا ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ بغیر فضائی قوت کے بحری قوت بیکار ہے، اس لئے جرمنی نے سب سے زیادہ توجہ اسی طرف صرف کی اور اس کی تقلید جاپان نے بھی کی۔ ہر چند جاپان کے سامنے بعض اقتصادی مشکلات بھی تھیں اور ہوائی جہازوں کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس کے یہاں کم پائی جاتی ہیں، لیکن اس نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنی ہوائی طاقت کو کافی حد تک بڑھا لیا۔

امریکی ماہرین کا بیان ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جاپان کے پاس پانچ ہزار اول قسم کے طیارے موجود تھے اور سالانہ آٹھ ہزار طیارے وہ بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ جاپان نے ارادہ کیا ہے کہ وہ سنہ ۴۲ء تک ۳۰ ہزار طیارے بنائے گا۔ گو ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کے پاس دھاتوں کی بہت کمی ہے، تاہم قیاس غالب یہ ہے کہ اس کی ہوائی قوت یقیناً پہلے سے بہت زیادہ ہو گی۔ — بحر پاسفک میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے امریکہ اور برطانیہ کے اخباروں نے لکھنا شروع کیا کہ جاپان کے پاس اگر ہوائی جہاز کافی تعداد میں ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کے جہاز ران ناقص ہیں، اور ان کے سر و گردن اور آنکھوں کی فطری ساخت انھیں قدر انداز ہواباز نہیں بنا سکتی، لیکن فوراً ہی ایک اور امریکی ماہر نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ جاپانی ہواباز بہترین قسم کے ہواباز ہیں اور امریکی و برطانوی ہوابازوں کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ عرصہ تک پرواز کر سکتے ہیں اور ان کا نشانہ بھی نہایت اچھا ہے۔

جاپانی جہاز کچھ تو امریکی وضع کے ہیں اور کچھ جرمن وضع کے۔ ان میں ۶۰ فی صدی (Fighters) ۳۰ فی صدی بم برسانے والے اور ۱۰ فی صدی باربردار۔ بمبار جہاز دو ہزار میل تک جا سکتے ہیں اور دو ہزار پونڈ کے بم لیکر ۱۵۰۰ میل تک بغیر دم لئے پرواز کر سکتے ہیں۔ — دوسرے آلات حرب میں بھی جاپان کسی سے پیچھے نہیں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسکے پاس

ہیں۔ مگر بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ ہر علمی یا فنی گفتگو کو "ذاتی" حربہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بہر حال کوئی لکھے یا نہ لکھے،
آپ ضرور تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھ بھیجئے، اشاعت کے لئے نہ سہی، میری رہنمائی کے لئے!

جی ہاں، میں نے بھی سُنا ہے کہ عبدالماجد دریابادی آج کل مودودی سے برسرِ جنگ ہیں
یا علی مدد ــــ!

افسوس ہے میرے پاس نہ ترجمان القرآن آتا ہے نہ صدق، ورنہ دیکھتا کس کے "ناخن و چنگال" زیادہ تیز ہیں۔ ایک وقت تھا کہ عبدالماجد، ہر گمراہ کو آستانۂ مودودی پر حاضری کا مشورہ دیتے تھے، لیکن اب شاید انھیں اپنی اس گمراہی کا پتہ چل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر نہیں، لیکن اگر آپ کو معلوم ہو تو بتائیے کہ "استخوانِ جنگ" کیا چیز ہے

مکرمی - ابھی ابھی گرامی نامہ ملا - امید ہے جواب روانگی سے پہلے آپ تک پہونچ جائے گا ــ آپ زحمت نہ فرمائیے، میں اس قابل نہیں، کہ آپ کی پذیرائی کر سکوں - مہمانی و میزبانی کا اُصول میرے یہاں بالکل جُدا ہے۔ آپ سے اگر اتنی بے تکلفی ہوتی کہ میں جو چاہتا آپ کے سامنے کر سکتا تو مضایقہ نہ تھا، لیکن چونکہ میں ایسا نہ کر سکوں گا، اسلئے مجھے تکلیف ہوگی اور جس مہمان سے تکلیف ہو وہ مجھ پر بار ہو جاتا ہے

لیکن ایک صورت اور ہے، وہ یہ کہ ہوٹل میں آپ کے قیام کا انتظام کرا دوں اور مصارف میں ادا کر دوں ــــ اس طرح آپ کو بھی آرام پہونچے گا اور مجھے بھی کوئی زحمت نہ ہوگی - اگر یہ شرط منظور ہو تو شوق سے تشریف لائیے اور جب تک جی چاہے قیام فرمائیے ــ میں حاضری بھی دیا کروں گا، لیکن کبھی کبھی - کھانا بھی آپ کے ساتھ نہ کھا سکوں گا، کیونکہ میں جس آزادی یا بدتمیزی کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں وہ آپ کے ساتھ مجھے میسر نہ آسکے گی

مطبوعاتِ طاق بستاں

(بہترین انتقادی لٹریچر)

خواب کی دُنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے، جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

الہاماتِ شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ...

مقامِ محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ ــ قیمت پانچ روپیہ (صہ)

اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور لکھا گیا ہے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت ۱۰ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ނިމުނީ

ٹینکوں کی تعداد کتنی ہے - جاپانی فوج بہت بڑی ہے جو چین کی لڑائی کے بعد سے برابر بڑھ رہی ہے چونکہ جاپان کی آبادی بہت زیادہ ہے اس لئے سپاہیوں کی اس کے پاس کمی نہیں اور چین کے میدانوں میں ان کی فوجی تربیت کا بھی کافی موقعہ مل گیا ہے — اس میں شک نہیں کہ جاپان اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے لیکن اس نے ان مشکلات کو اس طرح دور کیا ہے کہ ملک بھر میں جنگجویانہ جذبہ پیدا کر کے سب کو لڑنے بھڑنے پر آمادہ کر دیا ہے اور نازی جماعت کی طرح لڑائی کو مذہب بنا لیا ہے، چنانچہ آج جاپان میں لاکھوں آدمی میدان جنگ میں ہیں اور لاکھوں فوجی کارخانوں میں کام کر رہے ہیں - لیکن باوجود ان تمام باتوں کے بہ وقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور زیادہ عرصہ تک لڑتے رہنے کی تاب اس میں نہیں ہے -

جنگی جہاز کی عظمت!

آجکل آپ روز سنتے ہوں گے کہ فلاں جہاز فلاں سمندر میں ڈوب گیا اور آپ اس کو نہایت معمولی بات سمجھتے ہوں گے لیکن اگر آپ کو ایک جنگی جہاز (Battle - ship) کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو تو آپ سمجھیں کہ در اصل کسی ایک بڑے جہاز کا ڈوب جانا، قوم کے ایک بازو کا ٹوٹ جانا ہے - آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ایک جہاز کی تعمیر سے چوبیس قسم کی مختلف تجارتیں متعلق ہوتی ہیں اور اگر جہازوں کی تمام قسموں کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جائے تو وہ صرف میکانکی حیثیت بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی اعداد و شمار کی اتنی طویل فہرست بن سکتی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سوچ بھی نہیں سکتے - مثلاً آپ صرف طیارہ بردار جہاز اور کروزر (آہن پوش) ہی کو لے لیجئے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے علی الترتیب دو ہزار اور پندرہ سو نقشے طیار کرنے پڑتے ہیں -

تعمیر کی ابتدا سے لیکر سمندر تک پہونچنے میں ایک جنگی جہاز کو ۴۰ مہینے کا زمانہ چاہئے یعنی اگر غیر معمولی عجلت سے کام نہ لیا جائے تو وہ جہاز جس کی تعمیر ۱۹۴۲ء میں شروع ہوئی ہو ۱۹۴۵ء میں اپنے فرائض انجام دینے کے قابل ہوگا - پورا ایک سال تو ڈرائینگ یعنی خاکہ کی طیاری میں صرف ہو جاتا ہے، اس کے بعد چار مہینے نقشوں کے لئے چاہئے اور تین مہینے لاگت کا تخمینہ کرنے کے لئے - اس کے بعد ۱۵ مہینے تعمیر میں صرف ہوتے ہیں اور چھ مہینے اس کی جانچ اور عملۂ جہاز کی تربیت میں -

۳۵ ہزار ٹن کے جہاز کی تعمیر میں ۸ گھنٹے روزانہ کام کرنے کی صورت میں ۴۹ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے اور یہ صرف گودی کے اندر اندر کا حال ہے - گودی سے باہر نکلنے کے بعد جو محنت اس پر صرف ہوتی ہے اس کو بھی اگر اس میں شامل کر لیا جائے تو شمار ۹۵ لاکھ آدمیوں تک پہونچتا ہے - چھوٹے جہازوں کی تعمیر میں یقیناً کم زمانہ صرف ہوتا ہے لیکن اتنا کم کہ سالوں کا کام مہینوں میں ختم ہو سکے، چنانچہ ایک ۱۶ ہزار ٹن کے تباہ کن جہاز کی تعمیر میں بھی پورے ۲۰ مہینے اور گیارہ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے -

جہازوں کی تعمیر میں جلدی کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی جہاز کی تعمیر ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے جہاز کا کام شروع کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ متعدد مقامات پر کارخانے قائم کئے جائیں، لیکن چونکہ یہ کارخانے سمندر کے کنارے ہی قائم ہو سکتے ہیں اور ساحل کا ہر حصہ قیام کارخانہ کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، اس لئے جگہ کا سوال بھی بجائے خود بہت مشکل ہے -

امریکہ میں جہاز سازی کی صنعت دو حصوں میں منقسم ہے، ایک سرکاری اور دوسرے پرائیوٹ یعنی امریکہ کی حکومت خود بھی جہاز تعمیر کراتی ہے اور دوسرے کارخانوں سے خریدتی بھی ہے، لیکن ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں جہاز سازی کا کام اتنا پھیل گیا کہ حکومت کو خود اپنے لئے بھی اور تاجروں کے لئے بھی اپنے صرف سے نئی نئی گودیاں بنوانا پڑیں تاکہ وہاں بھی کام ہو سکے -

اس صنعت کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ تمام ضروری سامان صحیح وقت اور جگہ پر پہونچ جائے اور اسی لئے حکومت کو بھی بہت سے بیرونی ٹھیکہ داروں سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ اگر کوئی ایک چیز بھی مقررہ وقت پر نہ پہونچے تو سارا کام دفعتاً بند ہو جائے اور وقت کے اس نقصان کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں لیکن باوجود تمام احتیاط کے تاخیر ہوتی ہی ہے - جہاز کا بالائی حصہ جسے برج کہنا چاہئے، بہت پیچیدہ اور مشکل کام ہے کیونکہ اس کا وزن ۰۰ ۱۵ ٹن ہوتا ہے اور اس کے مختلف حصوں کو اتنی بلندی تک لیجانا آسان کام نہیں -

ایک جنگی جہاز ۶۰ یا ۷۰ فیصدی تعمیر ختم ہونے کے بعد ہی پانی میں ڈال دیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو ۴۰ یا ۴۵ فیصدی تعمیر ہونے کے بعد ہی اسے سمندر میں لے جا سکتے ہیں جہاں اُسے آہن پوش کیا جاتا ہے، برج طیار کئے جاتے ہیں، اور توپیں وغیرہ نصب کی جاتی ہیں — اس صنعت میں تجربہ کار کام کرنے والوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور جوں جوں جہاز کی [illegible] قریب ہوتی ہے اچھا کام کرنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے — امریکہ ۱۹۴۲ء تک بحر پاسفک اور بحر اٹلانٹک میں اپنی قوت کو جس حد تک بڑھاتا چاہتا ہے وہ ۳۵ بڑے جنگی جہاز، ۲۰ طیارہ بردار جہاز، ۸۸ کروزر، ۳۷۸ تباہ کن جہاز اور ۱۸۰ آبدوزوں تک پہنچتی ہے - یہ تعداد بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن آیئے یہ اندازہ لگائیں کہ اس پر صرف کتنا ہوگا — ایک بڑے جنگی جہاز ۷ کروڑ ڈالر (ڈالر ساڑھے تین روپیہ کا سمجھئے) میں طیار ہوتا ہے - ایک کروزر ۲ کروڑ ۲ لاکھ ڈالر میں - ایک طیارہ بردار جہاز ۲ کروڑ ۰۰ لاکھ ڈالر میں - ایک تباہ کن جہاز ۵۰ لاکھ ڈالر میں اور ایک آبدوز [illegible] لاکھ ڈالر میں - اب آپ ان رقموں کو علی الترتیب ۳۵ - ۲۰ - ۸۸ - ۳۷۸ اور ۱۸۰ سے ضرب دیکر جمع کیجئے اور جو نتیجہ اس سے حاصل ہو اس کو پھر ۳ [illegible] سے ضرب دیجئے تا کہ اگر روپیہ کی صورت میں [illegible] کے اعداد آپ کو ساتھ دے سکیں -

معلومات عامہ

مکڑی اور جنگ

تاریخ انسانی میں مکڑی بارہا مفید ثابت ہو چکی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج بھی وہ اپنے اس اہم کردار کی ادا کر رہی ہے۔ موجودہ زمانہ کی اہم ایجاد
Periscope) ہے جس کی مدد سے آبدوز کشتیوں اور ٹینکوں میں بیٹھنے والے باہر کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ اس میں ایک شیشہ ہوتا ہے
جس میں آنکھ لگا کر تمام چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ یہ شیشہ عمودی اور افقی لکیروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان لکیروں کو قطعی طور پر صحیح ہونا چاہئے کیونکہ شیشہ کی یہی وہ لکیریں ہوتی ہیں جن سے
رخ اور فاصلہ کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان لکیروں کو اتنا باریک بھی ہونا چاہئے کہ ان سے چیزوں کے دکھائی دینے میں کوئی فرق نہ پڑے۔ عام انسانی سر کا بال بھی اس کام کے لئے بہت موٹا
ہوتا ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے کا تار جو ایک انچ کے $\frac{1}{50}$ سے لیکر $\frac{1}{100}$ انچ تک باریک ہوتا ہے اس کام کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر مکڑی کے جالے کا تار اتنا باریک نہ ہو تو بھی اسے اتنے
باریک حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی اس کے استعمال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔
مکڑی کا جالا ایک دوسری آلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ آلہ (Theodolite) یہ آلہ پیمائش کے کاموں میں زاویوں کے ناپنے کے کام آتا ہے۔ فیکٹریوں اور ہوائی اڈوں
کے لئے زمینوں کے ناپنے اور انھیں مختلف نقشوں کے مطابق علیحدہ علیحدہ بانٹنے کا کام اسوقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک (اس آلہ) کا استعمال نہ ہو۔
ایک مرتبہ مکڑی کے جالے کی وسعت معلوم ہو جانے کے بعد جس کا معلوم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے، جالے کو ایک بے رنگ اور شفاف وارنش کے ذریعہ سے دیکھنے والے شیشہ پر لگا دیا
جاتا ہے اور پھر یہ جالا شدید ترین موسمی تغیرات اور درجۂ حرارت کے اتار چڑھاؤ کا بھی اثر نہیں قبول کرتا۔ اس خصوصیت میں دنیا کی اور کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ مضبوط بھی بہت ہوتا
ہے چنانچہ جالے کے تاروں کو اگر ایک ایسے دائرہ میں بٹ کر لگایا جائے جس کا قطر $\frac{1}{4}$ انچ ہو تو اسی لمبائی کے کسی دوسرے ڈورے سے ۳ گنا زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔ گر سائنس کے کام
پرانے جالوں کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے جالے منتخب کئے جاتے ہیں جنھیں بڑے بڑے مکڑوں نے تانا ہے۔
جالوں کے حصول میں بھی بڑی جد و جہد کی جاتی ہے۔ مکڑیوں کو پکڑ کر ہلکے بنے والے تختوں پر رکھ دیا جاتا ہے اور ان کی مسلسل نگرانی ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ ذرا بھی متوحش یا پریشان ہوتی
ہیں تو فوراً کسی جگہ چھپ جانا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بہترین ماحول کی موجودگی کے باوجود مکڑیاں اپنا کام بند کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی ہڑتال
سیکھ گئی ہیں۔ اس صرف میں مکڑیوں کو کبھی کھانا نہیں دیا جاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک مکڑی ۵۰ سے ۱۰۰ فٹ تک کسی لمبائی کا تار اپنے جالے میں تان دیتی ہے تو اسے فوراً رہا کر دیا جاتا ہے۔ اس جالے
کو بہت احتیاط کے ساتھ لکڑیوں پر جمع کیا جاتا ہے۔ حرارت، برودت، اور حرکت سے انھیں بالکل دور رکھا جاتا ہے اور انھیں پھر اسوقت تک نہیں چھوا جاتا ہے جب کہ ان کے استعمال کا
وقت نہیں آتا۔ شمالی انگلستان میں ایک کارخانہ اسی کام کو کر رہا ہے۔ اس کے مال گودام میں ہزاروں جالے بھرے ہیں۔

دستی تحریر سے ذہانت کا پتہ

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جنگ نے سیکڑوں طرح کی ضروریات پیدا کر دی ہیں۔ برطانیہ میں بھی یہ ضروریات پیدا ہو رہی ہیں اور انھیں
حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ آئے دن برطانیہ اور دوسرے ممالک میں ہزاروں آدمی سیکڑوں قسم کی خدمات بجا لانے
بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی عام بھرتی کا سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی ایسے کام کے لئے بھرتی کر لیا جائے جس کا وہ اہل نہ ثابت ہو۔ چنانچہ تیز رفتاری کے ساتھ
کو حل کرنا، اور دوسرے تمام وہ نفسیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں جن سے آدمی کی دماغی اہلیت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ لندن کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر مائیکل فورڈہم (Michael Fordham
نے ایک اور طریقہ آزمائش پیش کیا ہے یعنی دستی تحریر کا تجزیہ۔ یہ طریقہ کوئی نیا نہیں ہے۔ جرمن دس یا پندرہ سال سے اس طریقہ کو
استعمال کر رہا ہے اور ذمہ دارانہ کام سر انجام دینے کی اہلیت معلوم کرنے کے لئے لوگوں کا یہ بہت اچھا ذریعۂ آزمائش ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے خاص سفری ہوائی جہاز کا ہوا باز
دستی تحریر کی آزمائش کے بعد ملازم رکھا گیا تھا۔
برطانیہ میں بھی بچوں کی رہبری کرنے والے اور تجارت کرنے والے چند اداروں نے اس نفسیاتی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ خود ڈاکٹر فورڈہم نے زندگی کے مختلف پہلوؤں

ی کامیابی کے بہت سے تجربات بیان کئے ہیں ۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فایدہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک شخص کی بنیادی اور پوشیدہ اہلیت اس سے بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے اور وصیات جو یوں آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتیں آزمایشوں سے فوراً معلوم ہو جاتی ہیں ۔

...ی لوگوں کی مصیبت

۳۰ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھنے والے شخص کو انگلستان میں لکھ پتی سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح کیونکہ ۳۰ ہزار پونڈ کا مطلب ہے لاکھ ۵ ہزار روپیہ سمجھنا چاہئے ۔ اس طرح سے انگلستان میں ۴۴۰ لکھ پتی شخص موجود ہیں ۔ امریکہ میں ...۴ لکھ پتی ہیں مگر وہاں لکھ پتی کا لفظ آ ے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور دس لاکھ ڈالر رکھنے والا شخص بھی لکھ پتی کہلاتا ہے ۔

ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ لارڈ نفیلڈ (Nuffield) سر جان الرمین (Sir John Ellerman.) لیڈی لوئس ماؤنٹ بیٹن (Lady Louis Mountbatten) مس ڈاروتھی پیگٹ (Miss Dorothy Paget) برطانوی لکھ پتی ہر وقت جنت میں رہتے ہوں گے ں دنیا کا بہترین اطمینان نصیب ہوگا ۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے ۔ ان میں سے اکثر بڑے بڑے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کتنے ملازم رکھتے ہیں ۔

ٹیکسوں نے ان تمام لکھ پتی لوگوں کو بہت دبا رکھا ہے ۔ شاید انگلستان کا سب سے بڑا دولتمند شخص سر جان الرمین ہے ۔ اس شخص کی عمر ابھی ۴۲ سال کی ہے مگر انھوں نے اپنے باپ سے ران کمپنی کے سب سے بڑے مالک تھے ، ایک کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ ورثہ میں پایا تھا ۔ اس کے بعد سے انھوں نے اس زبردست رقم میں بہت بڑا اضافہ بھی کیا ہے ۔ مگر جنگ کے زمانہ میں ں کے ذریعہ سے دولت کا بہت بڑا حصہ کھینچ لیا جاتا ہے ۔ انگلستان کے جن لوگوں کی آمدنی ایک لاکھ پونڈ یعنی تیرہ ، چودہ لاکھ روپیہ سالانہ کی ہے ، اُن کی تعداد ۰ ۱۵ سے کچھ زائد ہے ۔ مگر بڑے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ ٹیکسوں کی ادائگی کے بعد اُن کے پاس اُن کے ہر پونڈ میں سے اُن کے لئے ایک شلنگ سے بھی کم رقم بچتی ہے ۔ چنانچہ ان بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے عام طور رگ بھی نسبتاً غریب ہوگئے ہیں ۔ مثال کے طور پر مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ کی سالانہ تنخواہ ملتی ہے ۔ مگر وہ ٹیکسوں میں ۶۸۴۲ پونڈ ادا کر دیتے ہیں ۔ ان کے پاس ۳۰۰۰ پونڈ سے کچھ ہی زاید ں ہے ۔ اگر برطانوی قوم یہ چاہے کہ مسٹر چرچل اپنی " دس ہزار سالانہ بلا ٹیکس " کی تنخواہ سے لطف اندوز ہو سکیں تو ایسے برطانوی وزیر اعظم کی ۰ ۶۶۹۲ پونڈ سالانہ کی تنخواہ منظور کرنا ی کیونکہ اسی صورت میں ٹیکس کی وصولیابی کے بعد مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ سالانہ کی بچت ہوگی ۔

بڑے بڑے مالی اداروں سے ایسے لوگ بھی متعلق ہیں جو عالمگیر شہرت کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کروڑ پتی یا لکھ پتی نہیں ہیں ۔ چنانچہ انگلستان کے ایک لارڈ ۲۰ کمپنیوں کے ڑ ہیں ۔ ان کمپنیوں کا مجموعی سرمایہ دس کروڑ پونڈ یعنی ایک ارب ۵۰ کروڑ روپئے کے قریب ہے ۔ مگر وہ خود لکھ پتی نہیں ہے اور معمولی حالت سے رہتے ہیں ۔ یہی حالت بنک آف انگلینڈ کے رمسٹر مانٹیگ نارمن کی ہے ۔ مگر برطانیہ کے بڑے لوگ کنجوس نہیں ہیں ۔ لارڈ نفیلڈ نے آکسفورڈ یونیورسٹی اور طبی درسگاہوں کو لاکھوں پونڈ دئے ہیں ۔ اسی طرح سے والٹر ولس (Walter Wills) نامی مشہور انگریز مخیر نے برسٹل یونیورسٹی کو ۲۵ ہزار پونڈ دئے تھے تاکہ وہاں ایک نیا شعبۂ تحقیقات کھولا جاسکے ۔ اس شعبہ کے لئے مشہور امریکن پتی نے ۵۰ ہزار پونڈ دئے تھے ۔ مگر بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے اس قسم کی امدادی رقوم میں بہت زیادہ کمی ہو جائے گی ۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کا جنگی قرضہ ابتک دس لاکھ پونڈ ہی ہوا ہے جو اس رقم سے اتنی آمدنی نہیں ہوگی جو ان ٹیکسوں کا بدل ہو سکے ۔ ایک بہت امیر انگریز کی جو ابتک غیر شادی شدہ ہے ڈیڑھ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہے مگر اسے ٹیکسوں میں ۱۴۲۹۲۴ نڈ ادا کرنا پڑتے ہیں ۔ جنگ کے بعد ڈاکخانہ میں اس کی محض ۶۰ پونڈ کی رقم بطور قرض کے واجب الادا رہ جائے گی ۔

...برما روڈ اور چین کی دوسری سڑکیں

جنگ کے زمانہ میں سامان جنگ کی فراہمی سے زیادہ اس سامان کے لانے لیجانے اور فوجوں کی بروقت نقل و حرکت کا سوال سامنے آتا ہے اور اسکے لئے نہ صرف ریلوے بلکہ سڑکوں کا ہونا ضروری ہے ، چنانچہ موجودہ جنگ میں اور بہت سے اہم مسایل کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر و درستی کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جب جاپان نے چین کی ناکہ بندی کی تو چین نے ایک لاکھ ستر ہزار قلیوں اور دو ہزار انجینیروں کی مدد سے وہ سڑک طیار کی جو برما روڈ کہلاتی ہے اور چونگ کنگ (چین کے پایۂ تخت) سے لاشیو (برما) تک ایک ہزار میل لمبی ہے ۔ اس سڑک کی حفاظت کے لئے چینی سپاہی مامور کئے گئے اور اس سڑک کے ذریعہ سے لڑائی اور رسد کا سامان چین کو پہونچتا رہا اور پہونچتا ہے ۔ درمیان میں تین مہینے کے لئے یہ سڑک برطانوی حکومت نے بند کر دی تھی ، تاکہ جاپان کسی طرح مایل بہ امن و سکون ہو جائے ، لیکن جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ سڑک پھر کھول دی گئی ۔۔۔ اس سڑک کے علاوہ چین نے ایک سڑک اور طیار کی جو ... میل لمبی ہے اور چونگ کنگ سے ماسکو تک جاتی ہے ۔ اس سڑک میں سو میل کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جسے صرف عورتوں نے بنایا ہے اس حال میں کہ بچے ان کی پیٹھ پر بندھے تھے اور صرف اُبلی ہوئی ترکاری کھا کر زندگی بسر کرتی تھیں ۔۔۔ ایک تیسری سڑک اور بھی ہے جو چونگ کنگ کو انڈو چائنا سے ملاتی ہے اور اسکی لمبائی ۱۴۰۰ میل ہے ۔ یہ سڑک بہت خطرناک ہے یعنی دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے اکثر زیر آب ہو جاتی ہے اور کنارہ کے پہاڑوں سے چٹانیں گر گر کر راستہ روک دیتی ہیں ، لیکن چینی فوج برابر اسے صاف کرتی رہتی ہے اور باوجود اس کے کہ جاپانی بم گرا گرا کر اس کو توڑتے رہتے ہیں چینی اس کو درست حالت میں رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ اب کہ جاپان کا انڈو چائنا پر قبضہ ہو گیا ہے ، یہ سڑک بیکار ہو گئی ، اور اگر برما انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو برما روڈ بھی غالباً بیکار ہو جائے ، لیکن وہ سڑک جو ماسکو تک جاتی ہے ، وہ قایم رہے گی اور چین کو سامان جنگ اس راستہ سے پہونچتا رہے گا ۔

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا - سہارن پور)

اکتوبر ۱۹۳۱ء کے نگار میں جہاں تک آپ نے مومن کے مشکل اشعار کا حل میرے اشعار کے جواب میں کیا تھا، اس سے آگے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں - از راہ کرم متوجہ فرمائیے - میں چاہتا ہوں، اسی طرح آہستہ آہستہ یہ شرح مکمل ہو جائے - اشعار حسب ذیل ہیں :-

(۱) اور بھی رنگ آج ہے عارض گلعذار کا — خوں ہو دل اپنا تھا گر گونۂ رخ طراز میں

"گونۂ رخ طراز" کیا ؟

(۲) کیوں نہ آدھی رات تک جاگے وہ جیکا دھیان ہو — آہوئے نیمخواب میں نرگس نیم باز میں

پہلا مصرع غلط معلوم ہوتا ہے - شعر کا مطلب بھی تحریر فرمائیے

(۳) بن ترے بزم سور میں ہیں یہ تپش متیں کہے — نغمۂ صور کا اثر نغمۂ سنے نواز میں

"بزم سور" کیا ؟

(۴) اُن سے اب التفات کی غیر کو ہیں شکایتیں — سن کے مرا مبالغہ منت احتراز میں

اس شعر کا مفہوم بالکل سمجھ میں نہیں آیا -

(۵) پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہ ہو کہیں — ہوتی ہیں سب عیاں جان نہفتہ راز میں

شعر کا مفہوم مطلوب ہے اور "جان نہفتہ راز" کیا ؟

(۶) مشکل ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — آثار اضطراب دور کہ ہجران کا غم نہیں

(۷) سید حاشا کردیا ہو مرے ذوق قتل نے — قاتل کے آگے گردن اغیار خم نہیں

(۸) غیرت کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ — وحشت کا جو فن کیونکہ نہ ہو مجھ سے رام نہیں

(۹) کیا خوش ہوں کو نہ غیر میں گر نقش پا نہ ہو — وہ شوخ جا تا ہوں کہ ثابت قدم نہ ہو

(۱۰) جانا حرام ہجر بتاں میں تو کیا گناہ — پیر مغاں شراب ہے شیشہ میں کم نہیں

(۱۱) بے التفاتیاں جو عدو سے تھیں نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و دام نہیں

(۱۲) بے جرم پائمال عدو کو کیا کیے — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

(۱۳) ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

(۱۴) عاشق کشی پہ شیوہ اگر بوالہوس سہی — آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

(۱۵) تھی خسرو و پرویز کو کام شادی مرگ کیا — جانکنی ہے انتقام کوہکن کی فکر میں

(۱۶) دہم عشق لالہ رو سے داغ دل لیکے اٹھے — جان کر گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں

(۱۷) خاک میں وہ تخم نہیں خار میں وہ خلش نہیں — کیوں نہ ہمیں زندہ ہو جوش جنوں بہار میں

(۱۸) مرگ ہے انتہائے عشق یاں ہی ابتدائے شوق — زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

(۱۹) مانے نہ مانے منع تپش ہائے دل کروں — میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

(۲۰) مرتا ہوں کس عذاب سے یہ وقت ہی میں ہو — اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

(۲۱) جاں دیدنی ہے اس آفت جاں سے معاملہ — بس کب تک اختلاف تقاضائے دل کروں

(۲۲) وہ علم الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

(۲۳) محضر قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا — سر قاصد کو وہ فتوے سے قلم کرتے ہیں

(۲۴) اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس میں قہر ہے دل اور بیع کم کرتے ہیں

(۲۵) کشتۂ یار ہوں اس رشک کے ستم ہو جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

(نگار) ۱ - "گونۂ رخ طراز" سے مراد "گلگونۂ رخ طراز" ہے، یعنی وہ غازہ جو چہرہ میں حسن و دلکشی پیدا کر دیتا ہے -

۲ - پہلا مصرع تقطیع سے گرتا ہے - بجائے کیوں کے کیونکہ پڑھئے - آہوئے نیمخواب اور نرگس نیم باز ایک ہی چیز ہے، یعنی معشوق کی نیم باز آنکھیں مطلب واضح ہے -

۳ - بزم شور، یعنی بزم عیش و نشاط -

۴ - مجھ سے محبوب نے احتراز شروع کیا تو میں نے اس پر اظہار شکر کیا، غیر نے یہ سمجھ کر شاید معشوق کا احتراز ہی کام کی بات ہوگی خود بھی التفات یار سے بیزار ہو کر اس کی شکایتیں شروع کر دیں -

۵ ۔ "جانِ نہفتہ راز" ۔ یعنی وہ جان جس کا راز پوشیدہ ہے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جان دینے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سے کسی پردہ نشیں کے عشق کی پردہ دری نہ ہو ۔ (جانِ نہفتہ راز میں بے حجابی اسی وقت ہوگی جب وہ نکلے گی)

۶ ۔ مومن نے مکر شاعرانہ سے کام لیا ہے ۔ محبوب سے کہتا ہے کہ میں تم سے آشنا ہو رہا ہوں کہ ہجراں میرے لئے غم کی چیز نہیں، اس لئے اگر واقعی مجھے ستانا چاہتے ہو تو مجھ سے ملو کیونکہ ستم کی بہتر صورت یہی ہے ۔

۷ ۔ اغیار میرے شوقِ قتل کو دیکھ کر ہمت ہار گئے اور اس لئے اب قاتل کے آگے ان کی گردن جھکی ہوئی نظر نہیں آتی ۔
دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم بھی اظہار ہوتا ہے کہ اغیار محبوب کی اطاعت سے باہر ہو گئے ہیں ۔ (گردن خم کرنا، اطاعت قبول کرنے کو بھی کہتے ہیں)

۸ ۔ یہ دیکھ کر کہ محبوب فرطِ نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے گریز نہیں کرتا، مجھے وحشت ہوتی ہے، کیونکہ جب مجھ سے احتراز نہیں تو ظاہر ہے، غیروں سے بھی نہ ہوگا ۔

۹ ۔ اگر کوئے غیر میں محبوب کا نقشِ پا نظر نہیں آیا تو خوشی کی بات نہیں، کیونکہ جانتا ہوں وہ کسی بات میں ثابت قدم نہیں ہے اور ہو سکتا ہے وہ کسی اور جگہ پہونچا ہو یا پیکر غیر کے پاس آنے جانے لگا

۱۰ ۔ اگر ہجرِ یار میں شراب کو میں نے حرام جانا تو کیا گناہ کیا ۔ اگر شراب زہر ہوتی تو البتہ اس عالم میں اُسے پی جاتا ۔

۱۱ ۔ چونکہ ہنگامِ وصل کسی بے التفاتی کا حال دشمن سے نہ سُنا تھا، اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ وصل میں رنج و الم نہیں ہوتا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور محبوب وصل میں بھی ہم سے نگرتا رہا

۱۲ ۔ اگر دشمن کو بے خطا پامال کیا تو تم اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں اپنے انجام سے ڈر کر ترکِ محبت کر دوں گا ۔

۱۳ ۔ ناصح نے مومن سے کہا کہ تم جور و ستم برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے اس لئے محبت ترک کر دو ۔ اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ شاید اس لئے میں تیری باتیں برداشت نہیں کر سکتا ۔ (گویا بالفاظ دیگر ناصح کی نصیحت کو انتہائی جور و ستم ظاہر کیا گیا ہے)

۱۴ ۔ اگر وہ سچے عاشقوں ہی کو ہلاک کرتا ہے تو پھر ہم بھی ہوس پرستی اختیار کریں گے کیونکہ ہم بھی تو اپنی جان کے دشمن نہیں ہیں ۔

۱۵ ۔ اگر خسرو، اپنے رقیب کوہکن کی موت پر فرطِ خوشی سے مر نہیں گیا بلکہ بے چین ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُس سے کوہکن کا انتقام لیا جا رہا ہے ۔

۱۶ ۔ یہ دیکھ کر کہ گلچیں تاراجِ چمن کی فکر میں ہے، میرے داغِ دل تازہ ہوئے، کیونکہ مجھے یہ وہم پیدا ہوا کہ کہیں وہ اُس لالہ رو کی محبت میں نہ مبتلا ہو اور اسی لئے پھولوں کو توڑتا ہو کہ یہ اس سے مشابہ ہیں ۔

۱۷ ۔ بہار میں جوشِ جنوں بڑھ جانے کی شاعرانہ تاویل کی ہے کہ میں تو صرف خلش اور تپش کا شایق ہوں چونکہ بہار میں ان چیزوں کی کمی ہو جاتی ہے اس لئے مرا جوشِ جنوں بڑھ جاتا ہے

۱۸ ۔ رنجش بار بار کی وجہ سے عشق کی انتہا نہ ہو سکی اور اس لئے جان بچ گئی، ورنہ ظاہر ہے کہ عشق کی انتہا میں مرنا ہی پڑتا ۔

۱۹ ۔ تماشا کرنا ۔ یعنی نمائش کرنا ۔ مطلب یہ کہ میں غیر تو ہوں نہیں کہ دل کی بیتابیوں کی نمائش کرتا پھروں، اس لئے میرا فرض یہی ہے کہ میں تپشِ دل نہ ظاہر ہونے دوں ۔

۲۰ ۔ مشہور ہے کہ جانکنی کی تلخی کے وقت ایک ساعت قبولِ دعا کی بھی آتی ہے، اس لئے مومن کہتا ہے کہ میں جس تکلیف سے جان دے رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید قبولِ دعا کا وقت یہی ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ تمنائے دل پوری ہونے کی دعا کروں ۔

۲۱ ۔ میں کب تک اس کا انتظار کروں کہ وہ دل کا تقاضہ کرے اور دل دیکر جان کو مصیبت میں ڈالے، آخر کار جان دینا ہی ہے اس لئے کیوں نہ اس سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دوں ۔

۲۲ ۔ "علے الرغمِ عدو" یعنی دشمن کی ضد میں ۔ یعنی محض دشمن کی ضد میں مجھ پر لطف ہونا بڑا ستم ہے ۔

۲۳ ۔ ہم نے قاصد کے ذریعہ خط بھیجا تو معشوق نے اس جُرم میں اسے قتل کر دیا ۔ گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب ہی محضرِ قتل تھا جس سے فتوائے قتل حاصل کیا گیا ۔

۲۴ "بیع سلم" اس بیع کو کہتے ہیں جس میں خریدار فروخت شدہ شے پر فوراً قابض نہ ہو سکے ۔ مطلب یہ کہ دل کا سودا بھی گویا "بیع سلم" کا سا ہے کہ مالک تو اس کا ہو جاتا ہے کوئی اور لیکن وہ بیچنے والے کے پاس ہی رہتا ہے ۔

۲۵ ۔ وہ میری موت کا غم نہیں کرتے بلکہ وہ اس رشک میں مبتلا ہیں کہ مومن تو کشتۂ یار ہوا اور وہ نہ ہو سکے ۔

مطبوعات موصولہ

فردوسِ تخیّل مجموعہ ہے مرحومہ زاہدہ خاتون شروانی کی منظومات کا، جنھوں نے اب سے ۲۵ سال پہلے، ہماری شاعری کی دُنیا میں اپنی نظموں سے ایک ہلچل سی ڈالدی تھی۔ یہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی تھیں اور انھیں کی تربیت میں انھوں نے علوم مشرقی سے استفادہ کیا تھا۔ ذوقِ ادب بھی انھیں باپ کی طرف سے ملا تھا اور فکر و خیال کی پاکیزگی بھی خاندانی ورثہ تھی۔

ایک عورت کا کلام محض اس وجہ سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ عورت کا ہے، چہ جائیکہ وہ واقعی خوب و پاکیزہ بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرحومہ کی نظمیں اول اول سامنے آئیں تو لوگ حیران رہ گئے اور پھر تو "ز۔ خ۔ ش" نے ایسی روانی فضا پیدا کر دی کہ ادبی صحبتوں میں اکثر یہی چرچا نظر آنے لگا۔

مرحومہ نے ۲۸ سال کی عمر میں شادی سے قبل ہی وفات پائی لیکن ان کی شاعری کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہ تھی اور اس قلیل مدت میں جو کچھ اور جتنا کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ہے۔

اس مجموعہ میں تقریباً ۲۵ نظمیں ہیں جو تین ادوار میں تقسیم کی گئی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرحومہ کے کلام میں اول ہی کافی پختگی پائی جاتی تھی جو رفتہ رفتہ تیسرے دور میں زیادہ دلنشین ہو گئی تھی۔ مرحومہ کی بعض فارسی نظمیں بھی اس میں شامل ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں بھی کتنی اچھی دستگاہ رکھتی تھیں۔

افسوس ہے کہ اسوقت تک اس مجموعہ کے بالاستیعاب مطالعہ کی سعادت ہم کو حاصل نہیں ہوئی، لیکن سرسری نگاہ کا فیصلہ یہی ہے کہ طبقہ نسواں میں زاہدہ خاتون شروانی کی سی شاعر ہمارے زمانہ میں کوئی پیدا نہیں ہوئی۔

دارالاشاعت پنجاب نے اسکی اشاعت میں بھی نہایت اہتمام سے کام لیا ہے۔ نہایت چکنا آرٹ پیپر، بہترین طباعت و کتابت، مرصّع سرورق، خوبصورت جلد اور قیمت صرف عہ۸ ہے۔

منٹو کے افسانے مجموعہ ہے سعادت حسن صاحب منٹو کے ۲۴ افسانوں کا جسے مکتبہ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ منٹو پنجاب کے مشہور افسانہ نویس و ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے مختلف رسایل میں شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہجو و تضحیک بھی ایک نوع کا اعتدال نہ ہونا ہے تو "دین دنیا" نے اسوقت تک منٹو کے افسانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کافی ثبوت ان افسانوں کی خوبی کا ہے۔

منٹو ترقی پسند حلقہ کے ممبر ہیں اور باوجود اس کے کہ اب تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ جماعت لٹریچر میں کیا انقلاب و ترقی چاہتی ہے، ہم کو افسانوں کی تراش و خراش میں یقیناً بہت سی اچھوتی باتیں نظر آتی ہیں اور نفسیاتی تجزیہ اور پلاٹ کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی ہم ان افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لٹریچر کا یہ دور یقیناً پہلے دور سے بالکل جدا ہے جس میں تخئیل کم لیکن فکر و تحلیل زیادہ ہے۔ ان افسانوں میں نیا قانون، ہتک، شغل اور شرابی خصوصیت کے ساتھ نہایت خوب ہیں۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ: مکتبہ اُردو لاہور۔

نئے زاویے مجموعہ ہے مختلف حضرات کے مضامین نثر و نظم کا، جو سب کے سب ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام افسانوں اور منظومات سے ہمیں ان رجحانات کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے ہمارے زمانہ کی کتابِ فکر و احساس کا بالکل نیا ورق اُلٹ دیا ہے۔ اس سے قبل ہمارے لٹریچر میں واقعیت بھی شاعری اور ادب کا رنگ لئے ہوئے تھی، لیکن اب شاعری اور ادب لطیف میں بھی زیادہ تر وہی واقعیت اور تلخ حقیقت سے بحث کی جاتی ہے اور نئے زاویے میں جتنے افسانے اور منظومات شایع کئے گئے وہ سب اسی نئی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

نظم نگاروں میں جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجاز، احسان دانش اور افسانوں میں منٹو، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور احمد علی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس مجموعہ میں غالباً "آخری لفظ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجلد نسخہ کی قیمت تین روپیہ، غیر مجلد کی دو روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ اُردو لاہور۔

ماورا جناب ن۔ م۔ راشد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر قافیہ و ردیف کی پابندی سے مبرا اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل نئے زمانہ کی چیزیں ہیں جن کے سمجھنے کے لئے خاص سمجھ پیدا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے لٹریچر میں بھی زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے لیکن چونکہ ابھی تک ہم ذہنی یا برزخی دور سے نہیں گزر چکے ہیں، بنا براں ہر چیز ([illegible]) حالت میں ہے اور اسی لئے راشد صاحب اور اسی نوع کے انقلابی شاعروں کے کلام میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا سر الفاظ خوبصورت، خیالات کا میلان بلند لیکن طرز ادا الجھی ہوئی اور جا بجا جدت پسندی ثقیل و ناگوار!

راشد صاحب کی شاعری انگلستان کے ایک نوجوان شاعر ولیم امپسن (William Empson) سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس کا قول بھی یہی ہے کہ نظمیں پیچیدہ اور مبہم سی ہونی چاہئیں کیونکہ اس طرح ہم کو ان کے سمجھنے کے لئے ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ میں جو اسوقت (Futurism) آرٹ کا ہنگامہ برپا ہے اسی سے دہاں کی بھی شاعری متاثر ہو رہی ہے اور اسی کی صدائے بازگشت ہندوستان میں بھی کہیں کہیں سننے میں آجاتی ہے۔ بہرحال راشد صاحب کی شاعری یقیناً بالکل نئی چیز ہے لیکن شاید اس کا تعمیری دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ کے بعد اس میں پختگی پیدا ہو کر وہ "پہیلیوں" سے گزر کر اسی "حکایت حال" میں تبدیل ہو جائے جو عام انسانوں کی سمجھ سے باہر نہ ہو۔

یہ مجموعہ بھی مکتبۂ اردو لاہور سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

روٹھی رانی منشی پریم چند مرحوم کا ایک طویل فسانہ ہے جو سرزمین مارواڑ کے راجستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت جو کچھ ہو لیکن افسانوی حیثیت سے اس کی خوبی مسلم ہے۔ منشی پریم چند زیادہ تر دیہات کے معاشرتی افسانے لکھا کرتے تھے، لیکن اس میں وہ راجاؤں کی نواس تک پہونچ گئے ہیں اور آخر میں رانیوں کے ستی ہونے کے دلدوز واقعہ پر اس افسانہ کو ختم کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس داستان کی ساری خوبی یہ ہے کہ باوجود صد درجہ رومانیت کے انداز بیان کا تاریخی رنگ بھی اس میں کافی پایا جاتا ہے، اور کیرکٹروں کی کثرت کے باوجود پلاٹ زیادہ الجھنے نہیں دیا۔ قیمت بارہ آنے ہے اور ملنے کا پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔

کربلا منشی پریم چند مرحوم کا ڈرامہ ہے جس میں انھوں نے کربلا کے مشہور واقعہ کو پیش کرتے ہوئے یزید اور حسین کے کیرکٹر کو ابھارا ہے۔ اس ڈرامہ کی بنیاد جن واقعات و حالات پر قایم ہے وہ زیادہ تر "ذکر الشہادتین" وغیرہ معمولی قسم کی کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں، اس لئے مبالغہ سے خالی نہیں، لیکن ایک فسانہ یا ڈرامہ کی تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ اگر اس قسم کا لٹریچر پہلے سے موجود نہ ہوتا، تو ڈرامہ نگار کو خود اپنی طرف سے "زیب داستان" کے لئے اس نوع کے زواید اضافہ کرنا پڑتے۔

میری رائے میں اس قسم کے واقعات جنھوں نے ایک جماعت کے بالکل دو ٹکڑے کر دئے ہیں، ڈرامہ یا افسانہ کی صورت میں کبھی نہ آنا چاہئے، کیونکہ ان سے اور زیادہ الجھنوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن پریم چند صاحب چونکہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے وہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ انھوں نے یہ کوئی اچھا اقدام نہیں کیا ہے۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فدک اور قتل کے قصوں کو فراموش کر کے مل بیٹھنے کی صورتیں پیدا کی جائیں نہ کہ ان میں رنگ آمیزی کر کے جذبات کو اور مشتعل کیا جائے۔ ڈرامہ کے لحاظ سے بھی یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ تمثیل کے لئے جن چست و مختصر فقروں کی ضرورت ہے اُن سے یہ کتاب محروم ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔

ایک معلم کی زندگی عبدالغفار صاحب مدہولی، جامعۂ ملیہ دہلی کے مدرسۂ ابتدائی کے مدرس ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں انھیں کی لکھی ہوئی ہے جس میں انھوں نے اپنی اکیس سال کی جامعی زندگی کو شروع سے اسوقت تک قلمبند کیا ہے۔ عبدالغفار صاحب نے شروع سے جامعۂ ملیہ ہی میں تعلیم پائی اور یہیں ایک عرصہ سے مدرس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی متوازی ان دونوں زندگیوں کا حال اس قدر دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے میں ایک افسانہ کا سا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس کتاب کا افادی پہلو، سو میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں "فن تعلیم" پر شاید ہی کوئی ایسی مفید کتاب اتنے دلچسپ طریقہ سے لکھی گئی ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جامعۂ ملیہ کا نظام تعلیم کتنا پاکیزہ و بلند ہے اور وہاں بچوں کی سیرت کتنی استوار بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے۔ عبدالغفار صاحب شروع ہی سے جامعۂ ملیہ کا عشق لیکر حیدرآباد سے آئے تھے اور اب بھی ایک مخلص عاشق کی طرح وہاں کام کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب نہ صرف بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ ان کے والدین و اساتذہ کے مطالعہ سے بھی گزرے، تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ صحیح تعلیم و تربیت کا حقیقی راستہ کیا ہے۔ قیمت ہر جلد کی ڈھائی روپیہ ہے، جو اس کی طباعت، کتابت، کاغذ اور جلد کی خوشنمائی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

نغمۂ زندگی مجموعہ ہے جناب سید فضل احمد کریم فضلی بی۔ لٹ (آکسن) آئی۔ سی۔ اس (بنگال) کی غزلوں اور نظموں کا جو کلکتہ کی مشہور فلم ساز کمپنی "فضلی برادران لمیٹڈ" کے روح رواں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کا رجحان غزل میں "سہمہ سنجی" کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ فضلی صاحب زمانۂ حال

...باقی کی پوری ہے۔ " وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ! " کہا جاتا ہے کہ پچھلے زمانہ کی شاعری میں ایہام کا عیب بہت تھا لیکن اب اس سے زیادہ ابہام کا عیب پایا ...ی صاحب کا یہ مجموعہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔
ان کے کلام میں اک سہل گفتگو کی سی سادگی و روانی پائی جاتی ہے اور ہم اسے بجا طور پر سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ رنگِ گلستاں، یہ عمر گریزاں	کہوں کیا الٰہی کہ کیا چاہتا ہوں
کبھی کچھ سوچ کر رونا کبھی کچھ سوچ کر ہنسنا	خدا ہی جانے کیا دل میں مرے پنہاں غم کے پنہاں تھا
خفا وہ کیا ہوئے، عالم خفا ہے	جسے دیکھو وہی کچھ کہہ رہا ہے

...ن مجموعہ میں جو نظمیں ہیں، ان کی زبان کی شستگی و رنگینی کا بھی یہی حال ہے۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس آرٹ پیپر پر سہ رنگی ٹائپ میں چھاپا گیا ہے اور جلد و طباعت کی پاکیزگی کو دیکھ کر ...یوان غالب کا برلن والا نسخہ سامنے آجاتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ :۔ دفتر انجمن ترقی اردو، دہلی۔

داستان تاریخ اردو مولوی حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کی تالیف ہے، جسے لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ نے شایع کیا ہے۔ اس موضوع پر اسوقت متعدد کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولوی حامد حسن صاحب کی یہ تالیف اپنی جامعیت و حسن ترتیب کے لحاظ سے خاص امتیاز کی مالک ہے۔ ابتدا میں اردو زبان کی اصلیت اور اس کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے، اب سے دو سو سال قبل تک کی اردو شاعری کا ذکر کر کے اس حصہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد نثر نگاری کے چھ دور قایم کرکے مشاہیر نثر نگار حضرات کے حالات اور ان کی تصانیف کے اقتباسات درج کرکے ان پر تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ باوجود اختصار کے اتنی تحقیق و کاوش کا حامل ہے کہ مجھے تو یہ کتاب تاریخ نثر اردو کی اچھی خاصی سائکلوپیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ دور حاضر کو البتہ انھوں نے نہیں لیا، نہایت سرسری اس سے گذر گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب کافی ضخیم ہو گئی تھی لیکن اگر دور حاضر کو شامل کرکے یہ کتاب بجائے ۵۰۰ صفحات کے ... صفحات کی ہو جاتی تو زیادہ حرج نہ تھا، بہر حال کتاب بہت مفید ہے اور اردو کے ہر ادیب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا محمد علی کے یوروپ کے سفر پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ دہلی نے تمام ان مقالات و مکتوبات کو جو مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی مغربی سیاحتوں کے متعلق لکھے تھے یکجا کر دیا ہے۔ سنہ ۱۸۹۸ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۰ء تک جتنی بار انھوں نے ولایت کا سفر کیا ہے، ان سب کا ذکر اس مجموعہ میں پایا جاتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم جن خصوصیات کے انسان تھے اُن کو سمجھنے کے لئے ان مقالات و مکاتیب کا مطالعہ ضروری ہے اور پروفیسر محمد سرور صاحب ان کی شیرازہ بندی کرکے یقیناً بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ اس کی قیمت ہے اور ملنے کا پتہ کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔

آج کا مصر پروفیسر محمد حسن (اعظم گڈھی)، جو جامعہ ازہر قاہرہ میں عربی تعلیم حاصل کرنے گئے تھے، اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں اردو کے پروفیسر ہیں۔ رخصت لیکر ہندوستان آئے تھے۔ وہیں اُن کے ایک دوست عبدالسلام صاحب خورشید نے اُن سے مصر کے متعلق تازہ حالات حاصل کئے اور ایک جگہ قلمبند کر لیا۔ یہ کتاب انھیں معلومات کی شیرازہ بندی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصر سیاسی و اقتصادی حالات کے متعلق اس سے زیادہ معتبر و صحیح ذریعہ ہماری معلومات کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے جو حضرات مصر کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔
یہ کتاب اردو اکاڈیمی لاہور نے شایع کی ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ شایع کی ہے۔

حرف ناتمام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ برق مرحوم، دہلی کے نہایت خوشگوار شعراء میں تھے اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ اس مجموعہ میں ۳۰ نظمیں اور تقریباً ۵۰ صفحات انتخاب غزلیات کے ہیں۔ لیکن کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق غزلگوئی زیادہ پاکیزہ تھا۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے اور فارسی ترکیبوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں :

بہار خندۂ گل دیدنی ہے باغ عالم میں	تماشا ہو گیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا
ہمہ تن گوش ہوں سننے کو نوا ہائے دروں	کونسا نغمہ ہے جو تار رگ جاں میں تپاں
رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں	یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

اس دیوان کی قیمت ہے اور ملنے کا پتہ جناب طالب بی۔ اے۔ چاوڑی بازار۔ گلی تباشاں۔ دہلی۔

مقام محمود — مولانا عبدالمالک آروی کے تاریخی، ادبی، اور انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے نیّر طاق بستاں آرہ نے شایع کیا ہے، اس مجموعہ میں تیرہ مقالے ہیں جنمیں سے پانچ نگار میں شایع ہوئے تھے اور باقی آٹھ دوسرے رسایل و جراید میں۔ مولانا عبدالمالک کا فضل و کمال نگار کے حلقہ میں اس قدر متعارف ہو چکا ہے کہ اُن کے مقالات کے متعلق کوئی رائے زنی تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ ضرورت تھی کہ ان منتشر اوراق علم و ادب کو ایک شیرازہ سے منسلک کر دیا جاتا اور اس لئے ادارۂ طاق بستاں کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اس مفید کتاب کی اشاعت سے ہماری زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ طاق بستاں آرہ

قابیل — انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی تمثیل کا ترجمہ ہے جناب مجنوں گورکھپوری کے قلم سے، جس کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ — "ذکر اس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا" — یاد آجاتا ہے۔ اس تمثیل میں موت کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شیطان کے کردار کے ذریعہ سے ایک بلند انتقادی چیز پیش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری ادبیات میں اس نوع کے لٹریچر کا اضافہ، بڑا مفید اضافہ ہے۔ قیمت ۱۲ ہے اور ملنے کا پتہ :- ایوان اشاعت، گورکھپور۔

نگار نامہ — درج مکاتیب کا دوسرا حصہ ہے، جسے جناب ساغر نظامی نے ایشیا کے خاص نمبر کی جگہ شایع کیا ہے، اس سے پہلے ایک مجموعہ اور شایع ہو چکا ہے۔ اس میں اور بہت سے حضرات کے خطوط ہیں، جو پہلے مجموعہ میں شایع ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ گلدستہ: ادارۂ ادبی مرکز میرٹھ سے مل سکتا ہے۔

ناکام — جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی، دہلی کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو بجا طور پر دہلی کی زبان جاننے والے کہے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب انھیں کے فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ نہ کوئی فسانہ ہے، نہ اصطلاحی حیثیت سے کوئی انتقادی تصنیف۔ لیکن اس کی ادبیت اور گہری ادبیت میں فسانہ وانتقاد دونوں شامل ہیں قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ، مصنف کا نام اور شیا محل دہلی۔

سلیس اُردو — انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے نثر و نظم کا یہ مجموعہ "سلیس اُردو" کے نام سے شایع کر کے بتایا ہے کہ اب ہمیں اس قسم کی زبان کی ضرورت ہے۔ مضامین مفید و پُراز معلومات بھی ہیں۔ یہ مجموعہ بالغ بتدیوں کو اُردو سکھانے کے لئے شایع کیا گیا ہے اور یقیناً بہت کارآمد ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے۔

افراط گریہ — شیعہ ریڈیکل سوسائٹی لکھیم پور کھیری، اثنا عشری مذہب کے بعض رسوم و قیود کے متعلق عرصہ سے خاموش اصلاحی خدمت انجام دے رہی ہے یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں بزم عزا کے صحیح مقاصد کو پیش کر کے گریہ و زاری کی کثرت پر منصفانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرات شیعہ عام طور پر اس کو کس نظر سے دیکھیں گے، لیکن اہلِ فکر ضرور اس کی قدر کریں گے۔

صحت و صفائی — احمد حسین صاحب حسّان نے بچوں کے لئے صحت و صفائی کے متعلق فسانوی انداز میں بعض اسباق تحریر کئے ہیں جن کا مطالعہ بچوں اور بوڑھوں سب کے لئے مفید ہے۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ - دہلی۔

انتظام کتب خانہ — کتب خانہ کی تنظیم ایک خاص فن ہے جس کے حاصل کئے بغیر آجکل کسی جدید کتب خانہ کو جدید طریقہ سے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب میں اسی فن پر بحث کی گئی ہے اور ایسے دو شخصوں نے کی ہے جو اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کتاب خانہ رکھنے کے شائق ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

خرمن عشق — جناب شفیق جونپوری کا دیوان ہے، جس میں غزلیں، قصیدے، نظمیں اور بہت سے تاریخی قطعات بھی شامل ہیں۔ جناب شفیق، مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں اور اس وقت کے خوشگو شعراء میں سے ہیں۔

شروع میں بہت سے لوگوں کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ جن میں اقبال سہیل خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- جناب شفیق - جونپور۔

اسلام اور اس کا مستقبل — مسٹر لیو پولڈ ویس، ایک انگریز نو مسلم نے، ممالک اسلامی کی سیاحت کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ کتاب اسی کے بعض ضروری اجزاء کا ترجمہ ہے جسے مجتبیٰ حسن صاحب نے پیش کیا ہے۔ خیالات جتنے پاکیزہ ہیں، ترجمہ بھی اتنا ہی پاکیزہ ہے۔ کتاب بہت مفید و دلچسپ ہے۔ نظامی پریس لکھنؤ سے خط و کتابت کی جائے۔

جنوری سنہ ۴۱ء اور جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار

دونوں ایک ساتھ مجلد کرائیے اور اگر ان میں سے کوئی پرچہ موجود نہ ہو تو ہم سے طلب کر لیجئے ورنہ چند دن بعد نہ ملے گا۔ — مینجر نگار

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی　　یاقوت اتنا سُرخ نہ چوکھا غضب غضب
وہ چلبلی ادائیں، اداؤں کے ساتھ ساتھ　　نتھنوں کا بار بار پھڑکنا غضب غضب
اپنی ہنسی پہ غصہ، کبھی غصے پر ہنسی　　سُونا لٹا دیا کبھی روپا غضب غضب
اُف اُف وہ پور پور میں مہندی رچی ہوئی　　ٹیسو کا پھول دیکھا تو ہوگا؟ غضب غضب!
اس واسطے "چنگیر" ہتیلی کی دیکھ لوں　　انگڑائی توڑنے کا بہانا، غضب غضب

بھڑکا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
کھنچتا تھا عطر یا تھا پسینا غضب غضب

اک تشنہ کام شوق کی حسرت بھری نظر　　دل بیقرارِ عرضِ تمنا، غضب غضب
بہکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب　　اُس پر دبا کے ہونٹ وہ کہنا "غضب غضب"
وہ التفات بخششِ بے حد کہیں جسے　　پرسش کے بعد رنجشِ بیجا غضب غضب

گفتار کوشئ لبِ میگوں کے ساتھ ساتھ
شرمندگی ہے حیا کا تقاضا غضب غضب

بیتابیوں نے ہوش سے بیگانہ کر دیا　　برہم ہوئی وہ بزم تماشا غضب غضب
اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جانِ آرزو　　محرومیاں ہیں اور دلِ شیدا غضب غضب

جوشِ جنوں میں وہ بھی آخر چاک ہو گیا
ہلکا سا رہ گیا تھا جو پردا غضب غضب!

(خان بہادر) جعفر علی خاں اثر بی۔ اے

راستے

ارضِ ناقوس و اذاں جولانگہِ اہلِ کتاب
اک شبِ بے ماہ و اختر اک سحر بے آفتاب

وہ زمیں، بستے ہیں جس پر زہد کے پالے گناہ
معبدوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے والے گناہ

برہمن زادوں کی گلیاں راہبوں کے رہگذر
چپے چپے کوچہ کوچہ آدمیت کے مزار

زہد کی فتنہ گری زنّار داروں کے فریب
ایسی کالی رات اور یہ چاند تاروں کے فریب

خونِ آدم کا تلاطم رہگذر در رہگذر
آدمیت کا جنازہ کفر و دیں کے دوش پر

رہگذاروں پر رواں تہذیب کے پروردگار
دونوں جانب کوڑھیوں کی چیخ اندھوں کی پکار

بُت گروں کے راستے پیغمبروں کے راستے
تاجروں کے راستے ہیں ساحروں کے راستے

سیکڑوں تسبیح خواں ہیں سیکڑوں زنّار دار
اُٹھ رہا ہے ہم نفس وہ دیکھ رستوں سے غبار

آہ وہ رستے رواں ہوں جن پہ ڈاکو سیکڑوں
گام زن ہوں جن پہ چنگیز و ہلاکو سیکڑوں

روندتے ہوں جن کو منعم جن پہ چلتے ہوں امیر
ٹھوکریں کھا کھا کے سوتے ہوں جہاں اندھے فقیر

سیکڑوں مفلوج جن رستوں پہ موقف خواب ہوں
گود میں جن ساحلوں کی سیکڑوں سیلاب ہوں

کتنے عارف، کتنے صوفی، کتنے کعبہ کے امام
گام زن ہیں کتنے قیدی، گرم رو کتنے غلام

خاک برسر کیسے کیسے بے نوا خانہ بدوش
کتنی آہیں، کتنی چیخیں، کتنے غم، کتنے خروش

کتنی میلی چادریں ہیں کتنے برقعوں میں ہے خاک
کتنے دامن ہیں دریدہ کتنے پیراہن ہیں چاک

سوختہ کتنے جگر ہیں کتنے سینے دلفگار
کتنی آہیں بے اثر ہیں، کتنی آنکھیں اشکبار

کس قدر جلوے غُبارِ راہ میں گم ہیں یہاں
خون میں ڈوبے ہوئے کتنے تبسم ہیں یہاں،

کیسے کیسے بے سروساماں بڑھاپے صرفِ خواب
کتنے افسردہ لڑکپن، کتنے پژمردہ شباب

کتنے دل شعلہ بداماں کتنے سینوں میں ہے آگ
آہ ان رستوں پہ ہیں اُجڑے ہوئے کتنے سہاگ

راستوں میں تپ رہے ہیں کتنے مردوں کے بدن
کتنی لاشیں ہیں انہی رستوں پہ بے گور و کفن

جانبِ دیر و کلیسا جانے والے رہگذار
اُف یہ سانپوں کی طرح لہرانے والے رہگذار

خانقاہوں کے مقدس خواب دکھلاتے رہے
مرمریں آذر کدوں کے زمزمے گاتے رہے

دور سے آغوش پھیلاتے ہیں کتنے راستے
بن بلائے سامنے آتے ہیں کتنے راستے

ہم نوا میرا کوئی ہم سفر میرے لئے
کتنی وحشت ناک ہے ہر رہگذر میرے لئے!

پروفیسر شوؔر (علیگ)

غزل : فراقؔ گورکھپوری

بہار کیا ہے؟ اسے گر کوئی کبھی دیکھے — تو اس گلِ چمن آرا کی تازگی دیکھے
یہ شانِ جلوہ گری خوب ہے کہ دیکھی آنکھ — قریب ہی سے تجھے دیکھے نہ دور ہی دیکھے
وہ آنکھ آئینہ اس دورِ انتشار کا ہو — جو اس کے گیسوئے پُرخم کی برہمی دیکھے
نہ دل کو اپنے پہ قابو نہ تجھ پہ بس کوئی — وہ اپنا گریۂ غم یا تری خوشی دیکھے
بھلا کے عہدِ وفا جب وہ پاس آ بیٹھے — بس ایسے میں کوئی اس کی سپردگی دیکھے
وہ جسم سر بسر اک خوابِ شادمانی ہے — کہ جیسے کوئی نہ آئی ہوئی ہنسی دیکھے
یہ وصل کا تھا کرشمہ کہ حُسن جاگ اُٹھا — ترے بدن کی کوئی اب خود آگہی دیکھے

کسی کے روٹھ کے منہ پھیرنے کی تھی یہ ادا
کوئی فراق کی جانب اگر کبھی دیکھے!

غزل : تمکیںؔ سرمست

نیرنگِ دردِ دل کی کوئی انتہا نہیں — اُس کا پتہ ملا تو ہمارا پتا نہیں
ہم یاد کر رہے ہیں انھیں کس امید پر — اب تو غمِ فراق کا بھی آسرا نہیں
حالانکہ تم نے کب کا بھلا بھی دیا، مگر — تم مجھ کو بھول جاؤ گے دل مانتا نہیں
یہ یاد ہے کہ مجھ کو کسی کی تلاش تھی — اب یہ خبر نہیں کہ ملا بھی وہ یا نہیں
اِک لمحۂ فریبِ اجل کے سوا مجھے — کس وقت انتظار تمھارا رہا نہیں
نزدیک ہو کے دور ہوا کس سے جائے گا — اور اس قدر قریب سے کچھ سوجھتا نہیں
دُنیا و دیں لٹا کے اُسے دیکھ تو لیا — یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں
منزل وہی ہے اپنی جہاں تھک کے بیٹھ جائیں — حدِ نگاہِ شوق کوئی راستہ نہیں
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں لیکن ترے بغیر — کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں
وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے — ورنہ جنونِ عشق کا کچھ مدعا نہیں

تمکیںؔ جفائے یار کو معلوم ہو تو ہو
اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کھلا نہیں

رجسٹرڈ نمبر ۳۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱ | فہرست مضامین مئی سنہ ۴۲ء | شمارہ ۵

ضروری اعلان

میں پہلی مئی کو نینی تال پہونچ جاؤں گا اور ۲۶ مئی تک وہیں رہوں گا۔ چونکہ دفتر کا ایک حصہ میرے ساتھ ہوگا اس لئے اگر اس زمانہ میں براہ راست نینی تال کے پتہ سے خط و کتابت کی گئی تو تعمیل نسبتاً جلد ہو سکے گی۔ جو ڈاک لکھنؤ کے پتہ سے آئے گی وہ بھی ریڈائرکٹ ہو کر میرے پاس ویر پہونچے گی لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تعمیل میں اور زیادہ دیر ہوگی۔

(۲) جون کا پرچہ غالباً ۱۵ یا ۲۰ جون تک شایع ہوگا، اس لئے ۲۵ جون سے پہلے پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت نہ کی جائے۔ جولائی کا نگار اپنے وقت سے نکلے گا۔ نینی تال کا پتہ: "ہمالیہ ہوٹل" ہوگا

نیاز فتحپوری

ملاحظات

آلاتِ جنگ

گردش اور مد وجزر، کائنات کے نظام اور مظاہر قدرت کا اصل اصول ہے، کسی ایک نقطہ پر کسی چیز کو سکون نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ لڑائی ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے، لیکن کچھ عرصہ تک ایک ہی قسم کی خبریں سننے کے بعد ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ لڑائی ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

سنگاپور کے فوراً بعد ہی رنگون پر جاپانی قبضہ نے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا تھا کہ جاپانی فوجوں کی رفتار غالباً یہیں رک جائے گی اور برما کی لڑائی چند دن میں ختم ہو جائے گی، اسی طرح روس کے محاذ پر بھی یہی یقین تھا کہ موسم بہار شروع ہوتے ہی نازی فوجیں اپنی پیشقدمی دوبارہ زور سے شروع کر دیں گی، لیکن نہ اب تک لڑائی ختم ہوئی، نہ ہٹلر نے روس کی طرف کوئی خاص جارحانہ قدم اُٹھایا — مگر اس سے کوئی مختتم نتیجہ نکالنا غلطی ہوگی

اس میں شک نہیں کہ محوری طاقتوں کے مقابلہ میں جمہوری قوتوں کا پلہ اپنی طیاریوں کے لحاظ سے بھاری ہوتا جا رہا ہے، لیکن اگر جرمنی اور جاپان دونوں جارحانہ پہلو، مدافعت میں تبدیل ہو جائے، تو بھی اس وقت تک وہ اتنا حاصل کر چکے ہیں کہ اس کے واپس لینے کے لئے وقت، روپیہ اور جان کا زبردست خراج دینا پڑے گا۔ کیونکہ جنگ کا ہر وقفہ، اس کی طوالت اور گتھیوں میں اضافہ کرتا جا رہا ہے، اور مشکل ہے کہ وقت یا نتیجہ کی تعیین کی جا سکتی ہے

اس وقت بظاہر لڑائی کے صرف تین محاذ نظر آتے ہیں ایک بحر پاسفک، دوسرا روس اور تیسرا لیبیا، لیکن سچ پوچھئے تو ساری دنیا اس سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اگر کسی قطعۂ زمین کو یہ آگ خاک سیاہ کر چکی ہے، تو دوسری جگہ اس کی لپٹیں پہنچ رہی ہیں، اگر کہیں اس کا صرف دھواں نظر آتا ہے، تو دوسری جگہ اس کی گرمی محسوس کی جا رہی ہے، الغرض اسوقت کوئی ملک ایسا نہیں، جو اس خطرہ سے دور ہو

ساحل مدراس پر وزیگاپٹم اور کوکوناڈا میں جاپانی ہوا بازوں نے جو بم گرائے ہیں، ان سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ جاپان کا آیندہ اقدام ہندوستان ہی کی طرف ہونے والا ہے، اور جس خطرہ کا اندیشہ تھا وہ ہمارے سامنے ہے

سنگاپور، جنوبی برما اور جزایر جاوا و سماترا پر جاپانی قبضہ نے دشمن کے لئے خلیج بنگال کا راستہ بڑی حد تک صاف کر دیا ہے، چنانچہ اس نے جزائر انڈمان و نکوبار میں بھی اپنی فوجیں آتار دی ہیں اور اس سلسلہ کی صرف ایک کڑی سیلون ایسی رہ گئی ہے کہ اگر وہ بھی دشمن کے ہاتھ آجائے تو پھر خلیج بنگال میں اس کی نقل و حرکت بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اس نے سیلون پر دو بار ہوائی حملے کئے۔ ہر چند وہاں اسے ہر مرتبہ کافی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ خطرہ ختم ہو چکا ہے

اس میں کلام نہیں کہ جاپان کی اسکیم خلیج فارس اور مشرق وسطی کے سواحل تک اپنا اثر قایم کرنا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسے نہ صرف سیلون بلکہ ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات پر بھی گھیرا ڈالنا ضروری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آغاز کب ہو

شمالی برما کی طرف جاپانی اقدام کی وہ رفتار بیشک نہیں ہے جو اس سے قبل ملایا یا جنوبی برما میں پائی جاتی، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے اور پٹرولی چشموں کے مرکز سخت خطرہ میں ہیں

اب اسی کے ساتھ آپ جرمنی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ روس میں اسے وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی اور نازی نقصان کی فہرست اب اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ ہٹلر کوئی دوسرا جارحانہ قدم اُٹھاتے ہوئے جھجکتا ہے، لیکن صورتیں کچھ ایسی ہیں کہ اسے بغیر اس کے چارہ بھی نہیں ہے۔ اسلئے

اسٹالینن گراڈ کی طرف نہ بڑھا تو جنوبی روس کی طرف بڑھنا اس کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ لڑائی جاری رکھنے کے لئے اس وقت سب سے بڑا سوال پٹرول کا
اور عراق و باکو کے پٹرول چشموں تک پہنچنے کے لئے وہ اپنی ساری کوششیں صرف کر دے گا، اس سلسلہ میں قدرتاً ترکی کا سوال بھی سامنے آجاتا ہے،
اناطولیا کی طرف سے تازہ فوجوں کا راستہ ترکی ہو کر ہے اور اقرار و انکار دونوں صورتوں میں اس کو میدان جنگ بننا ضروری ہے
کہا جاتا ہے کہ جس وقت جرمنی کا یہ نیا حملہ شروع ہوگا تو جاپان بھی سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا، تاکہ روس کی قوت منتشر ہو جائے اور چونکہ فرانسیسی حکومت
موسیو لاوال کے ہاتھوں میں ہے جو نازیوں کا طرفدار ہے، اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ ہٹلر فرانس کی بحری قوت اور اس کے دوسرے ذرائع سے فائدہ اُٹھا کر
مالٹا و لیبیا، اسکندریہ اور نہر سویز تک پہنچنے کی کوشش کرے گا
یہ ہے اُن خطرات کی فہرست جو برطانیہ اور اس کی ساتھی حکومتوں کے سامنے ہیں۔ اب آیئے علیحدہ علیحدہ ان میں سے ہر ایک پر غور کریں کہ ان کی اہمیت کیا
ہے اور ان کے خلاف کیا کیا امکانات پائے جاتے ہیں

ہندوستان اور برما

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ہندوستان پر حملہ کرنا یقیناً جاپان کی اسکیم میں شامل ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میں آسانی
سے کامیاب ہو سکے گا۔ حملۂ ہندوستان کی ایک غرض تو یہ ہو سکتی ہے کہ سارے ملک پر قبضہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ ساحلی علاقہ
پر یا ساحل سے قریب تر دوسرے مقامات پر قبضہ کر کے نہ صرف خلیج بنگال بلکہ سارے بحر ہند میں رنگون سے لیکر مڈگاسکر اور نہر سویز تک راستہ صاف کر لیا جائے۔
اول صورت کی کامیابی کے امکانات بہت ضعیف ہیں۔ کیونکہ ہندوستان ایسے طویل و عریض ملک پر تسلط قائم کرنے کے لئے اتنی طویل مہم کی ضرورت ہے کہ شاید
جاپان کی عمر اس کے لئے وفا نہ کرے۔ اگر اس نے صرف خشکی کی طرف سے بڑھنے کا ارادہ کیا تو پہلے اسے برما فتح کرنا ہوگا اور شمالی برما میں جنگ کی موجودہ رفتار جاپان
کے حق میں اتنی سست ہے کہ قلب ہندوستان تک پہنچنے کے لئے اسے طویل زمانہ درکار ہوگا، اور اگر ہم ان مدافعانہ تدابیر کو بھی سامنے رکھیں جو روز بروز
برطانیہ کی طرف سے زیادہ استحکام کے ساتھ اختیار کی جا رہی ہیں اور امریکہ کے اس وعدۂ امداد پر بھروسہ رکھیں جس کا مسٹر روزویلٹ نے حال ہی میں اعلان
کیا ہے، تو پھر یہ بات مشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جاپان ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکتا ہے
جاپان کو شاید یہ خیال بھی ہے کہ جس طرح برما کی آبادی نے اس کا ساتھ دیا ہے، ہندوستان کی آبادی بھی اس کی شریک ہو جائے گی، لیکن یہ خیال درست
نہیں، کیونکہ برما کی آبادی نسلی و تمدنی مشارکت کی وجہ سے جاپان کی طرف مائل ہو سکتی تھی، مگر ہندوستان جو بہ لحاظ تہذیب و معاشرت، اخلاق و مذہب جاپان سے
بالکل مختلف ہے، کبھی یہ جذبہ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا، علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ ملک آزادی سے کم کسی اور مفاہمت پر راضی ہو ہی نہیں سکتا
اور جاپان کی بدنام امپیریلزم سے وہ یوں بھی پوری طرح آگاہ ہے
اگر جاپان نے ہندوستان کا خیال ترک کر کے صرف ساحلی مقامات پر قناعت کرنا چاہی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اسے زیادہ تر بحری و ہوائی قوت سے کام
لینا پڑے گا، لیکن چونکہ اسے بحر پاسفک میں بھی اپنی موجودہ پوزیشن کو قائم رکھنا ہے اور ایک مہینہ کے بعد بارش کا موسم جہازوں کی نقل و حرکت کو دشوار بنا دے گا، اس
لئے جاپان غالباً اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف وہ اپنے مقبوضات پاسفک سمندر کو بھی ہاتھ سے نہ نکلنے دے اور دوسری طرف وہ کلکتہ، مدراس
سیلون سے لیکر افریقہ اور مشرق وسطی کے ساحلوں تک اپنا اقتدار قائم کرے۔ امریکہ جس تیزی کے ساتھ اپنی بحری اور ہوائی طاقت بڑھا رہا ہے، وہ جاپان
کے لئے ایک علیحدہ مستقل خطرہ ہے جو اسے کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اپنے ملک کی طرف سے مطمئن ہو کر دور دراز سمندروں میں قسمت آزمائی کرتا پھرے

جاپان اور روس

بعض کا خیال ہے کہ جاپان سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا۔ اول تو یوں بھی اس کا امکان بہت ضعیف ہے، کیونکہ جاپان
مشکل ہی سے اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈال سکتا ہے کہ ایک طرف وہ بحر ہند و بحر پاسفک میں بھی اپنی مہم جاری رکھے اور دوسری
طرف روس پر بھی حملہ کر دے۔ اس کا موجودہ بحری محاذ کیا کم ہے کہ وہ روس ایسی زبردست قوت کی دشمنی مول لیکر خشکی کا دوسرا طویل محاذ قائم کرے۔
لیکن اگر اس نے ایسا کیا بھی تو کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے
سوویٹ حکومت ۱۹۳۳ء سے مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر جنگ کرنے کی طیاریاں کر رہی ہے اور سائبیریا کی طرف اس کی خاص توجہ جوں کی توں
تیسری پنج سالہ اسکیم کی رو سے سائبیریا کا ریگ زار، ایک نہایت اچھے زرخیز خطہ میں تبدیل ہو گیا ہے، اور وہاں کی زندگی و صنعتی پیداوار اتنی کافی ہو گئی

یٹ حکومت اپنے مغربی محاذ کو نقصان پہونچائے بغیر مشرق میں جاپان کو برسوں اُلجھائے رکھ سکتی ہے

یہ درست ہے کہ اوکرائن اور سفید روس کا علاقہ نکل جانے کی وجہ سے مغربی حصہ ملک کی پیداوار سے دو بڑی حد تک محروم ہو گیا ہے لیکن سوویٹ حکومت کی جان نہ اوکرائن ہے، نہ سفید روس، نہ ماسکو ہے، نہ لینن گراڈ بلکہ یورال پہاڑوں کا وہ سلسلہ ہے جو شمال سے لیکر جنوب میں سرحد ایران تک چلا گیا ہے۔ ان پہاڑوں میں سوویٹ حکومت کے اتنے ذخیرے جمع ہیں اور آلات حرب بنانے کے اتنے کارخانے پائے جاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اگر اس کا سارا علاقہ چھن جائے، تو بھی وہ برسوں جاپان اور جرمنی دونوں سے جنگ کر سکتا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ جاپان روس پر حملہ کرنے کی حماقت کر سکتا ہے

روس اور جرمنی

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جرمنی کی توقعات روس میں پوری نہیں ہوئیں۔ ہٹلر کو یقین تھا کہ جس وقت نازی فوجیں حدود روس میں داخل ہوں گی، وہاں انقلاب پیدا ہو جائے گا، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ سوویٹ حکومت سے وہاں کی رعایا بالکل مطمئن ہے اور اس لئے دوسرا حملہ اس کا بالکل دوسرے حالات کے تحت ہوگا

پہلے اس کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور پٹرول و دیگر سامان حرب بھی کافی تھا اور روسی رعایا کی طرف سے انقلاب کا خیال بھی اس کا معاون تھا۔ لیکن اب دس ماہ کے بعد جرمنی کی پوزیشن کچھ اور ہے۔ ۲۰ لاکھ سے زیادہ اس کی فوج ختم ہو چکی ہے اور پٹرول کی کمی رومانیا اور پولینڈ کے چشموں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف روسی فوج بھی نازی طریق جنگ سے واقف ہو چکی ہے اور اس کی ہمت بہ نسبت پہلے کے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ پہلے ممکن ہے تذبذب کی حالت پائی جاتی ہو لیکن اب روس کو اپنی کامیابی کا یقین ہے اور اس نے نازی جانوروں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر ملک کی توقعات کو بہت بلند کر دیا ہے اس لئے ہٹلر کا دوسرا حملہ اگر ہوا بھی تو اس کا زور زیادہ تر عراق اور باکو کی طرف ہوگا تاکہ وہ یہاں کا پٹرول حاصل کر کے جنگ کو کسی طرح جاری رکھ سکے۔

ابھی تک یہ حملہ شروع نہیں ہوا اور اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہ فرانس کے مفتوحہ علاقہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا، یعنی اسے انگلستان کی طرف سے بھی حملہ کا اندیشہ تھا اور خود وشی حکومت پر بھی زیادہ اعتماد نہ کر سکتا تھا، لیکن اب کہ وشی حکومت لاوال کے ہاتھوں میں ہے، اسے اس سرحد کی طرف سے اطمینان ہو گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ روس اور لیبیا دونوں طرف حملہ شروع کرے، لیکن اگر یہ خبر صحیح ہے کہ وشی حکومت نے جرمنی کے استمزاج سے جاپان کے فوجی مشن کو ڈاکار آنے کی اجازت نہیں دی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مڈل ایسٹ اور افریقہ کی طرف جرمنی اور جاپان دونوں کا مل کر گھیرا ڈالنے کی اسکیم پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور ہو سکتا ہے کہ اس کا اثر لیبیا کی جنگ پر بھی پڑے

جرمنی اور ترکی

ترکی کے خطرات البتہ زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی غیر جانب داری کو کیونکر قایم رکھ سکتا ہے۔ اگر بلغاریا کی طرح جرمن فوجیں عراق کی طرف بڑھیں تو ترکی سے ہو کر گزرنا ناگزیر ہے اور چاہے وہ اجازت دے یا نہ دے ترکی کی سرزمین ایک سخت خونریز جنگ کا اکھاڑا بن جائے گی

ترکی کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ میلان تو اس کا بڑی حد تک روس اور برطانیہ ہی کی طرف ہے، لیکن عین وقت پر اسکے مصالح کیا ہوں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے جس طرح جرمنی کی دشمنی مول لینا دشوار ہے، بالکل اسی طرح برطانیہ کی مخالفت پر راضی ہونا مشکل ہے تاہم اسے کسی نہ کسی طرف ہونا پڑے گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت ترکی کے لئے بہت سخت ہوگا

خود ترکی میں تو اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ جرمنی کا مقابلہ کر سکے، لیکن برطانوی، امریکی اور روسی امداد سے وہ جرمنی کی راہ میں کافی مشکلات پیدا کر سکتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مڈل ایسٹ میں بھی ہٹلر کو ویسے ہی ناخوشگوار تجربات کا مقابلہ کرنا پڑے جو روس کے محاذ پر اُسے حاصل ہوئے ہیں

امریکہ و برطانیہ

الغرض خطرات جتنے زیادہ ہیں، اتنا ہی اطمینان بھی بڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ امریکہ کی ساری دولت، ساری قوت اور تمام ذرایع روس و برطانیہ کے ساتھ ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اتحادی طیارے بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو جرمنی کے مقابلہ میں برطانوی قوت نصف سے بھی کم تھی لیکن آج وہ برابر ہے اور ہر طلوع ہونے والے نئے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس لئے لڑائی جتنی بڑھتی جا رہی ہے، اتحادی کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر ۴۲ء خیریت سے گزر گیا تو ۴۳ء کا مطلع غالباً گرد آلود نظر نہ آئے گا۔

قتیل کا وطن

مرزا محمد حسن قتیل کہاں کے رہنے والے تھے؟ یہ سوال اکثر اصحاب نے مجھ سے کیا ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ایک اور صاحب کے نزدیک وہ لکھنوی ہیں۔ اصل میں یہ غلط فہمیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ بعض تذکروں میں بلا تحقیق بعض باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ جن حضرات نے مختلف تذکروں کے بیانات کو جانچا تولا نہیں ہے بلکہ محض کسی ایک تذکرے کے دعوئے بے دلیل پر بھروسہ کر لیا ہے وہ اکثر اس مسئلہ میں بہک گئے ہیں۔

سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ مختلف تذکرے قتیل کے متعلق کیا لکھتے ہیں :-

۱۔ "عقد ثریا" از مصحفی

"مرزا محمد حسن قتیل - در اصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند۔ پدرش درگاہی مل نام داشت و خودش در آن زمان دیوالی سنگھ موسوم بود۔ در ایامے کہ متعلقانش بحسب اتفاق بفیض آباد رفتہ استقامت گزیدند بدست مرزا باقر شہید اصفہانی ہیژدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوست۔"

۲۔ "مخزن الغرائب" از احمد علی ہاشمی جلد دوئم و سوئم - قلمی - کتب خانہ ریاست بھیکم پور - حبیب گنج۔

"مرزا محمد حسن المتخلص بہ قتیل سلمہ اللہ تعالیٰ از قوم کھتری است .... و دریں زمان عدیل و نظیر خود ندارد .... سی سال است کہ فقیر با ایشان مربوطیت و اخلاص دارد و بسا اتفاق افتادہ کہ در یکجا بودہ ایم"

۳۔ "خلاصۃ الافکار" از ابو طالب اصفہانی - قلمی - بوڈلین لائبریری آکسفورڈ

"دیگر محمد قتیل دادمردے وارستہ نیک نہاد - اصلش از کھتریان ساکن شاہجہاں آباد .... نہایت تحریر .... با عافیت و صحت بعاشرت شاگرداں و دوستاں در بلدۂ لکھنؤ بسری برد"

۴۔ "نتائج الافکار" از محمد قدرت اللہ گوپاموی - قلمی کتب خانہ حبیب گنج - ریاست بھیکم پور

"نکتہ سنج بے عدیل مرزا محمد حسن قتیل کہ اصلش از لاہور است - در بدایت حال پدرش درگاہی مل از قوم کھتری مع متعلقان بہ فیض آباد رفتہ استقامت گزید - مے صغر ہیژدہ سالگی بدست مرزا محمد باقر شہید بشرف اسلام مشرف شدہ .... نظم شستہ و آبدارش مطبوع فصحائے بلاغت شعار و نیز نکتہ و پرکارش مرغوب منشیان سخنگو بالجملہ از شاہجہاں آباد رخت بکالپی کشید چندے در آں جا بمصاحبت عماد الملک پسر امیر الامرا غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ بن نواب آصف جاہ بکمال خوبی و خرمی گزرانید و پس ازاں در لباس مصاحبت دار الحکومت لکھنؤ نہاد و تا آخر حیات بہاں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد .... آخر الامر اوائل عشرہ رابعہ مائۃ ثالث عشر رخت بدار آخرت کشید"

۵۔ "شمع انجمن" از نواب صدیق حسن خاں صاحب

"مرزا محمد حسین قتیل بن درگاہی مل، قوم کھتری بود اصلش از لاہور است .... سیر دہلی نمودہ بکالپی آمدہ مصاحب عماد الملک گشت - بعدہ در لکھنؤ تا آخر حیات بہاں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد .... وفاتش در ۱۲۳۰ھ اتفاق افتاد"

۶۔ "گلشن مشتاق" از محمد حافظ علی مشتاق ملیح آبادی لکھنوی - قلمی -

"قتیل - مرزا محمد حسن نام - از قوم کھتری است در عنفوان شباب مسلمان گشت - در انشاء و نثر و نظم بے نظیر عصر خویش بود و فکر کلام مرغوب نمود - از شاگردان مرزا محمد باقر گرامی شاہی شہید تخلص است - بتاریخ ۲۲ ربیع الاول روز شنبہ وقت عصر سن یک ہزار و دو صد و سی و سہ ہجری در دار السلطنت لکھنؤ قتیل خنجر اجل ناگزیر گردید"

۷ - "ریاض الفردوس" از مولوی محمد حسین شاہجہانپوری

"مرزا محمد حسین قتیل لکھنوی ہندو پسرے بود۔ بصحبت کسے از شیعان لکھنؤ مذہب تشیع اختیار کرد۔۔۔۔۔ این بیت از دست سہ

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب ✧ کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

۸ - "نقوش معرکۂ زیبا" از سعادت خاں ناصر۔ قلمی۔ کتب خانہ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب

"قتیل فخرِ فاخر مکیں یادگارِ علی حزیں۔ تصنیفات سے اس کی خاص و عام بہرہ ور۔ نو مسلم اور مسلم الثبوت مثل اس کے کمتر واسطے دریافت کرنے محاورات اہلِ زبان برسوں اصفہان میں رہا اور خوب دریافت کیا۔۔۔۔۔"

۹ - غالب در کلکتہ ۱۲۴۳ھ

"میں دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا"

۱۰ - "یادگارِ غالب" از خواجہ الطاف حسین صاحب حالی -

"(فٹ نوٹ) مرزا قتیل نو مسلم تھے۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دیوالی سنگھ تھا۔ اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔

۱۱ - "قاموس المشاہیر"

"تخلص قتیل، مرزا محمد حسن نام۔۔۔۔۔ وطن دہلی۔ اصلاً کھتری تھے اور بعد کو مذہب اسلام قبول کیا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔۔۔۔ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ لکھنؤ میں بعہد نواب غازی الدین حیدر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۳ھ انتقال کیا"

۱۲ - تاریخ اودھ از حکیم محمد نجم الغنی خاں صاحب - جلد چہارم صفحہ ۹۹

"مرزا محمد حسین قتیل جو پہلے ہندو مذہب فرید آباد کے کھتری تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ نظم و نثر میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچ گئے تھے۔ قواعد فارسی وغیرہ کے بیان میں ان کے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے اور ایک دیوان فارسی مشہور و معروف ہے۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی"

۱۳ - "لکھنؤ کی زبان" از سید محمد باقر شمس لکھنوی۔ مطبوعہ نگار مئی ۱۹۴۱ء

"یہاں صرف ان شعرا کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔۔۔۔۔۔ (۱۹) مرزا محمد حسن قتیل"

ان کے علاوہ دو اور قلمی تذکروں کا حال مجھ تک پہونچا ہے۔ لیکن میں نے وہ خود اپنی آنکھ سے نہیں دیکھے ہیں۔ گویا اس کی ذمہ داری نہیں لیجا سکتی کہ جو حال ان میں بتایا جاتا ہے وہ سب ویسا ہی ہو۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

۱۴ - "شمع انجمن" از سید میر جان فرقتی دہلوی عظیم آبادی۔ قلمی - (یہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "شمع انجمن" مطبوعہ سے بالکل الگ چیز ہے)

اس تذکرہ کا وجود ضرور ہے۔ جنوری ۱۹۰۵ء کے اردوئے معلےٰ میں ایک مضمون مرزا احمد انشا پر جناب سید علی سجاد دہلوی عظیم آبادی نے حوالہ قلم فرمایا تھا۔ مرزا انشا کے متعلق لکھا ہے کہ "تلامذۂ مرزا محمد حسن قتیل میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا"۔ مرزا انشا کی ایک غزل اور غالباً دیگر حالات بھی سجاد صاحب نے اسی تذکرہ شمع انجمن سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ اس تذکرہ کے متعلق سجاد صاحب کہتے ہیں۔ "یہ تذکرہ زبان فارسی میں ہے اور مولوی سید امیر جان صاحب فرقتی دہلوی ساکن عظیم آباد کی تصنیف سے ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ تذکرہ نگار راقم الحروف کے حقیقی چچا تھے جنھوں نے سال پیوستہ یہیں انتقال فرمایا"

لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس کو بھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میرے کرمفرما جناب مولوی ابو الکمال صاحب امید نے اسکو ۱۹۰۶ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اس کا اکثر حصہ قریب قریب حفظ کر لیا۔ امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں قتیل کا ذکر بہت تفصیل سے تھا۔ وطن وغیرہ کے متعلق مولوی امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں لکھا تھا کہ قتیل ۱۱۷۱ھ میں بمقام فرید آباد پیدا ہوئے اور ۶۲ سال کی عمر پا کر ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

۱۵ - دوسری کتاب جو میں نے نہیں دیکھی وہ ہے "بیاضِ یدِ بیضا" از مصحفی۔ قلمی۔ مشیر احمد صاحب علوی نے اس کا ذکر نگار کے مصحفی نمبر (جنوری ۱۹۳۹ء) میں کیا ہے۔ اور اس کو مصحفی کی غیر مطبوعہ بیاض فرمایا ہے۔ مشیر صاحب فرماتے ہیں کہ اس بیاض میں قتیل کا بھی ذکر اس طرح ہے کہ "ان کے بزرگ بٹالہ کے تھے۔ جب قتیل فرید آباد گئے تو مرزا باقر

اصفہانی کے ہاتھ پر ۱۴ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور مرزا محمد حسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد کو امامیہ مذہب اختیار کیا۔ اور نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ان کی فارسی دانی کی مصحفی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دریائے لطافت کی ترتیب میں یہ انشاء اللہ کے شریک تھے۔ کلام کا نمونہ نہیں دیا"

یہ ہے مرزا قتیل کے وطن کے متعلق دوسروں کی رائے جس تک میری پہنچ ہو سکی ہے۔

گویا ایک صاحب (صاحب تذکرہ ریاض الفردوس (۵)) قتیل کو لکھنوی بتاتے ہیں۔ یہ اگر اس نسبت سے نہیں لکھا گیا ہے کہ مرزا قتیل کی آخر عمر لکھنؤ میں گزری تو پھر یقیناً غلط ہے۔ صاحب تذکرہ یوں بھی کچھ زیادہ تحقیق کے طرفدار نہیں معلوم ہوتے۔ یہاں تک کہ جو شعر مرزا قتیل کا نمونہ میں دیا ہے۔ وہ بھی مرزا مرحوم کا نہیں ہے بلکہ حافظ کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ بہرحال ریاض الفردوس کا بیان بے دلیل ہے۔ اور کسی جگہ سے مطلق یہ بات نہیں پائی جاتی کہ قتیل لکھنوی تھے۔

"اصلش از لاہور است" دو تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے یعنی محمد قدرت اللہ صاحب گوپاموی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب۔ محمد قدرت اللہ صاحب کی "نتائج الافکار" کی تاریخ تالیف ۱۲۲۵ھ ہے۔ گویا یہ کتاب قتیل کے زمانہ حیات ہی میں لکھی گئی تھی۔ لیکن خود قتیل ہی کے حالات میں ان کی وفات تک کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا کام غالباً ۱۲۳۳ھ تک ہوتا رہا۔ بلکہ اس کے بھی بہت بعد تک۔ انتقال سے کچھ پہلے قتیل نے اپنی کتاب "ہفت تماشہ" تصنیف کی تھی جو منظر عام پر آ چکی تھی۔ اس میں مرزا قتیل نے ہندوستانی ذاتوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے اور کھتریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کھتریوں کی اصل پنجاب ہے اور وہیں سے نکل نکل کر مختلف جگہ آباد ہوئے ہیں۔ ممکن ہے قدرت اللہ صاحب کی نظر سے کتاب گزری اور انھوں نے اس بیان کو خود قتیل ہی پر چسپاں کر دیا ہو۔ "اصلش از لاہور است" کے یہ معنی مشکل ہی ہیں کہ خود قتیل یا ان کے باپ لاہور کے تھے۔ بلکہ اس فقرہ سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم یا قبیلے کی اصل کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح کا بیان اکثروں کے متعلق ملے گا۔ بہت ایرانی الاصل تھے جن کی تین تین چار چار پشتیں ہندوستان میں گزر چکی تھیں آج بھی دلی میں محلے کے محلے ہزارہا اصحاب سے آباد ہیں جو "پنجابی" کہلاتے ہیں لیکن جن کی پشتیں صدیوں سے دلی میں رہ رہی ہیں۔ اور جن کو نہ ایک لفظ پنجابی کا آتا ہے نہ ان میں سے اکثر کو یہ معلوم کہ وہ پنجاب کے کس حصہ سے کس زمانے میں آئے تھے۔ کشمیریوں کا حال تو اس معاملہ میں اور بھی ام نشرح ہے۔ یہ اصحاب ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں صدیوں سے نہایت عزت کے ساتھ وہیں کے باشندہ ہو کر رہ رہے ہیں لیکن سرشار اور چکبست کی لکھنویت اور کیفی کی دہلویت کے باوجود ان کو "کشمیری الاصل" لکھا جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ قدرت اللہ صاحب نے اسی معنی میں "اصلش از لاہور است" لکھا ہے۔ اسی لئے آگے چل کر جب تفصیل فرماتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "با جملہ از شاہجہاں آباد رخت بکالپی کشید۔ ۔ ۔ ۔ پس ازاں دل بساحت دارالسلطنت لکھنؤ نہاد"

شمع انجمن (۵) میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی "اصلش از لاہور است" تحریر فرمایا ہے لیکن یہ فقرہ ہی نہیں بلکہ اور سارا بیان یہاں تک کہ غلط تاریخ وفات کا اعادہ اس بات کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ کم از کم جہاں تک قتیل کا تعلق ہے شمع انجمن، نتائج الافکار کی ہی مرہون منت ہے۔ نواب صاحب نے اختصار فرمایا ہے لیکن وہ مولوی قدرت اللہ کی تقلید میں کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اس لئے شمع انجمن کا یہ بیان علحدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس پر وہی تنقید صادق آتی ہے جو نتائج الافکار پر اوپر ہو چکی ہے۔

ایک اور نام نہاد تذکرہ "ید بیضا" (۵) نے مرزا قتیل کو بٹالہ کا متوطن بتایا ہے۔ اس تذکرہ کو مصحفی کی تصنیف کہا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو اس کی قیمت کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی لیکن شکر ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ مصحفی کا کوئی تذکرہ اس نام (ید بیضا) سے نہیں لکھا گیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس تذکرہ کا ذکر جناب بشیر احمد صاحب علوی کاکوروی نے نگار کے "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" کے تحت میں بالتفصیل فرمایا ہے۔ لیکن ابھی بقول شخصے کاغذ کی سیاہی بھی سوکھنے نہ پائی تھی کہ جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اپنے مضمون "مصحفی کی بعض لغزشیں" مطبوعہ نگار ماہ اپریل ۱۹۳۹ء میں اس بوستان خیال کا بھرم کھول دیا۔ یہ سارا مضمون پڑھنے کے قابل ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم طویل اقتباسات تو نہ نقل نہیں کریں گے بلکہ صرف نتائج کو جناب آرزو ہی کی زبان میں پیش کئے دیتے ہیں۔ آرزو صاحب فرماتے ہیں "میں یہ کہدینے کے لئے تیار ہوں کہ "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" جعل کا بہترین نمونہ ہے اور "ید بیضا" اور "نور ازل" جناب بشیر کے تخیل کی صرف معجزہ ہیں اور بس" آرزو صاحب نے ثابت کیا ہے کہ نئی بیاضیں مصحفی کے تینوں معروف تذکروں کے بیانات الٹ پھیر کر گھڑ لی گئی ہیں" واقعات کی بے ربطی سنین کی غلطی اور بیانات کا الجھاؤ" مستزاد ہے۔ میں جناب آرزو کے اس محاکمے پر پوری طرح مطمئن نہ تھا اس لئے آخر فروری ۶۲ء ایک موقعہ نکال کر خود کاکوری گیا۔ وہاں بشیر احمد صاحب سے تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کے والد محترم جناب امیر احمد صاحب علوی سے نیاز حاصل ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ "بیاض ید بیضا مصحفی" کوئی کتاب نہ اس وقت ان کے کتب خانہ میں ہے نہ کبھی پہلے تھی۔ نہ کبھی اُن کی نظر سے ایسی کتاب گزری۔ فرماتے تھے کہ "میں نہیں بتا سکتا کہ بشیر صاحب کو ایسا مغالطہ کیوں یا کہاں کا ماخذ کیا تھا۔ تکیے شریف میں ایک صاحب کے تین قلمی تذکرے ہیں ایک فارسی شاعروں کا ایک اُردو شاعروں کا اور ایک شاعر عورتوں کا۔ لیکن یہ تذکرے مصحفی کے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مسرور کاکوروی کے شاگرد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ان کو دیکھ کر بشیر صاحب کو دھوکا ہوا ہو" غرض یہ بات اب بالکل ثابت ہے کہ "ید بیضا" مصحفی کی بلند پروازی کے سوا کچھ نہیں۔ بے وجود چیز پر مزید تنقید و تبصرہ بیکار ہے

حسب بالا چار تذکروں کے علاوہ چار اور تذکرے یعنی عقد ثریا ۔ مخزن الغرائب ۔ گلشن شتاق اور خوش معرکہ زیبا اس معاملہ میں خاموش ہیں۔ گلشن شتاق اور خوش معرکہ زیبا کی خاموشی تو کوئی تعجب خیز نہیں کیونکہ ممکن ہے ان اصحاب کو قتیل کے وطن کے متعلق علم نہ ہوا ہو لیکن مخزن الغرائب اور عقد ثریا کے مولف (احمد علی ہاشمی اور مصحفی) کی یہ فروگذاشت عاقبتی ہے بعد حیرت انگیز۔ مصحفی کے تعلقات مرزا قتیل سے بہت گہرے تھے اور عقد ثریا اصل میں مرزا قتیل ہی کی تحریک پر لکھی گئی تھی ۔ اس طرح احمد علی ہاشمی کے وہ اُستاد محسن اور رہنما تھے اور مخزن الغرائب مرزا قتیل ہی کے اشارے پر اور ان کی مدد سے لکھی گئی تھی ۔ اس کے باوجود یہ دونوں اصحاب اپنی ان کتابوں میں جو محض مرزا قتیل ہی کی تحریک اور امداد سے لکھی گئی تھیں مرزا قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ یہ بے شک بے حد تعجب انگیز ہے۔ لیکن گراں نہیں ۔ اگر اصل وطن نہیں بتایا گیا ہے تو کم از کم لکھنؤ ، لاہور یا اور کوئی ایسی ہی جگہ لکھ کر غلط بیانی بھی نہیں کی ۔ اس موقع پر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ پرانے تذکرے اکثر جزئیات اور تفصیلات میں حیرت انگیز تنقید اور تفصیل کے حامل ہوتے ہیں ۔ ابھی جوشش کا دیوان چھپا ہے۔ اس کے مرتب جناب قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۸ تذکروں سے جوشش کا حال نقل کیا ہے۔ اور گو اس بیان میں اختصار کا یہ عالم ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے بھی دو چار سطروں سے زیادہ چار سطر سے زیادہ حال نہیں لکھا لیکن وہ بھی مختلف اور اکثر متضاد ہے۔ جوشش کے ہمعصر اور ہم وطن تذکرہ نویس جو خود جوشش سے گہرے تعلقات رکھتے تھے بھی دھوکا کھا گئے ہیں اکثر ان کے بیان میں بہک گئے ہیں مثلاً تذکرہ شورش ۔ گلزار ابراہیم ۔ تذکرہ عشقی میں سے ایک نے بھی جوشش کے تبدیلی مذہب یا ولدیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا گو یہ نہایت اہم بات تھی ۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں جوشش کا نام ہی سرے سے بدل دیا ہے ۔ اور گو جوشش مصحفی سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے لیکن مصحفی نے ان کو قدما میں گنوایا ہے ۔ بعد کے تذکروں میں یہ غلط فہمیاں قائم ہیں۔ مصحفی کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں :- " کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔ ایسی غلطیاں ان سے بہت ہوئی ہیں " اصل یہ ہے کہ ان پرانے تذکروں کا مقصد ذاتی حالات کے بیان کا نہ ہوتا تھا اور نہ اس کی کوئی اہمیت تھی ۔ چنانچہ صاحب سخن شعرا دیباچہ میں فرماتے ہیں " میں نے بھی چاہا کہ شروع تالیف سے کوئے طول اور اس قصہ کو مختصر کروں یعنی اس طرح کا تذکرہ لکھوں جس میں اشعار بکارآمد میں اطناب و ایجاز ہو اور احوال شعرا میں اختصار و ایجاز اور حالات ابنائے زماں کو بقدر طاقت بشری جامع اور حشو و زوائد مانع ہو"

تین تذکرے (خلاصۃ الافکار ۔ قاموس المشاہیر ۔ لکھنؤ کی زبان) مرزا قتیل کو دہلوی بتاتے ہیں۔ اور یہی قرین صحت ہے (اگرچہ اصل میں وہ فرید آبادی تھے جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا) ان تذکروں کے علاوہ اور بھی ثبوت ہیں جن سے مرزا قتیل کا دہلی اعظم[1] کا ہونا ثابت ہے۔ سید انشاء اللہ نے دریائے لطافت میں شرائط زباندانی کو متعدد بار گنوایا ہے اور طرح طرح سے یہ کہا ہے کہ اُردو زبان کے متعلق مستند وہی ہے جو دلی کا باشندہ ہو ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :- " اس شان کے حاصل کرنے کے لئے متکلم کے شاہجہان آباد میں پیدا ہونے اور وہاں کے فصیحوں میں اعتبار حاصل کرنے کی شرط لازم ہے " ایک اور جگہ زباندانی کی چار شرطیں جو گنوائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ " اس کا ثبوت کہ اس شخص کے والدین دارالخلافہ کی خاک پاک ہیں " یہ نہیں کہ دلی کی چند روزہ بود و باش پر قناعت ہے ۔ بلکہ اسی لئے ان لوگوں کو ممیز کر دیا ہے جو باہر سے آکر دلی میں بس پڑے ہوں ۔ اس ضمن میں پنجابیوں کی خصوصیت ظاہر کر دی ہے ۔ اسی لئے کئی عنوان ایسے تم الدہلوی پنجابیوں کے متعلق قائم کئے ہیں مثلاً " پنجابی لہجہ " " پنجابی اُردو داں کے کلام کی مثال " " پنجابی لہجے اور خصوصیات " ۔ " پنجابی آمدہ " وغیرہ اور ان سب کو پایہ فصاحت سے گرا ہوا بتایا ہے ۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں :- " - - - - - - یہ الفاظ ان لوگوں کی زبان کے ہیں جن کی اصل پنجاب سے ہے ۔ یعنی لاہور ۔ کلانور ۔ پٹیالہ - - - - - - سے آئے ہیں " ایک اور جگہ لکھتے ہیں " یہ امر بھی احباب کے ذہن نشین رہے کہ دہلوی ہونا ایک شخص کے دلی میں ہونے پر منحصر نہیں ہے ۔ وہ نہ مغلپورہ[2] محلہ کے رہنے والے جو شاہجہان آباد میں پیدا ہوتے ہیں دہلوی ہونے چاہئیں ۔ لیکن ایسا نہیں ہے ۔ کیونکہ دہلوی وہ ہے جس روز مرہ وہ اہل دہلی والوں کا ہے - - - - ۔ بخلاف اس کے مغلپورہ والوں کو دیکھو کر ان کی گفتگو لاہور والوں سے ملتی ہے " پھر بھلا اگر قتیل پنجابی ہوتے اور لاہور یا کسی مقام سے آئے ہوئے ہوتے تو انشاء اللہ خاں ان کے ساتھ اُردوئے معلیٰ کی سب سے پہلی قواعد و معانی کی کتاب کیسے تصنیف کرتے یہی نہیں بلکہ انشاء اللہ نے دیباچہ میں قتیل کے مرتبہ کا یہ دیا ہے کہ " رہ کردہ او بے تامل رہ کردہ من و پسندیدہ او پسندیدہ این کمتر شہیاں بودہ است ۔ واز صغرسن میان من و او ہمچو حصہ بادرانہ قرار یافتہ " محض آمد تحسین ہی نہیں ہے بلکہ اس پر عمل ہے مثلاً ہفت تماشہ میں قتیل نے ایک جگہ لکھا ہے " حلال خور ۔ ہر چند این لفظ در اصل غلط است لیکن انچہ مشہور است ہمین است " دریائے لطافت میں بعد میں انشاء اللہ لکھتے ہیں " لفظ حلال خور اگرچہ اصل میں غلط ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں کثیر الاستعمال ہے اس لئے اُردو میں فصیح ہے " یا تشریح تنافر غرابت کو

---

[1] دہلی اعظم ۔ یہ اصطلاح میں نے (Greater London) کے نمونے پر وضع کی ہے ۔ یعنی شہر مع توابع
[2] دہلی کا ایک محلہ ۔

میں لکھا ہے "خدا بخشے مرزا علی نقی محشر مقتول نے کہا "پانی الیندا لو" اُردو ہے "پانی ناتے لو" پورب کی زبان ہے۔ مرزا قتیل نے جواب دیا کہ پانی الینڈلو دو لفظ ہے کہ شاہجہاں آباد کے شرفا اور عوام کے کان اس سے نا آشنا ہیں۔ اور پانی ناتے لو پورب والوں کے سوائے کوئی نہیں سمجھتا یا آپ سمجھتے ہیں۔ پس جو لفظ اہل اُردو کے سننے میں نہیں آیا اس کو اُردو کی عبارت میں لانا غرابت کا نقص عاید کرتا ہے اور فصاحت کے راستے سے بھٹکا جاتا ہے" یہ خیال رہے کہ مرزا علی نقی محشر شاعر تھے۔ لکھنوی تھے اور دلی میں بھی مدتوں سال رہ آئے تھے۔ اس بات پر تو ہوا کہ کسی ایسے شخص سے ظہور میں نہیں آسکتا جو اصلاً پنجابی ہو اور دلی میں صرف کچھ دن رہ لیا ہو۔ اگر قتیل کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہوں تو ان کے لئے داخلی اور قطعی ثبوت میں خود مرزا قتیل مرحوم کے کلام کی صریح اور بیّن شہادت پیش کی جاتی ہے۔ دیوان قتیل ت کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:۔

تا برقس آں فتنۂ کون و مکاں برخاست است   صد بلائے ناگہاں از ہر کراں برخاست است

اس کا مقطع ملاحظہ فرمایئے:۔

گرچہ باشد مولد من خاک دہلی اے قتیل   کم کسے چوں من ز یزد و ایرواں برخاست است

لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قتیل دلی کے تھے تو بھی یہ فرید آبادی ہونے کے مترادف کیونکر ہوا۔ کیونکہ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ قتیل فرید آبادی تھے اس کے ثبوت میں حسب ذیل شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو امید ہے شافی سمجھی جائیں گی۔

۱۔ اول تو یہ بات ملاحظہ طلب ہے کہ اکثر جب وطن کوئی نسبتاً غیر مشہور جگہ ہو تو قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کی جاتی ہے۔ آج کل کے زمانے میں بھی جبکہ ذرائع رسل و رسائل اور تعلیم خواندگی بہت عروج پر ہے یہی طریقہ ہے کہ مضافات کے رہنے والے تقریباً بلا استثنا اضلاع یا قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے تو یہ زیادہ تر ہوتا تھا۔ فرید آباد نہ صرف دلی کے ضلع میں تھا بلکہ دلی سے بہت ہی قریب بھی تھا۔ انگریزوں نے شروع میں دلی کے جنوبی رخ زیادہ تر فرید آباد سے ہی توجہ کی۔ ورنہ تو بیچ شہر شمال میں کو جنوب ہی کی طرح بڑھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ صورت نہیں ہے جو اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے تھی۔ جس زمانے میں نظام الدین۔ عرب سرائے۔ تغلق آباد خود دہلی کا حصہ اور فرید آباد گویا مسلسل دلی ہی کے محلے تھے۔ ان مقامات کے لوگ اکثر اپنے آپ کو دہلوی ہی کہتے تھے۔ میر مہدی مجروح ... کے رہنے ... اپنے کو دہلوی کہتے ہیں۔ مختصراً اگر قتیل نے خود اپنے کو دہلوی کہا یا دیگر تذکرہ نویسوں نے ان کو دہلوی لکھا تو یہ غلط نہیں بلکہ حسب دستور ... اس قسم کی مثالیں بے شمار دی جاسکتی ہیں اسی مضمون میں محمد حافظ علی مشتاق صاحب بگلشن مشتاق کا حوالہ اوپر گزرا ہے۔ وہ اپنے کو مسیح آبادی لکھنوی یا صرف لکھنوی لکھتے تھے۔

۲۔ چار اصحاب (غالب۔ حالی۔ نجم الغنی اور فرقتی) نے صریحاً قتیل کا فرید آبادی ہونا بیان کیا ہے۔ فرید آباد کچھ بہت مشہور و معروف قصبہ نہیں ہے کہ سہواً یا عادتاً اس کی طرف نسبت سکونت عائد کر دی جائے۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب تک علم صحیح نہ ہو کوئی تذکرہ نویس فرید آباد کی سکونت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ دہلی۔ لکھنو۔ لاہور۔ یا ملک مثلاً پنجاب۔ پورب۔ دکن۔ بنگال۔ اودھ وغیرہ کی نسبت تو اندازاً بھی بتائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس طرح کسی غیر مشہور قصبہ کا خصوصیت سے نام لیا جانا ممکن نہیں۔ پھر غالب دہلوی۔ حالی پانی پتی فرقتی دہلوی اور نجم الغنی مورخ نے کیونکر قتیل کو فرید آبادی لکھا؟ غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح "باہر والے" نہ تھے بلکہ دلی اور فرید آباد کے فرق کو خوب جانتے غالب دلی میں برابر رہے تھے جب قتیل کا طوطی لکھنؤ میں بول رہا تھا۔ خواجہ حالی بھی زیادہ تر دلی ہی میں رہے بلکہ فرید آباد کو بھی ... فرقتی بھی دلی میں اور ... حالات سے آگاہ۔ حکیم نجم الغنی بے شک رامپور کے تھے لیکن وہ مورخ ہیں محض تذکرہ نویس نہیں۔ انھوں نے غالباً زیادہ تحقیق کے بعد کچھ لکھنا مناسب سمجھا۔

۳۔ مرزا قتیل کی تحریر میں فرید آباد کے متعلق بھی داخلی شہادت ملتی ہے گو یہ کنایۃً ہے نہ کہ صریحاً شجرۃ الامانی میں شجرۂ سوم کے تحت میں لکھتے ہیں "در بیان فارسیِ اہلِ ہند بین کسانے کہ مقلد و مجالس اہل زبان نہ باشند و آں بر دو گونہ بود۔ یکے محاورہ کتابی و آں ہر چند خلاف روزمرہ زبان واقع شود لیکن صحیح باشد مثال آں :۔ دیروز چناں بخاطر من جانو کہ پاسے از روز بر آمدہ برائے ملاقاتِ گرامی بیایم لیکن یکے از دوستاں بمن گفت کہ میرزا صاحب بہ کارے برجناح استعجال بجانب فرید آباد قطرہ زن شدہ اند شمارا از رفتن و چنیں شدت گرما دہم آغوش حرماں باز آمدن چہ حاصل۔ اگر ایں چنیں خیال بخاطر بستہ آید یک ہفتہ مشغول بہ کار دیگر باید ماند تا مرزائے مذکور را از کار مقصود ذہبی حاصل نمودہ بخانہ خود رسیدہ آں زماں اگر دل دستوری دہد رفتہ از سخنانِ شیریں دل آویز مشار الیہ کام آرزو را شکر تنگ شکر و طبلۂ انگبیں باید نمود۔ بنا براں در آمدن تخلص تو تعویق بظہور آمد"

یہ رقعہ غالباً مرزا قتیل کے کسی جاننے والے کا ہے جو ان کے نام لکھا گیا اور جو انھوں نے مثال کے موقعہ پر نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب اس میں شک کریں اور فرمائیں کہ یہ تو مثالاً ایک عبارت لکھ دی گئی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسے اصحاب یہ غور فرمائیں کہ شجرۃ الامانی ۱۲۰۶ھ میں لکھی گئی تھی جبکہ مرزا قتیل کو وطن چھوڑے ہوئے اور لکھنؤ میں آئے ہوئے کم از کم ۲۰ سال (اگر وہ ۱۸ سال کی عمر میں آئے) اور زیادہ سے زیادہ نو برس (اگر ان کے والد ان کی پیدائش سے پہلے ہی فیض آباد آگئے تھے) ہو چکے تھے۔ لکھنؤ میں اتنے لمبے

وآرام کر قیام کے بعد کتاب لکھی جاتی ہے اور مثال میں بے ساختہ دلی سے فریدآباد جانے کا ذکر آجاتا ہے۔ کیا اس شخص سے اس چیز کا امکان ہے جو بتایا ہے۔ ہم آپ یا داود لکھنؤ پہنچا ہو مکمنو میں جو کچھ دن کو دلی ہو آیا ہو اپنی کتاب میں ایسی مثال دے سکتا ہے۔ کیا کوئی دلی شہر کا باشندہ جو ۵۱۰ سال کی عمر میں فیض آباد اور لکھنؤ کو انتقال سکونت ... دو سو برس بعد بھی اپنی کتاب میں مثال پیش کرنے کے لئے ایسی جگہ ... سوچ سکے گا۔ فریدآباد کچھ ایسی جگہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کی طرف ذہن منتقل ہو یا اس کا نام زبان زد رہا ہو۔ پھر کیا مرزا قتیل کا فریدآباد کا اس طرح بیان محض اتفاقی ہے؟

۱۔ ایک آخری لیکن قوی دلیل یہ ہے کہ مرزا قتیل مرحوم کا خاندان ابھی تک فریدآباد میں آباد و خوشحال ہے۔ یہ کھتری صاحبان قصبہ کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی دیوان گوت ہے جو ... نئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی اب تک رسم و راہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے جس میں آج تک کے اندراج موجود ہیں۔ ... درگاہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں درج کیا ہے غالباً اس لئے کہ درگاہی مل کے صاحبزادے مرزا قتیل مسلمان ہوگئے تھے۔

یہ جو بعض تذکرہ نویسوں نے لکھ دیا ہے کہ قتیل کے باپ فیض آباد آگئے تھے جہاں مرزا قتیل تولد ہوئے یہ بھی محض غلط معلوم ہوتا ہے۔ مرزا قتیل غالباً ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اس وقت ... آباد کچھ مشہور جگہ نہ تھی۔ کچے کچی کے مکانات اور کچھ فروشیوں کے ... اور یہ جگہ "بنگلہ" کہلاتی تھی۔ اس وقت بلکہ اس سے بھی پہلے بھلا کوئی کیوں ترک وطن کرکے یہاں آتا۔ اس زمانہ میں اودھ کے نواب وزیر بھی یہاں نہ رہتے تھے بلکہ ان کے عامل رہتے تھے۔ ۱۱۶۸ھ میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالریاست بنایا لیکن ابھی پورے طور پر شہر بننے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ نے پھر لکھنؤ کو مستقر بنایا۔ کوئی اگر کسی نے فیض آباد آنا چاہا ہوگا تو اسی دس سال کے عرصہ میں آیا ہوگا۔ لیکن قرائن ایسے ہیں کہ غالباً اس زمانہ میں بھی بہت کم لوگ اپنے بال بچوں سمیت فیض آباد گئے ہوں گے۔ شجاع الدولہ نے پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی عورت، بوڑھا، جوان یا بچہ بغیر خاص اجازت نامہ کے فیض آباد کی حدود سے باہر نہ جانے پائے۔ اس کی سختی سے پابندی ہوتی تھی اور اس کے انتظام کے لئے چوبیس گھنٹے ... پہرے ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں سوائے سرکاری ملازمین کے بھلا کوئی کیوں اپنی عورتوں سمیت اس شہر میں آتا ہوگا۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید تحقیق چاہتا ہے۔ میں تو خواجہ حالی مرحوم کی رائے سے متفق ہوں کہ مرزا قتیل دلی ہی میں اکتساب علم اور تبدیلی مذہب کر چکے تھے اور اس کے بعد لکھنؤ گئے۔

سید اسد علی انوری۔ فریدآبادی

جاپان کے خوفناک ارادے

اور
اُنکی کامیابیوں کے راز

ہٹلر کی کتاب "میری جدوجہد" بہت مشہور چیز ہے، جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے اور جرمن قوم کو دنیا کی تمام دوسری قوموں پر حکمراں بنانے کی کیا کیا تدابیر پہلے سے سوچ رکھی تھیں، لیکن شاید ہم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جرمنی کی طرح جاپان بھی یہ سودا عرصہ سے اپنے دماغ میں لئے ہوئے تھا۔

اس سلسلہ میں تناکا کی وہ یادداشت جو اس نے جولائی ۱۹۲۷ء میں میکاڈو شاہ جاپان کے سامنے پیش کی تھی بہت مشہور چیز ہے۔ تناکا، جاپان کا وزیر اعظم تھا اور اس نے جاپان کے تمام فوجی و غیر فوجی افسروں کی کانفرنس طلب کرکے، ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ تمام مشرق بعید کو کس طرح جاپانی مستعمرہ بنایا جا سکتا ہے۔

اس یادداشت میں عام تدابیر کے سلسلہ میں ایک جگہ یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے سب سے پہلا کام چین پر اقتدار حاصل کرنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے امریکہ کو شکست دی جائے، ویسی ہی شکست جیسی ہم روس کو دے چکے ہیں۔ اور اس کے بعد پہلے منچوریا اور منگولیا پر قبضہ کیا جائے۔

اگر ہم چین کو فتح کرلیں گے تو ایشیا کے دوسرے ملک اور جنوبی سمندر کے جزیرے ہمارے سامنے اپنا سر جھکا دیں گے اور پھر ہم ہندوستان، ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور یورپ کو زیر کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔"

اس یادداشت کے ایک اور حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ :۔ "ہمیں اپنے ملک کی توسیع کے سلسلہ میں شمالی منچوریا میں روس سے دوسری جنگ کرنا از بس ضروری ہے کیونکہ جب تک راستے سے یہ پتھر نہ ہٹ جائے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم نے اپنا سب سے پہلا فاتحانہ قدم فارموسا میں اُٹھایا (۱۸۹۵ء)، دوسرا قدم وہ جب کوریا پر قبضہ کیا (۱۹۱۰ء)، تیسرا قدم منچوریا اور منگولیا کو فتح کرنا تھا (۱۹۳۱-۳۲ء) اور اب اگلا قدم چین کی طرف ہوگا۔ افسوس ہے کہ آخری قدم ہم نے ابھی نہیں اُٹھایا، کیونکہ اس کے لئے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ہم کو برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ قوت سے جنگ کرنا پڑے گی۔"

جب تناکا کی یہ یادداشت شائع کی گئی تو جاپانیوں نے اس کی صحت سے انکار کیا، لیکن چین میں برابر ۱۹۲۹ء سے اس کی اشاعت ہوتی رہی اور جاپان نے اسکی تردید بھی نہیں کی۔ علاوہ اس کے دوسرا ثبوت اس یادداشت کے وجود کا سر ہوآنگ کی کتاب (Le Peril Japonais) ہے جو ۱۹۳۲ء کی جنیوا بین الاقوامی صلح کانفرنس کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۱ء سے برابر جاپان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ سارے ایشیا پر چھا جائے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۷ء میں اس نے شمالی چین پر حملہ کر کے ۱۹۴۱ء تک گیارہ صوبوں پر اس نے قوجی قبضہ کر لیا اور اس کے بعد فرانسیسی انڈو چائنا پر تسلط جمایا۔

اول اول جب جاپان نے چین کے خلاف قدم اُٹھایا تھا، اسی وقت سے جاپان کے ہٹلرانہ ارادے دوسرے ذرائع سے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں جنرل اراکی کی ایک تحریر جو اگست ۱۹۳۳ء کے ایک جاپانی میگزین میں شائع ہوئی تھی بہت اہم ہے۔

جنرل اراکی، جاپان کی عسکری جماعت کا بہت بڑا شخص ہے اور اس کا بیان گویا جاپان کے صحیح صحیح ارادوں کا اظہار ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔ "ہمارا ملک اپنے قومی نصب العین کو ساتوں سمندر پار کر کے پورا کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے لئے ہم کو لڑنے کی ضرورت پڑی تو ہم لڑیں گے، کیونکہ ہم خدا کی نسل سے ہیں اور ہمیں ساری دنیا پر حکومت کرنا چاہئے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چین کی تمام خام پیداوار پر ہمارا قبضہ ہو جائے۔"

جب منچوریا اور منگولیا پر جاپانیوں نے قبضہ کیا تو انھوں نے توجیہ یہ کی کہ ہمیں اپنی بقائے حیات کے لئے زمین کی ضرورت ہے اور چین کے ان علاقوں پر ہمارا قبضہ کرنا فطری اقتضا ہے۔ بالکل یہی توجیہ ہٹلر بھی کرتا ہے کہ جرمن آبادی کی زندگی اور ضروریات کے لئے آس پاس کے ملکوں کو تسخیر کرنا ضروری ہے۔ جاپان اور جرمنی کی یکساں ذہنیت کا ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو :۔

جب جاپان کے وزیر اعظم پرنس کونوے نے ۱۹۳۸ء میں چین کے خلاف موجودہ جنگ چھیڑی تھی تو اس نے اعلان کیا تھا کہ مشرقی ایشیا میں وہ جاپان کی سیادت میں ایک نیا نظام قایم کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب ہٹلر نے یورپ میں لڑائی چھیڑی تو اس نے بھی یورپ میں ایک نئے نظام حکومت کے قایم کرنے کا اعلان کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جاپان کے اس جدید نظام حکومت میں صرف چین اور منچوکو شامل تھے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کو یورپ میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں تو اس نظام میں سیام، برما، فلپائن، سنگاپور، انڈوچائنا، ڈچ انڈیز اور ہندوستان کو بھی شامل کر لیا اور دوسری طرف ہٹلر نے اپنے نئے نظام میں نہ صرف تمام یورپ، افریقہ اور جنوبی امریکہ کو بھی داخل کرنے کا اعلان کر دیا۔

محوری طاقتوں کے اتحاد نامہ میں جو شرائط طے پائے ہیں ان کی رو سے جاپان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ یورپ میں جرمنی اور اٹلی کی سیادت کو مانے گا اور جرمنی و اٹلی نے مان لیا ہے کہ وہ ایشیا میں جاپان کی سیادت کو تسلیم کریں گے۔

جاپان کے موجودہ وزیر اعظم توجو نے بھی پچھلے دسمبر میں جاپان کے اس جدید ایشیائی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے ایشیا کو فتح کرنے پر مجبور ہیں۔ جاپانیوں کے اس خیال کا تاریخی پس منظر یہ اعتقاد ہے کہ وہ سورج دیوتا کی اولاد میں سے ہیں اور ان کو ساری دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

سیاسی تنظیم کے لحاظ سے جاپان حد درجہ پست ملک ہے اور وہاں کی حالت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ شاہ جاپان، انسانی صورت میں خدا ہے، اسی لئے وہ میکاڈو اور اس کے وزیروں کے حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کرتے ہیں اور یہ لوگ جاپانی پبلک کے اس اعتقاد سے ناجائز فایدہ اٹھاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مادی ترقی کے لحاظ سے جاپان بالکل یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے اعتقادات کے لحاظ سے وہ حد درجہ وحشی ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کے لٹریچر ان کے آرٹ کا ماخذ قدیم چینی تہذیب ہے۔ لیکن ان کی سائنس بالکل مغرب کی چیز ہے، جسے انھوں نے انیسویں صدی کے آخری دوسرے حصہ میں حاصل کر کے انتہائی ترقی پہونچا دیا۔

ان کی قومی اسپرٹ، ان کے اقتصادی و سماجی حالات سے پیدا ہوئی ہے اور دنیا کی کوئی مہذب قوم ذات پات یا سوسائٹی کے لحاظ سے اتنی پراگندہ نہیں ہے جتنی جاپانی قوم۔

حکمران طبقہ، یہاں کے کاشتکاروں اور مزدوروں کو اپنا غلام سمجھتا ہے اور جاپان کی ۸۰ فی صدی دولت صرف دس خاندانوں میں تقسیم ہے جن میں دو خاندان (مٹسوئی و مٹسوبیشی) بہت مشہور ہیں اور وہاں کی تمام تجارت اور صنعت و حرفت پر انھیں کا قبضہ ہے۔

جاپان کے حکمران طبقہ میں ایک جماعت ان بڑے بڑے فوجی افسروں پر بھی مشتمل ہے جو شادی بیاہ کے ذریعہ سے حکمران حلقہ میں شامل ہو گئے ہیں اور دفتری اقتدار انھیں کے ہاتھ میں ہے۔

نوجوان فوجی افسر جن میں سب کے سب غریب شامل ہیں، بالکل جاہل ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، وہ آنکھ بند کر کے صرف جان دینا جانتا ہے اور ساری دنیا پر چھا جانے کا خواب دیکھتا ہے۔ اور اتنا توہی ہے کہ وہ کبھی کبھی اس الزام میں اپنے افسروں کی بھی جان لے لیتا ہے کہ جاپانی فتوحات میں کیوں اس قدر دیر ہو رہی ہے۔

جاپانی کامیابی کا راز

جو کچھ بیان کیا گیا اس سے وہ پس منظر ظاہر ہو جاتا ہے جو جاپانیوں کے فوجی اقدامات کی بنیاد ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اتنے تھوڑے زمانہ میں کیوں اسے اتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ کیا یہ صرف کسی اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ نہیں، بلکہ اس میں کچھ اور باتیں بھی شامل ہیں۔

جاپان میں پہلے بالکل جاگیردارانہ حکومت قایم تھی، اور ہر جاگیردار اپنی فوج رکھتا تھا جو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ہر چند اب وہاں کا نظام حکومت بدل گیا ہے لیکن جو قومی اسپرٹ وہاں پہلے پیدا ہو چکی تھی اب بھی پائی جاتی ہے اور فوج کی خدمت کو وہاں نہایت ہی معزز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے فوجی خدمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تو وہ شرم کی وجہ سے خودکشی کر لیتا ہے۔ اس لئے وہاں کا سپاہی اس لئے نہیں لڑتا کہ وہ لڑنے کا معاوضہ پاتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ لڑ کر جان دینے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جاپانی سپاہی حد درجہ محنتی و جفاکش ہوتا ہے اور اس باب میں وہاں کی معاشرت کو بڑا دخل ہے۔ آپ ان کی معاشرت کا مطالعہ کریں گے تو

معلوم ہوگا کہ ایک جاپانی کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے ہمیشہ جوتا اُتار ڈالتا ہے تاکہ فرش خراب نہ ہو۔ آپ اس کے کمرہ میں کوئی فرنیچر نہ دیکھیں گے وہ فرش ہی پر بیٹھتا ہے وہیں کھاتا پیتا ہے اور وہیں سب کچھ کرتا ہے۔

جب سونے کا وقت آتا ہے تو الماری سے چٹائی نکال کر رات بچھا لیتا ہے اور صبح کو اسے پھر لپیٹ کر رکھ دیتا ہے ۔ ۔ ۔ وہاں کی فوجی بارکیں زلزلہ کے خوف کی وجہ سے لکڑی کی ہوتی ہیں اور ان میں بھی کوئی فرنیچر نہیں ہوتا، زمین ہی پر تمام سپاہی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اس سادہ معاشرت کا نتیجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی وہ زمین پر آرام سے سو سکتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کے لئے میز، کرسی، یا پلنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کی وردی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی یوروپین سپاہی کی، لیکن وہ کم سے کم کپڑا خرچ کر کے زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہاں کا قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر سپاہی خود ہی اپنی وردی کی مرمت بھی کرتا ہے اور میدانِ جنگ میں درزیوں کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ جاپانی سپاہیوں کی غذا کا مسئلہ بھی نہایت سادہ ہے۔ ان کی غذا چاول اور ترکاری کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہاں کے سپاہی کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ دورانِ جنگ میں کم سے کم غذا پر زندگی بسر کرے، چنانچہ چاول کے آٹے کا صرف ایک کلچہ ۲۴ گھنٹے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غذا کے لئے رسد رسانی کا سوال بھی بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

فوجی تربیت بالکل مغربی اُصول پر ہوتی ہے اور بہت سخت محنت کا عادی بنا دیا جاتا ہے، چنانچہ سالانہ فوجی مظاہروں میں جو سال میں دو بار (نہایت سخت گرمی اور سردی کے زمانہ میں) ہوتے ہیں اگر کوئی سپاہی گر پڑتا ہے تو اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی ہمدردی اس کے ساتھ نہیں کی جاتی کیونکہ ایسے سپاہی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہا اور اس لئے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ایکبار وہاں نہایت سخت برفباری ہو رہی تھی۔ فوج کے کمانڈر نے سوچا کہ اس سے بہتر موقعہ فوجی آزمائش کا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے آدمی مر گئے لیکن پبلک یہ سنکر بہت خوش ہوئی اور اس نے کمانڈر کی بہت تعریف کی۔

جاپان میں معمولی معمولی بات پر جان دیدینا، ان کا مشغلہ ہے، وہ موت سے ڈرنا جانتے ہی نہیں اور بادشاہ کے لئے قربان ہو جانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، ان کا فلسفہ یہ ہے کہ خودکشی کر لینا، شکست سے زیادہ باعزت بات ہے اور اسی لئے وہ میدانِ جنگ میں نہایت بے جگری کے ساتھ لڑتے ہیں۔ جب کوئی نیا رنگروٹ بھرتی ہوتا ہے تو ایک مذہبی تقریب منائی جاتی ہے۔ سارا خاندان بہترین کپڑے پہن کر جمع ہوتا ہے اور سب مل کر رنگروٹ کو بارک تک لیجاتے ہیں، یہاں ایک افسر ان سب کی پذیرائی کرتا ہے اور رنگروٹ کو جب وردی پہنا کر سامنے لاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

یہی مذہبی عقیدہ ہے جس کی بدولت وہاں کی پبلک اپنے نوجوانوں کو خوشی سے فوجی خدمت کے لئے بھیج دیتی ہے اور یہی معاشرت کی سادگی ہے جو جاپانی سپاہی کو تیزی سے آگے بڑھنے اور مصائب برداشت کرنے میں مدد دیتی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ان کے آلاتِ حرب بھی بہت سُبک ہیں اور ان کی نقل و حرکت کے لئے بڑی بڑی سڑکوں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ جنگلوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں سے بھی بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔ الغرض جاپانی فوج اس میں شک نہیں بڑی خطرناک چیز ہے، اور اگر ہم اس قوم کی اخلاقی خصوصیات پر نگاہ ڈالیں تو اتنی ہی گھنونی بھی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ وہ ہندوستان یا کسی اور ملک پر صرف اس لئے حملہ کر رہے ہیں کہ اس ملک کو آزاد کرائیں گے غلطی ہے، اگر وہ آزادی کے ایسے ہی طرفدار ہیں تو انھوں نے چین پر کیوں حملہ کیا، منچوکو کو کیوں فتح کیا، منگولیا کی آزادی کیوں چھینی۔

سوچ

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

تھکا ہوا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف چلا جا رہا تھا، تھکا ہوا سرد دن آہستہ آہستہ اپنے کو ایک سیاہ کمبل میں لپیٹ رہا تھا، دھواں اور کہر رینگ رینگ کر غنودگی کے عالم میں مکانوں کی سونی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ بجلی کے بہت سے قمقمے گردن جھکائے چُپ چاپ سڑک سے گزرنے والوں کو اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، گرد میں اٹے ہوئے درخت نم آلود پتیوں کو لٹکائے ہوئے دم بخود کھڑے تھے، دن بھر کی سرگرمیوں میں ایک اضمحلالی کیفیت سی آ چلی تھی۔ زندگی میں ایک عجیب رکاؤ اور دھیما پن سا پیدا ہو چلا تھا۔ ایک ٹھنڈی۔ افسردہ۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی لہر چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔ یکے، تانگے، موٹر، پیدل چلنے والے بظاہر سب نہایت تیزی سے گزر رہے تھے مگر سب کی رفتار میں ایک خوابناکی سی پائی جا رہی تھی، سواریوں اور راہیوں کا شور و غل، قہقہوں اور کبھی کبھی گانے کی آواز فضا کو ذرا دیر گرما دیتی اور ایک اُداس سہانے پن کا احساس دلاتی ہوئی گزر جاتی مگر اس سہانے پن میں وہی کیفیت ہوتی جو ڈوبتے ہوئے دن میں پائی جاتی ہے — اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک مکان کے چھوٹے سے کمرہ میں لالٹین دھیمی دھیمی جل رہی تھی جس کی بتی کم کر دی گئی تھی۔ میز پر کہنی ٹکائے کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا، لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ دھندلا دھندلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گال پر رکھے ہوئے تھے، سامنے کتاب کھلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں جمی ہوئی وہاں نہ معلوم کیا دیکھ رہی تھیں — کمرہ کی سوگوار اور دھندلی فضا، خاموشی اور تنہائی، بے حس و حرکت ایک انسانی ڈھانچہ، دو بجھی بجھی خوابناک آنکھیں، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اس کا احساس دھیرے دھیرے سرد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس ڈھانچہ میں حرکت ہوئی، اُس نے آہستہ سے ہاتھ اُٹھا کر بالوں کو پیچھے کی طرف کیا اور پھر بتی ذرا تیز کر دی۔ کمرہ میں روشنی یوں پھیل گئی جیسے یکایک متفکر دماغ میں کوئی خیال آ جائے۔ اب اس کے خال و خد صاف نظر آنے لگے، وہ سانولے رنگ کا چوبیس پچیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ چہرہ پر پھیکا پن۔ بال بکھرے ہوئے۔ گال ذرا پچکے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں ایک لایعنی سی چمک۔ اسنے کتاب کے صفحے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر ورق گردانی کرنے لگا، کبھی دو چار ورق پیچھے اُلٹ دیتا اور کبھی دو چار ورق آگے۔ اسکے چہرہ سے ٹپک رہا تھا کہ وہ محض شغلاً ایسا کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کتاب کے صفحات پر ہوتے ہوئے بھی ان پر نہیں تھیں ——— آخر کار اس نے کتاب بند کر دی اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ کرسی پر اس طرح بے دم ہو کر بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے جسم سے بیزار ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سب ڈھیلے پڑے ہوئے تھے گو ان سے عملی قوتیں سلب کر لی گئی ہیں — سامنے دیکھتے دیکھتے جب وہ اُکتا گیا تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میز پر ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر کئی جگہ اس کے نام لکھے ہوئے تھے اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے قلم نکال کر اپنا نام لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ محض لکیریں ہی کھینچتا رہ جاتا۔ اُن تمام باتوں کے باوجود بھی وہ ان سے قطعاً غیر متعلق تھا۔ وہ نہ معلوم کہاں تھا۔ اُس کی کھوئی ہوئی آنکھیں بدستور کھوئی ہوئی تھیں۔ اس کے دماغ میں شاید کوئی خیال نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ نہ جانے کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا وہ پھر آہستہ آہستہ بالوں کو انگلیوں سے گھمانے لگا یہاں تک کہ وہ اس سے بھی گھبرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے ملائیں اور چٹ چٹ انگلیاں توڑنے لگا۔ پھر جمائی لی اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی سے گرم کوٹ اُتار کر پہنا۔ لالٹین دھیمی کی اور کمرہ سے نکل کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔

سردی اب تیز ہو چلی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی نسبتاً کم پڑ گئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کے پیر دکھنے لگے مگر وہ ٹہلتا ہی گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ صرف ایک سگریٹ رہ گیا تھا۔ ذرا سے توقف کے بعد وہ جلا کر پینے لگا۔ اب واقعی اس کے دماغ میں کچھ اُلجھے اُلجھے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ مگر وہ انھیں سلجھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ دماغ پر زیادہ زور دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ان خیالات کو صاف طور پر سمجھنا ہی چاہتا تھا۔ اُس میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ ٹہلنے کے بعد وہ پھر کمرہ میں چلا آیا۔ لالٹین تیز کی اور چارپائی کے پاس کرسی کھینچ کر اس پر رکھ دی۔ کوٹ اُتار کر اس نے میز پر پھینک دیا اور چارپائی پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا مگر اس کے سکون سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس میں جھنجلاہٹ بھری ہوئی ہے۔ ایک عجیب بے چینی اور انتشار اس کی رگ رگ میں پنہاں تھا۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سرہانے سے ایک رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اور اب اس رسالہ میں اسکے

اور کوئی جاذبیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر ایک تصویر پر جم کر رہ گئی۔

یہ ایک عورت کی تصویر تھی جس کو شاید اس سے قبل اس نے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ مگر آج وہ اس تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نگاہیں عورت کی ہنستی ہوئی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ تصویر کو ترچھا کر کے دیکھنے لگا۔ کبھی وہ اس کو دائیں طرف لیجاتا کبھی بائیں طرف۔ کبھی دور لیجاتا اور کبھی قریب لاتا مگر جس زاویہ سے بھی وہ تصویر کو دیکھتا عورت کی آنکھیں اسے اپنی ہی طرف دیکھتی معلوم پڑ رہی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بہت سی تصویریں وہ یوں دیکھ چکا تھا اور قریب قریب سب میں اس نے یہی بات پائی تھی مگر اس وقت وہ اس میں خواہ مخواہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اسی طرح جی بہلا رہا تھا کہ دروازہ پر قدموں کی آہٹ آئی اور تقریباً اسی کی عمر کا ایک نوجوان داخل ہوا۔

"کہو کیا ہو رہا ہے؟" آنے والے نے پوچھا

"کچھ نہیں اسی رسالہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا —— کہاں سے آ رہے ہو؟"

"گھر سے —— پڑھائی وڑھائی شروع کی کہ نہیں؟"

"ہاں، یہاں لڑکوں کو پڑھانے سے تو فرصت ملتی ہی نہیں تمہیں پڑھائی کی سوجھی ہے!"

"ارے بھئی تو صبح کو پڑھاتے ہو کہ شام کو؟"

"نہ صبح نہ شام!" لہجہ میں جواب نہ دینے والی کاہلی کا انداز شامل تھا۔

"کیا جھول قسم کی باتیں کر رہے ہو —— سگریٹ ہے؟"

"نہیں۔ ایک تھا پی گئے۔ اب کھانا کھانے کے بعد دوکان پر چل کر پئیں گے"

"کتنی دیر میں آئے گا کھانا؟"

"بس اب آتا ہی ہوگا، گھر کے لوگ کھا چکے ہوں گے"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے ان کے پاس کوئی اور موضوع نہیں رہ گیا ہے جس پر باتیں کریں۔ گویا دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس نہیں ہے کمرہ میں بالکل سکوت طاری تھا جو ذرا دیر بعد حسب امید سوال پر ٹوٹا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ تو نہیں"

"آخر؟" محض باتیں کرنے کی خاطر اب باتیں ہو رہی تھیں۔

"یہی کہ کھانا ابھی تک نہیں آیا"

"یا یہ کہ دنیا میں کتنے غم ہیں"

"ہٹاؤ کہاں کی بات نکالے ہوئے ہو تم بھی!" اتنے میں ملازم کھانا لیکر آ گیا "آج بڑی دیر لگائی بھئی تم نے!" گویا اس سے زیادہ کوئی دسترس وہ ملازم پر نہیں رکھتا تھا۔

"ارے صاحب بغیر سرکار کو کھلائے کیسے لاتے — اور ہاں ماسٹر صاحب سرکار نے کہا ہے کہ آپ کی تنخواہ پرسوں ملے گی"

"خیر —!" اس نے لاپرواہی سے کہا جس میں ملازم کے مقابلہ میں اپنے ذاتی وقار کی خفیف سی نمائش بھی شامل تھی۔ "آؤ بھئی کھانا کھاؤ"

"بسم اللہ کیجئے" اور وہ اس مختصر اور کم مقدار کھانے سے نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کھانے کے دوران میں بالکل خاموشی تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں محو تھے —— کھانے سے فارغ ہو کر دونوں سگریٹ لینے چل دئے۔ راستے میں بھی دونوں چپ تھے۔ وہ زبان کھولتے ہوئے ایک بار سا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس خاموشی کو توڑیں جیسے وہ ڈرتے تھے کہ اس کے بعد جو کچھ باتیں ہوں گی وہ انہیں اور بے کیف اور پژمردہ بنا دیں گی انھیں اپنے وجود کے بیکار ہونے کا احساس دلا دیں گی سگریٹ خریدنے کے بعد دونوں آہستہ آہستہ گھر کی طرف لوٹے پاس ہی کہیں سے گھنٹہ بجنے کی آواز آنے لگی انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ایک دوسری آواز ان کے دماغ کی بے اثر اور ٹھہری ہوئی آواز کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھیں

جنجھوڑ کر جگا رہی ہے ۔ دونوں دل میں گھنٹے گن رہے تھے ۔

" ایک ۔۔ دو ۔۔ تین ۔ ۔ چار ۔۔ پانچ ۔۔ چھ ۔۔ سات ۔۔ آٹھ ۔۔ نو ۔۔ ٹن سے آخری گھنٹہ بولا اور انھوں نے ایسا محسوس کیا دونوں میں سے ایک کو اب بولنا چاہئے

" نو بجے ہیں ۔۔ ماسٹر صاحب ! " ماسٹر صاحب کو کھینچ کر ادا کیا گیا ۔

" ہاں "

" لڑکیاں انگریزی سینما دیکھ کر واپس ہو رہی ہوں گی ۔ ذرا اور رک رک کر چلیے "

" فایدہ ؟ "

" گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی "

" جی ہاں سردی میں جان دینا ہے "

" جیسے اتنی دیر میں جم ہی تو جائیں گے آپ "

دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی سینما سے لوگ لوٹ رہے تھے ۔ آواز قریب آتی گئی ۔ ایک ٹانگا پاس سے ہو کر گزر گیا ۔ اس پر صرف مرد ہی تھے ۔

" لاحول ولا قوۃ "

ایک اور ٹانگے کی بھی آواز سنائی دینے لگی ۔

" اس پر ضرور ہوں گی ۔ میرا دل کہہ رہا ہے "

یہ ٹانگا بھی تیزی سے گزر گیا ۔ چند نرم و نازک ہلکے پھلکے قہقہوں کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی ۔ دونوں ٹانگے کو مڑ کر دیکھنے لگے ۔ بجلی کے دوسرے کھمبے کے پاس پہونچ کر ٹانگے پر ذرا روشنی پڑی انھوں نے دیکھا تین لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں ۔ دو کو وہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکے ۔ مگر ایک پر روشنی زیادہ پڑ رہی تھی ۔ اس کا چہرہ انھوں نے صاف طور پر دیکھ لیا ایک عجیب لاحاصل سا احساس حسن ان میں جاگ اُٹھا ۔ ابھی آنے والے ٹانگے پر وہ پہلے ہی سے متوجہ ہو گئے ۔ اس پر کی سواریوں کو انھوں نے اچھی طرح دیکھا ۔ واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں ۔

" دیکھا تم نے ! مگر دوست ان میں سے کوئی بھی تمھیں پوچھنے والی نہیں ۔ تم ہو اگر و قابل اور حساس ۔ جب تک تم چند روپیوں کے واسطے یہاں ٹکے ہوئے پڑھا رہے ہو تم ماسٹر صاحب ہی کہے جاؤ گے ۔ تمھاری دماغی قوتیں سو جائیں گی ۔ کیا تم خود نہیں محسوس کرتے کہ تم میں وہ اگلی سی چمک نہیں رہی ۔ تم دن کا بیشتر حصہ معمولی معمولی باتیں سوچنے میں گزار دیتے ہو ۔ تمھاری گفتگو بد مزہ اور پھیکی ہونے لگی ہے " وہ رو میں کہتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ خود اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے ۔ اس نے پھر خطابت شروع کر دی " کون جانتا ہے کہ تمھارے پاس اتنا بیدار دماغ ۔ اتنا پر خلوص دل ۔ اتنے لطیف جذبات ہیں ۔ تم سے بھلا کس کو محبت ہو سکتی ہے کیتنی غلط بنیادوں پر ہماری ازدواجی زندگی قایم ہے ۔ جانتے ہو زندگی کا سب سے المناک پہلو کیا ہے ۔۔ ۔ آیں ! آیں ! "

" اوں ! " وہ چونک پڑا " کس کا سب سے المناک پہلو ! "

کوٹھری آ گئی دونوں لحاف اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے

" زندگی کا سب سے المناک پہلو ! " اس نے دہرایا اور پھر سوچ میں پڑ گیا

" ہاں کیا ہے ؟ "

" شاید یہی سوچتے رہنا کہ کیا کرنا چاہئے "

" اور تنہائی ؟ "

" تنہائی ! " اس نے دھیرے سے کہا اور اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی ۔ اُسے ایک دم سے تنہائی کا احساس ہونے لگا اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے چلتے چلتے یکایک اس کی نبضیں رک گئی ہیں ۔ جیسے ساری دنیا اچانک سونی ہو گئی ہے اور وہ تن و تنہا تاریک اور مبہم خلاؤں میں سانس لے رہا ہے ۔ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے مگر اسے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے ۔۔۔ وہ تنہا ہے ۔۔ بالکل تنہا ۔ وہ کسی کو دیکھ رہا ہے نہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے ۔۔ اُسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے ۔۔

ت! کتنا خوفناک احساس! اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے! وہ ٹھٹھرنے لگا۔ اسے سردی لگنے لگی۔ اس کے تمام بدن میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو چلی۔ اس کے دوست نے اسے پھر راب سے چونکایا۔ "سنا تم نے! تنہائی! زندگی کا سب سے المناک پہلو تنہائی ہے اور اس کی بھی وجہ یہی غلط قسم کی ازدواجی زندگی ہے۔ ہماری زندگی کی ساری مسرتیں سارا حوصلہ فنا ہو جاتا ہے۔ ہم بہت جلد بے روح ہو جاتے ہیں۔ اگر عورت اچھی ہے تو اسے مرد اچھا نہیں مل رہا ہے۔ اگر مرد اچھا ہے تو اُسے مناسب عورت نہیں مل رہی ہے دونوں میں سے کسی کو بھی حسبِ خواہش ساتھی نہیں ملتا"۔

"اتنا میری طرف سے اضافہ کر دیجئے اگر دونوں مل بھی گئے تو پھر روپیہ نہیں ملتا کہ ان دونوں کو متحد کر سکے" اور اس نے پھر اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوٹھری بھی اُسے بار بار دیکھ رہی ہے۔ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"آخر تم چپ کیوں ہو جایا کرتے ہو" اس کے دوست نے خاموشی سے اکتا کر پوچھا

"اس قسم کی باتوں کا لازمی نتیجہ خاموشی کے سوا اور کیا ہے" اس نے گردن اس کی طرف پھرا کر جواب دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر اس کا دوست اپنے گھر چلا گیا —— وہ چارپائی پر یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے دماغ میں پھر کوئی خیال نہیں رہ گیا تھا۔ اور وہ پھر بیکاری محسوس کر رہا تھا کبھی وہ لالٹین تیز کر دیتا اور کبھی دھیمی۔ اس کے چہرہ پر کبھی اُجالا دوڑ جاتا اور کبھی تاریکی —— وہ بالکل خالی الذہن بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں برابر چمک رہی تھیں —— ایک اداس بے حس چمک! —— باہر رات اور زیادہ سرد اور بے جان ہو چکی تھی۔ اُس نے پھر وہی رسالہ اُٹھا لیا۔ اُس کی نظر پھر اُسی عورت کی تصویر پر پڑی جو اُسے برابر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ تصویر کو اور غور سے دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عورت کے لبوں میں جنبش ہونے والی ہے اور وہ کچھ بولنا ہی چاہتی ہے۔ وہ تصویر کو اور قریب لا کر دیکھنے لگا...... اُسے کچھ اور معلوم ہونے لگا جیسے عورت کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔ اور وہ گردش کرنے ہی والی ہیں" اُس نے اپنی آنکھوں کو چھوا خود اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں "کیا حماقت ہے بیٹھے بیٹھے! کوئی بات نہیں اور خواہ مخواہ افسردہ ہوتا چلا جا رہا ہوں" اُس نے رسالہ رکھ دیا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ پھر سوچنے لگا۔ "زندگی اور تنہائی! تنہائی اور بیکاری! آخر یہ سب کیوں ہے؟ میں تنہا کیوں ہوں میرا دل کتنی محبت کر سکتا ہے مگر مجھ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ مجھے تنہا ہی رہنا پڑے گا۔ اور میں رہوں گا بھی تنہا۔ مگر کیا واقعی ہمیشہ تنہا رہوں گا —— ہمیشہ تنہا!" اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں بند کر لیں —— سامنے لالٹین جل رہی تھی —— مگر وہ بالکل تاریکی میں تھا —— سیاہ تاریکی! —— زندگی کی بھیانک۔ خاموشی، انجان تاریکی! جس میں صرف خیالات چکر لگایا کرتے ہیں۔ جہاں عدم و وجود گھل کر ایک ہو جاتے ہیں —— وہ آنکھیں یونہی بند کئے بیٹھا تھا —— سامنے لالٹین اسی طرح جل رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ لالٹین مدھم ہو رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا تھا۔ اس نے لالٹین گل کر دی۔ کمرہ میں کامل اندھیرا چھا گیا۔ جس میں وہ بالکل گم ہو کر رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین آسمان کچھ بھی نہیں رہ گئے ہیں —— صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس میں لیٹا ہوا وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا —— اور شاید سوچ رہا تھا —— شاید —— مگر اس کی آنکھیں اندھیرے میں کون دیکھ سکتا تھا!

مجتبیٰ حسین

"نگار"

جنوری فروری سنہ ۴۱ء اور جنوری فروری سنہ ۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرما لیجئے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگا لیجئے، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اُردو شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔

مینجر نگار

سیماب صاحب اور شیطان

جناب سیماب اکبرآبادی نے شیطان کے متعلق ایک نظم "موحد اعظم" کے عنوان سے لکھی جو کسی رسالہ میں شایع ہوئی۔ اس کو پڑھکر کوئی مولوی صاحب برافروختہ ہوئے اور انھوں نے تردید لکھ دی۔ ایک شاعر صاحب کو جوش آیا، انھوں نے جواب میں ایک نظم چھپوا دی، سیماب صاحب کے دوستوں نے یہ ہنگامہ دیکھ کر نظم کی مدح سرائی شروع کی۔ مخالفوں کو جلال آیا، انھوں نے اعتراض سرزد کردئے۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ نظم کو جانچا، نہ مضمون پر غور کیا، نہ زمانہ و ماحول کو دیکھا، نہ سیماب صاحب کو سمجھا۔

(۱) اس نظم (موحدِ اعظم) کا فنِ شاعری میں کوئی مرتبہ نہیں ہے اور خود سیماب صاحب کے کلام میں بھی یہ کوئی شہپارہ نہیں۔ انھوں نے اس سے بہتر نظمیں کہی ہیں۔ نظم نہایت معمولی، چلتی ہوئی صرف لکھنے کے لئے لکھدی ہے۔

(۲) "موحدِ اعظم" میں شاعری کی غلطیاں موجود ہیں۔ جو سیماب صاحب سے بعید تھیں۔ الفاظ غلط نظم ہوئے ہیں اور بے اصول ساخت کئے گئے ہیں۔ ترکیب و بندش میں سستی و کمزوری ہے، مضامین غلط ہیں۔ شاعر کی نظر نظم کے نفس موضوع تک نہیں پہونچی، اس لئے نظم بے اثر ہوگئی ورنہ "سخن گسترانہ بات" آپڑی۔ مختصر نقصیں ملاحظہ ہوں :-

(۳) نظم کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ ہے :- "فرشتوں کا معلم، عالمِ ملکوت کا عالم"

اس میں (ملکوت) بسکونِ ثانی نظم ہوا ہے یہ غلط ہے۔ (ل) پر زبر ہونا چاہئے۔ ایک اور مصرع ہے :- "خدا کے ساتھ "آعوذ" میں استحکام ہے اسکا"

یہاں آعوذ (مد کے ساتھ) پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے، جہلا "آعوذ" کہا کرتے ہیں۔ اصل صیغہ بغیر مد کے ہے۔ یہ بجائے خود شاعر کا ضعفِ نظم ہے اور یہاں اس لئے زیادہ ہوگیا کہ اس بحر میں بغیر مد کے نظم ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس طرح کہہ سکتے ہیں :- "خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا"

تیسری جگہ سیماب صاحب فرماتے ہیں :- "سرشتاً تجھکو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت"

(۳) لفظ (سرشت) پر عربی کی تنوین بھی سیماب صاحب کے قلم سے عجیب ہے یہ بھی جاہلوں کا انداز آگیا ہے۔

(۴) سیماب صاحب یہ آمیزش عربی و فارسی اور جگہ بھی کرچکے ہیں۔ رسالہ چمنستان دہلی بابت مارچ ۱۹۲۱ء میں اپنے مضمون (شاعرحیات) کے صفحہ ۳۹ پر تحریر فرمایا ہے "و مجمع قدیم کے پابندِ ہجران العمر رئیس تھے"

اس حساب سے ان کے نزدیک "قریباً مرگ" بھی جائز ہوگا۔ یہاں زبان کی صحت اور معیار کی بحث آجاتی ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ سیماب صاحب کی غلطی مستند مانی جائے اور یہی قانون بن جائے۔ سیماب صاحب جیسے شاعر یہ آزادی اختیار کریں گے تو زبان کو بگڑتے کچھ دیر نہ لگے گی۔

(۵) سیماب صاحب کی اسی نظم کا ایک مصرع یہ ہے :- "اُدھر یہ سند کہ ہو مسجود خاکِ آدمِ اُولی"

سیماب صاحب کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اُولیٰ مونث ہے اور اوّل الذکر آدمِ اوّل کہنا چاہئے تھا۔ یہ غلطی سیماب صاحب سے ہونے کی نہ تھی۔

(۶) سیماب صاحب فرماتے ہیں :- "بمذہبِ عشق حکمِ سجدۂ آدم نمی گنجد"

یہ "ہندوستانی فارسی" ہے، ایرانی اسلوب کو اس سے کچھ تعلق نہیں — بہتر ہوتا کہ یہ مضمون بھی اُردو میں لکھ دیتے۔

(۷) ایک جگہ لکھتے ہیں :- "کبھی میں کعبۂ مسجود دروازے قیادت کے"

یہاں یہ غلطیاں ہیں :- (۱) "کعبۂ مسجود" نامانوس ترکیب ہے۔ (۲) کعبہ کبھی مسجود نہیں ہوتا۔ (۳) "کعبۂ مسجود" کہنے سے پہلے مصرع کے مقابلہ میں کوئی جدت اور بلندی پیدا نہیں ہوئی۔ (۴) اگر اختراع سے کام نہ لیتے اور وہی قدیم لفظ "کعبۂ مقصود" رکھدیتے، تو مصرع کہیں سے کہیں پہونچ جاتا یعنی شعر ہوتا۔

کبھی سجدے ہیں تیرے آستانے پر حکومت کے کبھی ہیں کعبۂ مقصود در وازے قیادت کے

کعبۂ مقصود" کہنے سے "کعبہ" میں پہلا مصرعہ کا مضمون سجدہ بھی آ گیا۔ اور مقصود کے مضمون کا اضافہ بھی ہو گیا۔

۸) سیماب صاحب نے اس نظم میں ذوق کا ایک شعر اس طرح تضمین کیا ہے :-

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۱) تضمین کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ شعر گویا اپنا کر لیا جائے۔ اس کا مضمون اپنی نظم میں کھپا لیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔

(۲) ذوق کے پہلے مصرع میں اظہار واقعہ ہے اور دوسرے میں اس کی تائید۔ سیماب صاحب جب اوپر سے شیطان کی تحسین کر رہے ہیں، تو اسکے لعین و رجیم ہونے کی تائید موزوں نہیں، جو ذوق کے مصرعۂ ثانی کا مفہوم ہے صرف پہلا مصرع کھپ سکتا ہے۔

(۳) ذوق کا شعر بے جگہ رکھا گیا ہے۔ اس سے اوپر سیماب صاحب کا جو شعر ہے، اس کے صرف پہلے مصرعہ سے ذوق کا شعر متعلق ہے یعنی ترک سجدہ سے یہ برہمی پیدا ہوئی کہ شیطان مارا گیا۔ دوسرے مصرع سے کوئی میل نہیں ہے۔ مصرعوں کی ترتیب بدل کر اس طرح تضمین درست و با معنی ہو سکتی تھی۔

قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے، کر حساب انکا وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۹) سیماب صاحب نے مرزا داغ کا یہ شعر بھی اپنی نظم میں چسپاں کیا ہے :-

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

داغ کا یہ شعر ان کے عامیانہ شعروں میں ہے، جس میں بوالہوس عاشقوں کا جذبہ و معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو ظرافت کے موقعہ پر بطور ضرب المثل کے لکھ سکتے تھے اس نظم میں اس شعر کے آنے سے نظم کا توازن اور لہجہ بدل گیا (جس کو انگریزی میں ٹون کہتے ہیں)

(۱۰) شعرائے متصوفین کو شیطان کے انکارِ سجدہ میں ایک بات سوجھی۔ لیکن وہ صرف تصوف کا ایک نکتہ اور شاعری کا ایک لطیفہ تھا، اس لئے صوفی شاعروں نے اس کو صرف مثال و نکتہ کی حد تک رکھا۔ چنانچہ کسی کی رباعی ہے :-

جعفر سخن از کعبہ و از دیر مکن در وادیِ شک چو گمرہان سیر مکن

رو شیوۂ بندگی ز شیطان آموز یک قبلہ گزین و سجدۂ غیر مکن

ایک شاعر بے نماز مسلمان کا شیطان سے مقابلہ کرتا ہے :-

شیطان ہزار مرتبہ بہتر ز بے نماز آں سجدہ پیش آدم و ایں پیشِ حق نہ کرد

ان سب سے بڑھکر حضرت خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور قصیدے میں شیطان کے متعلق ایک لطیفہ او معرفت کا ایک نکتہ بیان کیا ہے یہ مضمون ۲۰ شعروں میں لکھا ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں :-

روزے از روزہا کلیم اللہ خواست مرشد ز ایزدِ دادار

شد ندائے براے او کہ برو پیشِ ابلیس مفسداں سالار

یعنی ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالٰے سے اپنے لئے ایک ہادی و مرشد طلب کیا۔ ندا آئی کہ مفسدوں کے سالار ابلیس کے پاس جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ شیطان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالٰے نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تجھ سے ارشاد ہدایت چاہتا ہوں۔ "خواہم من از تو ارشاد" - اس کو ابلیس نے جس طرح سُنا اور جو کچھ کہا۔ اس کو خواجہ عطار نے اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ اشعار قصیدہ کے شہ بارے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

زیں سخن ہمچو شعلہ سر پیچید جست و برجائے شست ہمچو شرار

تو کلیم اللّٰہی ، نداری ننگ　　　　تو کریم اللّٰہی ، نداری عار

کہ زمن چشم داری ایں معنےٰ　　　　کہ بمن بر نویسی ایں طومار

من کجا و طریق ایں احکام　　　　من کجا و سبیل ایں اطوار

من پلنگم ، پلنگ عصمت خوار　　　　من نہنگم ، نہنگ پُر ادبار

راہ و رسم ضلالت از من پُرس　　　　مفسداں را منم سپہ سالار

یعنی شیطان نے کہا کہ میری گردن میں تو ازل سے طوق لعنت پڑا ہوا ہے۔ تجھ کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ مجھ سے تو راہ و رسم ضلالت و گمراہی پوچھ لو۔ لیکن حضرت موسیٰ نے پھر بزبان نیاز، سے اصرار کیا تو ابلیس نے "لب گوہر فشاں و شکر بار" کھولے اور

"من" مگو گفت۔ تا چو من نشوی　　　　ایں سخن را ز من بخاطر دار

یعنی اول چو من شوا سے سرہ مرد　　　　زخم اول را سپر بسینہ میار

چوں شدی ہمچو من برو پس از آں　　　　ہر چہ خواہی بگو و باک مدار

یہ جواب دیا کہ جب تک مجھ جیسے نہ ہو جاؤ "من" نہ کہو، خودی کا دعویٰ نہ کرو، اول میری طرح میدان عشق میں اس طرح زخم کھاؤ کہ کبھی ڈھال کو سینہ کے سامنے نہ کرو۔ جب مجھ جیسے ہو جاؤ تو جو چاہو کہو۔

اس طویل قصے کا ماحصل بھی وہی رباعی کا مصرع ہے — "یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن"۔ لیکن دیکھنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان تمام اسالیب بیان میں شیطان شیطان ہی کے درجہ پر رہتا ہے۔ کوئی شخص اس دھوکے میں نہیں پڑتا کہ ان بزرگوں اور شاعروں نے ابلیس کو موحد اعظم اور عارف کامل قرار دیا ہے۔ سیماب صاحب بھی حد کے اندر رہتے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن وہ فرماتے ہیں :-

خدا کے ساتھ آ عوذ میں استحکام ہی کا　　　　کلام اللہ میں سب سے زیادہ نام ہے اُس کا

کلام اللہ میں صرف نام یا ذکر کا سب سے زیادہ آنا، کوئی مدح و ستایش نہیں ہے۔ ابلیس و شیطان کے نام اگر سیماب صاحب کے شمار کے مطابق سب سے زیادہ بھی ہوں، تو اس عنوان سے ہیں کہ شیطان (بقولِ مرزا غالب) یہ کہتا ہوگا :-

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ　　　　ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

سیماب صاحب نے اپنے اس شعر میں شیطان کی مدح کرنی چاہی ہے لیکن "ہجو ملیح" ہو گئی۔

(۳) یہ دعوےٰ کہ "اُردو شعرا میں آج تک کسی نے شیطان پر نظم نہیں لکھی" صحیح نہیں — ڈاکٹر اقبال کی تصانیف دیکھنے سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

(۱) ضرب کلیم کے صفحہ ۴۲ و ۴۳ پر "تقدیر" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں ابلیس و یزداں کا مکالمہ ہے نظم کے نیچے لکھا ہوا ہے "ماخوذ از محی الدین بن عربی" اس نظم میں اقبال نے مسئلۂ تقدیر کو حل کیا ہے، وہ نکتہ اور ایسا نادر اسلوب پیدا کیا ہے کہ یہ نظم حرز جاں بنانے کے قابل ہے۔ سیماب صاحب کی نظم کے تقریباً ۵۰ شعر ہیں اور اقبال کے ۵۔ لیکن یہ پانچ اُن پچاس پر بھاری ہیں - (۲) ضرب کلیم ہی میں صفحہ ۱۴۸ پر دوسری نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" (۱) بال جبریل صفحہ ۱۹۲ پر ایک نظم ہے بعنوان "جبریل و ابلیس" (۴) بال جبریل ہی میں صفحہ ۲۱۵ پر "ابلیس کی عرضداشت" کے نام سے ایک نظم ہے۔ (۵) جاوید نامہ میں ایک نظم میں ابلیس کی مجلس شوریٰ دکھائی ہے۔ یہ اس قسم کی نظموں میں بہترین اور اختراع بدیع ہے۔

اقبال نے ان نظموں میں اور اسی قسم کی فارسی نظموں میں ابلیس کی فطرت کے مختلف پہلوؤں میں جو لطیف نکتے پیدا کئے ہیں اور جس اسلوب سے ان کو بیان کیا ہے وہ شعر و ادب کے لطائف و نوادر ہیں اور سیماب صاحب کی سطح فکر سے نہایت ارفع و اعلےٰ۔

(۴) جن علمائے کرام نے سیماب صاحب کی نظم پر اظہار خیال فرمایا، ان سے بھی مجھے عرض کرنا تھا لیکن یہ مضمون میرے ارادہ و امید سے زیادہ طویل ہو چکا۔ ہے اس لئے بہت مختصر گزارش کرتا ہوں کہ مذہبی نقطۂ نظر سے اس نظم کی اتنی طویل تنقید و تردید لاحاصل تھی۔ صحیح العقیدہ مسلمانوں کے خیالات پر سیماب صاحب کی نظم کا مطلق کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہر جاہل اور کم علم مسلمان بھی اس نظم کو سنکر لاحول پڑھے گا۔ ایسے لوگوں کے بہکنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کو سمجھانے کی تکلیف ضروری

نہ تھی - دوسرا گروہ فاسد العقیدہ انقلاب پسند مسلمانوں کا ہے - وہ خدا کے انکار اور مذہب سے بیزاری میں آپ کے وعظ و تبلیغ کی حد سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں، وہ آپ کے مضمون پر لاحول کے مترادف انگریزی الفاظ استعمال کریں گے - آجکل خدا اور مذہب سے بغاوت کی نظمیں نہایت کثیر و عام ہیں - ان نظموں کے اقتباس سے مضمون اور طویل ہوجاتا اس لئے ترک کرتا ہوں - ان کو بھی سمجھانا بیکار ہے - آپ اس ارشاد پر عمل کرتے ہیں کہ " فذکر ان نفعت الذکریٰ"- لیکن یہ لوگ منافق ہیں کہ باوجود بیدینی کے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا چاہتے ہیں - اس لئے یہ بھی یاد رہے کہ :-

" ذالک بانہم آمنوا ثم کفروا فطبع علیٰ قلوبہم فہم لایفقہون"

(۱۵) آپ رہے سیماب صاحب کے خاص شاگرد، تو ایک تلمیذ رشید کہتے ہیں :-

میری گستاخی معاف اے خالق فطرت کہ آج	تیرے قانون قضا سے کر رہا ہوں احتجاج

اور ایک طویل نظم میں موت کے خلاف احتجاج کرکے اس نتیجہ اور نصیحت پر نظم کو ختم کرتے ہیں :-

جبر ہی پر ہے اگر دار و مدار زندگی	تو یہ بہتر ہے کہ ہر انسان کرے خودکشی	(رسالہ شاعر جنوری سنہ ۱۹۳۵ء)

دوسرے شاگرد عزیز ایک طویل نظم کہتے ہیں - " اگر خدا ہے" نمونے کے طور پر دو شعر اس کے سن لیجئے :-

اگر خدا ہے تو کیوں نہیں اس کو اپنی دنیا کی فکر و پروا	ازل سے سوا ہے یوں کہ بیدار تا ابد اب نہ ہوگا گویا
اگر خدا ہے ترا بھی اے فرشتۂ نیک نام سن لے	حیات تک تو نہیں بنوں گا ترے خدا کا غلام سن لے

(رسالہ کنول آگرہ فروری سنہ ۱۹۳۶ء)

(۱۶) آخر میں خود سیماب صاحب کی سنئے - ان کو پیامی شاعر بننے کا دعویٰ ہے - چنانچہ ایک پیام دیتے ہیں :-

عشرت کی طرف نگاہ بھی میں نہ کروں	تو نغمہ سرا ہو، آہ بھی میں نہ کروں
نیکی نہیں ممکن ہے تو کیا اے ناصح	دنیا میں کوئی گناہ بھی میں نہ کروں

ہر جلوہ کہ داد خواہ ہے فطرت کا	اک عقیدۂ بے پناہ ہے فطرت کا
حیرت نہیں فطرت میں جو اسکی ہے گناہ	انسان خود اک گناہ ہے فطرت کا

سوچئے کہ ان رباعیوں میں کیا پیام ہے اور کیا دعوت عمل ہے اور غور کیجئے کہ دوسری رباعی میں شاعری کیا ہوئی اور شعری و ادبی نکتہ کیا نکلا اگر انسان کا گناہِ فطرت ہونا کسی شاعرانہ توجیہ سے بھی ثابت کیا ہوتا تو کچھ بات پیدا ہوجاتی - اس کے مقابلہ میں کسی شاعر کی اس رباعی کی لطافت و شعریت دیکھئے :-

یہ بات نہیں کہ مے پرستی ہے گناہ	مٹ جائے خودی جس سے وہ مستی ہے گناہ
پھر کیا ہے کوئی گناہ بھی وہ نہ کرے	انسان کے لئے خود اسکی ہستی ہے گناہ

سیماب صاحب نے اس طرح کے پیام اور کبھی دئے ہیں جن میں ضلالت اور گمراہی کی قیادت نظر آتی ہے - اس کے علاوہ اولیاء اللہ کی توہین بھی جائز رکھی ہے انھوں نے اپنے رسالہ شاعر میں ایک مضمون شایع فرمایا تھا - جس میں اقبال کی خودی پر تنقید کی تھی - اس میں حضرت منصور، حضرت شبلی اور حضرت سرمد کی شان میں گستاخانہ الفاظ موجود ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو :-

" خودی کے ایک معنی ہیں خود کو کچھ سمجھنا یعنی انانیت - اور یہ بھی شعائر انسانی میں ایک شعار غیر مستحسن ہے منصور بن حلاج، شبلی اور سرمد کو اگر سوسائٹی صوفی اور خدا شناس کہکر خودی و خود نمائی کے گناہ سے بری کردے تو فرعون، شداد اور ہامان وغیرہ خودنما انسانوں پر تعریض، درحقیقت عصبیت کا ایک مظاہرہ ثابت ہوتی ہے اور کچھ نہیں، ورنہ مسلک دونوں طبقوں کا ایک ہے"- (شاعر آگرہ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے محض تعصب سے فرعون و شداد و ہامان کو اولیاء الشیاطین مان رکھا ہے اور انھیں جیسے خودنما انسانوں منصور، شبلی و سرمد کو اولیاء اللہ میں شامل کرلیا ہے - نعوذ باللہ من ذالک !

یہ اعتراضات اس وجہ سے ہیں کہ سیماب صاحب کی طرف سے بار بار دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ پیامی شاعر ہیں ان کا کلام ملک و قوم کے لئے ایک پیغام ہے

ہو تو کچھ بات نہیں۔ ان سے پہلے کتنے فارسی و اُردو شاعروں نے خدا اور انبیاء و اولیاء کو کیا کیا کہا ہے۔ غالب و مومن، امیر و داغ وغیرہ سب اس حمام میں برہنہ ہیں۔ ان میں سے کسی نے پیغامبر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ صرف شاعری کی ہے۔ رسمی شاعری جس میں طریقت و معرفت، اخلاق و موعظت کے ساتھ ساتھ رندی و بدمستی و عیاشی کے مضامین بھی تھے۔ وہ لوگ شعر کو "برائے گفتن" سمجھتے تھے اس لئے ناگفتنی بھی کہہ جاتے تھے۔ نہ پرہیزگاری کا دعویٰ تھا، نہ رندی کا۔ اسی لئے کسی نے ان کے "کلمات کفر" پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

سیماب صاحب بھی پیامی و شاعر اعظم، مصلح اعظم بننے کا دعویٰ چھوڑ دیں سب اعتراضات اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر بقول خواجہ عطار کے، "ہر چہ خواہی بگو و پاک مدار"

"الحق"

(ن) حضرت سیماب کی نظم "محاکمہ" کچھ عرصہ سے مولویوں اور شاعروں میں موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ اس دوران میں متعدد مقالے اور استفسارات ہمیں بھی موصول ہوئے۔ چند استفسارات کا جواب تو خطوط کے ذریعہ سے دے دیا گیا لیکن مقالوں کی اشاعت غیر ضروری سمجھی گئی۔ لیکن چونکہ اس مقالہ کے آخری حصہ میں ایک اصولی بحث آگئی ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مقالہ نگار نے جو اعتراضات شاعری کے متعلق کئے ہیں، اس کا جواب دینا سیماب صاحب کے ذمہ ہے، لیکن مذہب کو سامنے رکھ کر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا جواب دینا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو مذہب کو مجموعۂ "مزخرفات" نہیں سمجھتا۔

سیماب صاحب نے اس نظم میں اس وقت کے مدعیان مذہب پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بحالات موجودہ جبکہ ہر مولوی ایک بت بنا ہوا ہے، شرک نے ایسی خطرناک عمومی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ سوائے "شیطان" کے اب کوئی صحیح معنے میں "موحد" نظر نہیں آتا۔

یہ درست ہے کہ نظم کے بعض حصے بہت سادہ ہے، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر نے شیطان کی شان میں قصیدہ لکھا ہے، بلکہ ایک تقابلی نفسیاتی مطالعہ معلوم ہوتا ہے، جس میں عہد حاضر کے حامیان مذہب کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

اس وقت تک مولویوں کا فتوائے کفر و الحاد صرف نثر نگاروں تک محدود تھا، لیکن اب شعراء بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، سچ ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں !

نگار کے پچھلے پرچے

(۱۹۲۹ء) - جنوری عہ ر - (۱۹۳۰ء) - اگست عہ ر - (۱۹۳۰ء) مئی عہ ر - (۱۹۳۱ء) جولائی ۸ ر - اگست ۸ ر - ستمبر عہ ر - نومبر ۸ ر - دسمبر ۸ ر - (۱۹۳۲ء) - جنوری ۱۲ ر - فروری عہ ر - مارچ عہ ر - مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ - نومبر عہ ر - (۱۹۳۳ء) فروری عہ ر - (۱۹۳۴ء) - فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ - (۱۹۳۶ء) دسمبر عہ ر - (۱۹۳۷ء) جنوری ۱۲ ر - (۱۹۳۷ء) - جنوری عہ ر - فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر عہ ر - (۱۹۳۸ء) جنوری ۱۲ ر، فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (۱۹۳۹ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ - (۱۹۴۰ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (۱۹۴۱ء) جنوری، فروری ۱۲ ر - مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (۱۹۴۲ء) جنوری فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی ۸ ر فی پرچہ -

منیجر نگار

پورب اور پچھم ——— دو ہواؤں کا تصادُم

یعنی

چین کے معاشرتی انقلاب کا نفسیاتی مطالعہ

(بہ سلسلۂ ما سبق)

جب میں نے اپنے گھر کو خیرباد کہا اور اُس سُرخ کُرسی پر بیٹھی جس پر بیٹھ کر دلہن شوہر کے گھر جاتی ہے تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکوں گی مجھے اس خیال سے اُس وقت مسرت تھی کہ میرا جسم ہلکا پھلکا اور خوبصورت ہے اور میرے چہرے کی ساخت بیضاوی ہے جس کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا شوہر بھی میری شکل دیکھ کر خوش ہوگا۔

شراب کی رسم کے موقع پر میں نے اپنی نقاب کے ریشمی تاروں سے اُس کو دُزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت قسم کے سیاہ ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کا جسم لانبا تھا بانس کی طرح سیدھا تھا۔ میرا دل بیک وقت سرد بھی ہوا اور اُچھلنے بھی لگا۔ میں تو دل ہی دل میں اُس کو دیکھنے کے لئے مر رہی تھی، مگر اُس نے میری طرف نظریں بھی نہیں اُٹھائیں ہم نے ایک ساتھ شراب پی اور ایک ساتھ اُس کی خاندانی لوح کے سامنے سر جھکایا اور پھر میں نے اُس کے پاک اجداد کے سامنے بھی سر خم کیا۔ لیکن اُس نے مجھے قطعاً نہیں دیکھا۔

اُسی رات دعوت اور فلک شگاف قہقہوں کے بعد میں حجلۂ عروسی میں تنہا بیٹھی تھی اور خوف سے دبی جا رہی تھی۔ زندگی کا وہ لمحہ جس کے متعلق میں سوچا کرتی تھی، جس کا مجھے ڈر بھی تھا اور جس کی آرزو بھی، بالآخر آ ہی گیا۔ اُس نے آہستہ سے نقاب سرکائی اور غور سے میری صورت دیکھی، وہ دیر تک دیکھتا رہا، گویا اُس نے میری شکل پسند کی۔ پھر میرے سرد ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لئے۔ میری ماں نے مجھے تعلیم دی تھی کہ :- "گرم جوشی سے سرد مہری بہتر ہوتی ہے اور شراب کا ذائقہ بن شہد کی اُس شیرینی سے اچھا ہوتا ہے، جس سے طبیعت فوراً سیر ہو جائے۔ اگر تم نے اس کو یاد رکھا تو تمھارے شوہر کی طبیعت تم سے کبھی بھی سیر نہ ہوگی۔"

یہی وجہ تھی کہ میں نے اُس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی، میرے شوہر نے بھی شاید اس کو محسوس کر لیا چنانچہ اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھ الگ کر لئے۔ پھر اُس نے پرخلوص سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا اُس کی آواز بیحد دلکش تھی، گہری مردانہ آواز۔ میرا بدن مارے شرم کے کانپنے لگا، پہلے تو میں اُس کی باتیں سمجھ ہی نہیں پائی، پھر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"آج پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمھیں ہم سے محبت ہو ہی جائے گی۔ یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے ہم لوگ اب تک اِس معاملہ میں قطعاً بے بس تھے۔ لیکن اب جبکہ ہم دونوں تنہا ہیں اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نئے طریقوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہر معاملہ میں تم کو میں اپنے برابر سمجھوں گا اور کسی بات کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ تم میری ملکیت یا منقولہ جائداد نہیں ہو۔ ہاں اگر چاہو تو میری دوست بن سکتی ہو۔"

بہن! یہ تھیں وہ باتیں جو مجھے اپنی شادی کی پہلی رات میں سُننی پڑیں۔ پہلے تو میں اُس کا مطلب ہی نہیں سمجھی اور پھر جب میں نے سمجھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی — میں اُس کے برابر ہوں؟ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ کیا میں اُس کی بیوی نہیں ہوں؟ اگر وہ میری رہبری نہ کرے گا تو کیا کوئی باہر سے مجھے راستہ بتانے آئیگا؟ کیا قانوناً وہ میرا مالک نہیں ہے؟ مجھے کسی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اور میں کرتی کیا اگر اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی؟ شادی کرنے کی میرے پاس اور کونسی صورت تھی سوا اس کے کہ میرے والدین جو رشتہ پسند کریں میں اُسے قبول قبول کر لوں؟ جس کے ساتھ میں بچپن سے منسوب ہو چکی تھی، اُس کے علاوہ اور کس سے میں شادی کرتی؟ یہ سب تو بالکل دستور کے مطابق ہوا تھا۔ اس میں زبردستی کا کیا سوال ہے۔

اُس کے الفاظ میرے کان میں گونج رہے تھے کہ "یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے" میں ڈر کے مارے بیہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ کیا وہ

بات نہ ہو تو کچھ بات نہیں۔ ان سے پہلے کتنے فارسی و اردو شاعروں نے خدا اور انبیاء و اولیاء کو کیا کیا کہا ہے۔ غالب و مومن، امیر و داغ وغیرہ سب اس حمام میں برہنہ ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے پیغامبر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ صرف شاعری کی ہے۔ رسمی شاعری جس میں طریقت و معرفت، اخلاق و موعظت کے ساتھ ساتھ رندی بیباکی بد دینی و عیاشی کے مضامین بھی تھے۔ وہ لوگ شعر کو "برائے گفتن" سمجھتے تھے اس لئے ناگفتنی بھی کہہ جاتے تھے۔ نہ پرہیزگاری کا دعویٰ تھا، نہ رندی کا اعلان۔ اسی لئے ... نے ان کے "کلمات کفر" پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

سیماب صاحب بھی پیامی شاعر اور مصلح امم بننے کا دعویٰ چھوڑ دیں سب اعتراضات اٹھتے جاتے ہیں۔ پھر بقول خواجہ عطار کے، "ہر چہ خواہی بگو و پاک مدار"

"الحق"

(نگار) حضرت سیماب کی نظم "معبد اعظم" کچھ عرصہ سے مولویوں اور شاعروں میں موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ اس دوران میں متعدد مقالے اور استفسارات ہمیں بھی موصول ہوئے، چنداستفسارات کا جواب تو خطوط کے ذریعہ سے دیدیا گیا لیکن مقالوں کی اشاعت غیر ضروری سمجھی گئی۔ لیکن چونکہ اس مقالہ کے آخری حصہ میں ایک اصولی بحث آگئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مقالہ نگار نے جو اعتراضات شاعری کے متعلق کئے ہیں، اس کا جواب دینا سیماب صاحب کے ذمہ ہے، لیکن مذہب کو سامنے رکھ کر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا جواب دینا ہر اس شخص کا فرض ہے جو مذہب کو مجموعہ "مزخرفات" نہیں سمجھتا۔

سیماب صاحب نے اس نظم میں اس وقت کے رہبران مذہب پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بحالات موجودہ جبکہ ہر مولوی ایک بت بنا ہوا ہے، شرک نے ایسی خطرناک عمومی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ سوائے "شیطان" کے اب کوئی صحیح معنے میں "موحد" نظر نہیں آتا۔

یہ درست ہے کہ نظم کے سب و لہجہ میں تلخی زیادہ ہے، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر نے شیطان کی شان میں قصیدہ لکھا ہے، بلکہ ایک تقابلی نفسیاتی مطالعہ معلوم ہوتا ہے، جس میں عہد حاضر کے حامیان مذہب کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

اس وقت تک مولویوں کا فتوائے کفر و الحاد صرف نثر نگاروں تک محدود تھا، لیکن اب شعراء بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، سچ ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں !

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء)۔ جنوری عہ ر۔ (سنہ ۲۹ء)۔ اگست عہ ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (سنہ ۳۲ء)۔ جنوری ۱۲ ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ ۳۳ء)۔ فروری عہ ر۔ (سنہ ۳۴ء)۔ فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۱۲ ر۔ (سنہ ۳۷ء)۔ جنوری عہ ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (سنہ ۳۸ء) جنوری ۱۲ ر، فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۹ء)۔ جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۰ء)۔ جنوری عہ ر، فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۱ء) جنوری، فروری ۱۲ ر۔ مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی ۸ ر فی پرچہ۔

منیجر نگار

پورب اور پچھم ——— دو ہواؤں کا تصادم

یعنی

چین کے معاشرتی انقلاب کا نفسیاتی مطالعہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جب میں نے اپنے گھر کو خیرباد کہا اور اُس سُرخ کُرسی پر بیٹھی جس پر بیٹھ کر دلہن شوہر کے گھر جاتی ہے تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکوں گی مجھے اس خیال سے اُس وقت مسرت تھی کہ میرا جسم ہلکا پھلکا اور خوبصورت ہے اور میرے چہرے کی ساخت بیضاوی ہے جس کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا شوہر بھی میری شکل دیکھ کر خوش ہوگا۔

شراب کی رسم کے موقعہ پر میں نے اپنی نقاب کے ریشمی تاروں سے اُس کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت قسم کے سیاہ بریشمی کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کا جسم لانبا ہو بانس کی طرح سیدھا تھا۔ میرا دل بیک وقت سرد بھی ہوا اور اُچھلنے بھی لگا۔ میں تو دل ہی دل میں اُس کو دیکھنے کے لئے مر رہی تھی مگر اُس نے میری طرف نظریں بھی نہیں اُٹھائیں ہم نے ایک ساتھ شراب پی اور ایک ساتھ اُس کی خاندانی لوح کے سامنے سر جھکایا اور پھر میں نے اُس کے پاک اجداد کے سامنے بھی سر خم کیا۔ لیکن اُس نے مجھے قطعاً نہیں دیکھا۔

اُسی رات دعوت اور فلک شگاف قہقہوں کے بعد میں حجلۂ عروسی میں تنہا بیٹھی تھی اور خوف سے دبی جا رہی تھی۔ زندگی کا وہ لمحہ جس کے متعلق میں سوچا کرتی تھی، جس کا مجھے ڈر بھی تھا اور جس کی آرزو بھی، بالآخر آہی گیا۔ اُس نے آہستہ سے نقاب سرکائی اور غور سے میری صورت دیکھی، وہ دیر تک دیکھتا رہا، گویا اُس نے میری شکل پسند کی۔ پھر میرے سرد ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لئے۔ میری ماں نے مجھے تعلیم دی تھی کہ:۔ "گرم جوشی سے سرد مہری بہتر ہوتی ہے اور شراب کا بدذائقہ پن شہد کی اُس شیرینی سے اچھا ہوتا ہے، جس سے طبیعت فوراً سیر ہو جائے۔ اگر تم نے اس کو یاد رکھا تو تمھارے شوہر کی طبیعت تم سے کبھی بھی سیر نہ ہوگی"۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اُس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی، میرے شوہر نے بھی شاید اس کو محسوس کر لیا چنانچہ اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھ الگ کر لئے۔ پھر اُس نے پُرخلوص سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا اُس کی آواز بیحد دلکش تھی، گہری مردانہ آواز۔ میرا بدن مارے شرم کے کانپنے لگا پہلے تو میں اُس کی باتیں سمجھ ہی نہیں پائی، پھر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"آج پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمھیں ہم سے محبت ہو ہی جائے گی۔ یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے ہم لوگ اب تک اِس معاملہ میں قطعاً بے بس تھے۔ لیکن اب جبکہ ہم دونوں تنہا ہیں اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نئے طریقوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہر معاملہ میں تم کو میں اپنے برابر سمجھوں گا اور کسی بات کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ تم میری ملکیت یا منقولہ جائداد نہیں ہو۔ ہاں اگر چاہو تو میری دوست بن سکتی ہو"۔

بہن! یہ تھیں وہ باتیں جو مجھے اپنی شادی کی پہلی رات میں سننی پڑیں۔ پہلے تو میں اُس کا مطلب ہی نہیں سمجھی اور پھر جب میں نے سمجھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی ——— میں اُس کے برابر ہوں؟ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ کیا میں اُس کی بیوی نہیں ہوں؟ اگر وہ میری رہبری نہ کرے گا تو کیا کوئی باہر سے مجھے راستہ بتانے آئیگا؟ کیا قانوناً وہ میرا مالک نہیں ہے؟ مجھے کسی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اور میں کرتی کیا اگر اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی؟ شادی کرنے کی میرے پاس اور کونسی صورت تھی سوا اس کے کہ میرے والدین جو رشتہ پسند کریں میں اُسے قبول قبول کر لوں؟ جس کے ساتھ میں بچپن سے منسوب ہو چکی تھی، اُس کے علاوہ اور کس سے میں شادی کرتی؟ یہ سب تو بالکل دستور کے مطابق ہوا تھا۔ اس میں زبردستی کا کیا سوال ہے۔

اُس کے الفاظ میرے کان میں گونج رہے تھے کہ "یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے"۔ میں ڈر کے مارے بیہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ کیا وہ

میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا !

بہن ! میں سخت کرب و بےچینی میں مبتلا تھی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھے مل رہی تھی۔ اول تو بولنے کی میرے اندر ہمت نہیں تھی . . . . اور اگر ہمت بھی ساتھ دیتی تو ان باتوں کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ پھر اُس نے اپنا ایک ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا میں بہت پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ اُٹھا لے۔ میں اُس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ اُس کی آواز کچھ مدہم مگر تلخ تھی۔

"وہی ہوا جس کا مجھ کو ڈر تھا۔ تم اپنی اصلی خواہشوں کا اظہار مجھ سے نہ کرو گی۔ تم نہیں کر سکتی ہو۔ رسم و رواج کی بندشیں تم نہ توڑو گی اور آج کے لئے تم کو جو تعلیم دی گئی ہے تم اُس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ اچھا میری ایک بات سُنو۔ میں تم کو باتیں کرنے کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ صرف ایک چھوٹی سی بات چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر تم میرے ساتھ نئے راستے پر چلنا پسند کرتی ہو تو اپنا سر اک ذرا سا جھکا دو"

وہ میری طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے ہاتھ بڑی تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف جُھک رہے ہیں۔ ان باتوں سے اس کا کیا مطلب تھا ؟ آج واقعات نے متوقع شکل کیوں نہیں اختیار کی ؟ میں تو اُس کی بیوی تھی اور اُس کے بچے کی ماں بننا چاہتی تھی۔ میرے غم کی ابتدا اُسی وقت سے ہوتی ہے اور غم کا یہ بوجھ نہ تو دن کو کم ہوتا ہے اور نہ رات کو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور میں نے تو حماقت میں اُس وقت اپنا سر بھی جھکا دیا۔

"میں تمھارا بڑا ممنون ہوں" وہ تو مارے خوشی کے اُچھل پڑا، اُس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر سے ہٹا لئے اور اُس نے کہا "اب تم اس کمرے میں آرام کرو۔ یاد رکھو کہ آج یا کبھی بھی تم کسی چیز سے ڈرنا نہیں۔ اچھا اب تم لیٹو۔ آج میں بغل کے چھوٹے کمرے میں سوؤں گا"

وہ تیزی سے گھوم کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اے رحم کی دیوی، ماں ان (Kwan yin) ! میرے حال پر رحم کر ـــ میرا سن ہی کیا تھا، میں تو بالکل بچہ تھی، اکیلی ڈر رہی تھی۔ آج تک میں گھر کے باہر کبھی نہیں سوئی تھی۔ لیکن آج تنہا لیٹی تھی اور مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ شوہر کی نظروں میں کوئی وقعت میں نہیں حاصل کر سکی۔

پریشانی میں دوڑ کر میں دروازے کی طرف گئی کہ شاید بھاگ کر ماں کے گھر پہونچ سکوں، لیکن بھاری آہنی دروازوں پر جوں ہی میرے ہاتھ پڑے میں اس خیال سے چونک پڑی کہ میں تو اب کبھی بھی اس گھر سے نہ جا سکوں گی۔ اور پھر اگر میں مکان کے نا آشنا حصوں کو پار بھی کر لوں تو سڑکوں سے بھی تو میں ناواقف ہوں۔ اور اگر کسی دکسی طرح اپنے گھر کے دروازوں پر بھی میں پہونچ جاؤں تو اب وہ دروازے میرے استقبال کے لئے نہیں کُھل سکتے۔ اور اگر بوڑھا دربان رحم کھا کر دروازے کھول بھی دے تو میری ماں فوراً مجھے واپس کرے گی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میری ماں غمگین مگر تحکمانہ انداز میں مجھے واپس جانے کا حکم دے رہی تھی۔ اب اُس گھر سے مجھے کوئی تعلق نہ تھا ـــ میں نے آہستہ سے اپنا عروسی جوڑا تبدیل کیا اور الگ تہ کر کے رکھ دیا۔ میں دیر تک اُس چوڑی مسہری کے کنارے بیٹھی رہی جس کے چاروں طرف پردے پڑے تھے۔ میں اندر گھستے ہوئے اپنے سایہ سے ڈرتی تھی۔ اس وقت بھی اُس کی گفتگو میرے دماغ کی چار دیواری سے ٹکرا رہی تھی۔ بالآخر آنسو طوفان کی طرح میری آنکھوں میں اُمنڈ آئے، میں منہ اوڑھ کر رونے لگی اور روتے روتے میری آنکھ لگ گئی۔

بہت صبح میری آنکھ کھلی۔ میں پہلے تو اپنے کو ایک اجنبی جگہ پا کر کچھ گھبرا سی گئی لیکن جلد ہی کل واقعات مجھے یاد آ گئے۔ میں اُٹھ کر جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگی ساتھ میں خادمہ گرم پانی لے کر آ گئی۔ اُس نے مسکرا کر مستفسرانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھ کو خوشی تھی کہ میں نے اپنی ماں سے تمکنت کے سارے انداز سیکھ لئے تھے۔ آخر کسی کو یہ کیوں معلوم ہو کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکی۔

"یہ پانی اُس کمرے میں لے جاؤ" میں نے پرشکوہ آواز کے ساتھ حکم دیا "تمھارا آقا وہاں لباس تبدیل کر رہا ہے"

میں نے فخر کے ساتھ اپنا کمخواب کا جوڑا زیب تن کیا اور زیور پہنے۔

میری شادی کو ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اِس عرصہ میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے ہماری زندگی کو ایک معمہ سا بنا دیا ہے۔

اُس نے آبائی مکان کو خیرباد کہہ کر اب ہم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اُس نے تو اپنی محترم ماں کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ وہ خود سر واقع ہوئی ہے اور وہ اپنی بیوی کو گھر کی لونڈی نہیں بنانا چاہتا۔

یہ سب باتیں دراصل ایک معمولی سی بات سے پیدا ہوئیں۔ جب شادی کی دعوتیں ختم ہوئیں تو میں اپنی ساس کی خدمت میں حاضر ہوئی اور رسم کے مطابق

تے صبح کے وقت خادمہ کو گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ پانی پیتل کے تسلے میں لیکر ایک خادمہ کے ہمراہ اپنی ساس کے کمرہ کی طرف چلی۔ میں نے سر خم کرکے لجاجت کے ساتھ کہا کہ:

"میں التجا کرتی ہوں کہ اس پانی سے ہاتھ منہ دھو کر آپ میری عزت افزائی فرمائیں"

اپنے بستر پر ساٹن کی ریشمی رضائی اوڑھے پہاڑی دیو کی طرح لیٹی تھی۔ وہ اُٹھی تو اُس کے چہرہ پر نظر ڈالنے کی میں جرأت نہ کرسکی۔ اُس نے فارغ ہونے کے بعد تسلا ہٹانے اور مت پھینکا اشارہ کیا۔ تسلا ہٹاتے ہوئے میرے ہاتھ نہ جانے ریشمی پردوں میں اُلجھے یا ڈر کے مارے اُن میں لرزش پیدا ہوگئی، بہرحال ایک ذرا سا پانی بستر پر گر پڑا۔ ڈر کے مارے جسم میں خون کی گردش رک گئی میری ساس نے اپنی بھاری آواز میں ڈانٹ کر کہا:— "بہو کیوں ہی کام کرنا چاہیئے؟"

میں جانتی تھی کہ ایسے موقعہ پر اپنی صفائی میں بولنا بدتہذیبی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن تسلا سنبھالتے ہوئے میں باہر آگئی۔ اُس وقت میرا شوہر بھی اُدھر گزر رہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اُس کا چہرہ مارے غصہ کے سُرخ تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ مجھ ہی پر خفا نہ ہو کہ پہلے ہی موقعہ پر اُس کی ماں کو میں خوش نہ کرسکی۔ ں نے اپنے آنسو خشک کرنے کی بھی ہمت نہ کی اگرچہ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ ڈھلک کر گالوں تک آچکے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا:— "یہ تسلا پھسلتا ہے اور ———"

"میں تم کو الزام نہیں دیتا" اُس نے میری بات کاٹ کر کہا "میں اپنی بیوی سے نوکروں کا کام نہ لوں گا۔ میری ماں کے پاس سیکڑوں نوکر ہیں"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اُس کی ماں کی تابعداری کروں گی۔ میری ماں نے مجھے وہ سب کچھ سکھلایا ہے، جس کی ایک بہو کو ضرورت ہوتی ہے۔ میں بڑی انکساری کے ساتھ اُس کے سامنے آؤں گی اور اُس کی موجودگی میں برابر سر جھکائے کھڑی رہوں گی۔ اُسے مسند میں لے جاکر بٹھاؤں گی۔ اُس کی پیالی میں گرم گرم چائے لے کر دونوں ہاتھوں سے اُس کے سامنے پیش کروں گی۔ لیکن میرا شوہر تو ارادہ کرچکا تھا۔ اُس نے میری ایک بھی نہ سُنی ——— یہ سمجھنا چاہیئے کہ معاملہ آسانی سے طے ہوا۔ اُس کے والدین کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہم لوگ رواج کے مطابق آبائی مکان ہی کی چھت کے نیچے زندگی بسر کریں۔ اُس کا باپ پڑھا لکھا آدمی ہے اُس کی کمر علم کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ اپنے کمرہ میں وہ آبائی لوح کے نیچے بیٹھا تھا، اُس نے اپنی مختصر سی داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیر کر کہا:— "بیٹا، تم یہیں رہو۔ میرا جو ہے وہ آخر تمھارا ہی تو ہے۔ جب تمھارے گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں ہے تو پھر محنت کرنے سے کیا حاصل۔ تم آرام کے ساتھ زندگی گزارو اور کتابیں پڑھا کرو جس کا تم کو وق ہے۔ یہیں تمھارے بال بچے ہوں جس سے ہمارا گھر آباد ہو۔ ایک چھت کے نیچے تین پشتوں کو رہتے دیکھ کر دیوتا بھی خوش ہوتے ہیں"

میرا شوہر بڑا ہی جلد باز ہے۔ اُس نے باپ کے سامنے سر جھکائے بغیر جواب دیا کہ "محترم باپ! میں محنت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے جس کو فرنگ میں سب سے زیادہ شریفانہ پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ رہا اولاد پیدا کرنا، میں اس کو پہلا درجہ نہیں دیتا۔ میں تو اپنے ملک کی بھلائی کے لئے پہلے اپنے دماغ کا پھل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جسمانی پھل تو کتے بھی پیدا کرلیا کرتے ہیں"

میں دروازے کے پاس پردوں سے لگی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ میرا جسم خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ کی پہلی اولاد ہوتا یا اُسے پرانے زمانہ کی تعلیم ملی ہوتی تو وہ ایسی باتیں نہ کرتا۔ یا اگر برسوں اُن ملکوں میں اُس نے زندگی نہ گزاری ہوتی جہاں چھوٹے بڑوں کی عزت نہیں کرتے تو وہ اپنے باپ کو اس نالائقی کے ساتھ جواب نہ دیتا۔ لیکن رخصت ہوتے وقت اُسنے کافی سعادتمندی کا ثبوت دیا اور اپنے والدین کو یقین دلایا کہ اُس کے پہلو میں لائق اولاد کا دل ہے۔ لیکن وہ الگ ہو ہی گیا

یہ نیا مکان عجب طرح کا ہے۔ ایسا مکان میں نے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ ہے اور اُسی کمرے سے اور کمروں میں جانے کے دروازے بھی ہیں اور اوپر جانیکا زینہ بھی۔ پہلی مرتبہ جب میں اُس زینہ پر چڑھی تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور تب گری۔ میرے پاؤں اوپر چڑھنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے میں تو زینہ پر بیٹھ گئی اور لکڑی کی ریلنگ پکڑے پکڑے اوپر چڑھی۔ لکڑی کا رنگ میرے کوٹ میں بھی لگ گیا۔ کوٹ میں نے فوراً بدلا۔ میرا شوہر اُس کو دیکھ کر میرا مضحکہ اڑانے لگا۔ وہ بہت زور سے اور تیزی کے ساتھ ہنستا ہے۔ میں تو اُسکے قہقہے سے ڈرتی ہوں

ایسے گھر میں فرنیچر لگانے کا مسئلہ آسان نہ تھا۔ میں نے ایسا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اِن کمروں سے کوئی کام لیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ میں جہیز کا کچھ سامان ساتھ لائی تھی، ایک میز، ایک بڑی کرسی اور ایک چوڑی سی مسہری جو اُس مسہری کے برابر تھی جو میری ماں کو جہیز میں ملی تھی۔ یہ میز اور کرسی تو میرے شوہر نے اُس کمرہ میں لگائی جسے وہ "کھانے کا کمرہ" کہتا ہے۔ اور بڑی مسہری جس کے متعلق مجھے خیال تھا کہ اس پر میرا لوکا جنم لے گا، وہ اوپر کے کسی کمرہ میں نہیں آئی میں نوکروں کی طرح بانس کے پلنگ پر سوتی ہوں اور میرا شوہر لوہے کے پلنگ پر لیٹتا ہے، جو ایک بنچ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ میں اتنی تبدیلی کی عادی نہیں ہوسکتی۔

مکان کا بڑا کمرہ جسے وہ "بیٹھک" کہتا ہے، وہاں اُس نے خرید کر کچھ نئی کرسیاں ڈالی ہیں۔ یہ عجیب سی ہیں اور بدشکل ہیں۔ اُن میں کوئی کرسی بھی

ایک دوسرے سے مشابہ نہیں، اور بعض کرسیاں تو بالکل معمولی بید کی بنی ہیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہے اور چند گلدان رکھی ہیں۔ کتنا برا معلوم ہوتا ہے ـــــ دیواروں پر اُس نے چند جو کو تصویریں لٹکائی ہیں۔ یہ اُس کے اُستادوں کی تصویریں ہیں۔ جا بجا اُس نے کچھ کپڑے بھی ٹانگے ہیں جن پر ریشمی حرفوں میں کچھ لکھا ہے نہیں نے پوچھا کہ کیا یہ اُس کی سند ہے۔ اس پر وہ بڑی زور سے ہنسا اور پھر مجھکو اپنی سند لا کر دکھلائی جعلی ایسے کاغذ پر کالے کالے حرفوں میں کچھ لکھا تھا اُس نے اُنگلی رکھ کر اپنا نام مجھے دکھلایا جو ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا تھا۔ سب سے اوپر کالج کا نام لکھا تھا، جہاں اُس نے تعلیم پائی تھی۔ سب سے نیچے اُس فن کا نام لکھا تھا جس کا اُس نے امتحان پاس کیا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ "یہ سند کیا ہماری پرانی طبی سند بان لن کے برابر ہے؟" میرے سوال پر بھی وہ بہت ہنسا اور بتلایا کہ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ سند ایک بڑے بورڈ کے نیچے میں مہمانوں کے بیٹھنے والے کمرے میں بھی اُس جگہ ٹنگی ہے جہاں میری ماں نے اپنے مہمانوں والے کمرے میں پہلے منگ بادشاہ کی تصویر لٹکائی ہے ـــــ مغربی انداز کے اس خوفناک مکان کو میں شاید ہی کبھی "اپنا گھر" سمجھ سکوں۔ بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن میں چاول کے کاغذ کی جگہ بڑے بڑے شیشے لگے ہیں جن سے آر پار دکھائی دیتا ہے۔ تیز دھوپ سفید دیواروں کو چمکا دیتی ہے اور ذرا سی گرد بھی اگر فرنیچر پر پڑ جائے تو وہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ میں ایسی بے پناہ روشنی کی بالکل عادی نہیں ہوں۔ اگر میں لبوں پر سرخی یا بھووں پر چاول کا پاؤڈر ملتی ہوں، جس کی مجھ کو تعلیم دی گئی ہے تو یہ تیز روشنی اس درجہ اس کو نمایاں کر دیتی ہے کہ میرا شوہر کہہ اُٹھتا ہے کہ "خدا کے لئے تم یہ سب نہ کیا کرو، مجھے تو قدرتی عورت پسند ہے۔"

مگر سرخی یا پاؤڈر استعمال نہ کرنا تو حسن کو نامکمل چھوڑ دینے کے مصداق ہے اور یہ تو ایسے ہے کہ میں بالوں میں برش تو کروں لیکن تیل نہ لگاؤں یا جوتے تو پہنوں مگر وہ بالکل سادے اور بے کڑھے ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ چینی گھروں میں کھڑکیاں جھلملی دار ہوتی ہیں اس لئے چینی عورتوں کے چہروں پر روشنی ہلکی پڑتی ہے لیکن اس مکان میں کیونکر اُسے خوبصورت معلوم ہو سکتی ہوں۔

یہ کھڑکیاں بھی عجیب احمقانہ انداز کی ہیں۔ میرے شوہر نے سفید کپڑا خرید کر کچھ پردے مجھ سے سلوائے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ کون طریقہ ہے کہ پہلے تو دیوار میں بڑا سوراخ کر کے شیشہ جڑا گیا، اب اُس شیشے پر پردے ڈالے جائیں گے ـــــ مکان کا فرش لکڑی کا بنا ہے۔ میرا شوہر جب اپنے ولایتی جوتے پہن کر اُس پر چلتا ہے تو بہت آواز ہوتی ہے۔ اب اُس نے ایک چوکھٹی سی اونی پھولدار چیز فرش پر ڈال دی۔ اس پر بھی مجھکو بڑا تعجب ہوا کہ ایسی خوبصورت اور قیمتی چیز جوتوں سے روندی جائے، مجھے کوڑ کر نوکر تھوک کر اس کو خراب نہ کر دیں، جب میں نے یہ بات اپنے شوہر سے کہی تو وہ بیحد خفا ہوا اور کہا کہ فرش تھوکنے کے لئے نہیں ہوتا۔

"فرش پر نہیں تو پھر آدمی کہاں تھوکنے جائے؟"

"گھر کے باہر" اس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

نوکروں کے لئے یہ مشکل تھا۔ اور خود میں تو اکثر بھول جاتی اور تربوز کے بیج فرش پر ڈال دیتی۔ اب اُس نے اگالدان خرید کر ہر کمرے میں رکھ دئیے ہیں اور اس میں تھوکنے کی ہدایت کی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ جس کپڑے سے منہ پونچھتا ہے، اُس کو پھر جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہ بھی کتنی گندی مغربی عادت ہے۔

آہ! بعض وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں لیکن جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ ان حالات میں ماں کو تو میں صورت دکھلا نہیں سکتی اور دوسری جگہ نہیں ہے جہاں مجھے پناہ مل سکے۔ بہرحال زندگی کے دن گزر رہے ہیں۔ دن اور تنہائی کے وقت کسی نہ کسی طرح کٹ ہی رہے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ کام کرتا ہے، بالکل مزدور کی طرح اپنا پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرتی پڑتی ہے۔ گویا وہ ایک معزز امیر کبیر خاندان کا نہیں بلکہ کسی غریب مزدور کی اولاد ہے۔ صبح کو آفتاب کے بلند ہونے سے پہلے وہ باہر چلا جاتا ہے اور پھر میں شام تک اس مکان میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ مکان کے اندر سب نئے نوکر ہیں، آپس کی باتیں سن سن کر میں شرمایا کرتی ہوں۔ اکثر میں تو سوچتی ہوں کہ ماں کی چار دیواری میں بند رہنا اور ساس کے ساتھ میں زندگی گزارنا اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہاں کم از کم قہقہے کی آوازیں تو سنائی دیا کریں گی۔ یہاں تو مکان کی دیواروں پر ہر وقت خاموشی اداسی کی طرح چھائی رہتی ہے۔ میں دن بھر بیٹھی یہ سوچا کرتی ہوں کہ اُس کے دل پر کیسے قابو حاصل کروں ـــــ روزانہ صبح اُٹھتی ہوں اور پھر اُس کے جانے کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہوں۔ چاہے رات بھر سارے جسم کے درد سے نیند نہ آئی ہو مگر سویرے اُٹھ کر گرم پانی سے ہاتھ منہ دھو کر تیل وغیرہ استعمال کرنا نہیں بھولتی تاکہ اُس کے سامنے لیپ سکوں۔ میں جس قدر بھی سویرے اُٹھوں وہ مجھ سے پہلے ہی اُٹھ چکا ہوتا ہے میں روزانہ اُس کو میز پر پڑھتے پاتی ہوں۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔ آہستہ سے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھماتی ہوں۔ یہ بھی کتنے عجیب و غریب ہینڈل ہیں۔ اُن کو کھولنے کے لئے مجھے کتنی بار مشق کرنا پڑی ہے۔ اب بھی روزانہ اُس کی غیر موجودگی میں ان کو کھولنے کی مشق کرتی ہوں تاکہ اُس کے سامنے جلدی سے کھول سکوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی صبح کے وقت میرا ہاتھ پھسل ہی جاتا ہے اور میں جلدی کھول نہیں پاتی ہوں۔ میرا

لگتا ہے کیونکہ اُس کو آہستگی سے نفرت ہے۔ چلتے وقت وہ بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے جسم کو جنبش دیتا ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کسی وقت وہ اپنے جسم کو مجروح نہ کرلے۔

اُس کو اپنے جسم کے تحفظ کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ روزانہ صبح کو ناشتے میں جب گرم چائے اُس نے سامنے میں پیش کرتی ہوں تو وہ اُس کو قبول کرنے کے لئے بھی اپنی نظریں کتاب سے نہیں ہٹاتا۔ میں ہر روز صبح نوکر کو بیکار ہی کے پھول لانے کے لئے بھیجتی ہوں۔ اُن کی خوشبو تو وہاں ان کتابوں کے اندر نہیں گھس سکتی۔ بارہ دنوں میں گیارہ دن یہ ہوتا ہے کہ جب میں اُس کی غیر موجودگی میں کمرے کے اندر یہ دیکھنے جاتی ہوں کہ اُس نے چائے پی یا نہیں تو میں دیکھتی ہوں اُس نے تو پیالی کا ڈھکن بھی نہیں کھولا ہے اور پیالہ کی پتیاں برابر تیر رہی ہیں۔ اُس کو کتابوں کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میری ماں نے شوہر کو خوش کرنے کے جتنے جتن بتلائے تھے میں نے سب کو آزما دیکھا۔ میں نے لذیذ کھانے پکائے۔ نوکر کو بھیج کر مرغ کا تازہ گوشت منگایا، بانگو سے بانس کی تازہ مچھلیاں منگوائیں، سرخ مچھلیاں، ادرک، سرخ شکر اور سویابین کی چٹنی منگوائی۔ میں نے سب کھانے بڑی محنت سے طیار کئے ان کو خوش ذائقہ اور خوشبودار بنایا جب سب چیزیں طیار ہوگئیں تو میں نے نوکر کو ہدایت کی روزانہ جو کھانا ہوا کرتا ہے جب وہ کھایا جاچکے تب یہ کھانے لانا آئیں۔ شوہر خوش ہو کر کہہ اٹھے گا:۔ "اچھے اچھے کھانے بعد کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ یہ تو شاہی کھانے ہیں"۔ لیکن جب یہ کھانے لگائے گئے تو اُس نے ان کو ایسی خاموشی کے ساتھ کھایا کہ گویا یہ تو روزانہ ہوا کرتے ہیں۔ اُس کے منھ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ میں بڑے شوق سے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، مگر وہ تو بالکل خاموش تھا۔ بانس کی مچھلیاں تو اُس نے اِس طرح کھائیں جیسے وہ گویا بھی ہے جو کسی کھیت سے منگالی گئی ہے ــــ رات کو جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ کھانے اُسے پسند نہیں ہیں، اسی وجہ سے وہ خاموش رہا۔ اور چونکہ وہ خود کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کرتا ہے اس لئے میں کسی نوکر کو اُس کی ماں کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجوں کہ اُس کو کونسے کھانے پسند ہیں۔ میں نے یہی کیا۔ اس کی ماں نے جواب دیا کہ "سمندر پار جانے سے پہلے تو اُسے بط کا بھنا ہوا گوشت جو جنگلی بیر کے سرکہ میں تر کیا گیا ہو پسند تھا لیکن برسوں تک مغربی باشندوں کے وحشیانہ اور کچے پکے کھانے کھانے کے بعد، اُس کو اچھے کھانوں کی کوئی خواہش نہیں رہی"۔

میں یہ سنکر خاموش ہوگئی۔ میرے شوہر نے مجھ سے ابتک کسی چیز کی فرمائش نہیں کی شاید اُس کو کوئی ایسی ضرورت ہی پیش نہیں آئی جس کو میں پورا کرسکوں۔

اِس گھر میں آنے کے کوئی پندرہ دن بعد، ہم لوگ شام کو کمرہ میں بیٹھے تھے۔ میں جس وقت وہاں پہونچی تو میرا شوہر ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ سامنے والے صفحہ پر ایک تصویر تھی جس پر میری نظر پڑی۔ یہ ایک آدمی کی تصویر تھی جو سیدھا کھڑا تھا۔ لیکن میں یہ تصویر دیکھ کر ڈر گئی کیونکہ یہ صرف ڈھانچہ ہی ڈھانچہ تھا اور گوشت کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی کہ وہ اِس قسم کی کتابیں کیوں پڑھتا ہے۔ لیکن میری زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

میں بید کی عجیب سی کرسی پر جو وہیں پڑی تھی بیٹھ گئی۔ میں سیدھی بیٹھی رہی اور پیچھے کی طرف ٹیک نہیں لگائی کیونکہ کھلی جگہ پر اس طرح بیٹھنا نازیبا سمجھا جاتا ہے مجھے رہ رہ کر اپنی ماں کا گھر یاد آرہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس وقت لوگ رات کا کھانا کھانے کے لئے جمع ہو رہے ہوں گے ــــ میرے باپ کی داشتہ عورتیں اور اُنکے شور مچانے والے بچے، سب موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں جمع ہوں گے۔ میری ماں اپنی جگہ پر میز کے کنارے بیٹھی نوکروں کو گرم گرم ترکاریاں اور چاول لانے اور سب کے سامنے تیلیاں رکھنے کا حکم دے رہی ہوگی۔ کھانے کے بعد میرا باپ اندر آئے گا اور اپنی داشتہ عورتوں کے بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلے گا۔ کام ختم کرنے کے بعد سب نوکر صحن میں اپنے اپنے اسٹول پر رات کو بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میری ماں اُسوقت میز پر بیٹھ کر باورچی سے دن بھر کے خرچ کا حساب لیگی اور اُسوقت سرخ بتی کی روشنی اُس پر پڑے گی۔

میں وہاں جانے کے لئے بے قرار تھی ــــــــــــــــ میں اس وقت وہاں پھولوں کی کیاری پر ٹہل کر غور کیا کرتی تھی کہ نئے پودے نکلنے شروع ہوئے یا نہیں کیونکہ بہار شروع ہوچکی تھی اور یہی زمانہ اُن کے نکلنے کا تھا۔ چاند کے کچھ بلند ہونے کے بعد میری ماں مجھسے ستار لانے کے لئے کہتی اور پھر وہ اپنے پسندیدہ نغمے الاپنا شروع کرتی۔

اِس خیال کے ساتھ ہی میں اپنا ستار لانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ستار کو اُس کے خانہ سے نکالا، جس کے اندر موسیقی کی آٹھ روحوں کی تصویریں سیپی سے کھدی ہوئی ہیں۔ خود ستار میں تاروں کے نیچے طرح طرح کی لکڑیاں لگی ہیں۔ جب تاروں سے سر چھوٹتے ہیں تو اُس وقت اُن سروں میں یہ لکڑیاں اپنے حسین نغموں کا بھی اضافہ کردیتی ہیں۔ یہ ستار اور اُس کا خانہ میری دادی کے لئے اُن کے باپ نے اُس وقت خریدا تھا جب پاؤں باندھے جانے پر انھوں نے اپنا رونا موقوف کیا تھا۔

میں نے آہستہ سے ستار ... [illegible] ... کو چاندنی رات میں خاموش

نی کے کنارے کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر بجانا چاہئے۔ اُس وقت اس کے نغمے زیادہ میٹھے اور سریلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس نامانوس اور سنسان کمرے میں اُس کی دازبھی کمزور نکل رہی تھی۔ پہلے میں نے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن پھر میں نے سنگ کے زمانہ کا ایک پرانا نغمہ شروع کیا۔ میرے شوہر نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔

"یہ تو بہت اچھا نغمہ ہے" اُس نے کہا "مجھ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم یہ بھی جانتی ہو۔ میں تم کو کچھ دنوں میں پیانو خرید دوں گا اور تم مغربی موسیقی بھی سیکھ لینا" اور پھر اُس نے کتاب پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور میں اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ستار بجا رہی تھی اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت میں کیا بجا رہی ہوں نے پیانو کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں یہ بدیشی چیز لے کر کیا کروں گی؟ پھر یکایک میری اُنگلیاں رک جاتی ہیں، میں ستار ایک طرف رکھ دیتی ہوں اور سر جھکا کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی ہوں — میرا شوہر بڑی دیر کے بعد اپنی کتاب بند کر کے میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔

"کیوہی لین" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

میرا دل اُچھل پڑا۔ آج پہلا موقعہ تھا جبکہ اُس نے نام لے کر مجھ کو پکارا ہے۔ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں نے شرمیلے پن کے ساتھ اپنی نظریں اُٹھائیں۔

"شادی کے بعد سے برابر میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم سے پیر کھول ڈالنے کی استدعا کروں۔ یہ تمھارے سارے جسم کے لئے بیحد مضر ہے۔ دیکھو تمھاری ہڈیاں اس طرح لی معلوم ہوتی ہیں"

اس نے پنسل اُٹھائی اور اپنی کتاب کے ورق پر پیر کی ایک ٹیڑھی میڑھی سی تصویر بنادی جو بالکل میرے پیر کی نقل تھی۔ اُس کو میرے پیر کی شکل کیسے معلوم ہوئی؟ یں نے تو آج تک اُس کی موجودگی میں جوتے بھی نہیں پہنے تھے۔ ہم چینی عورتیں کبھی کسی کے سامنے اپنا پیر نہیں کھولتے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی ہم لوگ موزے پہنے رہتے ہیں۔

"تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ اور مغرب میں میں نے یہ سیکھا ہے" اس نے جواب دیا۔ "اچھا تو میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ ان کو کھول ڈالو کیونکہ یہ خوبصورت بھی نہیں معلوم ہوتے اور پھر اب پیر باندھنا فیشن میں بھی تو داخل نہیں رہا۔ اس کا تم پر کچھ اثر ہوتا ہے"۔ اُس نے مسکرا کر مجھے دیکھا، اُس کی نظروں میں مہربانی تھی۔ لیکن میں نے جلدی سے اپنے پیر کرسی کے نیچے چھپا لئے۔ میں اُس کے الفاظ سنکر جھینپ میں پڑ گئی تھی۔ کیا میرے پیر واقعتاً خوبصورت نہیں ہیں؟ مجھ کو تو اب تک ان پر بڑا ناز رہا ہے۔ میرے بچپن کے زمانہ میں میری ماں نے ہمیشہ میرے پاؤں کی خود دیکھ بھال کی اور اُن کی بندش کی مضبوطی روزانہ بڑھائی گئی۔ جب میں درد کے مارے چیخنے لگتی تو وہ کہتی کہ اسی کی بدولت ایک دن تمھارا شوہر تمھارے پیروں کے حسن کی تعریف کرے گا۔

میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے اپنا منہ پھیر لیا۔ مجھ کو اس وقت وہ دن اور وہ راتیں یاد آرہی تھیں جب مارے تکلیف کے میں تڑپا کرتی تھی، نہ کھانے کو جی چاہتا تھا اور نہ کھیلنے کو۔ میں اپنے پلنگ کے کنارے بیٹھ کر پیر کو ہلاتی تھی تاکہ اس سے خون کا بوجھ کچھ کم ہو اور ذرا سا سکون ہو جائے۔ اور اتنے دنوں تک مصیبت برداشت کرنے کے بعد جب اِدھر کچھ دنوں سے تکلیف کم ہوئی ہے تو آج معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت نہیں ہیں۔

"نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی" ...ر نے آنسو پیتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے یہ انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کی زیادہ پرواہ تھی۔ بلکہ میں نے سوچا کہ حسین پھولدار جوتوں میں پڑے ہوئے پیر جب اُس کی محبت نہ حاصل کر سکے تو پھر اب اس کی کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی مجھ سے محبت کرے گا چین کے دستور کے مطابق، دو ہفتہ کے بعد میں اپنے گھر پہلی بار روانہ ہوئی۔ میرے شوہر نے پھر پیر کھولنے کے متعلق دوبارہ کچھ نہیں کہا اور نہ پھر اُس نے مجھے نام لیکر پکارا ہی۔

تم پریشان تو نہیں ہو رہی ہو میری بہن؟ اچھا تو میں پھر شروع کرتی ہوں:—

مجھ کو رخصت ہوئے اگرچہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے مگر مجھ کو تو محسوس ہوتا تھا کہ چاند اس عرصہ میں اپنی گردش سیکڑوں بار پوری کر چکا ہے۔ رخصت ہوتے وقت میں بلکہ کم پُرامید تھی اور خوفزدہ بھی تھی اور اب جبکہ ایک بیاہی عورت کی حیثیت سے میں واپس آئی ہوں، جب میری چوٹی جوڑے میں تبدیل ہو چکی ہے اور میری پیشانی اُن بالوں سے پاک ہو گئی ہے جو ناکتخدائی کی نشانی ہیں — تو اب بھی میں کم و بیش پہلے ہی جیسی لڑکی ہوں، پہلے سے زیادہ خوفزدہ، زیادہ تنہا اور کم پُرامید۔

میری ماں، اپنے حقہ پر جھکی ہوئی پہلے صحن تک میرے استقبال کے لئے آئی۔ مجھ کو وہ پہلے سے کچھ زیادہ پریشان نظر آئی، یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اُس

آج زیادہ عرصہ کے بعد دیکھا تھا۔ بہر حال اُس کی آنکھوں کی غم انگیزی کے اضافہ نے مجھے اُس سے اور بھی قریب تر کر دیا۔ اُس کے سامنے سر خم کرنے کے بعد میں نے اُس کے بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے اور خود اُس نے بھی آہستہ سے میرے ہاتھ دبائے۔ ہم لوگ ایک ساتھ زنانہ مکان کے صحن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آہ! میں بھی کس قدر حریصانہ انداز میں ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ہر چیز میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوگی مگر نہیں ہر چیز صحن میں پہلے کی طرح اپنی جگہ پر سوا اس کے کہ جب داشتہ عورتوں، اُن کے بچوں اور نوکروں نے مجھے دیکھا تو وہ سب ہنستے اور چلاتے ہوئے میرے گرد جمع ہو گئے۔ اوائل خزاں کا سورج پھول کی پر چمک رہا تھا، صحن کے پتھروں کو جگمگا رہا تھا اور تمام جھاڑیوں اور تالاب پر اُس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمروں کے جنوبی حصہ کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھ تھیں تا کہ گرمی اور دھوپ وہاں تک پہونچ سکے چنانچہ آفتاب کی کرنیں چھت کی رنگین اور نقشی کڑیوں تک پہونچ رہی تھیں۔ اگرچہ مجھ کو اس کا پورا احساس تھا کہ اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں رہی لیکن اس کے باوجود میری روح اپنے حقیقی آشیانے میں خوش تھی۔

میں صرف ایک کمی محسوس کر رہی تھی۔

"تیسری داشتہ کہاں ہے؟" میں نے اپنی ماں سے سوال کیا

میری ماں نے ایک لونڈی کو حقہ بھرنے کے لئے آواز دیتے ہوئے کہا:۔ "تم نے لاسے کے متعلق سوال کیا تھا؟ ہاں میں نے اُسے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے د بھیج دیا ہے۔

اُس کے انداز سے میں سمجھ گئی کہ زیادہ سوال کرنا بے سود ہے اور شام کو جب میں اپنے پرانے بچپن والے کمرے میں سونے کا انتظام کر رہی تھی تو پہلے کی طر وانگ ڈاما میرے بالوں میں برش کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا کہ میرا باپ ایک چوتھی داشتہ کا اضافہ کرنے و جو پیکنگ کی ایک رقاصہ ہے اور جس نے جاپان میں تعلیم حاصل کی ہے اور میرے باپ کی تیسری داشتہ کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے تو جان ہی دینے کر لیا تھا۔ وہ ہیرے کی جو انگوٹھی پہنے ہوئے تھے، اُس کا نگ وہ کھا گئی اور دو دن تک کسی کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔

بالآخر میری ماں کو اس کا پتہ چلا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کو بلوایا جس نے اُس کی کلائی اور اُس کے ٹخنوں میں سوئیاں بھونکیں لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہ پڑوسی نے ولایتی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر میری ماں اس کے لئے مستعد نہ ہوئی کیونکہ ہم لوگوں کو ولایتی آدمیوں کا کچھ حال نہیں معلوم اور اس کے ء غیر ملکی آدمی کو یہ کیونکر پتہ چل سکتا ہے کہ چینی کو کیا مرض ہے؟ غیر ملکی ڈاکٹر اپنے لوگوں کا مرض سمجھ سکتے ہیں جو متمدن اور پر پیچ چینیوں کے مقابلہ میں وحشی او ہیں۔ اتفاقاً اُس وقت میرا بھائی بھی گھر پر "آٹھویں چاند" کا تہوار منانے آیا تھا، وہ خود جا کر ایک ولایتی ڈاکٹرنی کو بلا لایا۔

ڈاکٹرنی اپنے ساتھ ایک عجیب سا اوزار لائی، جس میں ایک لمبی سی نلی لگی تھی۔ اور اُس اوزار کو اُس نے مریض کے حلق میں گھسیڑ دیا اور اُسی کے ساتھ آ گیا۔ ہر شخص سوا اُس ڈاکٹرنی کے اس بات پر بیحد متعجب تھا۔ ڈاکٹرنی نے خاموشی کے ساتھ اپنا اوزار اُٹھایا اور باہر چلی گئی، جیسے یہ کوئی بڑی بات ن

دوسری داشتہ عورتیں اُس سے بیحد خفا تھیں کہ اُس نے اتنی قیمتی چیز کیوں برباد کی۔ چنانچہ موٹی عورت نے کہا:۔

"اس سے اچھا تھا کہ تم دیا سلائی کی تیلیوں کو چبا لیتیں جو ایک پیسہ میں بہت سی ملتی ہیں"

لیکن اُس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کی حالت آہستہ آہستہ رو بہ اصلاح تھی لیکن اِس عرصہ میں کسی نے اُس کو کھاتے پیتے یا نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت پردے ڈالے ہوئے پلنگ پر پڑی رہتی۔ اُس کو اپنی ناکامی کا بڑا صدمہ تھا اور اُس کا چہرہ بالکل اُتر گیا تھا۔ میری ماں کو اُس پر آیا اور اُس نے اُس کو باہر بھیج دیا تا کہ لوگوں کے طنز سے وہ محفوظ رہے۔

یہ چھوٹی سی بات تھی اسی وجہ سے میری ماں نے شاید اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ مگر چونکہ مجھے اس گھر سے بیحد اُنس ہے اس لئے میں نے سارا قصہ تفصیل وانگ ڈاما سے سنا۔ یہ ہمارے گھر کی پرانی خادمہ تھی اور اُس کو ہم سب لوگوں کا ذرا ذرا معلوم تھا۔ وہ در اصل میری ماں کے ساتھ شادی سے اُس کی ش پر آئی تھی۔ اُس نے میری ماں کے سب لڑکوں کو کھلایا ہے اور اب جب میرے بھائی کی شادی ہوگی اور اُس کے بچہ ہوگا تو اُس کو بھی یہی کھلائے گی۔

میں نے اپنی خادمہ سے جو قصے سنے اُن میں ایک بات بہت اہم تھی اور وہ یہ کہ میرے بھائی نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری ماں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور وانگ ڈاما صبح کے وقت جب میرے منہ دھونے [illegible] تو اُس نے بتایا کہ پہلے تو میرا باپ اپنے لڑکے کے اس خیال پر بہ

و بھی اس کے لئے بالآخر تیار ہو ہی گیا کہ وہ امریکہ پڑھنے کے لئے جائے۔ کیونکہ اب تو باہر پڑھنے جانا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ میری ماں نے جب میرے باپ کا فیصلہ تو وہ بہت رنجیدہ ہوئی اور شاید اتنا صدمہ اُس کو اُس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب میرے باپ نے پہلی داشتہ عورت کے ساتھ شادی کی تھی۔ اُس نے تین دن تک رکھا یا اور نہ کسی سے بولی لیکن میرے بھائی پر جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور کسی طرح وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آیا تو میری ماں نے کوشش کی کہ جانے سے پہلے پنی منسوبہ کے ساتھ شادی کرے۔ میری ماں نے کہا کہ "تم شاید اس سے انکار نہ کر سکو گے کہ تمہارا گوشت و خون صرف تمہارا ہی گوشت و خون نہیں بلکہ اس پر دوسرا دل حق حاصل ہے۔ اب جب کہ سب کی مرضی کے خلاف تم نے وحشی ملک میں جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو جانے سے پہلے اپنی منسوبہ کے ساتھ شادی کر لو اور اپنے اجداد ن پاک ورثہ کو جو تمہاری پشت میں محفوظ ہے دوسرے کے جسم میں منتقل کر دو تا کہ سلسلۂ نسل جاری رہے۔ اور اگر خدانخواستہ تم وہاں مرجاؤ تو میں اپنے پوتے ہی کو دیکھ کر ہ حاصل کر لیا کروں گی۔"

میرے بھائی نے جواب دیا۔ "شادی کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو زندگی میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پیاری ماں، میں ں مرجاؤں گا اور آپ کے پاس صحیح و سالم واپس آؤں گا۔ میں جب واپس آؤں گا تو پھر —"

اس جواب کے بعد میری ماں نے اپنے شوہر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے کو کسی طرح شادی کے لئے طیار کرے، لیکن وہ بہت ہی لاپرواہ قسم کا انسان ، اور اُس وقت اپنی نئی داشتہ کا معاملہ کر رہا تھا، اُس کو ان باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ بالآخر میرا بھائی یوں ہی کنوارا امریکہ چلا گیا۔

مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ میرا باپ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اس طرح سے میرا بھائی ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہوا تو نسل ہی منقطع ہو جائے گی میری ماں کے اور لڑکے کو بچپن ہی میں داغ دے چکے تھے اس لئے یہ میرے بھائی کا فرض تھا کہ جلد سے جلد شادی کر کے اولاد پیدا کرے تا کہ میری ماں اپنے فرض سے روش ہو کر میرے اجداد کی روح کے سامنے سرخرو ہو۔ وہ بچپن ہی سے خاندان لی کی لڑکی کے ساتھ منسوب ہو چکا ہے۔ میں نے خود لڑکی کو نہیں دیکھا ہے لیکن سنا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اُس کی بدصورتی کی میری ماں کی خواہش کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

کئی دن تک مجھے اپنے بھائی کی اس نافرمانی کی بڑی تکلیف رہی۔ میری ماں نے اس کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اس غم کو بھی اپنی روح کی گہرائی میں ہ کر لیا۔ یہ اُس کی عادت تھی کہ جب کوئی مصیبت آ ہی جاتی تو اُس کا وہ خاموشی کے ساتھ مقابلہ کرتی اور لبوں کو سی لیتی۔ چنانچہ میں بھی جانی پہچانی صورتوں اور نے در و دیوار کی فضا میں اپنی ماں کا غم آگیں اور پرسکوت چہرہ دیکھنے کی عادی ہو گئی۔

گھر بھر کی آنکھیں جو سوال مجھ سے کر رہی تھیں وہ وہی تھا جس سے میں ڈر رہی تھی — میں ماں بننے والی ہوں یا نہیں؟ لوگ مجھ سے سوال کرتے اور میں خوبصورتی ساتھ سر کے اشارے سے ٹال جاتی۔ میں نے یہ چھپانے کی پوری کوشش کی کہ میرا شوہر میری پرواہ نہیں کرتا ہے۔ لیکن میں اپنی ماں کو دھوکا نہیں دے سکی۔

گھر جانے کے ساتویں دن میں اُس دروازے کے قریب بیٹھی تھی جو صحن کے سامنے تھا۔ شام ہو رہی تھی اور سب نوکرات کے کھانے کے انتظام میں مشغول تھے۔ ہوا ، مچھلی اور بطے کے گوشت کے بھونے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور فضا گل داؤدی کی خوشبو سے معطر تھی۔ میرے اندر گھر کی اور قدیم گرد و پیش کی محبت جوش مار رہی تھی۔ میں ی محبت کے ساتھ ہر ایک نقش و نگار پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور اُس جگہ آپ اپنے کو بالکل محفوظ پا رہی تھی جہاں میرا بچپن اس طرح گزرا تھا کہ اُس کے گزرنے کا مجھے احساس ں نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس جگہ کی ہر چیز سے اُنس تھا، شام کی خاموش تاریکی سے جو آہستہ آہستہ گھر کی ترچھی چھتوں پر قبضہ جماتی، اُس مومی روشنی سے جو کمروں کو منور کرتی انے کی خوشبو سے، بچوں کی چلاہٹ سے اور اُن کے جوتوں کی نرم آواز سے جو زمین پر جوتوں کے پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آہ! میں قدیم چینی گھرانے کی بیٹی ہوں، جہاں پرانا تھ، پرانا فرنیچر اور پرانے مضبوط اور قدیم رشتے پائے جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہاں کس طرح زندگی گزاری جاتی ہے۔

پھر مجھے اپنا شوہر یاد آیا جو اپنے مغربی مکان میں میز کے قریب اپنے ولایتی انداز کے کپڑے پہنے اس وقت بیٹھا ہوگا۔ وہ ہر طرح سے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں ں کی اس زندگی کے ساتھ کیسے میل کھا سکتی ہوں؟ اُس کو تو میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگی، میں نے کبھی بھی اپنے اس قدر تنہا نہیں محسوس کیا تھا۔ اب مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اُس میں سوا تلخی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے تاریکی کی سمت سے اپنی آنکھیں پھیریں اور میرے گالوں سر دھیمی دھیمی روشنی پڑنے لگی۔ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی اور میں اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کھانے کے کمرے میں اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

میری ماں آج معمول سے کچھ پہلے اپنے کمرے میں چلی گئی اور داشتہ عورتیں بھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں داخل ہو گئیں۔ میں اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ وانگ ڈا امود ار

ہوئی اور کہا کہ:-

"تمہاری محترم ماں تم کو یاد کر رہی ہیں"

"لیکن انھوں نے تو کہا تھا کہ وہ سونے جا رہی ہیں" میں نے سوال کیا۔

"نہیں میں تو وہیں سے آ رہی ہوں" اُس نے جواب دیا "انھوں نے تم کو بلایا ہے"

خادمہ صحن کی طرف چلی گئی اور میں آہستہ سے پردہ سرکا کر ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاموشی کے ساتھ بستر پر پڑی تھی ا! میز پر اُس کی بغل میں لمبی سی ایک بتی جل رہی تھی۔ میں نے اس طرح سے اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا۔ وہ بالکل کمزور اور زرد معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور لب کچھ کھلے ہوئے سے تھے۔ میں آہستہ سے جا کر بستر کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ پہ کوئی رنگ نہ تھا، بالکل سنجیدہ، نازک، رنج آگیں چہرہ۔

"ماں" میں نے آہستہ سے کہا

"بیٹی" اُس نے بھی اسی طرح جواب دیا

میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ مجھے بیٹھنے کو کہ رہی ہے یا کھڑے رہنے کو۔ پھر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا — میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی؛ دل میں سوچا کہ شاید وہ میرے بھائی کے خیال سے پریشان ہے جو پردیس میں پڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ میرے بھائی کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ میری طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا:-

"بیٹی! میرا خیال ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ جب سے تم واپس آئی ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری، تکلی سی آسودگی تم سے رخصت ہو چکی ہے۔ تمہاری روح مضطرب رہا کرتی ہے اور تمہاری آنکھوں میں بہت جلد آنسو آ جایا کرتے ہیں۔ اگرچہ تمہارے لب خاموش ہیں مگر صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی غم ہے جو ہر وقت تمہارے دل سے ہم آغوش رہتا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے؟ اگر تم کو اس کا دکھ ہے کہ اب تک تم حاملہ نہیں ہوئیں۔ تو صبر کرو ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ میں نے شادی کے دو سال تمہارے باپ کو بچے کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس طرح اپنے غم کا اظہار کروں۔ ریشمی پردے کا ایک تار میرے قریب لٹک رہا تھا۔ میں اُسی سے کھیل رہی تھی اور خاموش تھی۔ خیالات کا میرے دماغ میں ایک تلاطم سا تھا۔

"بولو" میری ماں نے کچھ تحکمانہ انداز میں کہا۔

میں نے اُس کی طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میں کچھ نہ بول سکی۔ اُن کی موجیں بڑھتی گئیں۔ میری سانس پھولنے لگی اور میں نے سسکیاں لینی شروع کیں۔ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا اور اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے" میں نے روتے ہوئے کہا "وہ کہتا ہے کہ تم میرے برابر ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس کو میرے پیروں سے نفرت ہے اور اُن کی تصویر کھینچتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اُس نے میرے پیر کیسے دیکھے جبکہ آج تک میں نے اپنا پیر کبھی بھی اُس کے سامنے کھولا نہیں ہے"

"اُس کے برابر؟" میری ماں اُٹھ بیٹھی اور سوال کیا "اس سے اُس کا کیا مطلب ہے؟ تم اپنے شوہر کے برابر کیونکر ہو سکتی ہو؟"

"مغرب میں عورتیں" میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"ہاں" میری ماں نے کہا "وہ لوگ تو وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور تمہارے پیر کی تصویر کیوں اُتارتا ہے؟ کیا مطلب کیا ہے؟"

"یہ بتلانے کے لئے کہ میرے پیر بدصورت ہیں" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پیر؟ میں نے تم کو بیس جوڑ جوتے دئے ہیں۔ یقیناً تم نے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہ لیا ہوگا"

"وہ میری ہڈیوں کا خاکہ اُتارتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹیڑھی ہیں"

"عورت کے پیر کی ہڈی آج تک کسی نے بھلا دیکھی ہے؟ کس کی آنکھیں گوشت کے اندر گھس سکتی ہیں؟"

"وہ کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں، مجھے اندر کا حال معلوم ہے"

"میری بدنصیب بیٹی!" اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "تو کیا وہ مغرب کے جادو سے بھی واقف ہے؟"

"اُس کو تو اس کی پروا نہیں ہے کہ میرے بچہ ہو۔ اُس کو مجھ سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔ میری پیاری ماں میں تو اب تک کنواری ہوں"

پھر خاموشی چھا گئی اور میں نے اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا جو دیر تک وہیں رکھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھی کہنے لگی:۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمھاری تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں۔ مجھکو یقین ہے کہ کوئی شریف چینی مرد تم سے ناخوش نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمھاری شادی دشمن کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ تو لنگ خاندان کا فرد ہے۔ اُس پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اُس کے پردیس میں برسوں رہنے کا قصور ہے۔ اس خیال سے میں ار... بھائی کے وہاں جانے سے پہلے اُس کا مر جانا بہتر سمجھتی تھی" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر لیٹ گئی۔ جب اُس نے پھر بولنا شروع کیا تو اُس کی آواز سے تھکن ٹپک رہی تھی۔

بیٹی! اس دنیا میں عورت کے لئے بہرحال ایک اور صرف ایک راستہ ہے جس پر وہ چل سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اُسے اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا چاہئے اس کا بیحد دکھ ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ جتنی محنت کی تھی سب اکارت جا رہی ہے۔ اب میرے خاندان سے تم کو کوئی تعلق نہیں رہا اور تم اپنے شوہر کی ہو چکیں اب سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم اپنے شوہر کو خوش کرو۔ اچھا تم ایکبار اُس کو ہاتھ میں لینے کی پھر کوشش کرو۔ گہرے سبز اور سیاہ کپڑے پہنو، عطر اور کنول کا پانی استعمال کرو۔ لبوں کی خفیف جنبش کے ساتھ مسکرایا کرو، جس میں کچھ شرم کا بھی پہلو ہو۔ تم اُس کے ہاتھ میں نے کر اُن کو آہستہ سے دباؤ۔ اگر وہ ہنسے تو تم بھی خوش ہو۔ اور اگر اب بھی وہ خوش نہ ہو تو اُس کی مرضی کے آگے سر جھکا دو"

"کیا میں اپنے پیر بھی کھول ڈالوں؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا — میری ماں نے کچھ دیر سوچا۔

"ہاں" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "یقیناً کھول ڈالو، اب زمانہ بدل گیا ہے"

اچھا تم اب جاؤ

محمد عتیق صدیقی

باب الاستفسار

فلکیات کے بعض مسائل

(جناب سید حیدر رضا صاحب - پالن پور)

اس سے قبل نگار میں فلکیات کے متعلق بڑے اچھے اچھے مقالے شائع ہوئے ہیں، لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ میری رائے میں کبھی کبھی اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہنا چاہئے، کیونکہ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دلچسپ تو خیر یہ موضوع اتنا ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ بہرحال، اس وقت میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آسمان کا رنگ نیلگوں کیوں نظر آتا ہے اور آفتاب صبح و شام یا بادل اور کہر کے اندر کیوں سرخ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے؟

(نگار) اس سے قبل نگار میں فلکیات پر اتنے مقالے شائع ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو اس موضوع پر اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ اس فن پر تحقیقی کام برابر جاری ہے، اس لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے اور نگار میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ کے ان دو سوالوں کا جواب نگار کے پچھلے فائل میں کہیں مل سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ آفتاب کا اصلی رنگ کیا ہے اور اس کی شعاعوں میں انکسار ہونے کے بعد کیا کیا رنگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ میں آپ کے دوسرے سوال پر بھی غور کروں گا۔

اگر ہم ساٹھ میل فی سکنڈ کی رفتار سے فضا میں بلند ہو سکیں تو ایک خاص مقام پر پہنچ کر ہم دو باتیں محسوس کریں گے ایک یہ کہ زمین کے دائرۂ کشش سے نکل کر سورج کے دائرۂ کشش میں آگئے ہیں۔ یعنی خود بخود سورج کی طرف کھنچے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ سورج کی روشنی کا مفہوم جو کچھ ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ہم اس رفتار سے چند سکنڈ پرواز کرنے کے بعد ہی، فضائی روشنی میں عجیب و غریب تغیرات محسوس کرنے لگیں گے۔ یعنی وہ آسمان جو ہمیں نیلا نظر آتا ہے بلندی پر پہنچنے کے بعد تاریک دکھائی دے گا یہاں تک کہ اور زیادہ بلندی پر وہ بالکل شب دیجور نظر آئے گا اور سورج بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے لوہے کے توے کو سفید ہونے کی حد تک گرم کیا جائے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی علمی توجیہ بھی سن لیجئے:

اگر آپ نے دریا کے کنارے کسی پل کے اندر سے پانی کے دھارے کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جب کوئی بڑی لہر پل کے پایہ سے ٹکراتی ہے تو وہ پھٹ کر آگے بڑھتی ہے اور دونوں حصے پھر ایک ہو جاتے ہیں، لیکن چھوٹی لہریں ٹکرا کر چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی حال سورج کی روشنی کا ہے۔ وہ جب زمین کی طرف بڑھتی ہے تو فضا میں حجابات و موانع سے اس کو ویسا ہی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جیسا دریا کی لہر کو پل کے پایہ کا۔ چونکہ آپ کو معلوم ہی ہوگا سورج کی روشنی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے جو قوس قزح میں ہم کو الگ الگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سورج کی روشنی میں لہریں ہوتی ہیں اور لہروں کی لمبائی کے لحاظ سے رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً لمبی لہروں سے سرخ یا گہرا سنہرا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور چھوٹی لہروں سے نیلا رنگ۔

پھر جس وقت سورج کی روشنی فضا کے حجابات و موانع سے ٹکراتی ہے تو وہ ہم تک جوں کی توں پہونچ جاتی ہے۔ اس کی لمبی لہریں جن سے سرخ روشنی پیدا ہوتی ہے متاثر نہیں ہوتیں، لیکن چھوٹی لہریں جن سے نیلا رنگ پیدا ہوتا ہے چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں، اور اسی لئے ہمیں آسمان نیلا نظر آتا ہے۔ گویا یہ رنگ آسمان کا نہیں بلکہ روشنی کی ان چھوٹی چھوٹی لہروں کا ہے، جو فضا میں منتشر ہو کر چاروں طرف پھیل گئی ہیں اور جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہم اس کی سرخ لہروں سے واسطہ پڑتا

ہوتی ہیں اور فضا میں کسی حجاب سے ٹکرا کر منتشر نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سورج کی روشنی جو ہم کو یہاں نظر آتی ہے وہ بھی اصلی روشنی نہیں ہے کیونکہ ان میں سے نیلگوں چھوٹی لہریں علٰحدہ ہو چکی ہیں۔ اور اسی لئے حجابات سے ٹکرا کر چھوٹی لہریں جتنی زیادہ چھن کر علٰحدہ ہوتی جائیں گی، سورج اتنا ہی زیادہ سرخ نظر آئیگا وجہ ہے کہ بادل، بھاپ اور کہر وغیرہ کے اندر سے آفتاب زیادہ سرخ دکھائی دیتا ہے۔ صبح و شام، طلوع و غروب کے وقت بھی آفتاب کا رنگ زیادہ سرخ اسی لئے ہوتا ہے کہ اسوقت شعاعیں زیادہ فاصلہ طے کر کے ترچھی ہو کر ہم تک پہونچتی ہیں اور زیادہ حجابات سے ٹکرانے کے بعد چھوٹی لہریں (نیلگوں) بہت زیادہ چھن کر علٰحدہ ہو جاتی ہیں۔ سورج کی اصلی روشنی، جس وقت وہ سورج سے چلتی ہے، کئی رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے، لیکن جوں جوں زمین کی فضا سے قریب ہوتی جاتی ہے، اس کی چھوٹی لہریں علٰحدہ ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک صرف سرخ لہریں پہونچتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم کو سورج ویسا ہی نظر آئے جیسا کہ ایک جلتا ہوا آہنی توا جو سفید ہونے کی حد تک تپا گیا ہے۔

مذہب و عقل

جناب مرتضیٰ علی خانصاحب - اٹاوہ)

میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ سچا مذہب وہی ہے جسے عقل انسانی قبول کر سکے اور جب میں اُن سے مذہبی معتقدات کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو بعض یہ کہتے ہیں کہ مذہب عقل سے بلند چیز ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہماری آپ کی عقل ہی کیا کہ غور کر کے فیصلہ کر سکیں، بتایئے اس صورت میں کیا کیا جائے۔

نگار) میری رائے یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ کیونکہ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، اس میں اس قسم کی لایعنی گفتگو کی گنجایش ہی نہیں۔ اس قسم کی باتیں اگر سنجیدگی سے کی جائیں تو وہ جھگڑا پیدا کرتی ہیں اور اگر محض تفریحی مشغلہ ہو تو بے نتیجہ ہے۔ مذہب و عقل کی جنگ نئی چیز نہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے، اسی وقت سے وہ اس کشمکش میں پڑا ہوا ہے، پہلے بھی نظام قدرت اور حوادث عالم کے اکثر مناظر و مظاہر اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور اب بھی یہی حال ہے، مگر فرق یہ ہے کہ پہلے وہ زیادہ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا اور جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی اسے کسی دوسری قوت غیر معلوم سے منسوب کر دیتا تھا (اور یہی بنیاد تھی مذہب کی) لیکن اب چونکہ بہت سے حجابات دور ہو گئے ہیں، اس لئے وہ "عدم علم" کو کوئی اضطراری و فطری چیز نہیں سمجھتا اور کوشش کرتا ہے کہ وہ ہر بات کی حقیقت تک پہونچ جائے۔ الغرض وہ دور جب عقل کسی حجاب سے ٹکرا کر مذہب کی پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی تھی، بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے اور اب مذہب و عقل کی جنگ ایسے دو فریق کی جنگ ہے جس میں ایک جدید آلات حرب سے آراستہ ہے اور دوسرا صرف روحانی قوت و ارادہ کے بھروسہ پر لڑنا چاہتا ہے۔ مذہب کے باب میں میرے سامنے ہمیشہ یہ سوال آیا کہ اگر اس کا تعلق اخلاقیات یا روحانیات سے ہے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) تو اس کا مقصود دنیا میں صرف امن و سکون کی اشاعت ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اس لئے اب دو ہی صورتیں ہیں یعنی اگر مذہب کوئی خدائی یا الہامی چیز ہے تو ہم اس کا صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں اور اگر وہ خود انسان کی پیدا کی ہوئی چیز ہے تو اب اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یقیناً مذہب ایک مجبور و بیکس انسان کے لئے بڑا سہارا اور سکون ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ ساری دُنیا کے انسانوں کے لئے مُضر ثابت ہو۔ حالانکہ صورت اسکے بالکل خلاف ہے۔ مذہب کا تخیل اگر صرف یہ قرار دیا جائے کہ تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور وہی سب کا مالک ہے، تو پھر وہ مذاہب جو صرف معتقدات اور تعبیرات کی بناء پر دوسرے مذاہب والوں کو گمراہ اور دوزخی سمجھتے ہیں، سوسائٹی کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے اور عقلیت پسندوں کا ہدف قرار پائیں گے۔ خدا کا بلند ترین تصور جو اسوقت تک قائم کیا گیا ہے وہ اسکے بے نیاز اور قادر مطلق ہونے کا ہے۔ لیکن حقایق کی دنیا میں یہ تصور بالکل بدل جاتا ہے۔ خدا کے بے نیاز ہونے کے معنے صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی اور یہیں سے مذاہب کا تمام مابعد الطبیعاتی ڈھیر اور حشر و نشر ختم ہو جاتا ہے۔ اخروی عذاب و ثواب کو اعمال دنیا کا لازم نتیجہ قرار دینا، گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا متاثر ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ اس کی شان بے نیازی کے منافی ہے۔ اسی طرح یہ سمجھنا کہ وہ ہم سے خوش یا ناخوش ہو کر اس دنیا میں ہمیں کامیاب و محروم کر سکتا ہے، اس تصور کے خلاف ہے۔ اب قادر مطلق ہونے کو لیجئے، تو یہ عقیدہ اور زیادہ رواداری اور مسالمت چاہتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کا حق باقی ہی نہیں رہتا کہ جو ہم سمجھتے ہیں وہی صحیح ہے اور دوسرے غلطی پر ہیں۔ بہرحال مذہب کی صحیح روح میری رائے میں یہی ہونا چاہئے کہ وہ تمام افراد انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم خلاف عقاید کو ہم بالکل ذاتی و انفرادی چیز خیال کریں۔ وہ زمانہ جب مذہب کی مدد سے صرف قبائلی یا قومی اغراض پورے کئے جاتے تھے گزر گیا ہے، اب اس میں آفاقیت پیدا ہونا چاہئے اور اسے ایک کائناتی چیز ہونا چاہئے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ مذہب کا مفہوم محض "انسانیت پرستی" قرار دیا جائے۔ اگر خدا کو جتے پوجتے ہم آپس میں لڑنے لگیں تو اس سے زیادہ خدا کی توہین کیا ہو سکتی ہے؟

مطبوعات موصولہ

فن شاعری ارسطو کی مشہور کتاب بوطیقا (Poetics) کا ترجمہ ہے۔ جناب عزیز احمد صاحب بی۔ اے استاذ انگریزی جامعہ عثمانیہ کے قلم سے ——— ارسطو کی یہ کتاب غالباً دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے جس میں فن شاعری پر علمی انتقادی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں، پہلے حصہ میں شاعری پر ایک عمومی تبصرہ کیا گیا ہے، دوسرے میں ٹریجڈی پر گفتگو کی گئی ہے، تیسرے میں رزمیہ شاعری پر، چوتھا نقادوں کے اعتراضات اور ان کے جواب دینے کے اُصول سے متعلق ہے اور پانچویں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹریجڈی رزمیہ شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔

ابتدا میں فاضل مترجم نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کے اُصول نقد کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور آخر میں اشارات و تلمیحات کا ایک باب اضافہ کرکے ترجمہ کو بہت زیادہ مفید بنا دیا ہے۔

انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کو شایع کرکے فن نقد کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور وہ حضرات جو اس فن کا اصولی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب سے استفادہ ناگزیر ہے۔ قیمت ۱۲ ؎ ـ ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

علم الاقوام ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فیلس کی تصنیف کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس نام سے کیا ہے۔ "علم الاقوام" جتنا دلچسپ علم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ دلچسپ اس لئے کہ اس میں خود انسان اپنی جستجو کرتا ہے اور مشکل اس لئے کہ تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے انسانوں اور اُنکی تہذیبوں کا کسی ایک مرکز تک سراغ لگانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے انتہائی صبر، حد درجہ کاوش اور غیر معمولی فراست و سلیقہ کی ضرورت ہے۔ اصل کتاب کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زبردست ماہر "اقوامیات" کی کاوش کا نتیجہ ہے اور ترجمہ کی خوبی و صحت کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔

یہ کتاب دو جلدوں میں انجمن ترقی اُردو دہلی نے شایع کی ہے۔ پہلی جلد کی قیمت ۴ ؎ ہے اور دوسری جلد کی ۱۲ ؎۔

ہماری غذا ترجمہ ہے رابرٹ لیکریسن کی کتاب کا جو مسئلہ غذا میں استنادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ انتخاب غذا کے اُصول کیا ہیں اور اس کا انتخاب کیونکر کرنا چاہئے۔ آجکل انسانی صحت کا انحصار زیادہ تر "حیاتین" پر سمجھا جاتا ہے اور شاید یہی وہ چیز ہے جس سے ہندوستانی عام طور پر ناواقف ہیں۔

چونکہ قومی ترقی کے مسایل میں مسئلہ صحت سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے اس لئے اس وقت جبکہ ہندوستان نے بھی ترقی کی طرف قدم اُٹھایا ہے ضروری ہے کہ "اصول غذا" کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے، اور اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی کتابیں پبلک کے سامنے کثرت سے پیش کی جائیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند نے اپنے سلسلۂ مطبوعات میں اس کو بھی جگہ دی اور ایک اچھی کتاب اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کی۔

ترجمہ سید مبارز الدین احمد رفعت نے کیا ہے اور ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب نے نظر ثانی کی ہے۔ قیمت ۱۲ ؎

انشاء داغ مجموعہ ہے نواب مرزا داغ کے خطوط کا جسے جناب احسن مارہروی (مرحوم) نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں امراء و رؤساء کے نام کے خطوط ہیں۔ دوسرے حصہ میں اعزہ و احباب کے نام کے اور تیسرے حصہ میں شاگردوں کے نام کے خطوط یکجا کر دئے گئے ہیں۔ ان خطوں میں محض انشاء کے لحاظ سے تو کوئی خاص بات نہیں، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ بڑے کام کی چیز ہیں۔ ضرورت تھی کہ داغ ایسے شاعر کے خطوط کا مجموعہ شایع کیا جاتا۔ قیمت ۸ ؎، ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔

حیوانی دنیا کے عجائبات

فنِ تاریخ میں نیچرل ہسٹری کا شعبہ غالباً سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مغربی زبانوں میں تو اس فن پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اُردو میں، اس کی بہت کمی تھی۔ جناب عبدالبصیر خاں صاحب (مسلم یونیورسٹی) نے یہ کتاب لکھ کر بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جابجا تصاویر و نقوش سے اس کی اہمیت و دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ قیمت عا ر ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

دیوان جوشش

محمد روشن جوشش، عظیم آباد کے مشہور شعرا میں تھے۔ ان کے باپ کا نام جسونت ناگر تھا جو علی وردی خاں کے ممتاز سرداروں میں سے تھے۔ قریب قریب تمام تذکروں میں ان کا ذکر نظر آتا ہے، لیکن دیوان اس وقت تک شایع نہ ہوا تھا، اب انجمن ترقی اردو نے اس کمی کو پورا کیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے اور ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے تمام وہ معلومات پیش کر دی ہیں جو ایک مقدمہ نگار کو پیش کرنا چاہئے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ زیادہ تر سودا کی تقلید پائی جاتی ہے اور وہ بھی ناقص۔ قیمت عہ ہے۔

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، اُردو زبان کے مشہور حامی ہیں اور انھوں نے جب کبھی کسی جلسہ میں اس موضوع پر تقریر کی ہے، صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس رسالہ میں انھیں کے خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت ۸ ر۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

محمدؐ

ترجمہ ہے توفیق الحکم مصری کی کتاب کا جناب ملیح آبادی کے قلم سے! سیرت نبوی پر اس وقت تک بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ زمانہ کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے ان کے اسلوب کو بدلا جائے۔ چنانچہ یہ کتاب بالکل اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس میں ولادت سے لیکر رحلت نبوی کے تمام اہم واقعات ڈرامہ کی صورت سے پیش کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف مستند واقعات لئے جائیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ ملیح آبادی کی نسبت اس کے حسن و صحت کے لئے کافی ضمانت ہے۔

قیمت عہ ملنے کا پتہ :- دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

ترکی افسانے

ترجمہ ہے چار ترکی افسانوں کا جو وہاں کے مسلم الثبوت فسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے ترکی افسانوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ترکوں کی "انشاء عالیہ" کتنی بلند چیز ہے۔ ملیح آبادی صاحب نے ان ترجموں کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی تمام خصوصیات کو قایم رکھا ہے۔ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ :- دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

نورس

جناب مسعود اختر جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جمال ایک نوجوان شاعر ہیں اور جب تک میں ان سے ملا نہ تھا ان کو عمر رسیدہ ہی سمجھتا تھا۔ اگر تخلص کا اثر کسی کے کلام پر پڑ سکتا ہے تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جمال کا کلام واقعی جمیل ہے۔

اس مجموعہ میں مذہبی، قومی، ادبی ہر طرح کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور ہر نظم میں کوئی نہ کوئی بات ایسی پائی جاتی ہے جو ہمارے فکر و تخیل کو چونکا دیتی ہے یا مسرور بنا دیتی ہے، قدامت کا گھنونا پن کہیں نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک ذہین نوجوان کی دلچسپ نظمیں ہیں اور ترقی پسند لٹریچر میں یہ مجموعہ یقیناً ایک مفید اضافہ ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ ر۔ ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ادبستان بنارس۔

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں

حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے اس مجموعہ میں ۲۵ نظمیں آج کل کے ترقی پسند نوجوانوں کی جمع کر دی ہیں۔ ابتدا میں ہلکا سا تبصرہ بھی شامل ہے۔

کشمش نائی

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کی ہے دیں کتاب ہے۔ یہ کتاب "ادبیات اطفال" کے سلسلہ کی چیز ہے اور خوب ہے۔ اس سلسلہ میں قصے کہانیوں کے ذریعہ سے بچوں کو کام کی باتیں بتلانے والی کتابیں شایع کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱ ہے اور ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن)

گارسان دتاسی

اس کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بتایا ہے کہ گارسان دتاسی اور اس کے بعض ہمعصر مستشرقین نے اُردو کی کتنی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہ کتاب نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد (دکن)

گلِ تریاک[1]

(ابن العربی کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ بہ واسطۂ انگریزی)

میں نے اپنے بچپن میں ایک نواب صاحب کو چانڈو پیتے دیکھا تھا۔ تاریک کوٹھری، نہایت کثیف تکیہ، ایک چراغ روشن۔ ایک شخص نے قیوام کا توام لو ۔۔۔ تیلی سے نے کی چھوچھی میں جونے کی وسط میں موتی تھی لگایا۔ ایک شخص کروٹ سے لیٹا، دوسرا، دوسرا اُسکے کولے پر ۔۔ یکمر کردن نہ ہوا۔ چھوچھی کو چراغ کی لَو سے ملایا، دم لگایا، ادھر ایک شعلہ فروزاں ہوا اُدھر دم لگانے والے کی آنکھیں پلٹ گئیں۔ اور وہ بیٹھ گیا دوسرا ۔۔ بڑائے اُٹھا اور اسی عمل کا اعادہ ہوا۔ اس شعلے کو یہ لوگ "گلِ تریاک" کہتے تھے۔ اب نظم کے آخری بند پر غور کیجیے۔ گلی کا جلکر شاداب و شگفتہ ہونا تنہا اور خنک خاموشی میں گلِ تریاک کا کھلنا تشنگی، مدہوشی۔ معلوم ہوتا ہے ابن العربی کے زمانہ میں عربوں میں چانڈو کا رواج تھا۔ "اختر"

سیمابی ہوا میں ہانپتے پودے دھوپ کے گھونٹ چڑھاتے ہیں
شدت وہ عطش کی ہے لیکن، اس پر بھی ہانپتے جاتے ہیں

غش کھائے گلابکے رس کو چوس رہی ہے سنہری اک تتلی
نازک نازک، سندر سندر، چھوٹی موٹی، دُبلی پتلی

اور ہونٹ ترے سوتے میں ادھر ہیں نیم تبسم آلودہ
اے کاش کبھی دیکھوں میں انھیں پیغام سے اپنے آسودہ

جنبش نہ ہو یونہیں سوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی
اور ہوش سبھوں کے کھوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

باریک سنہری نقاب تو اپنے روئے زیبا سے نہ ہٹا
مشتاق ہیں آنکھیں ذروں کی اور تاک میں ہے تپتا صحرا

تیرے خزانۂ زر کی نگہباں ہے اور اُسکو چھپائے ہے
وہ پردا ہے جو چشمِ زخم سے حُسن کو تیرے بچائے ہے

سورج کی دمکتی لپٹ جو ہے شفاف تن بلوریں میں
(محلول ستارے یا موتی مینائے مئی انگوریں میں)

وہ ہم کے ہو نہ قرار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی
اور فتنے نہ ہوں بیدار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

---

[1] چانڈو باز گلِ تریاک اس شعلے کو کہتے ہیں جو چانڈو کا دم لگانے پر نے سے بلند ہوتا ہے۔ دم لگانے کو یہ لوگ "چھینٹا لینا" کہتے ہیں۔

مد و جزر موج دریا سینے کے اُبھرنے میں ڈوبنے میں
تھکتی ہی نہیں تکنے سے جنھیں نوخیز حبابوں کی آنکھیں
اُف برف کی ایسی سفیدی مگر دو ٹُسے جو لہروں سا نسکے تھا
ساحل کا راز تشنہ لبی، اس درجہ قریب اور آئیں نہ ہاتھ
جیسے ہو دہن میں موج کے کف، زریں زریں، تاباں تاباں
تند اور سرکش، تاہم دلکش، برخود نازاں برخود پیچاں

کروٹ نہ بدل، کروٹ نہ بدل، اے نیند کی ماتی متوالی
ہے ہے نہ مچل، ہے ہے نہ مچل، اے نیند کی ماتی متوالی

پھر کیوں نہ ہو چشمہ اشک فشاں اور توڑے نہ دم بیلی تتلی
منظر ہو جب ایسا تاب شکن، کیوں غیر نہ ہو حالت دل کی
جب ایسی شدید محبت ہو، کثرت سے گلابی میخواری
خوابیدہ پیکر رعنائی، اپنی مجبوری، ناچاری
کیوں پیٹیں نہ جلتی آنکھیں مری چھاتی کے سرخ انگوروں سے
کیوں رحم کی رکھوں آس نہ میں ہشیار نہ مخموروں سے

جلتی ہے جو چھاتی جلنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی
جو کچھ بھی ہو آنکھیں ملنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی

جل جائے تو میرے دل کی کلی شاداب و شگفتہ ہو جائے
ہو خاک اور پھر یہ خاک اُڑ کر اک کیف ابد میں کھو جائے
مَس ہو کے گل و صندل سے مہکتے جسم کی تیرے خوشبو سے
قسمت پہ نہ کیوں وہ ناز کرے جس کو ہوں میسر "بوسے"
پروانے پہ گزرے جو گزرے شعلے سے مبارز کوشی میں
مانند گلِ تریاک کھِلے تنہا و خنک خاموشی میں

اس تشنگی و مدہوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی
حسرت کشئ ہمدوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی

اثر لکھنوی

ایک شاعرانہ لمحہ

جسمِ سیمیں کی یہ لرزش - یہ محبت کا سلام   مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وفا کا پیغام
اُف یہ لغزیدہ قدم - ہائے یہ بے ربط کلام   عشق نے بخشدیا آج تجھے حسنِ دوام
جو ادا ہے تری مینوش ہوئی جاتی ہے

حشر کیا اے دلِ رنجور ہوا جاتا ہے   حسن اک عالمِ مجبور ہوا جاتا ہے
کیف وہ ہے کہ جہاں چور ہوا جاتا ہے   ہر نفس بے خود و مخمور ہوا جاتا ہے
ہر نظر میکدہ بردوش ہوئی جاتی ہے

دل میں شورش ہے کہ برپا ہے سکوں کیا کہئے   شعلۂ زیست میں یہ سوزِ دروں کیا کہئے
کارگر ہے مری نظروں کا فسوں کیا کہئے   تیری آنکھوں میں یہ اندازِ جنوں کیا کہئے
آرزو محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے

ہائے کس درجہ حسیں رات ہے - کیا لمحہ ہے   تیری ہر سانس میں اک جذبۂ وارفتہ ہے
کیا ترنم ہے - یہ کیا سحر ہے - کیا نغمہ ہے   کتنا رس ہے تری آواز میں کیا لہجہ ہے
دل کی دنیا ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

یہ نگاہوں میں تری حسرتِ پرواز ہے کیا   رخ پہ یہ برہمیِ زلف کا انداز ہے کیا
ہائے انجامِ تمنا کا یہ آغاز ہے کیا   رہ گیا آکے جو لب تک وہ حسیں راز ہے کیا
بات کیا ہے جو فراموش ہوئی جاتی ہے

چشمِ غمناک میں یہ جذب یہ تاثیر ہے کیوں   میرا غم آج ترا عالمِ تصویر ہے کیوں
اُلجھی اُلجھی سی مرے خواب کی تعبیر ہے کیوں   شمعِ احساس یہ گم کردۂ تنویر ہے کیوں
عقل خود رفتہ و مدہوش ہوئی جاتی ہے

یہ مرادوں کا شبستاں - یہ خیالوں کا ہجوم   تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے تابندہ نجوم
اُف یہ ہیجانِ تمنا - یہ نگاہِ معصوم   یہی دنیا جو تھی آغوشِ وفا سے محروم
آج آغوش در آغوش ہوئی جاتی ہے

مسعود اختر جمال

حسنِ دوشیزہ

دوشیزگیٔ حُسن کا اللہ رے! آغاز
بہکی ہوئی رفتار، یہ کھوئے ہوئے انداز
ہر بات میں سہمی ہوئی لے ناز و ادا کی
ہر سانس میں دبتی ہوئی جذبات کی آواز
گھبرائی ہوئی چال کا یہ حال ہے جیسے
اک طائرِ نوخیز کی جھجکی ہوئی پرواز
عارض سے نکلتی ہوئی اک آتشِ بے رنگ
ہونٹوں پہ لرزتا ہوا اک نغمۂ بے ساز
رُخسار سے تھم تھم کے یہ ہٹتے ہوئے گیسو
ہو شام کو جیسے کسی میخانہ کا در باز
مدہوش بنا کر رہی یہ ڈھاتا ہے قیامت
رفتار کا جادو، کبھی گفتار کا اعجاز

آنکھوں کو جھکائے ہوئے مبہم سا اشارہ
سو جان سے ہو جس پہ فدا صنعتِ ایجاز

آنکھیں وہ حیا کوش کہ نظارے سے بیزار
عارض میں وہ نازک کہ پسینہ سے گرانبار
اونچی ہے ستاروں سے بھی اخلاق کی رفعت
پھولوں سے بھی بڑھ کر کہیں معصومی کردار
آنکھوں کا وہ اندازِ تغافل نہ توجہ
گردن کا وہ خم، جس میں نہ انکار نہ اقرار
وہ سادگیٔ حُسن کی افسانہ نگاری
سانچے میں اداؤں کے وہ ڈھلتے ہوئے اشعار
آگاہ نہیں ہے ابھی دُنیا کی ہوا سے
اپنوں ہی سے واقف ہے نہ غیروں سے خبردار
اک آتشِ خاموش ہے کہتے ہیں یہ تیور
طوفان ہے طوفان بتاتے ہیں یہ آثار

اک صبح کہ جس میں نہ اندھیرا نہ اُجالا
اک کشتیٔ جذبات نہ اِس پار نہ اُس پار

شانوں پہ دوپٹہ کا یہ اُڑتا ہوا آنچل
ماحول ہے بے چین، ہواؤں میں ہے ہل چل
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں یہ تابشِ رُخسار
آتشکدۂ حُسن پہ چھائے ہوئے بادل
اللہ رے! یہ ساقِ بلوریں دمِ رفتار
جنبش میں ہو جس طرح مے ناب کی بوتل
چھایا ہوا اک بار ہے احساسِ حیا کا
تیور بھی گرانبار ہیں، پلکیں بھی ہیں بوجھل
کُرتہ کے گریبان پہ کچھ پان کے دھبے
آنکھوں میں پسینہ سے ہے پھیلا ہوا کاجل
گردن میں ہے مالا نہ کلائی میں ہے کنگن
اور پاؤں میں پازیب، نہ گھنگرو ہیں نہ چھاگل

جس سے کوئی کھیلا نہ ہو وہ لعبتِ رنگیں
شبنم سے بھی ہو پاک وہ اُٹھتی ہوئی کونپل

وہ گیت مغنی جسے دُہرا نہ سکا ہو
وہ ساز جسے چھو نہ سکی جنبشِ مضراب
وہ بُت کہ نہ اک پھول چڑھایا ہو کسی نے
جس میں کوئی سجدہ نہ ہوا وہ خمِ محراب
کچھ تجربہ دُنیا کا نہ آگاہیٔ ماحول
بیگانۂ دستور ہے ناواقفِ آداب

کیا چیز ہے دُنیا اسے معلوم نہیں ہے
ظالم ہے یہ ظالم، ابھی مظلوم نہیں ہے

ماہرالقادری

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی ونفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار وجواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار وجواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی وتنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مازنین کا مذہب

۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید ودلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج وزوال موت وحیات، صحت وبیماری شہرت ونیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات وتنقید عالیہ کا عجیب وغریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآراکتاب ہے جس میں تاریخ واساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب وشائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھ کر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جنوری ۳۵ء

(اردو شاعری نمبر) اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام یہ مجموعہ اردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اس کے بعد پھر کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں۔ صفحات ۲۳۶ - اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

جنوری ۳۶ء

(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعرا کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام، اردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال [illegible] کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۲۴ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر ا بـــــے ۳۶۵



قیمت فی کاپی ۸ ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، اسکی تخئیل، اس کی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۴ افسانے ۳۳ سے تک کے درج ہیں ۔ قدرتِ بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے ۔

قیمت چار روپیہ (للعہ/)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے ۔ جذبات نگاری اور سلاستِ بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے۔ جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے ۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ/۸)

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے ۔

قیمت آٹھ آنے ۔ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۲ء | شمارہ ۶

ملاحظات

جنگ کی موجودہ منزل

لڑائی کا تیسرا سال ختم ہونے کے قریب ہے اور اس دوران میں جنگ قریب قریب کرۂ زمین کے ہر گوشہ تک پہونچ چکی ہے، لیکن نوعِ انسانی ابھی تک بیم و رجا کی منزل سے نہیں گزر چکی ۔۔۔

لاکھوں انسانوں کا درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون بہانا، ہزاروں میل تک جہاں کھیتیاں لہلہایا کرتی تھیں، انسان کے گرم خون کی کیچڑ کے سوا کچھ نظر نہ آنا ۔۔۔ بیشمار گھروں کا جلکر خاک سیاہ ہوجانا، کروروں یتیموں اور بیواؤں کا رات دن روح فرسا دردِ دکھ میں تڑپتے رہنا ۔۔۔ ایک عالمگیر فقر و فاقہ، ایک غیر متناہی ویرانی و بربادی ۔۔۔ نہ بجھنے والی آگ کی لپٹوں میں انسان کی کٹی ہوئی گردنوں اور چھدے ہوئے سینوں سے ابلتے رہنے والا خون! کچلے ہوئے سر اور سروں کے بھیجوں سے لتھڑے ہوئے چہرے ۔۔۔ کٹی ہوئی پسلیاں، پھٹے ہوئے شکم، ٹوٹے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں کی کھال کو پھاڑ کر نکل آنے والی ہڈیاں ۔۔۔ اور اسی قسم کے بہت سے ہولناک مناظر! ۔۔۔ یہ ہے موجودہ جنگ جو انسان کی تاریخ میں شدت درندگی کے لحاظ سے شاید سب سے پہلی اور آخری جنگ ہے ۔

جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بناکر بھیجنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے عرض کی "کیا تو اُس کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمین کو فساد و خونریزی سے بھر دیگا" خدا نے فرمایا "انی اعلم مالا تعلمون" ۔۔۔ تمھیں نہیں معلوم، میں جانتا ہوں ۔۔۔

پھر فرشتوں کی پیشین گوئی تو ہمارے سامنے ہے، لیکن خدا کیا جانتا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ علم خداوندی کے بے پردہ ہو، خدا کا یہ خلیفہ اب خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا

اس سے پہلے بھی لڑائیاں ہوئی ہیں اور سو سو سال تک برابر جاری رہی ہیں، لیکن ہلاکت باری کے لحاظ سے اس جنگ کا ایک ایک دن پچھلی لڑ کے ایک ایک سال پر بھاری ہے اور اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس کے نقصانات کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی، لیکن زیادہ عرصہ تک جاری رہنے کی پیش گوئی نہیں کر سکتے!

لڑائی اب جس منزل سے گزر رہی ہے وہ یقیناً بیم و رجا کی منزل ہے، لیکن اس منزل کو اب جلد ختم ہونا ہے، کیونکہ فریقین کی جانب سے جو انتہائی حد کوشش و کاوش کے متعین ہو سکتے تھے وہ سب متعین ہو چکے ہیں اور خونی سیلاب کی یہ خونی موج اب بلند ہو کر اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے، جہاں سے اس کا نشیب ہی کی طرف مائل ہونا ہے اور ساحل سے ٹکرائے یا نہ ٹکرائے مگر اب اس کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں!

جن جن ملکوں کو جنگ میں شریک ہونا تھا، ہو چکے ہیں اور اب کوئی حکومت ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اس کی شرکت موجودہ توازن؟ کوئی تبدیلی پیدا کر سکے گی۔ اس لئے فریقین کی قوت و ذرائع جنگ کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے اور ہر چند لڑائی کے معاملات میں زیادہ منطق سے کام نہیں لیا جا سکتا، تاہم اسباب و علل کی دنیا میں ہمیں صغریٰ و کبریٰ دیکھ کر نتیجہ پر حکم لگانا ہی پڑتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کے بڑے حصہ پر اس وقت نازی اقتدار قائم ہے، لیکن محوری طاقت نام ہے صرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کے اتحاد اور انھیں کو لڑائی کا سارا بوجھ اٹھانا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ، امریکہ، چین اور روس کی اجتماعی قوت ہے، اس لئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فریقین میں کس کا پلہ بھاری ہے اور اگر فیصلہ "الفت بالانف" کے حساب سے ہو تو بھی نتیجہ کے متعلق دو رائیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔

جرمنی کی انتہائی قوت اور اس کے انتہائی عروج کا زمانہ وہ تھا جب اس نے دفعتاً مغرب کی طرف سے پلٹ کر مشرق کا رخ کیا اور تین چار مہینے کے ا روسی فوجوں کو ماسکو اور لینن گراڈ کی چار دیواری تک ڈھکیل دیا۔ یہ وقت روس کے لئے بہت نازک تھا اور اس کی حالت ایسے قطرۂ شبنم کی سی تھی کانٹے کی نوک پر تھرتھرا رہا ہو، لیکن اشتراکیت کا معجزہ سمجھئے یا موسم سرما کی شدت کہ نازی سیلاب کا وہ زور گھٹنے لگا اور اسے بجائے حملہ کے دفاعی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔

یقیناً روس اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اس نے جرمنی کو اتنا نقصان ضرور پہونچا دیا کہ اب موسم بہار میں جو اس نے دو حملہ شروع کیا ہے وہ نسبتاً بہت تھکا ہوا اور بیجان معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت خارکوف کے میدان میں بڑے معرکہ کی لڑائی ہو رہی ہے اور دونوں طرف کی آہن پوش قوتیں نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہر چند خبروں سے واقعی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جرمن فوجوں کو ابھی تک نہ کرچ کی طرف آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے نہ خارکوف کی طرف اور اگر روس اس موسم بہار میں اسی طرح کامیاب مدافعت کرتا رہا تو پھر جرمنی کے خلاف پانسہ پلٹنا بالکل یقینی ہے۔

ہٹلر کو جو ناکامی روس کے محاذ پر ہوئی ہے اور اس کا جتنا گہرا اثر ہٹلر پر ہوا اس کا پتہ خود ہٹلر کے بیانات سے چلتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ روس کے کارزار سے اپنے دامن کو کیونکر علیحدہ کرے۔ اور جرمن آبادی کو وہ کس طرح اطمینان دلائے کہ اس کی زبردست قربانیاں رائگاں جانے والی نہیں ہیں۔

اس دوران میں اس کو ایک سیاسی کامیابی فرانس میں ضرور ہوئی اور وہ یہ کہ وہاں لاوال برسر اقتدار ہو گیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسولینی نے جن شرائط پر آئندہ مدد کا وعدہ کیا ہے وہ ہٹلر کو وشی حکومت کے اس انقلاب سے بھی فائدہ نہ اٹھانے دیں گی۔ اٹلی کا ایسے وقت میں وشی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ کارسکا وغیرہ اس کے حوالے کر دئے جائیں، کبھی ہٹلر کو پسند نہیں آ سکتا اور اگر یہ سب کچھ ہٹلر کے اشارہ سے ہوا ہے اور اس کا مقصود وشی حکومت پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا ہے، تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لاوال فرانس کی آبادی کو یہ زہر کا گھونٹ کس طرح آسانی سے پلا سکے گا، تاہم وشی حکومت سے اندرونی طور پر ہٹلر کی کوئی مفاہمت ضرور ہوئی ہے جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ لیبیا میں پھر جرمنی نے اقدام شروع کر دیا ہے۔

یہ موسم لیبیا میں جنگ جاری رکھنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اس لئے چھیڑ چھاڑ سے زیادہ یہاں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا اور اگر آگے چلکر یہ لڑائی کوئی اہمیت حاصل کرے تو بھی اُس سے اتحادیوں کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، کیونکہ مڈگاسکر پر انگریزی فوجوں کے تسلط نے بحر روم اور سواحل افریقہ کے اُن خطروں کو بہت ضعیف کر دیا ہے جو چند دن قبل، جاپانیوں کے وہاں تک پہونچ سکنے کے خیال سے پیدا ہو چلے تھے۔ قبضۂ مڈگاسکر کے بعد دوسری اہم بات میکسیکو کا جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا ہے، جس سے امریکہ کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور بحر اٹلانٹک میں نازی قزاقی کا استیصال نسبتاً آسان ہو جائے گا۔

ایشیا میں برما سے انگریزی فوجیں ہٹکر ہندوستان کی سرحد پر آگئی ہیں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ برما کی جنگ ختم ہو چکی ہے، کیونکہ اب برطانیہ و چین کے مقاصد بالکل ایک ہیں اور جس طرح برطانیہ، جاپان کی کسی کامیابی کو گوارا نہیں کر سکتا خواہ وہ اندرونِ چین ہی سے کیوں نہ متعلق ہو اسی طرح چین بھی اس کے کسی کامیاب اقدام کو پسند نہیں کر سکتا، خواہ اس کا تعلق برما یا اندرونِ ہند ہی سے کیوں نہ ہو — اس لئے برما کے بڑے حصہ پر قابض ہو جانے کے بعد بھی جاپان ابھی تک برما کی لڑائی لڑ رہا ہے اور اس وقت تک وہ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک چین کو بالکل ختم نہ کر دے چنانچہ جاپان کے تازہ اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس کی فوجوں کا زیادہ زور چین ہی کی طرف ہے۔

بحر پاسفک میں بھی جاپانی جنگ وہ بہت دھیمی پڑ گئی ہے اور جنرل توجو (وزیر اعظم جاپان) کا آسٹریلیا کو ایشیا کے جدید نظام میں جاپان کا ساتھ دینے کی دھمکی ملی ہوئی دعوت دینا، اُن ناکامیوں کی ناکام تلافی کی کوشش سے زیادہ نہیں جو آسٹریلیا کے مسئلہ میں اسے حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہندوستان کا خطرہ دور ہو گیا ہے، درست نہیں۔

امریکہ جس انداز سے اس جنگ میں حصہ لے رہا ہے، وہ بظاہر نمایاں نہ ہو، لیکن بہت ٹھوس تدابیر پر قائم ہے اور تدریجی طور پر اتحادی کامیابیوں کو مستحکم بنا رہا ہے۔ طیارے، بحری جہاز، آبدوز کشتیاں، اور ہر قسم کا سامانِ حرب نہایت تیزی کے ساتھ وہاں طیار ہو رہا ہے اور اس کی بری، بحری و فضائی فوجوں نے بھی نقل و حرکت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں کے جنرل جارج مارشل کا یہ اعلان کہ امریکی فوجیں بہت جلد فرانس میں داخل ہو جائیں گی، امریکہ کے اُن وسیع عزائم و ذرایع کو ظاہر کرتا ہے جو اتحادیوں کی آخری کامیابی کے لئے وہ اختیار کر رہا ہے۔

بہرحال جس حد تک طیاریوں اور مستقبل کے ارادوں کا تعلق ہے، اتحادی اب بہت مضبوط چٹان پر کھڑے ہوئے ہیں اور محوری طاقتیں اپنے تمام ممکن ذرایع صرف کرنے کے بعد بھی، جنگ کے ضایعات کی تلافی اپنی حربی صناعت سے نہیں کر سکتے اور اس صورت میں جنگ جتنی زیادہ طویل ہوگی، اتحادی کامیابی اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔

اگر درمیان میں کوئی اور تازہ واقعہ رونما نہ ہوا، تو جنگ کا مستقبل روس کے میدان میں بہت جلد واضح ہو جائے گا، کیونکہ لڑائی کا اصل سر رشتہ جرمنی ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ روس ہی میں ہونا ہے۔ اگر اب کے موسمِ بہار میں وہ روس کو شکست دینے یا اسکو صلح پر مجبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، تو اس کی شکست پر مہرِ توثیق ثبت ہو جائے گی اور پھر جاپان کو بھی اپنے بلند ارادوں سے باز آنا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ روس میں کامیاب ہو گیا تو جنگ کی تیسری منزل شروع ہوگی اور یہ منزل یقیناً بہت زیادہ ہولناک اور پُر از خطر ثابت ہوگی۔

ہندوستان کی حکومت، جاپانی خطرہ کا مقابلہ کرنے کی طیاریاں کر رہی ہے، فوجی طیاریوں کا تو پورا حال معلوم نہیں، لیکن پبلک طیاریاں سب کے علم میں ہیں اور ان طیاریوں میں "اے۔ آر۔ پی" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں لوگوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ ہوائی حملہ کے وقت اُن کو کیا کرنا چاہئے اور حکومت کے ساتھ تعاون کی کیا صورتیں اس وقت مفید ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں روشنی کے گل یا کم کرنے کے متعلق جو مشق کرائی جا رہی ہے، وہ بھی ضروری چیز ہے، لیکن اس پر مسلسل اصرار کی ضرورت نہیں۔ مہینے میں ایک دو دن اس مشق و تجربہ کے لئے کافی ہیں۔

تخلیہ کے متعلق حکومت نے بہت زیادہ نرم پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کسی خطرہ کی جگہ سے بھاگنا انسان کی فطرت ہے لیکن اصولاً یہ کوئی

معقول بات نہیں۔ اس سے حکومت و رعایا دونوں کے لئے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک جگہ سے بھاگ کر دوسری جگہ جاتے ہیں، وہ خود بھی خانماں برباد ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ اول تو ابھی ہندوستان پر ہوائی حملہ کا کوئی اندیشہ نہیں اور اگر ہو بھی، تو اس کی تدبیر بھاگ نکلنا نہیں، بلکہ اپنی جگہ رہکر اس کے مقابلہ کی تدابیر اختیار کرنا ہے۔ شاید بھاگنے والے سمجھتے ہیں کہ حملہ کا مقصود محض انھیں کو ہلاک کرنا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو بھاگنے کی حالت میں اُن کی ہلاکت اور زیادہ یقینی ہے اور اگر غلط ہے تو پھر کیوں نہ پوری آبادی کی قسمت کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کرکے صبر و سکون کے ساتھ مصیبت کا مردانہ مقابلہ کیا جائے۔

جنگ کے دوران میں ایک خطرہ اندرونی بد امنی کا بھی ہوا کرتا ہے اور ملک کا جرائم پیشہ عنصر ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ لوگ گھبرا کر بھاگیں اور وہ اس اضطراب سے فایدہ اُٹھا کر لوٹ مار شروع کردیں۔ اس لئے ملک کے اندر بد امنی پیدا نہ ہونے دینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ جو شخص جہاں ہے وہیں رہے اور "اندیشۂ فردا" سے متاثر ہوکر بھاگ نکلنے کی غیر شریفانہ اور بزدلانہ حرکت اختیار نہ کرے۔

"سر اسٹیفورڈ کرپس" کے ناکام واپس جانے کے بعد، یہاں کی سیاسیات کا نہایت دلچسپ واقعہ راجہ گوپال اچاریہ کا وہ رزولیوشن ہے جس میں انھوں نے "پاکستان" کے قیام کو اصولاً تسلیم کرلیا ہے۔ راجہ جی اپنی رائے پر اس قدر استحکام کے ساتھ قایم ہیں کہ انھوں نے کانگریس کی مجلس عاملہ سے بھی استعفا دیدیا اور اب وہ کانگرس میں ایک پاکستانی جماعت علحدہ قایم کرنے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔

مسلم لیگ نے راجہ جی کے اس خیال کا اول اول تو بڑے زور سے خیر مقدم کیا، لیکن اب یہ زور کچھ سرد پڑگیا ہے، یہاں تک کہ مسٹر جناح نے بھی ابتک کوئی مفصل بیان اس باب میں پیش نہیں کیا — کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی چیز جو پہلے انھیں اچھی معلوم ہوتی تھی اب راجہ جی کے کہنے سے محل نظر ہوگئی ہو، کیونکہ "ساقی" کی غیر معمولی عنایتوں سے یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے "کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ راجہ جی کی یہ اپیچ واقعی مسلم لیگ کی حمایت میں ہے یا اس سے کسی اور "استان" کی بنیاد ڈالنا مقصود ہے، بہرحال جو مقصد بھی ہو، "متحدہ ہند" کی اسکیم کے منافی ہے اور عملاً اس کی کامیابی بہت دشوار ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ چیز "گاندھی جی" کا وہ بیان ہے جس میں انھوں نے آزادی ہندوستان کے لئے کسی بڑی زبردست تحریک کے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے — جس وقت سے گاندھی جی کا یہ ارادہ ظاہر ہوا ہے، ہر شخص اپنی جگہ قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے، لیکن آزادی۔ عدم تشدد — ستیا گرہ اور امن پسندی — ان سب کے امتزاج کی کوئی صحیح صورت سمجھ میں نہیں آتی — بہرحال گاندھی جی جو صورت بھی تجویز کریں گے وہ ایک بار ملک میں ہلچل تو ضرور پیدا کردے گی، خواہ اس کے بعد انھیں اپنی غلطی کا اعتراف ہی کیوں نہ کرنا پڑے!

"حُر" جماعت کی شورش افسوسناک بات ہے۔ روہڑی (سندھ) کے قریب ایک گاؤں ہے کبنگڑی، وہیں کے پیر کے مُرید "حُر" کہلاتے ہیں ان کے پیر کا دعویٰ ہے کہ وہ سید شاہ علی مکی کی اولاد میں سے ہے جو محمد قاسم کے ساتھ حملۂ سندھ کے وقت آئے تھے (۷۱۲ء)۔ یہاں انھوں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کرلی تھی جو مسلمان ہوگئی تھی۔ سید شاہ علی مکی کی بعض اولاد خیر پور کے علاقہ میں بھی بس گئی تھی جن میں سے ایک پیر محمد راشد نے بڑی جماعت مُریدوں کی پیدا کرلی۔ انھوں نے تیرہ بیٹے چھوڑے اور ان میں خلافت پر جھگڑا ہوا، لیکن چونکہ وہ اپنے بیٹے صبغۃ اللہ کو نامزد کرگئے تھے اس لئے زیادہ تر لوگوں نے انھیں کی پیروی کی، پیر صبغۃ اللہ نے ان کی وفاداری دیکھ کر انھیں حُر کا لقب دیا (وہ حُر جنھوں نے کربلا میں امام حسین کا ساتھ دیا تھا)۔ پیر صبغۃ اللہ کے ایک مُرید نے رفتہ رفتہ اس جماعت کو بہت منظم کرلیا اور ان کے لئے مونگیا رنگ کا لمبا کُرتہ اور خاص قسم کی پگڑی مقرر کی۔ اس کے بعد حُر جماعت کی تاریخ گویا فتنہ و فساد کی تاریخ ہے جس میں خلافت کے جھگڑے، غارتگری اور حکومت کے خلاف بغاوت وغیرہ سب شامل ہیں اور یہ تاریخ سنہ ۱۸۹۳ء سے شروع ہوتی ہے۔

ہندوستان میں تصوف و درویشی کے بہت سے ادارے پائے جاتے ہیں، لیکن فتنہ و فساد، شورش و ہنگامہ کے لحاظ سے اس ادارہ کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی انھوں نے بارہا سر اُٹھایا اور ہمیشہ اس فتنہ کو سختی سے دبانا پڑا۔

جھوٹوں کے بادشاہ

جھوٹ بولنے کی ابتدا کیونکر ہوئی، اس کا سراغ لگانا مشکل ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کے تاریخی دور کا کوئی حصہ اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں جھوٹ نہ بولا گیا ہو، اور اسی لئے جھوٹ کی قسموں کی انتہا نہیں

ماں اپنے بچے سے گہوارہ ہی میں جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے لیکن اس کا نام پیار ہے، جب بچے ہوش سنبھالتے ہیں تو باپ جھوٹ بولتا ہے اور اس کا نام "طفل تسلی" ہے بچے اپنے والدین سے جھوٹ بولتے ہیں اور اسے "طفلانہ خوف" کہتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبہ سے جھوٹ بولتے ہیں اور اس کا نام "تادیب" ہے۔ دوست دوست سے جھوٹ بولتا ہے اور اسے مذاق کہتے ہیں۔ حکومت اپنی رعایا سے جھوٹ بولتی ہے اور اس کا نام "مصلحت" ہے ۔لیکن جھوٹ بولنا محض جھوٹ بولنے کی غرض سے ــــ یہ آرٹ یقیناً بہت بعد کی پیداوار ہے

جھوٹ کی ایک قسم وہ ہے جس میں سنجیدگی کے ساتھ جھوٹ بولا جائے اور دوسرا وہ جس کا مقصود صرف لطف و مزاح ہو۔ فارسی میں بوستان خیال اور اُردو میں طلسم ہوشربا یقیناً دنیا کا سب سے بڑا "دفترِ کذب و دروغ" ہے، لیکن ان کا شمار اُن قصّوں، کہانیوں میں ہوتا ہے، جن کو ہر پڑھنے والا جھوٹ ہی جان کر پڑھتا ہے۔ واقعاتی رنگ کے فسانوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ان میں جس قدر مبالغہ اور دور از عقل باتوں سے کام لیا گیا ہے وہ خود اپنے کذب کی شہادت ہیں۔ یعنی ان میں جھوٹ تو سنجیدگی کے ساتھ بولا گیا ہے لیکن محض جھوٹ کی غرض سے ــــ لطف و مزاح کے سلسلہ میں وہ تمام چھوٹے چھوٹے لطائف و ظرائف پیش کئے جا سکتے ہیں، جن سے ہر زبان کا لٹریچر مالا مال ہے

یوروپ کے لٹریچر میں ہمیں بعض مثالیں جھوٹ کی ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں جھوٹ پوری قوت کے ساتھ بولا گیا، اور اس مقصد کے ساتھ کہ لوگ اسے سچا سمجھیں، اور اس سلسلہ میں بیرن مونچاسن (Baron Munchausen) اور سالمنازار (Psalmanazar) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے

بیرن، جرمنی کا باشندہ تھا، جس نے روس کی سیاحت کرنے کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور جتنا جھوٹ بول سکتا تھا وہ سب اس کتاب میں پایا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "دورانِ سیاحت میں مجھے ایک بارہ سنگھا ملا، اس وقت میں چیری کھا رہا تھا، میں نے اس کی گٹھلی پھینک کر ماری، جو اس کے سینگوں میں لگی اور آخرکار بارہ سنگھے کے سر سے ایک پورا درخت چیری کا اُگ آیا"

یہیں روس میں اس نے ایک کوئی درخت بویا اور وہ بڑھتے بڑھتے اتنا بلند ہو گیا کہ چاند کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک اور لطیف جھوٹ ملاحظہ ہو عام طور پر چیزوں کے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں اسپرٹ میں ڈال دیتے ہیں اور وہ سڑنے گلنے سے محفوظ رہتی ہیں، لیکن بیرن لکھتا ہے کہ میں نے ایک بار ایک عمدہ گانے والے کی تانوں اور ٹکٹکریوں کو بھی اسپرٹ میں رکھ کر محفوظ کر لیا

روس کی سیاحت کے دوران میں اسے جنگلی جانوروں سے بہت واسطہ پڑا جن میں سے بعض کو اس نے رام کر لیا، اور بعض کو ہلاک کر ڈالا اور بعض سے وہ بال بال بچ گیا۔ اس سلسلہ میں دو بھیڑیوں کے واقعات بہت عجیب و غریب ہیں۔ ایک بھیڑئے کو تو اس نے پکڑ کر لگام چڑھا دی، اور گاڑی میں جوت کر سنٹ پیٹرسبرگ کے بازار دن میں اسے لئے پھرا، اور دوسرا بھیڑیا وہ تھا جس کے حلق کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ دُم تک لے گیا اور پھر ہاتھ باہر کھینچ کر بھیڑئے کو اس طرح اُلٹ دیا جس طرح دستانہ کو اُلٹ دیتے ہیں، یعنی بھیڑئے کے جسم کا بیرونی حصّہ اندر ہو گیا اور اندرونی حصّہ باہر آ گیا

بیرن کوئی فرضی ہستی نہیں تھا بلکہ روسی فوج میں ایک افسر کی حیثیت رکھتا تھا جس نے سنہ [illegible]ء میں ترکوں کی لڑائی کے بعد پنشن لی اور اپنے عجیب و غریب تجربات برلن کے بعض رسایل میں شایع کرا دئے۔ اتفاق سے ایک شخص نے جس کا نام راسپ (Raspe) تھا ان مقالات کو غور سے پڑھا اور اس نے سوچا کہ

اگران سب کو [illegible] واقعات کی طرح شایع کر دیا جائے تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ تیرہ مہینے رہنے کے بعد وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اس لئے بھاگ کر انگلستان [illegible] طرح بیرن کے سفرنامہ کا سب سے پہلا اڈیشن انگریزی زبان میں شایع ہوا

یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ انگریزی زبان کے طنز نگاروں نے ہر نئے اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا شروع کیا، لیکن یہ اضافہ کوئی اچھا پیوند نہ تھا، اس لئے رفتہ رفتہ لوگوں کی دلچسپی کم ہونے لگی

بیرن کے جھوٹ اور دوسرے لوگوں کے اضافوں میں یہ فرق تھا کہ بیرن کے جھوٹ میں سچ کا انداز تھا اور ہلکی سی ظرافت جو دوسروں کے حاشیہ آرائی میں مفقود تھی گویا وہ ایک ایسا لطیفہ گو تھا جو بغیر ہنسے ہوئے دوسروں کو ہنسانا چاہتا تھا۔ علاوہ بریں اس کے جھوٹ میں ایک منطقی استدلال بھی ہوا کرتا تھا اور بچوں کی سی سادگی بھی جو ہر بات پر حیران ہو جاتے ہیں

وہ لکھتا ہے: ۔ "میں ایک بار کسی گاؤں میں پہونچا جو شدید برفباری کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا میں نے اپنا گھوڑا کھونٹا سمجھ کر ایک لکڑی سے باندھ دیا جو زمین سے ابھری ہوئی نظر آتی تھی، رات بھر میں برف پگھل گئی اور صبح کو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا ایک منارہ کے بادنما سے بندھا ہوا ہے" مطلب یہ کہ برفباری کی کثرت سے پورا منارہ چوٹی تک چھپ گیا تھا اور صرف بادنما کا حصہ کھلا ہوا باقی رہ گیا تھا جسے کھونٹا سمجھ کر اس نے گھوڑا باندھ دیا تھا، اس لئے جب برف پگھل گئی تو گھوڑا بادنما سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا

ایک دفعہ اس کے پوستین کے کوٹ کو کسی باؤلے کتے نے کاٹ لیا، تو کوٹ بھی دیوانہ ہو کر کتے کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا

ایکبار اس کا دستہ کسی گاؤں میں پہونچا جہاں سخت برفباری ہو رہی تھی۔ سوتے وقت اس نے بگل بجایا، لیکن اس سے کوئی آواز پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے دن جب وہ کسی اور مقام پر پہونچا جہاں سردی کم تھی اور بگل کو کھونٹی پر لٹکا دیا تو اس سے وہی آواز نکلنے لگی جو پہلے نہ نکلی تھی۔ یعنی وہ آواز جو سردی کی شدت سے بگل کے اندر جم کر رہ گئی تھی، گرم جگہ پہونچ کر سنائی دینے لگی

بیرن کا جھوٹ ایک طرح سے گویا جن و پری کی کہانیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور جو یورپ کے بعض قصے کہانیوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، مثلاً درخت کا اگ کر چاند تک پہونچ جانا کہ بعینہ یہی کہانی جرمنی کے (Fairy tales) میں بھی پائی جاتی ہے

جرمن زبان میں اس قسم کی کہانیاں بہت پائی جاتی ہیں اور (Schilda) کے رہنے والوں سے اس قسم کے احمقانہ واقعات اکثر منسوب کئے جاتے ہیں سرزمین شلارافن لینڈ کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں، جہاں اسی شخص کو بادشاہ بنایا جاتا تھا جو سب سے بڑا جھوٹ بولنے پر قادر ہو۔ چنانچہ ایک شخص کو اس روایت پر بادشاہ بنایا گیا کہ اس نے بھنے ہوئے مسلم سوروں کو ادھر ادھر لوگوں کے پاس جاتے اور کھانے کی درخواست کرتے ہوئے دیکھا تھا

انگریزی زبان میں اس قسم کے ادب کا عنصر بہت ضعیف ہے۔ للی پٹ ([illegible]) کے یہاں طنز کا حصہ زیادہ غالب ہے اور شاعری کا کم۔

بیرن کی سی دروغ بافی زیادہ تر سیاحوں کے یہاں پائی جاتی ہے، لیکن بیرن کے بعد سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ جھوٹ بولنے والا سالمنا زر ہوا ہے ۔۔۔۔ یہ لینگوی ڈاک کا رہنے والا تھا جو اپنے داستان گوئیوں کی وجہ سے مشہور ہے

بیرن کا جھوٹ تو ایک قسم کا تفریحی جھوٹ تھا جس سے مقصود دھوکا دینا نہ تھا، لیکن اس شخص نے تو جھوٹ کی ایک عمارت کھڑی کر دی اور عرصہ تک لوگوں کو اس پر سچ کا گمان رہا۔ اس کی عمر ابھی ۲۰ سال کی بھی نہ تھی کہ ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے سیاحت شروع کر دی، لیکن یہ سیاحت یورپ سے باہر کی نہ تھی، کچھ دنوں تک غائب رہنے کے بعد جب واپس آیا تو وہ بالکل دوسرا شخص تھا، یعنی یہ اپنے آپ کو جاپان کا باشندہ بتانے لگا اور اسی کے ساتھ جزیرہ فارموسا کے حالات سیاحت بیان کئے جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا

اس نے یہ حالات جاپانی زبان میں لکھے حالانکہ وہ اس زبان سے ناواقف تھا، اسی طرح اس نے گویا اپنی طرف سے ایک زبان علٰحدہ ایجاد کی (جسے وہ جاپانی کہتا تھا) اور اس زبان میں اس نے جاپانیوں کی معاشرت اور ان کے مذہبی رسوم کی تاریخ لکھی، جاپانی زبان کی گرامر ایجاد کی اور بہت سے ایسے اعداد و شمار پیش کئے جنھیں ایک جاپان کا باشندہ ہی بتا سکتا تھا۔ الغرض یہ شخص اس قدر محنت و سلیقہ سے جھوٹ بولا کہ لوگ عرصہ تک اس کو سچ سمجھتے رہے اور شاید دنیا کی تاریخ میں یہی پہلا شخص ہے جس نے جھوٹ بولنے کا ایسا زبردست ریکارڈ قائم کیا۔

اے حجرہ نشینو!

شکن ڈالے پڑے ہو، خاک آلودہ جبینوں میں
چھپائے دست و بازو لمبی لمبی آستینوں میں

یبوست کا تسلّط ہے دماغِ زہد پرور پر
تناسب ہے قیاسوں میں، نہ گہرائی قرینوں میں

وہی وقتی تضرّع ہے، وہی رسمی جبیں سائی
غلامی اینٹھتی پھرتی ہے جذبے کمینوں میں

سمجھتے ہو تمھارا دل نہیں، عرشِ الٰہی ہے
خدا کو بند کر رکھا ہے تم نے اپنے سینوں میں

ابوجہلو! تمھیں عرفاں نہیں اس راز کا شاید
خدا اب جلوہ فرما ہے بموں اور گن مشینوں میں

کشاکش ہائے نظمِ عالمِ امکاں میں ملتا ہے
وہ حجروں میں نہیں، اب جنگ کے میداں میں ملتا ہے

نہیں ہے امتدادِ وقت کا تم کو یقیں اب تک
کہ تم ہو دورِ ماضی کی طرح بارِ زمیں اب تک

ہوئی مدت کہ تم نے سلب کر لی روحِ ملّت کی
رہے میّت فروشِ مذہب و ایمان و دیں اب تک

نماز و سجدہ تک محدود استعداد و ہمّت ہے
وضو میں صرف چڑھتی ہیں تمھاری آستیں اب تک

روایاتِ کہن کا درس اب بھی دے رہے ہو تم
خبر کچھ انقلابِ بزمِ ہستی کی نہیں اب تک

قیامت ساحلِ مشرق سے ٹکراتی ہے سر اپنا
مگر اے بزدلو! تم ہو یہاں حجرہ نشیں اب تک

تمھارا خانوادہ قوم کا اک جزوِ مہمل ہے
جو ہے اسلام کا داعی، وہی طبقہ معطّل ہے

سبق تیرہ صدی پہلے کے ابتک ہیں زبانوں پر — کیا کرتے ہو تم لفظوں سے جادو نوجوانوں پر
حوادث سے زمیں کا گوشہ گوشہ شعلہ بر سر ہے — دماغ ابتک تمہارے ناچتے ہیں آسمانوں پر
حدیثِ ارتقا ایسی اذانِ بزمِ ہستی ہے — کہ سنتے ہی جسے تم ہاتھ رکھ لیتے ہو کانوں پر
خدا اُن کے بنے بیٹھے ہو تم زعمِ تقدس میں — پڑے رہتے ہیں جو جاہل تمہارے آستانوں پر
عصا و جبہ و عمامہ اسبابِ نمائش ہیں — مقدس جال ہیں یہ لمبے لمبے بال شانوں پر

شکاری قوم کے ہو - تاجرِ علم و عقیدت ہو
حقیقت میں تمھیں وجہ زوالِ اہلِ ملت ہو

چھپے بیٹھے ہوئے ہو تم قدامت کے نقابوں میں — مسلسل، عورتوں کی طرح رہتے ہو حجابوں میں
اُٹھو، اور دو ثبوت اسوقت اپنے مرد ہونے کا — کہ تم ہو مجلسِ اہلِ وطن کے باریابوں میں
تحفظ میں وطن کے - ساتھ اربابِ وطن کا دو — وطن ہے مبتلا اسوقت صد گونہ عذابوں میں
سوادِ ہند کے چاروں طرف بارود پھیلی ہے — نہیں معلوم کس دن آگ لگ جائے شتابوں میں
یہ حجرے ہی تمہارے مستقل مدفن نہ بن جائیں — کہیں تم دب کے رہ جاؤ نہ بوسیدہ کتابوں میں

ہے عہدِ جنگ، ذہنیت بدل کر باہر آجاؤ
جو زندہ ہو تو حجروں سے نکل کر باہر آجاؤ

سیماب اکبرآبادی

بھگتی تحریک کے شاعر

علم و ادب کا احیاء امیر خسرو کے بعد کچھ عرصہ تک ادب کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زمانہ شعر و شاعری کے لئے سازگار نہ تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس دور میں مذہب کا بہت زور رہا۔ مذہب کی تبلیغ کے لئے شاعری کو ایک ناکارہ سی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے نظم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آخرکار جس مذہبی تحریک کی بدولت ہندی شاعری کو دیس نکالا ملا تھا وہی ڈیڑھ دو سو برس کے بعد اس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ شالی ہندوستان میں وشنو مذہب کا پھیلنا تھا کہ ہندی ادب میں جان پڑ گئی۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوؤں میں ایک بھاگ دوڑ مچ گئی۔ یہی حال ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کا ہوا تھا جسے ترکوں نے فتح کیا تھا وہاں کے یونانی عالم اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بختیار کے بیٹے محمد خلجی نے جب بہار فتح کیا تو سارا ہندوستان سہم گیا۔ بڑے بڑے عالم پنڈت اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے چن چن کر بت توڑے اور مندر برباد کئے لیکن اس سے ہندو مذہب فنا نہ ہو سکا۔ ہندو مذہب کا فلسفہ ایسا اٹل ہے کہ اگر رسم و رواج کا خاتمہ بھی ہو جائے پھر بھی ہندو دھرم اس فلسفہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمان پرانے مذہب کو مٹا نہ سکے ورنہ جہاں کہیں بھی یہ گئے انھوں نے سارے ملک کو مسلمان بنا دیا۔ چنانچہ مذہب اسلام سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے وشنو دھرم کا پرچار ہوا لیکن آگے چل کر ان دونوں کے عناصر اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ ایک اور مذہب پیدا ہوا جسے "صوفی مت" کہتے ہیں۔ اس طرح ہندو مسلمانوں کے خیالات میں بڑی حد تک یگانگت پیدا ہو گئی جیسے پھر کبھی نہ پیدا ہوئی۔

بھگتی تحریک کو تین شاخوں میں منقسم کر سکتے ہیں (۱) رام کی بھگتی (۲) کرشن کی بھگتی اور (۳) صوفی مت۔ یہ لازم ہے کہ ان تحریکوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھا جائے کیونکہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اتنی بات تو ہر وشنو، چاہے وہ کسی فرقہ کا ہو، مانتا ہے کہ خدا انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے یعنی اوتار لیتا ہے اور انسان اس کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہے۔ یہی مکتی یا نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ یہ فلسفہ بڑا دلکش تھا، اس کے مقابلہ میں برہمنوں کا فلسفہ وحدانیت جس کے بانی شنکر اچاریہ تھے بہت خشک تھا۔ چنانچہ وشنو دھرم کے بے شمار پیرو کار ہو گئے اور برہمنوں کا زور دن بدن کم ہونے لگا۔ ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وشنو تحریک برہمنوں کا اقتدار کم کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ وشنو مذہب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی تھیوسوفی (Theosophy) سے کیا جا سکتا ہے جس میں محض رسم و رواج کی پابندی کا نام مذہب نہیں ہے بلکہ جس کا واحد مقولہ یہ ہے کہ "خدا محبت ہے اور محبت خدا" (God is love and love is God)

جب یہ حال ہو تو وشنو مذہب کیوں نہ مقبولِ عام ہوتا۔ اس کی بے نظیر مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس نے سنسکرت کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان میں دھرم کا پرچار کرنا شروع کیا۔ اس لئے مذہب کے دائرہ میں اس نے جو کچھ کیا وہ تو ایک الگ چیز ہے۔ لٹریچر پر اس کے احسانات بہت زیادہ ہیں چنانچہ قدیم ہندی نظم کا سب سے خوشگوار حصہ وہی ہے جو رام اور کرشن کے بھگتوں نے لکھا ہے۔

تحریک بھگتی کا آغاز یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بھگتی تحریک کی ابتدا راما نند سے ہوئی لیکن ان سے پہلے بھی بعض بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے راما نند کے لئے شاہراہ طیار کی تھی چنانچہ سکھوں کی مقدس کتاب "آدی گرنتھ صاحب" ہے جس میں بہت سے قدیم شاعروں کا کلام ہے۔ اسے ۱۶۰۴ء میں گرو ارجن نے مرتب کیا تھا۔ اس میں بھگتی کے اشعار بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں[1]۔ ان سے بہت پہلے سرن اور نام دیو دو شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں بہت زیادہ حسن اور شیرینی ہے۔ عہدِ قدیم کا ایک اور شاعر ہے جس کا نام جے دیو ہے۔ یہ "گیتا گوبندا" نامی مشہور کتاب کا مصنف بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ کوئی اور شخص رہا ہوگا ہم نے جس شاعر کا ذکر کیا ہے اس کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ اس کا کلام ہی دستیاب ہو سکا۔

---

[1] گرنتھ صاحب کسی ایک آدمی کی تصنیف نہیں ہے اس میں بہت سے شاعروں کا کلام پایا جاتا ہے چنانچہ کبیر کا بہت سا منتخب کلام اس میں شامل کیا گیا ہے۔ قدیم ترین بھگتی شاعروں کے اشعار بھی اس میں پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے یہ ایک نادر کتاب ہے۔

سرجن پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس کی پیدائش سندھ میں کسی قصاب کے گھر ہوئی تھی لیکن اس نے اپنا آبائی پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا اور ساری زندگی یادِ اللہ میں گزار دی۔ "گرنتھ صاحب" میں اس کے دو حمد ملتے ہیں۔

نام دیو، مرہٹہ دیس کا رہنے والا تھا اور "پونڈرپور" کے "وِٹھوبا" کا چیلا تھا۔ وہ غالباً پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ ذات کا درزی تھا۔ پہلا اس نے اپنے پیشے کی طرف بہت توجہ صرف کی لیکن جب اس میں نفع کی صورت نہ دیکھی تو ڈاکوؤں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ آخر اس نے اس مکروہ پیشہ سے توبہ کی اور سادھو ہو گیا۔ اس کی شاعری کا دور بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نام دیو نے اپنی مادری زبان مرہٹی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہندی میں بھی اس کا کلام بہت وافر ہے۔ اسکے بہت سے حمد گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ نام دیو کی مختلف الحیثیات شخصیت بہت دلچسپ ہے۔ مذہب ہو یا ادب دونوں حیثیتوں سے بہت کم انسان ایسے گزرے ہیں جو اس کی صف میں کھڑے کئے جا سکیں۔

رامانند غالباً رامانند کا عہدِ زندگی سنہ ۱۴۰۰ء ہے۔ انھوں نے رام چندر جی کو خدا کا اوتار مانا ہے اور اس کی تعلیم زندگی بھر دیتے رہے۔ ان کے خیال میں رام کی بھگتی سعادتِ اولین ہے جس سے انسان "آواگون" کی زنجیروں سے نجات پا جاتا ہے۔ رامانند اس عقیدہ کے بانی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے نام دیو اور سرجن یہی درس دے گئے تھے البتہ ان کی تعلیم کسی منظم تحریک کی صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آئی اس لئے رامانند کو مواد طیار ملا اور انھوں نے اپنی تحریک میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بنارس میں قیام کیا اور یہیں اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے پیروؤں میں قابلِ تعظیم سمجھے جاتے تھے بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی انھیں اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

لیکن اس پُرعظمت زندگی سے ادب کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ بحیثیت شاعر کے ان کا مرتبہ بلند نہیں ہے —— گرنتھ صاحب اور بعض دیگر مجموعوں میں ان کا ہندی کلام موجود ہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ خدا انسان کے دل میں ہے۔ اس کا نور ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے، پھر ہم کیوں اسے مندر یا مسجد میں تلاش کریں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رامانند بت پرستی کے خلاف تھے گو انھوں نے اس طرزِ عبادت پر حرف ضرور رکھا ہے۔ وہ رام کے بھگت تھے لیکن بت پرستی کو جائز سمجھتے تھے۔ "تثلیث" کے بھی قائل تھے اور ہندو دیومالا کی بڑی قدر کرتے تھے۔

بھگتی دھرم کا خاص اصول یہ ہے کہ اگر انسان میں سچی لگن ہے تو خدا ضرور مل جاتا ہے۔ کون ایسا انسان ہے جسے خدا کی تلاش نہ ہو، پس رامانند کے مذہب میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ و طبقہ کے لوگ شامل ہو گئے۔ ہندو مسلمان، شودر، اچھوت، مرد عورت سب نے ان کے مذہب کو لبیک کہا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مساوات اور رواداری کے باوجود بھی ذات پات کی بندھن نہیں ٹوٹی بلکہ دن بہ دن مضبوط ہوتی گئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ در پردہ برہمنوں کا اب بھی زور تھا اور مذہب اسلام کے سامنے ذات پات کی آہنی دیوار قائم کرنے کا جذبہ دن بہ دن دلوں میں موجزن ہوتا جا رہا تھا۔ رامانند اور ان کے چیلوں نے سنسکرت کو دور ہی سے سلام کیا اور ہندی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ ٹھہرایا۔ ہندی کی تحریک اس طرح ایک مخصوص طبقہ سے نکل کر عوام تک پہونچی۔

رامانند کے شاگردوں میں بارہ زیادہ مشہور ہیں جن کا کلام ابھی تک محفوظ چلا آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر راجہ پیپا ہیں جو گگرون گڑھ کے راجہ تھے۔ انکی ولادت سنہ ۱۴۲۵ء میں ہوئی تھی۔ رامانند کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد انھوں نے راج پاٹ چھوڑ دیا اور فقیر ہو گئے۔ دوسرے دھنّا جاٹ تھے جو ان سے دس سال پہلے پیدا ہوئے تھے، ان کی نسبت مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ سین، مہاراجہ ریواں کے یہاں نائی تھا۔ اس کے بعض دوہرے گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ عباد تنند، امرت دھارا نامی کتاب کے مصنف تھے، اس کا موضوع ویرانت ہے۔ یہ کتاب چودہ فصلوں میں ہے۔ ریداس ذات کے چمار تھے لیکن ان سے زیادہ سچا بھگت شاید بھگتی کی تاریخ میں کبھی نہ پیدا ہوا ہوگا۔ ریداس جیتے تھے تو رام کے لئے اور مرتے تھے تو رام کے لئے۔ ان کی عظمت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرا بائی ایسی بھگت ان کی چیلی تھی۔ ریداس کے تیس حمد گرنتھ صاحب میں درج ہیں۔

کبیر داس مذہبی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے کبیر داس رامانند کے شاگردِ رشید کہے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ وہ کسی بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے اپنی لاج رکھنے کے لئے بچے کو بنارس کے قریب کسی تالاب میں پھینک دیا۔ ایک جولاہے نے جس کا نام نیرو تھا یہ دلخراش منظر دیکھا اور تالاب میں کود کر بچے کو نکال لایا۔ اس کی بیوی جس کا نام نیمہ تھا بچے کو پاکر بہت خوش ہوئی۔ یہ دونوں بیچارے اولاد کو ترس گئے تھے انھوں نے اس بچے کو پالا

۱؎ والمیکی مصنف رامائن کے بارے میں بھی اسی طرح کا قصہ مشہور ہے۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر کی نسبت بھی ایسی ہی ایک روایت سنی جاتی ہے۔ ۲؎ اس تالاب کا نام میرا تالاب ہے۔

پوسا اور اس کا نام کبیر رکھا۔ کبیر کی نسبت ایک روایت اور بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ جوان تھے اس زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں ان سے ناراض ہو گئے ہندو اس وجہ سے برہم تھے کہ کبیر نے اچھوتوں کو جنیو پہننے کی اجازت دیدی تھی، مسلمان اس وجہ سے خفا تھے کہ انھوں نے رام کو خدا کا اوتار مانا تھا۔ لوگ طعنے دیتے تھے کہ تمھارے تو کوئی گرو ہی نہیں۔ کبیر کے لئے یہ کلنگ کا ٹیکا تھا اسے مٹانے کے لئے انھوں نے رامانند کا ساتھ کیا۔ پہلے رامانند میں کلام تھا کہ وہ انھیں اپنے مریدوں میں شامل کریں گے یا نہیں اس لئے انھوں نے یہ سوانگ رچا کہ بھور کے وقت گھاٹ کی سیڑھی پر لیٹ گئے۔ ادھر ہی سے گرو جی کا گزر ہوتا تھا۔ جب وہ سیڑھی کے سہارے نیچے اترنے لگے تو ان کے پیر کبیر کے بدن سے لگ کر لڑکھڑا گئے اس پر انھوں نے "رام رام" کہا۔ یہ کلمہ منھ سے نکلنا تھا کہ کبیر ان کے چیلے ہو گئے۔ اب کبیر رامانند کے نقش قدم پر چلنے لگے اور ایسے چلے کہ بعد میں اپنے گرو سے بہت آگے نکل گئے، ان کا مذہب "کبیر پنتھ" کہلاتا ہے جس کے ماننے والے اب بھی شمالی ہندوستان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کبیر مسلمان تھے اس وجہ سے ان کی تعلیم میں اسلامی رنگ بھی موجود ہے۔ انھوں نے خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیا ہے۔ خدا کے لئے وہ 'رام' 'ہری' 'گوبند' اور 'اللہ' وغیرہ ہر طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں کبیر کو اوتاروں پر اعتقاد نہ تھا۔ بت پرستی اور اس طرح کے بہتیرے "پاکھنڈوں" سے انھیں سخت نفرت تھی۔ چونکہ لوگ برہمنوں کی زیادتیوں سے تنگ آگئے تھے اس وجہ سے انھیں کبیر کی تعلیم بہت پسند آئی۔ کبیر کو وہی کامیابی نصیب ہوئی جو ان سے تقریباً دو ہزار برس پہلے گوتم بدھ کو ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جو مذہب کا اس قدر اثر ہے وہ انھیں مہاتماؤں کی تعلیم کی بدولت ہے (ملاحظہ ہو کتاب "کبیر اینڈ کبیر پنتھ" مصنفہ پادری ای۔ سی ڈیوک)

کبیر پنتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف کبیر کے چیلے ہی نہیں بلکہ اور سنتوں کے ماننے والے بھی ان کے اصولوں سے بہت فیض اٹھاتے ہیں۔ ان بہت سے سنتوں کے پھیل جانے سے شاعری کا رواج بہت بڑھ گیا اور اس طرح ادب کا ذخیرہ بھی وسیع ہو گیا۔ کبیر کی نسبت سیکڑوں روایات مشہور ہیں لیکن ان میں بہت کم صداقت کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ کبیر نے اپنے مذہبی خیالات کی دھن میں کبھی کبھی اپنے کنبہ والوں کو ناراض بھی کر دیا تھا یہی نہیں ہندو و مسلمان ہر ایک ان سے ناراض تھا۔ یہ مخالفت ساری زندگی ان کے لئے سوہان روح رہی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ کبیر ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ سکندر لودی جو اس زمانہ میں بادشاہ تھا کبیر پر بہت برہم ہوا اور انھیں قید کر لیا۔ رہائی کے بعد بھی انھیں حکم دیا کہ بنارس سے نکل جائیں۔ آخر انھیں بنارس چھوڑنا پڑا اور قصبہ مگہر ضلع گورکھپور میں قیام کرنا پڑا۔ یہیں پیرانہ سالی میں ان کا انتقال ہوا۔

کبیر کی نظمیں بے شمار ہیں جس کا ایک نادر مجموعہ بابو شیام سندر داس نے "کبیر گرنتھاولی" کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے بھگتی تحریک پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ کبیر کی نسبت جو عام طور پر مشہور رہے کہ انھوں نے صنف نازک کی بڑی خدمت کی ہے، اس کی مولف موصوف نے پر زور تردید کی ہے۔ کبیر کے مذہب، ان کے گرو کا نام، ان کے شاگردوں کی تعداد اور ان کے سنہ وفات کی نسبت سخت اختلاف ہے لیکن ڈاکٹر "میورا" کی سند پر ہم نے جو حالات کبیر کے درج کئے ہیں وہی تحقیق سے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔[2]

کبیر کا مذہب صوفیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے یہاں تک کہ ان پر بھی بادشاہ وقت کا قہر اسی طرح نازل ہوا جس طرح عرب میں منصور حلاج پر "انا الحق" کہنے کے باعث نازل ہوا تھا۔ کبیر کی آزاد روی ان کے ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ وہ دنیا کو "مایا جال" سمجھتے تھے اس لئے اس کی ترغیبات میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مذہب انسان کا مذہب تھا ہندو مسلمان کا مذہب نہیں ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے اپنے کلام کو خود تحریر کا جامہ نہیں پہنایا۔ غالباً یہ ان کے شاگردوں نے کیا۔ کبیر کے بہت سے مجموعے موجود ہیں لیکن ان میں بہت سا حصہ ایسا ہے جس کے وہ مصنف نہیں تھے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا حصہ "گرنتھ صاحب" میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ "بیجک" (مخفی خزانہ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب کبیر پنتھیوں کی مذہبی اور مقدس کتاب ہے۔ اسے بھاگو داس نے ترتیب دی جنھیں کبیر سے بڑا اعتقاد تھا۔ یہ کوئی مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی نظمیں ہیں جن میں اکثر کی بحریں مختلف ہیں۔ ایک اور مجموعہ نظم "رامائنی" ہے جس میں ان کے تمام مذہبی اصول اکٹھا کر دئے ہیں۔ "سیرہ" نامی اسی طرح کی نظم ہے لیکن اس کی بحر رامائنی سے مختلف ہے۔ چونتیسا میں ناگری رسم الخط کی مذہبی اہمیت کا ذکر ہے وپر تیسی میں برہمنوں کی قدامت پرستی پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ "کہرا"، "وسنتا"، "بیلی"، "چاچری"، "برہولی" اور "ہندولا" بھی مذہبی رنگ کی نظمیں ہیں۔ جن بحروں میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے بھی یہی نام ہیں۔ ان نظموں میں لگ بھگ چار سو ساکھی (بند) ہیں۔ گرنتھ صاحب کا وہ حصہ جو کبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

---

[1] کبیر کے پیر شیخ تقی نامی ایک بزرگ تھے۔ کبیر کے دو چیلے دھرم داس اور گوپال بہت مشہور ہیں۔ کبیر کی بیوی کا نام لوئی اور بیٹے کا نام کمال تھا۔ (ماخوذ از شیام سندر داس)

[2] ملاحظہ ہو: Antiquities of the North Western Provinces by Dr: Fuhrer

سب کا سب انھیں کی تصنیف نہیں ہے۔ اسی طرح "بیجک"، جو کبیر کی تصنیف سمجھی جاتی ہے اس میں آدھے سے زیادہ اشعار دوسروں کے کہے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ ہزار سے زیادہ دوہے کبیر کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ محلہ کبیر پورا شہر بنارس میں کبیر کی ایک کتاب ملی ہے اس میں ان کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہے۔ اس کتاب میں بیس ابواب ہیں جس میں زیادہ تر حصے شاگردوں کے لکھے ہوئے ہیں لیکن یہ اب تک شایع نہیں ہوئے۔ بیجک اودھی زبان میں ہے اس لئے کبیر کے بقیہ کلام سے مختلف ہے جس کی زبان عامیانہ اور سوقیت سے بھری ہوئی ہے[1]۔ زبان تو گنوار ہے ہی اسلوب بیان بھی سخت عامیانہ ہے۔ الفاظ ایک دوسرے میں زبردستی گتھو دئے گئے ہیں۔ حرفی غلطیاں بہت زیادہ ہیں جیسے ادبی حیثیت نہیں رکھتے صرف گنواروں کی بول چال میں کام آسکتے ہیں۔ صنعت ایہام اور صنائع بدائع کی اس قدر بھرمار ہے کہ بعض اوقات مطلب گم ہو جاتا ہے۔ باوجود ان سب خامیوں کے کبیر کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔ پاکھنڈ یعنی ظاہر پرستی کے انھوں نے بخیے اڑا دئے، خدا پرستی کا صحیح اور سب سے آسان راستہ بتایا۔ یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ ان کے اشعار دل میں چبھنے والے جذبات کو ابھارنے والے ہوتے ہیں۔ ہندی شاعری کا انھیں باوا آدم کہا جاتا ہے۔ شاعری میں جو ایک صنف حمد و ثنا کی بہت مقبول ہے اس کے بانی یہی ہیں۔ انسے بیشتر جو شعرا گزرے ہیں، ان کی تعلیم اس قدر عام نہ ہو سکی تھی۔ کبیر نے مختلف مذاہب اور اعتقادات کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ کبیر کے بعد جو لوگ ہوئے وہ انھیں کے نقش قدم پر چلے۔ کبیر کے خیالات ہندوستان میں اس قدر مقبول ہیں کہ شاعر اعظم رابندرناتھ ٹیگور نے ان کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور انھیں کے خیالات سے مستفید ہو کر "گیتان جلی" لکھی جس پر انھیں دنیا کا سب سے بڑا انعام "نوبل پرائز" ملا (ملاحظہ ہو Hundred Poems of Kabir by Dr. Tagore)

ایک خاص بات جو کبیر اور ان کے دور کے تمام شعرا میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ایک خاص پیغام کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری شاعری میں آج یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ہم خود نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی جمع پونجی وہی چند عشقیہ باتیں، ہجر و فراق اور رز[...] کے مضامین ہیں۔ ہم اس بدنما داغ کو دھونے کے لئے اس سے بہتر اور کیا کام کر سکتے ہیں کہ کبیر، نانک اور چیتنیہ کی طرح اپنی شاعری کا ایک خاص مقصد بنالیں۔ دنیا کے تمام مذہب ملکوں میں یہی ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کی بنیاد پڑ چکی ہے لیکن ہنوز ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

کبیر کے ایک بیٹے کمال نامی تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کی تمام تعلیم کو مٹی میں ملا دیا اور اس کی سخت تردید کی اسی وجہ سے ایک بار کبیر نے خود کہا تھا:۔

"میرے کو کھ لے سانپ جنا ہے" یعنی میری اولاد سخت نالائق ہے۔

نانک کبیر کی تعلیم سے جتنے مذاہب پیدا ہوئے ان میں نانک کے مذہب نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ نانک کا زمانہ حیات (۱۴۶۹-۱۵۳۸ء) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ ۲۷ برس کے تھے تو ان کی ملاقات کبیر داس سے ہوئی۔ اس ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ نانک کے خیالات بھی کبیر سے ملنے جلنے لگے۔ یہاں تک کہ نانک ہندو مذہب سے کبیر کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔ عرصہ تک گرو نانک اپنے شاگرد مردان کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرتے رہے[3]۔ مردان کو ساز بجانے میں اچھی مہارت تھی۔ اس کے کلام ملتے ہیں ان میں پنجابی اور ہندی کی کھچڑی ہوتی ہے۔ اگرچہ بحیثیت شاعر اس کا مقابلہ کبیر سے نہیں کیا جا سکتا پھر بھی اس کے اشعار میں شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ نانک کے بہت سے چیلے تھے جو عبادت کے وقت گرو کے بھجن گایا کرتے تھے۔ "گرنتھ صاحب" میں نانک کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔

رام بھگتی کا دور راما نند اور کبیر داس ہی تک ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس تحریک کے روشن ترین ستارہ تلسی داس ہیں۔ ان کے بعد بھی اس کا بہت زور رہا چونکہ مذہب ہندوستان کی روح ہے اس لئے رام اور کرشن کی بھگتی ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ البتہ اس کے ادبی رجحانات کو سمجھنے کے لئے راما نند، کبیر، تلسی داس اور نانک کا کلام کافی ہے۔ اب رہا کرشن بھگتی کا اثر اس مضمون میں اس کا ہم تفصیل سے ذکر نہیں کر سکے کیونکہ یہ موضوع طویل ہے۔ انشاء اللہ کسی آیندہ مضمون میں اسکی وضاحت کی جائے گی۔

گوری سرن لال سریواستو ایم۔اے (علیگ)

---

[1] کبیر نے خود لکھا ہے "میری بولی پوربی" لیکن ان کی زبان میں اودھی، راجستھانی، پنجابی اور پوربی کا معجون مرکب ہے۔ ماخوذ از شیام سندر داس

[2] کبیر کے اشعار کھردرے ہیں۔ ان میں ادبیت کی چاشنی نہیں ہے۔ (شیام سندر داس)

[3] نانک صاحب اولاد بھی تھے لیکن بعد میں انھوں نے ترک و تجرید اختیار کر لیا تھا۔

عقلیت کیا ہے؟

دنیا کی ہر شئے انقلاب پذیر ہے۔ ہر چیز، ہر لمحہ، ہر گھڑی تبدیل ہو رہی ہے۔ جو صورت کل تھی وہ آج نہیں، جو آج ہے کل نہ ہوگی۔ کسی چیز کو قیام نہیں اگر قیام ہے تو فقط تبدیلی کو۔

ہر شئے کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہبی تصورات اور سماجی و اخلاقی قدروں میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ کبھی قدما کے ہر قول و فعل پر آمنا صدقنا کہنا ہمارا شیوہ تھا۔ جو کچھ وہ کہہ گئے اُس میں سرِ مو تبدیلی کرنا یا ان کی کسی بات پر شک کرنا گناہِ عظیم تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ جو وہ کہہ دیں اسی کو صحیح سمجھو۔ نہ تجربے سے حقیقت سمجھنے کی ضرورت، نہ مشاہدے کو دلیلِ راہ بنانے سے غرض۔ مگر یہ حالت بھی قایم نہ رہ سکی۔ آفتابِ علم کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی تمازت نے صدیوں کے منجمد اور متحجر خیالات کو پگھلانا شروع کیا۔ انسانی دنیا پُرانے خیالات، قدیم رسم و رواج اور مذہبی عقاید کی سچائی میں شبہ کرنے لگی۔ محض اندھی تقلید اور اعتقادیت سے انسان کی تسلی نہیں ہوئی۔ حقیقت اور سچائی کے شیدائی کرم خوردہ کتابوں کی ورق گردانی کی بجائے براہ راست فطرت کا آزاد مطالعہ کرنے لگے۔

پہلے مذہبی عقیدوں اور مفروضہ حقیقتوں کے مطابق قدرتی مظاہر کی تشریح کیجاتی تھی۔ اب ہر کیفیت کا طبعی سبب ڈھونڈھا جانے لگا۔ اندھی تقلید کی بجائے عقل کو فوقیت حاصل ہونے لگی۔ دماغی غلامی کی زنجیریں ایک ایک کرکے کٹنے لگیں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قدما کے بسیط عناصرِ اربعہ کا تجزیہ کرکے انھیں ۹۹ عناصر میں ترتیب دیدیا۔ زمین جسے کائناتِ عالم کے مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا سورج کا ایک ادنےٰ سا سیارہ ہوکر رہ گئی۔ ستارے جو چرخِ نیلی پر زیبایش کے لئے سونے کی کیلوں کے بجائے سورج سے بھی بڑے بڑے آتشیں گولے نظر آنے لگے۔ حضرت انسان کو گمان تھا کہ وہ دوسرے جانداروں سے ایک مختلف مخلوق ہے۔ مگر نظریۂ ارتقاء کی صداقت نے ثابت کر دیا کہ یہ سب وہم ہے۔ غرض کہ علوم کی ترقی نے انسانی ذہنیت کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ یہ نئی ذہنیت ایک نئے فلسفہ کی صورت میں فروغ پانے لگی۔ آج اس فلسفہ کو ہم عقلیت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

عقلیت نام ہے اس ذہنیت کا جو بلا استثنا و کلّی طور پر عقل کی برتری کو تسلیم کرے اور ایسے فلسفہ و اخلاقیات کو تشکیل دے، جو عقل کی کسوٹی پر کسا جا سکے اور ہر طرح کے خیالی مفروضات سے مبرّا ہو۔ عقلیت ایک طریقہ ہے جو ہر چیز کا ٹھوس تجزیہ کرکے اس کی صحیح قدر معلوم کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقلیت، فلسفۂ زندگی کا اور فلسفۂ زندگی کی حیثیت سے عقلیت زندگی کے ہر پہلو پر اثرانداز ہوتی ہے مگر یہ دوسرے فلسفوں کی طرح چند مخصوص نظریوں کا مجموعہ نہیں بلکہ بدلتی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں بدلتی ہوئی چیزوں کی قدر معلوم کرنے کی کسوٹی ہے۔

یوں تو ہر شخص سوچتا اور سمجھتا ہے۔ کم و بیش اپنی عقل کا استعمال بھی کرتا ہے۔ مگر سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عقلیت پسند زندگی کے مسئلوں کی ہر گتھی کو عقل کے ناخن سے سلجھاتا اور عقل ہی کی روشنی میں ہر چیز کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگر اُس کے خیالات و نتیجے غلط ثابت ہوں تو وہ اُنھیں تبدیل کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اُس کے نزدیک سچائی سے بڑھکر کوئی سند نہیں۔ مگر وہ شخص جو کسی مذہب یا فرقہ کا پابند ہے۔ جس کی ذہنیت چند مخصوص اعتقادات تک محدود ہے لازمی طور پر اپنی عقل کی وسعت اور دائرۂ عمل کو تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اُس کے اعتقادات غلط ثابت ہوں تو بھی وہ نہ اُنھیں چھوڑ سکتا ہے اور نہ چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمانہ کے انقلاب سے پیدا شدہ نئے حالات کے زیرِ اثر وہ خود کو نہیں بدل سکتا وہ ہر چیز کو اپنے تنگ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر معنی اور حقیقت کو نہایت بے رحمی سے توڑ مروڑ کر اپنے فرسودہ اعتقادوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے خواہ اس میں انصاف اور سچائی ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔

عقیدہ سے ہماری مراد کسی ایسے دعوے سے ہے جس کی تائید میں نہ کوئی ثبوت ہو اور نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ کی ضرورت سمجھی گئی ہو بلکہ اس میں دھمکی دینا کافی سمجھا جاتا ہو۔ مثلاً فلاں بات نہ ماننے سے گناہ ہوگا یا جہنم میں بھیجے جاؤگے یا سماج سے خارج کر دئے جاؤگے وغیرہ۔

مذہب کی بنیاد کسی الہامی کتاب یا کسی ایسے شخص کے اقوال پر ہوتی ہے جو مافوق الفطرت خصوصیات رکھتا ہے۔ مذہب ہمارے سامنے چند دعوے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم ان پر یقین کریں۔ ناچیز عقل اور شیطانی سائنس کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی اجازت نہیں۔

نت نئی دریافتوں اور معلومات کے اضافہ سے ہمارا علم لگاتار ترقی کر رہا ہے۔ موجوداتِ عالم کے بارے میں جتنی معلومات آج ہمیں حاصل ہیں اُتنی کبھی نہ تھیں چنانچہ ہمارے خیالات اور نظریوں میں موجودہ علم کے مطابق بڑی حد تک ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور آیندہ بھی علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ خیالات اور نظریے بدلتے رہیں گے۔ مگر مذہبی اعتقادات کبھی نہیں بدلتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار جو مذہبی قوانین بتا دئے مذہب کے خیال میں وہ ہر مقام، ہر قوم اور ہر حالت میں یکساں کارآمد ہیں۔ برخلاف اس کے عقلیت کسی عقیدہ کی حامل نہیں، عقلیت پسند موجوداتِ عالم کے متعلق اپنے خیالات کو علم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اپنے اخلاق اور اعمال میں سماج کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق ترمیم کر لیتا ہے۔ کوئی عقیدہ، رسم و رواج یا روایت خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو اُسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عقلیت، مذہب کے خلاف ہے کیونکہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ عقلیت ہر اُس خیال اور رسم و رواج کی مخالف ہے جو معقولیت سے خالی ہے اور انسانیت کے حق میں نقصان دہ ہے۔ مگر پھر بھی محض مذہبی احکام کے زیرِ اثر یا اُن کی قدامت کے باعث مانا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر اہلِ ہنود کے ذات پات کے مذہبی سماجی نظام کو لیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان پیدائش ہی سے اچھا یا بُرا، اعلیٰ یا ادنےٰ ہوتا ہے۔ بڑی ذاتیں چار ہیں۔ برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ اور شودر۔ برہمن سب سے اعلیٰ سمجھے جاتے ہیں اُن کی تعظیم اور پیروی دیگر سب ذاتوں پر فرض ہے۔ اس نظام میں شودر کا درجہ سب سے نیچا ہے۔ اُس کی قسمت میں اونچی ذات والوں کی خدمت کرنا ہی لکھا ہے وہ اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتا اونچی ذات والوں سے ہمسری کی خواہش تک اُس کے حق میں موت کا پیغام ہو سکتی ہے۔ اسی ذات پات کے بندھن کے باعث کروڑوں انسان جہالت، غربت اور ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انسانیت سوز اور آمرانہ سماجی نظام مذہب کی سرپرستی میں قایم کیا گیا تھا۔ مذہب نے کہا ابتدا میں برہمن برہما کے تن سے نکلے۔ کھشتری بازوؤں سے ویش پیٹ میں سے شودر پاؤں سے پیدا ہوئے، چنانچہ اسی تناسب سے برہمن سب سے اونچے اور شودر سب سے نیچے سمجھے گئے۔ اس غلامانہ نظام کو قایم رکھنے کے لئے دو اعتقاد گھڑے گئے ایک مسئلہ آواگون اور دوسرا کرم کا قانون۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہر جاندار مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز ہر شخص کی موجودہ حالت اور ذات اس کے پچھلے اعمال پر منحصر ہے۔ یعنی اگر اُس نے پچھلی زندگی میں ہندو مذہب کے مطابق نیک اعمال کئے ہیں تو وہ اس زندگی میں برہمن یا دوسری اونچی ذاتوں میں پیدا ہوگا اور اگر بُرے اعمال کئے تو شودر بنے گا۔ صدیوں پہلے فاتح آریوں ہی نے ذات پات کے نظام کو ہندوستان کے مفتوح باشندوں پر لادا تھا۔ اور اُن میں سے اکثر کو نیچ ذات یا شودر قرار دیا تاکہ وہ بدیسی حاکموں کی خدمت کرتے رہیں۔ زمانہ بدلا، آقا خود دوسروں کے غلام بن گئے، مگر اس وقت تک ذات پات کا عقیدہ عوام کے مذہب کا جزو بنکر اُن کی ذہنیتوں پر چھا چکا تھا۔ وہ لکیر کے فقیر بن چکے تھے برہمنوں کی مذہبی حکومت کے قدم جم چکے تھے۔ آج بیسویں صدی میں بعہدِ جمہوریت میں جب ہم "مساوات" اخوت اور آزادی کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں۔ آج جب ہم کہتے کہتے کہ ہر شخص کو زندہ رہنے اور سماج کی مشترکہ دولت میں حصہ داری کا حق حاصل ہے۔ یہی ذات پات والے ہماری قومی اور سماجی ترقی کی راہ میں کانٹا بنے ہوئے ہیں آج بھی وہ عہدِ جاگیرداری کے خواب دیکھتے ہیں۔ اُن پر اس چیز کا اتنا اثر ہے ان کا آزادی کا تخیل اور معیاری حکومت کا تصور رام راج تک محدود ہے۔ رام راج کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداری۔ اُمرا شاہی۔ غلامی ذات پات کی غیر فطری و انسانیت سوز تقسیم اور عورتوں پر ظلم کے سوا وہ کچھ بھی نہ تھا۔

ہمارے سیاسی معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ ان پیچیدہ مسئلوں کو عقل اور حقیقت کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے ہم ایسے لوگوں کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چل رہے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ضرورتِ وقت کیا ہے۔ ایک وہ ہیں کہ قوم اور ملک کی قسمت کو ستّ اور اہنسا کے تجربات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں اُنھیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اگر اُن کا تجربہ ناکامیاب رہا تو ملک کا کیا حشر ہوگا ان کے نزدیک ستّ اور اہنسا مقصود کو حاصل کرنے کے ذرایع نہیں بلکہ خود مقصود ہیں۔ اسی ذہنیت کے باعث ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی قومی جماعت کی بجائے بھگتوں اور چیلوں کی بھجن منڈلی بنی ہوئی ہے اور دوسرے ہیں کہ عوام کی فرقہ وارانہ ذہنیت کو اُکسا کر اپنی شہرت اور منفعت کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ کہیں پاکستان کی طیاریاں ہیں تو کہیں رام راج کی صدائیں آ رہی ہیں۔ غرضکہ حقیقت بینی اور عقل کے استعمال کے بجائے فرسودہ اعتقادات اور جذبات کی رو میں بہکر ہم زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانا چاہتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ عقلِ انسانی سہو و خطا سے بری نہیں اس لئے اس پر کامل بھروسہ رکھنے سے ممکن ہے کہ یہ ہمیں غلط راستہ پر لیجائے۔ عقل اور منطق سے انسان

جو چاہے ثابت کر دکھاتا ہے۔ عدالتوں میں وکلاء انہی کے سہارے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے عقل کے ذریعہ ہم کسی شئے کے متعلق یکساں نتیجہ پر کبھی نہیں پہونچتے۔ اس کے علاوہ خشک اور بے رنگ منطق و عقل کی پیروی بھی تو زندگی کا واحد مقصد نہیں ہو سکتی۔ احساسات اور جذبات کی رنگینی انسانی زندگی پر ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ انسانی مزاج میں پسند ناپسند، محبت نفرت اور روپ رنگ کی دلفریبی کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ تصوف و عرفان کی مہمل اور معقولیت سے خالی باتیں اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ انسان نے انہی جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر بارہا ایسے اشرف اور نمایاں کام کئے ہیں جو ان کے بغیر ممکن نہ تھے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری قوت ادراک و فہم خطا کر سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہی وہ قوت ہے جس کے مناسب استعمال سے ہم ہر چیز کی حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔ عقل ہی انسان کی سب سے بڑی ذہنی قوت ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کی تمیز کرتی ہے۔ رہا ادراک و فہم کی غلطیوں کا سوال تو اس کے جواب میں ہم دو باتیں کہیں گے۔ اول یہ کہ ہمارے سوچنے سمجھنے میں جو عام غلطیاں ہوتی ہیں اگر ہم اُن کی وجوہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل کی کسی کمزوری یا نقص کے باعث نہیں بلکہ ہمارے تعصبات یا ذاتی رجحانات یا جذباتی ہیجان کے عقل و فہم پر غالب آجانے سے ہوتی ہیں۔ ایسی غلطیوں سے بچنے کے لئے نہ صرف یہی ضروری ہے کہ ہم صحیح اور درست طریقہ پر کسی چیز کے بارے میں سوچیں بلکہ جہاں تک ہو سکے اخذ کردہ نتائج پر ذاتی تعصبات اور رجحانات کا اثر نہ ہونے دیں۔ دوئم صرف عقل ہی میں یہ غیر معمولی استعداد ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو خود صحیح کر لیتی ہے اپنے افعال کی خود تنقید و تنظیم کرتی ہے۔ یہ اوصاف ہماری کسی اور ذہنی قوت میں نہیں پائے جاتے۔ مثال کے طور پر عقیدہ ہی کو لے لیجئے۔ وہ لوگ جو عقل کو ہیچ سمجھتے ہیں اکثر کہا کرتے ہیں کہ جہاں عقل کی رسائی نہیں وہاں ایمان لیا جاتا ہے۔ اس لئے ایمان زیادہ قابل اعتبار ہے۔ بلاشبہ ایمان سے ان کا مطلب مذہبی عقاید سے ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ مذاہب بھی کسی بات میں ہم خیال اور متفق نہیں۔ مختلف مذاہب اپنے پیروؤں کو مختلف باتوں پر عقیدہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں بعض اوقات ایک مذہب کے عقیدے دوسرے کے عقیدوں سے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ دونوں مذاہب خدائی مگر احکام ایک دوسرے کے قطعی خلاف!

کہا جاتا ہے کہ عقلیت پسند بھی تو کسی نہ کسی چیز پر یقین رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر سائنسدانوں پر کیونکہ علم کا خزانہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص ہر بات کا علم بذات خود حاصل نہیں کر سکتا اس لئے بہت سی باتوں میں سائنسدانوں اور عالموں کے اقوال کا اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ مگر سائنسدانوں پر یقین رکھنا جن کی ہر بات کی تصدیق ہو سکتی ہے ایسے شخص یا کتاب پر ایمان لانے سے بالکل مختلف ہے کہ جس کے دعوؤں کی کسی صورت بھی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ کسی علمی سچائی کو ہم عقیدہ محض نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی شخص یا سائنسداں کی صرف سند یا قول پر ہی ہم اسے ماننے کے لئے مجبور نہیں۔ دوئم ہر علمی اور سائنٹفک سچائی کی مشاہدہ تجربہ اور استخراج سے تصدیق ہو سکتی ہے اس کے برعکس کسی عقیدہ پر بلا کسی ثبوت کے یقین رکھنا ضروری ہے۔

اگر کبھی ہم اپنے خیالات پر ایک تنقیدانہ نظر ڈالیں تو ایسی باتوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ جائیں گے جنھیں ہم بلا حجت آنکھیں بند کئے مانتے چلے آئے ہیں جن کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی صحیح دلیل یا ثبوت نہیں۔ زیادہ تر ہمارے خیالات اور اعتقادات دوسروں کی ایما سے بنتے ہیں جنھیں ہم اپنی ذہنیت کا جزو بنا لیتے ہیں۔ کسی نے کسی جگہ کسی وقت کسی بات کا اظہار کیا اور ہم نے اسے اعتقاداً مان لیا۔ عام طور پر دوسروں کے خیالات کا اثر بچپن میں ہوتا ہے جبکہ سوچنے سمجھنے کی قوت کمزور ہوتی ہے بعد میں ہم ان خیالات سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ ان کی سچائی میں شبہ بھی محال ہوتا ہے۔ ہمیں اُن کی صداقت عیاں نظر آتی ہے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شبہ کرنا بھی بیہودہ پن میں شامل ہوگا۔

لیکن اگر کسی کٹر سے کٹر مسلمان اور ایک پکے سے پکے ہندو کو جبکہ وہ دودھ پیتے بچے تھے بدل کر مسلمان کو ہندو گھرانے میں رکھا جاتا اور ہندو کو خالص اسلامی ماحول میں پلنے دیا جاتا تو اس میں قطعی شبہ نہیں کہ آج اُن کے خیالات اور اعتقادات یہ نہ ہوتے جو اب ہیں اور اُس حالت میں بھی ہر ایک اپنے خیالات کی صداقت پر اتنا ہی یقین رکھتا جتنا کہ وہ آج مخالفت میں رکھتا ہے یہی چیز مذہبی اعتقادات کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی صحیح ہے۔ اگر ہم ایسے سماج یا فرقہ میں پیدا ہوتے جہاں خودکشی یا آدم خوری رائج ہے تو ہمیں بھی اس ماحول میں پرورش پانے سے وہ باتیں قدرتی جائز نظر آتیں۔ اگر ہماری پرورش شہر کے جرائم پیشہ طبقہ میں ہوتی تو ہمارا اخلاقی معیار یہ نہ ہوتا جو اب ہے۔ اسی طرح کسی انگریز بچہ کو جرمن گھر میں رکھا جائے اور اُسے اس کا علم نہ ہونے دیا جائے کہ اُس کے والدین انگریز تھے تو بالغ ہونے پر بھی اُس کے جذبات اور احساسات جرمن قوم اور ملک سے وابستہ رہیں گے۔ جرمنوں کی طرح اسے بھی تمام انگریز غیر قوم اور دشمن نظر آئیں۔ ہمارے اعتقادات اور خیالات۔۔۔

ہمارے بعض نہایت گہرے اور بنیادی عقیدے ــــ اُس ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ اس لئے انسان کو عقل کا پتلا تصور کرنا غلطی ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جب تک انسانی دماغ کی بناوٹ ایسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے تب تک انسانی زندگی کے ڈرامہ میں جذبات اور احساسات ہمیشہ ایک اہم پارٹ ادا کرتے رہیں گے بلا شبہ انسان کے بعض نہایت اعلیٰ اور اشرف کارنامے انہی کے اثرات کی پیداوار ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ قبیح سے قبیح افعال کا مرتکب بھی انہی کے زیر اثر ہوا ہے۔

مانا کہ روایتیں اور رسم و رواج کسی عہد کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی اُس زمانہ کی خرابیوں اور برائیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں اس لئے قدیم رسم و رواج اور روایات کے بیشتر حصہ کی موجودہ زمانہ میں بہت کم اہمیت رہ گئی ہے۔ کیونکہ انقلابات زمانہ نے انسانی ماحول کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ انسان کے شخصی معاشی اور سیاسی تعلقات میں ایک انقلاب عظیم ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے زمانہ میں علم و سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کا عملی تجربہ اور موجودہ زمانہ کا وسیع علم دونوں ہمارے پاس ہیں اس لئے آج بدلے ہوئے حالات میں بھی ہر بات میں قدما کے قول کو سند ماننا صحیح نہیں۔ سماج کی صحیح معنوں میں ہم اسی حالت میں خدمت کر سکتے ہیں اگر ہم ماضی کا مطالعہ زمانۂ حال کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے کریں۔

اخلاق کا عقلی نظریہ یہ ہے کہ کوئی فعل جتنا سماج اور فرد کے لئے مفید ہو اُتنا ہی اچھا اخلاق ہے۔ با اخلاق وہ ہے جو حتی الامکان ایک منظم سماج کو تشکیل دینے اور بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے اور ہر اُس فعل سے پرہیز کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے کہ اُس کے یا سماج کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ہمارے ملک کو عقلی ذہنیت کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہماری بہت سی اُلجھنوں اور گتھیوں کو سلجھا دے گی جن کا ہم آج تک کوئی حل تلاش نہ کر سکے مثال کے طور پر ہمارے مذہبی تفرقات اور تعصبات جو ہمارے لئے وبالِ جان ہیں عقلیت کے زیر اثر رواداری اور آزاد خیالی کی رو میں بہہ جائیں۔ ہمارے سیاسی مسئلے بھی عقل و فہم کی روشنی میں بخوبی حل ہو سکتے ہیں جذبات کی فراوانی سے نہیں۔ فرقہ پرست۔ متعصب اور رجعت پسند رہنما اپنی قوم کی راہنمائی نہیں کر سکتے۔ وہ ملک یا قوم جو اپنی عقل کا استعمال نہیں کر سکتی جس کی مشعلِ راہ قدامت پرستی اور کورانہ تقلید ہو تہذیب اور ترقی کی ہمیشہ پچھلی صفوں میں رہے گی۔

ہمارے وسیع ملک کی اکثریت افلاس۔ بیماری اور جہالت کے خوفناک غاروں میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ قوم جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے ذات پات اور فرقوں کی غیر فطری زنجیروں میں بندھی مذہبی ریاکاری۔ توہم پرستی اور مختلف اقسام کے استحصالات کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ہماری آیندہ ترقی کا راز زندگی کے ہر شعبہ میں سائنس اور عقل کے استعمال میں پنہاں ہے۔

ڈاکٹر پریم ناتھ

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (سنہ۲۷ء) اگست عہ ر۔ (سنہ۳۰ء) مئی عہ ر۔ (سنہ۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر ــ (سنہ۳۲ء) جنوری عار۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ۳۳ء) ۔ فروری عہ ر ــ (سنہ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ ــ (سنہ۳۵ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ۳۶ء) جنوری عا، فروری عہ ر، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر ــ (سنہ۳۸ء) جنوری سے ر۔ فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ ــ (سنہ۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ، ستمبر عہ ر، اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ ــ (سنہ۴۰ء) جنوری عہ ر، فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ ــ (سنہ۴۱ء) جنوری فروری عا ر، مارچ تا دسمبر ۶ ر فی پرچہ۔ (سنہ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

ابدی طاقت

صوفی کا تصور :-

کون ہے : جس نے کیا عالمِ امکاں تخلیق
کس کے احساس نے بخشی ہے نگاہِ تحقیق،

جامِ کونین میں کیا ہے - یہ چھلکتی ہوئی مے
تیرتی ہے یہ فضائے ابدی میں کیا شے

انجمستاں کی فضا میں یہ کشش ہے کیسی
دلِ خورشید میں آخر یہ تپش ہے کیسی

کون ہے یہ جو خراماں ہے چمن زاروں پر
دبدبہ کس کا ہے - چھایا ہوا کہساروں پر

بجلیوں میں یہ تب و تابِ نظر ہے کس کی
مسکراتی ہوئی یہ شام و سحر ہے کس کی

لالہ و گل میں بھڑکتے ہوئے شعلے کیا ہیں،
سطحِ دریا پہ مچلتے ہوئے نغمے کیا ہیں

عالمِ عشق میں ہے کس کا خرامِ رنگیں،
حسن ہے کس کی تجلی کا پیامِ رنگیں

کس کی تصویر ہے یہ دل کے صنمخانے میں
یہ مئے ناب ہے کیا عقل کے پیمانے میں

جامِ رنگیں میں یہ مستانہ ادا ہے کس کی
لبِ منصور پہ آخر یہ صدا ہے کس کی

کس کے آئینۂ ہستی کا ہے ادراک و نمود
یہ امڈتا ہوا طوفاں - یہ کہستاں کا جمود

ہائے یہ حسن و جوانی کی متاعِ ابدی
ہائے یہ مہرِ درخشاں - یہ شعاعِ ابدی

لامکاں کی یہ فضائیں - یہ نظر کی پرواز
عالمِ شوق و تمنا کا یہ سربستہ راز،

میرے احساس میں یہ جذبِ نہاں - سوزِ دروں
دل کی دنیا میں یہ ہیجان - یہ شورش - یہ جنوں،

ہو نہ ہو کوئی زیارت کدۂ دل ہے ضرور
انھیں موجوں میں کوئی دامنِ ساحل ہو ضرور

"کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستم کاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

سرمایہ دار کا تصور :-

کس کے جلووں سے یہ شہروں کی فضا ہے معمور
کون برساتا ہے محلوں کے در و بام پہ نور،

تاجِ سلطاں میں یہ تابش، یہ جھلک ہے کس کی
ان دمکتے ہوئے سکوں میں چمک ہے کس کی

شمعِ تہذیب میں یہ سوزِ دروں ہے کس کا
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ فسوں ہے کس کا

فیض سے کس کے یہ دولت ہے سزاوار مجھے
کس کی رحمت نے بنایا ہے گنہگار مجھے

معرفت کس کی سکھاتے ہیں یہ پیمانۂ و خم
کس کی قدرت کا ہے شہکار یہ ماہ و انجم

محفلِ عیش میں نوروز ہے کیا - عید ہے کیا
حرم و دیر میں یہ نغمۂ توحید ہے کیا

کس کی تقدیس سے روشن ہیں عبادت گاہیں
کس نے کھولی ہیں نجاتِ ابدی کی راہیں

کس کی عظمت ہے یہ مسجد کے مناروں سے عیاں
کس کے شعلے ہیں کلیسا کے شراروں سے عیاں

کس نے سونپی ہے یہ قارون کی دولت مجھ کو
کس نے بخشی ہے یہ تقدیر کی جنت مجھ کو

کس کا مظہر ہے یہ طوفانِ حوادث کا جلال
کس کے ہاتھوں میں ہے قوموں کا عروج اور زوال

حکم ہے کس کے ہے یہ معرکۂ سود و زیاں،
کس کی ابرو میں لچکتی ہے معیشت کی کماں

ہو نہ ہو یہ کوئی معبودِ حقیقی ہے ضرور
عادلِ کون و مکاں - خالقِ ہستی ہے ضرور

جو لٹاتا ہے زر و سیم و گہر میرے لئے
بخشتا ہے جو دعاؤں میں اثر میرے لئے

کیف سے جس کے ہے معمور دو عالم کا ایاغ
جس کی تنویر سے روشن ہیں مذاہب کے چراغ

غریب کا تصور :—

کس نے بھیجا ہے یہ طوفان - یہ سیلابِ عظیم
کون ہے قحط کی دنیا کا خداوند کریم،

قہر ہے کس کا، سمندر کا اُبلتا ہوا جھاگ
کون برساتا ہے سورج سے دہکتی ہوئی آگ

اس کڑکتی ہوئی بجلی میں غضب ہے کس کا
یہ گرجتا ہوا طوفان سبب ہے کس کا

آگ ہے کس کی یہ جنگل کے چناروں میں نہاں
کس کے قبضے میں ہے بپھری ہوئی موجوں کی عناں

کس نے فردوسِ تمنا کی مجھے دی ہے خلش
کس نے بھر دی مری ہستی میں قیامت کی تپش،

کس کی آنکھوں میں ہے یہ میری تمناؤں کا خوں
کس کی بیرحم مشیّت ہے مرا حالِ زبوں،

سینۂ بحر پہ یہ دیو کے مانند جہاز
زر پرستوں کے یہ محمود - حکومت کے ایاز

کوئی بتلائے کہ یہ زیرِ نگیں ہیں کس کے
راز داں کس کے ہیں - جبریلِ امیں ہیں کس کے

کارخانوں کی یہ چمنی - یہ دھوئیں کے بادل
چشمِ افلاک میں پھیلا ہوا جیسے کاجل

یہ فضاؤں میں امڈتا ہوا سیلابِ خیال
شعلۂ زیست میں یہ حلقۂ گرداب خیال

زندگی موت کی آغوش میں پر تولے ہوئے
آندھیاں بڑھتی ہوئیں - زلزلے منہ کھولے ہوئے

کس کی جانب ہیں - وہاں یہ مری قسمت کے سفیر
کس کے ہاتھوں میں ہے یہ موجِ ہوا کی زنجیر

کتنا تاریک ہے دنیا کے تصور کا مآل،
کتنا عفریت کے سایوں سے لرزتا ہے خیال

میری تخئیل میں یزداں بھی ہے - ابلیس بھی ہے
اہرمن نار بھی ہے - گلشنِ تقدیس بھی ہے

میری پستی نے بنائے ہیں ہزاروں مسجود وہم نے میرے تراشے ہیں ہزاروں معبود
ایسے معبود کہ ہے جن کا تصور بھی محال ایسے خالق کہ زمانے میں نہیں جن کی مثال
دیوتاؤں کو مگر پھر بھی مری فکر نہیں بزمِ افلاک میں افسوس مرا ذکر نہیں
داستانِ غمِ دل جا کے سناؤں کس کو داغِ دریوزہ گری آہ دکھاؤں کس کو
اُف یہ تپتا ہوا دن اور جھلستی ہوئی رات موت کے خواب میں کھوئی ہوئی تعبیرِ حیات
ہائے مٹتی ہوئی صورت شبستانوں کی یہ اُجڑتی ہوئی دنیا مرے ارمانوں کی
کتنا دلدوز ہے یہ رات کا پرہول سماں نہ کوئی شمعِ سرِ راہ ۔ نہ منزل کا نشاں
کوئی دمساز ۔ کوئی راہنما ہے کہ نہیں سوچتا ہوں کوئی میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

مسعود اختر جمالؔ

ستاروں کی پیمائش اور انکا وزن

وہ لوگ جو فلکیات کی ریاضی سے واقف نہیں ہیں، انھیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی ستارے کا وزن یا اس کی پیمائش بیٹھے بیٹھے جان لی جائے اور اسی لئے جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین کا وزن اتنا ہے، مشتری اتنی دور واقع ہے، یا سورج کا رقبہ اتنا ہے، تو وہ ہنستے ہیں کہ یہ سب لغو قیاس آرائی ہے اور صحت و حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن جو لوگ اس فن کے جاننے والے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں صحیح ہے اور اتنا صحیح ہے جیسے دو اور دو چار۔

آیئے آج کی صحبت میں ہم بھی غور کریں کہ کیا ان لوگوں کا کہنا واقعی درست ہے اور وہ کیا اصول ہیں جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ کہا کرتے ہیں۔

اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ساری کائنات میں اصول کشش جاری و ساری ہے، یعنی فضائے بسیط کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اس زنجیر سے جکڑا ہوا نہ ہو۔ چاند کا مقررہ وقت سے مقررہ دوری پر گردش کرتے رہنا، سیاروں کا ایک خاص دائرہ میں چکر لگانا، سمندروں میں مدوجزر پیدا ہونا، یہ سب قوت کشش ہی کا نتیجہ ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہی وہ کشش تھی جس نے اربوں سال پہلے کرۂ آفتاب سے اس کے ایک حصّہ کو جدا کرکے ہماری زمین کو پیدا کیا اور یہی وہ کشش ہے جو اُسے آفتاب کے دائرۂ حرارت کے اندر رکھتی ہے، ورنہ یہ فضائے بسیط کے کسی بر فانی عمق میں خدا جانے کب غائب ہو گئی ہوتی اور جاندار کے وجود سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی۔

اب آیئے قوت کشش کو سمجھیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ سے اگر کہا جائے کہ دس من کا پتھر اُٹھایئے تو آپ نہ اُٹھا سکیں گے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہم اس کشش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ آپ کرکٹ کے گیند کو پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی چند گزوں سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتے محض اس لئے کہ زمین کی کشش اسے دور نہیں جانے دیتی۔ اگر یہ کشش مزاحم نہ ہو تو وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے اور ایک سال کے بعد فضا میں ۵۰۰،۰۰۰،۱ میل آپ سے دور ہو جائے۔ چاند ہی کو لیجئے کہ ہمارے سروں پر ۲۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، لیکن اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچے تو ایک سال کے اندر وہ فضا میں ہم سے دو کروڑ میل دور ہو جائے۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کشش کیا چیز ہے اور نظام کائنات میں اسے کتنا دخل ہے، پھر اس کشش کا تفصیلی مطالعہ صرف زمین کی انسانی تجربہ گاہوں ہی میں نہیں ہو سکتا، بلکہ قدرت کے اس وسیع تجربہ گاہ میں بھی ہوتا ہے جسے فضائے بسیط کہتے ہیں اور جہاں بڑے بڑے کُرے رات دن گردش کیا کرتے ہیں۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جسم جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی زیادہ کشش اس میں پائی جائے گی۔ چونکہ زمین سے بڑی چیز کوئی اور ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے ہم کو زیادہ تر اسی کی کشش سے واسطہ پڑتا ہے اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کشش کا علم ہمیں نہیں ہوتا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے حقیر سے حقیر ذرہ میں قوت کشش پائی جاتی ہے۔ ایک دوسری بات اور بھی ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ جب دو جسم ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو مقدار کشش دونوں کی ایک ہوتی ہے، لیکن ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔

ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، اس کے معنے یہ ہیں کہ زمین نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا، لیکن چونکہ سیب زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اس لئے ہم یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود اس کی قوت کشش کا زمین پر کیا اثر ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان قوت کشش کا انحصار بہت کچھ مادہ کی مقدار پر ہوا کرتا ہے، مادہ کی نوعیت پر نہیں۔ اسی لئے زمین کی قوت کشش جتنی ایک من سیسہ پر صرف ہوتی ہے اتنی ہی ایک من روئی پر، ورنہ دنیا کا تمام تجارتی کاروبار درہم برہم ہو جائے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھئے:۔

آپ بازار جاتے ہیں اور دوکاندار سے ایک پونڈ چاء خریدتے ہیں، وہ ترازو کے ایک پلڑے میں پونڈ کا باٹ رکھتا ہے، دوسرے میں چاء اور جس وقت دونوں پلڑے برابر ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ چاء کا وزن پورا ہو گیا۔ آپ نے شاید غور نہ کیا ہوگا کہ وزن جس چیز کا نام ہے وہ صرف زمین کی کشش ہے، یعنی ترازو میں چیز کو

وزن نہیں کیا جاتا بلکہ زمین کی کشش کا اندازہ کیا جاتا ہے اور چونکہ زمین کی کشش ہر مادہ کی ایک معین مقدار پر یکساں کام کرتی ہے اس لئے ایک پلڑے میں باٹ اور دوسرے میں چاول دونوں پر اس نے یکساں کام کیا اور جب دونوں پلڑوں پر کشش برابر ہو گئی تو سمجھ لیا گیا کہ دونوں کا وزن برابر ہے۔

کشش کے ان چند ابتدائی اُصول کے سمجھنے کے بعد آپ کو یہ سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ سیاروں کا وزن کیونکر معلوم کیا جاتا ہے۔

زمین کا وزن

اگر ہم دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں تو فاصلہ کی مقدار سے ان کی باہمی کشش بھی کم ہو جائے گی۔ لیکن فاصلہ اور کشش میں کیا تناسب ہے، اس کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا۔ ماہرین نے تجربات سے اس کو بھی متعین کر لیا ہے اور وہ بتا سکتے ہیں کہ اگر ایک ہی وزن کی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے دور کیا جائے تو دوری کے لحاظ سے باہمی کشش میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ انھوں نے مختلف اوزان کی چیزوں کے درمیان بھی فاصلہ و کشش کے تناسب کو معلوم کر لیا ہے اور اس طرح زمین کی اس کشش کا اندازہ کر کے جو ایک من سیسہ ایک گیند یا چاند پر صرف ہوتا ہے، انھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ زمین کا وزن تقریباً ۔۔۔،۔۔۔،۔۔۔،۔۔۔،۔۔۔،۔۔۔،۔۔۰۰۰ ٹن ہے

آفتاب کا وزن

جس طرح ہم زمین اور چاند کی کشش سے زمین کا وزن معلوم کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم آفتاب کی کشش سے جو نظام شمسی کے تمام سیاروں پر صرف ہوتی ہے خود اس کا وزن بھی جان سکتے ہیں اور اسی بنا پر ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ آفتاب کا وزن زمین سے ۳۳۲۰۰۰ گنا زیادہ ہے، گویا ہر اونس حصۂ زمین کے مقابلہ میں آفتاب ۹ ٹن سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

چونکہ آفتاب کا وزن بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی قوت کشش بھی اتنی ہی بڑھی ہوئی ہے۔ ہم زمین پر کئی کئی من کا وزن اُٹھا لیتے ہیں اور گیند کو کافی دور تک پھینک سکتے ہیں، لیکن آفتاب کی سطح پر مضبوط سے مضبوط آدمی بھی سات پونڈ کا وزن نہیں اُٹھا سکتا اور گیند دو تین گز سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتا۔ اور یہ بھی اُس صورت میں ممکن ہے جب آدمی فولاد کا بنا ہو ورنہ یوں تو وہ خود اپنے ہی وزن سے پس کر رہ جائے گا۔

پھر جس طرح آفتاب کی کشش نظام شمسی کے تمام سیاروں پر کام کر رہی ہے، اسی طرح ان سیاروں کی کشش بھی چھوٹے چھوٹے اجسام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیارۂ مشتری کے مطالعہ سے اس کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔

ہر اُس شخص کو جسے فلکیات سے دلچسپی ہے، یہ بات معلوم ہوگی کہ مشتری کے نو چاند ہیں یعنی جس طرح زمین کا ایک حصہ اُس سے جدا ہو کر ایک چاند بن گیا، اسی طرح مشتری نے نو چاند پیدا کئے۔ لیکن اب جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ سات چاند تو بیشک اس سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن دو ایسے ہیں جو اپنی کشش کی بدولت اس نے فضا سے حاصل کئے ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان دو کی گردش دوسرے سات چاندوں سے مختلف ہے، وہ مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتے ہیں اور یہ شمال سے جنوب سے شمال کی طرف۔ زحل اور عطارد میں بھی ایک ایک چاند اسی طرح کا نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آفتاب کی طرح دوسرے سیارے بھی چھوٹے اجسام کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔

نظام شمسی کے بعید ترین سیاروں کا اکتشاف

ایک صدی قبل نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ یورانوس سمجھا جاتا تھا، لیکن ماہرین نے دیکھا کہ آفتاب اور یورانوس کی باہمی کشش کے لحاظ سے جو راستہ یورانوس کی گردش کا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہے اور انھیں خیال ہوا کہ ممکن ہے بعض اور سیاروں کی کشش اس راستہ سے ہٹا دیتی ہو، چنانچہ پندرہ سال کی تحقیق و جستجو کے بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں معلوم ہوا کہ واقعی ایک سیارہ عطارد سے بھی زیادہ دور ایسا ہے جو یورانوس کے دائرۂ رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا نام انھوں نے پلوٹو رکھا۔ یہ بہ نسبت زمین کے ۴۰ گنا زیادہ آفتاب سے دور ہے اور ۲۵۰ سال میں آفتاب کے گرد اپنا دائرہ پورا کرتا ہے۔

دوسرے سیاروں کا وزن

یہاں تک تو صرف ان سیاروں کا ذکر تھا جن کا تعلق ہمارے نظام شمسی سے ہے، لیکن یورانوس اور پلوٹو سے بھی آگے فضا میں بے شمار جھنڈ تاروں کے نظر آتے ہیں اور اُن میں سے بعض اتنے چھوٹے یا اتنی دور ہیں کہ وہ جھنڈ سے علٰحدہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی اُصول کشش کے ماتحت ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گے اور ان کی دُنیا میں بھی قریب قریب وہی حالت پائی جاتی ہوگی جو ہمارے نظام شمسی میں نظر آتی ہے۔

ان جھنڈوں میں ہم سے قریب تر جھنڈ تین ستاروں کا ہے جن میں دو زیادہ روشن اور ایک کم روشن ہے، بعض صرف دو ستاروں کا جھنڈ ہے، لیکن ان سب کی

گردش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قانونِ کشش کے پابند ہیں اور اس لئے ان کا وزن بھی بڑی حد تک معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماہرین نے ان میں سے بعض سیاروں کا وزن آفتاب سے ایک ہزار گنا زیادہ اور بعض کا ۸۰ گنا زائد دریافت کیا ہے۔

سیاروں کی روشنی

آسمان میں ہم کو بعض ستارے بہت روشن اور بعض بہت دھندلے نظر آتے ہیں، لیکن جس طرح یہ ضروری نہیں کہ زیادہ روشن ستارہ ہم سے زیادہ قریب ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ زیادہ دھندلا ستارہ ہم سے زیادہ دور ہو۔ بعض ستارے واقعی بہت روشن ہیں اور بعض بہت کم۔

تمام اُن ستاروں میں جو ہمیں نظر آتے ہیں، سیرئیس (Sirius) سب سے زیادہ روشن ستارہ ہے، اسی سے متصل ایک اور ستارہ نظر آتا ہے جو بہت دھندلا ہے، حالانکہ یہ یقیناً زیادہ دور واقع نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ستارہ کی روشنی علٰحدہ علٰحدہ ہے اور ماہرین نے ان کی روشنی کا اندازہ بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے زمین کو لیجئے۔ اس کا فاصلہ سورج سے ۹۲۹۰۰۰۰۰ میل ہے، اور اگر اتنی دوری پر ہمارا کرۂ زمین بھی روشن نظر آتا ہے تو اسے ۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ بتیوں کی روشنی پیدا کرنا چاہئے۔

سیرئیس ۵۰ لاکھ گنا زیادہ دور ہے، یعنی آفتاب کی روشنی تو ہم تک آٹھ منٹ میں آجاتی ہے لیکن سیرئیس کی آٹھ سال میں، اس لئے باوجود اتنی دوری کے سیرئیس کا اتنا روشن نظر آنا ثابت کرتا ہے کہ وہ آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ ماہرینِ فن نے بتایا ہے کہ وہ آفتاب سے ۲۶ گنا زیادہ روشنی رکھتا ہے یعنی اگر سورج کی جگہ ہم سیرئیس کو رکھدیں تو قطبین کے برف پوش سمندر بھی آناً فاناً اُبلنے لگیں اور دنیا کے تمام جاندار دفعتاً مر جائیں۔ لیکن کائنات کی وسعت اور قدرت کی عظمت کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوگا کہ سیرئیس سے بھی زیادہ روشن ستارے فضا میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ ایک ستارہ ڈوراڈس، سیرئیس سے دس ہزار گنا اور آفتاب سے ۵ لاکھ گنا زیادہ روشن ہے۔ یعنی جتنی حرارت آفتاب سے پورے ایک سال میں پیدا ہوتی ہے، اتنی اس ستارے سے صرف ایک منٹ میں پیدا ہو جاتی ہے اور اگر ہم آفتاب کی روشنی کو ایک موم بتی کی روشنی فرض کریں تو یہ ستارہ اس کے مقابلہ میں سرچ لائٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیاروں کی جسامت

آفتاب زمین سے بارہ ہزار گنا بڑا ہے اور اس کی سطح سے ہر وقت جتنی روشنی و حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے، اس سے ہم لوگ پوری طرح واقف ہیں کہ ۹ کروڑ میل کے فاصلہ پر بھی مئی جون میں جھلسنے لگتے ہیں۔ لیکن ڈوراڈس سیارہ سورج سے ۵۰ ہزار گنا زیادہ حرارت و روشنی پیدا کرتا ہے، تو کیا یہ سورج سے ۵۰ ہزار گنا بڑا ہے یا یہ کہ اس کی برقی قوت اتنی زیادہ ہے۔

اس سوال کا جواب دو صورتوں سے دیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہم براہ راست ڈوراڈس کی جسامت معلوم کرنے کی کوشش کریں یا یہ معلوم کریں کہ فی مربع گز اس کی سطح سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاروں کی جسامت معلوم کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ جب ہم دوربین سے انھیں دیکھتے ہیں تو بھی وہ اتنے چھوٹے نظر آتے ہیں کہ ہم ان کی جسامت کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک آلہ حال ہی میں ایجاد ہوا ہے جسے (Interferometer) کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے بعض بڑے بڑے سیاروں کی جسامت کا حال معلوم ہو سکتا ہے اور آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت (Relativity) کی رو سے بعض چھوٹے ستاروں کی جسامت بھی متعین کی جا سکتی ہے لیکن ان دونوں طریقوں سے جتنے ستاروں کی جسامت کا حال اس وقت تک معلوم ہوا ہے ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ البتہ دوسرا طریقہ زیادہ کامیاب ہے، یعنی ہر سیارہ سے جتنی برقی قوت پیدا ہوتی ہے، اس کا اندازہ کر کے اس کی جسامت کا حال زیادہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

سیاروں کا رنگ

اگر آپ سُرخ اور نیلے کپڑوں کی تصویر لیں تو سُرخ رنگ تصویر میں سیاہ نظر آئے گا اور نیلا قریب قریب سفید، کیونکہ کیمرے کا لنس نیلے رنگ سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور سُرخ سے بہت کم۔ اب آپ آسمان کے کسی حصہ کی تصویر لیں تو اس میں بھی آپ کو بعض ستاروں کی تصویر بہت روشن نظر آئے گی اور بعض کی دھندلی۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ستاروں کے رنگ مختلف ہیں جن کا رنگ نیلگوں ہے ان کی تصویر زیادہ صاف آتی ہے اور جو سُرخ رنگ کے ہیں وہ دھندلے نظر آتے ہیں۔ الغرض کیمرے کے ذریعہ سے ستاروں کا رنگ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے، لیکن رنگ کا یہ اختلاف کیوں ہے اس کا معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

بات یہ ہے کہ ستاروں کا درجۂ حرارت مختلف ہے اور حرارت کی کمی بیشی سے رنگ بدل جاتا ہے۔ اگر آپ لوہے کے کسی ٹکڑے کو بھٹی میں گرم کریں تو آپ دیکھیں گے کہ پہلے اس کا رنگ ارغوانی ہوگا، پھر سُرخی میں تبدیل ہوگا، اس کے بعد وہ زرد ہوگا اور پھر سفید، چنانچہ لوہار انھیں رنگوں کو دیکھ کر معلوم کرتے ہیں کہ لوہا کتنا گرم ہے۔

ماہرینِ فلکیات بھی اسی طرح ستاروں کے رنگ سے ان کا درجۂ حرارت معلوم کرتے ہیں۔ جو ستارے سُرخ نظر آتے ہیں وہ نسبتاً کم گرم ہیں اور ان کا درجۂ حرارت ۵۵۰۰ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ زرد رنگ کے ستاروں کا درجۂ حرارت ان سے دوچند ہوتا ہے، ان کے بعد سفید رنگ کے سیارے ہیں جو آفتاب کا سا درجۂ حرارت (دس ہزار) رکھتے ہیں اور پھر نیلگوں اور بنفشی رنگ کے سیارے جو بہت زیادہ گرم ہیں اور جن کا درجۂ حرارت ۷۰ ہزار سے کم نہیں۔

ستر ہزار درجۂ حرارت رکھنے والے سیارے غیر معمولی برقی قوت پیدا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی چند مربع گز سطح سے جتنی قوت پیدا ہوتی ہے، اس سے کرۂ زمین کی تمام ریلیں کو چلایا جاسکتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑے جہاز کو چلانے کے لئے صرف ایک مربع انچ سے پیدا ہونے والی قوت کافی ہے۔

ان طریقوں سے سیاروں کی جسامت اور قوت کا جو حال معلوم ہوا ہے وہ بہت حیرتناک ہے۔ آفتاب جسے ہم اس وقت تک بہت بڑا سیارہ سمجھتے تھے اتنا بڑا کہ لاکھوں کرۂ زمین اس میں سما سکتے ہیں وہ اب بہت معمولی سیارہ رہ گیا ہے اور بعض اتنے بڑے سیارے دریافت ہوئے ہیں کہ آفتاب ایسے لاکھوں کُرے اس میں سما سکتے ہیں اور پھر بھی بہت جگہ باقی رہ سکتی ہے یعنی اگر ہم ان سیاروں کی جسامت موٹر کے برابر فرض کریں تو اس کے مقابلہ میں آفتاب کی جسامت ایک مٹر سے زیادہ نہیں ہوتی!

اعتبارات!

" بڑھیا تو کیوں رو رہی ہے" "میرا بچہ بیمار ہے۔ جوان اکلوتا بچہ! میری زندگی کا اکیلا سہارا، میرے اُجڑے ہوئے گھر کا تنہا چراغ۔ آہ۔ وہ بہت بیمار ہے، لوگ کہتے ہیں وہ بچے گا نہیں، سچ بتاؤ، کیا واقعی وہ مرجائے گا"

— "نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، گھبراؤ نہیں، علاج کرو، اچھا ہوجائے گا"

— "علاج! ہاں، علاج تو میں کرچکی جو کچھ کرسکتی تھی۔ اس ٹوٹی ہوئی دھوتی کے علاوہ جو کچھ تھا سب بیچ کر میں اسکے علاج میں لگاچکی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا"

— "پھر اب کہاں جارہی ہے"

— "مسجد جارہی ہوں، خدا سے التجا کرنے جارہی ہوں، وہی سُنے گا اور وہی اسکو اچھا کریگا"

— "ضرور جاؤ، خدا میں بڑی قدرت ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے"

چند دن بعد —

— "بڑھیا یہ کیا بک رہی ہے، خدا کی شان میں ایسی گستاخی!"

"خدا! ۔ کون خدا؟ وہی جس نے میرا اکلوتا بچہ مجھ سے چھین لیا۔ جو رات دن ناک رگڑوانے کے بعد بھی میری خواہش کو پورا نہ کرسکا۔ جو مردوں کو جلانے کی قدرت رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود معمولی کھانسی بخار کو دور نہ کرسکا۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے، مجھے نہیں معلوم میں کیا کہہ رہی ہوں، میرے سینہ سے دھواں اُٹھتا ہے۔ مجھے نہ چھیڑو — میرے جسم کی رگ رگ ٹوٹی جارہی ہے۔ میرا ریشہ ریشہ اینٹھ رہا ہے — جب میرا بیٹا دنیا میں نہ رہا تو میں خدا کو لیکر کیا کروں گی!"

— "بڑھیا، ایسی ناشایستہ باتیں منھ سے نہ نکال، تیرا بیٹا خدا کی امانت تھی، اس نے واپس لیلی، اس میں بُرا ماننے کی کیا بات!"

— "خدا کی امانت تھی! بالکل جھوٹ؟ جب اس کا باپ چھوٹا سا چھوڑکر مرا تو کیا خدا نے اس کو آکر پالا تھا۔ کیا جلتی دھوپ میں پتھر توڑ توڑ کر خدا ہی اسکے لئے غذا فراہم کیا کرتا تھا — ہونہہ! — میں نے اپنا خون پلا پلا کر اُسے پالا، میں نے فاقہ کرکرکے اس کا پیٹ بھرا — جب بیمار پڑا تو ساری گھرستی بیچکر میں نے اس کا علاج کیا، رات رات بھر میں اس کے لئے جاگی۔ اس کی صحت کے لئے میلوں پیدل چلکر میں دوا لائی — خدا نے کیا کیا — وہ میرا بیٹا تھا میری چیز تھی۔ امانت کیسی!"

— "معلوم ہوتا ہے تو نے صرف دوا پر بھروسہ کیا۔ خدا سے دعا نہیں کی"

— "(چیخ کر) ہٹ جاؤ، دور ہو میرے سامنے سے — میں نے دعا نہیں کی؟ اندھو جاؤ، جاکر دیکھو مسجد کے فرش پر اب بھی میرے آنسوؤں کے دھبے بہت سے موجود ہوں گے — خدا — خدا، کرتے پھرتے ہیں — جب دعا کرتے وقت میرا سینہ پھٹتا تھا، تو تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے والا نظر نہ آتا تھا اور اب جو میں دعا نہ سننے والے کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں، تو تم سب کائیں کائیں کرکے میرے پیچھے پڑے ہو — اگر خدا کسی کی دعا نہیں سُن سکتا، تو اسے بُرا بھلا سننے کے لئے بھی طیار رہنا چاہئے"

بڑھیا کو پاگل سمجھ کر لوگ چلے گئے، لیکن میں نے یہ سارا واقعہ ایک بڑے دیندار عالم سے بیان کیا، تو انھوں نے کہا "افسوس ہے اسلامی حکومت نہیں۔ ورنہ اس بڑھیا کو قتل کردیا جاتا —"

یہ سنکر میں نے دل ہی دل میں کہا کہ — "بڑھیا کو تو خیر غم نے دیوانہ بنادیا تھا اور وہ خدا کے صحیح تصور پر قادر نہ تھی لیکن انھیں کیا ہوگیا ہے

خدا اور دار و رسن!"

اس امتزاج پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

احسان

چمپا کو ہم ایک ہی پوشاک میں پھرتا ہوا دیکھتے ۔ سفید دھوتی، سفید جمپر اور ایک پھٹی سی چپل، یہ تھی اس کی وضع جس میں وہ رات دن دکھی جاتی ۔ مگر اس کے پاس ایک دھوتی اور ایک جمپر اور بھی تھا ۔ جب ایک ان میں سے میلا ہو جاتا تو دوسرا جو دھوبی سے دھلا کر بڑی احتیاط سے رکھا ہوا ہوتا نکالتی اور پہنتی !! سال میں صرف ایک دفعہ یا اگر اس کی تقدیر جاگ گئی تو دو مرتبہ نئی دھوتی، نئے جمپر اور نئی چپل پہنے دکھی جاتی مگر یہ بھی ہوتا تھا ۔ جب پہلی چیزیں پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتیں !!

اس سے زیادہ اس کو کچھ نہیں مل سکتا تھا ۔ اس کو خواہش کرنے پر بھی نہیں مل سکتا تھا ۔ وہ سوچا کرتی کہ شاید میں زیور اور اچھی اچھی ساریاں اپنی قسمت میں لائی ہی نہیں ۔ پرماتما نے بھی ہماری قسمتوں میں کتنا فرق رکھا ہے ۔ اس کے پڑوسی کے کئی ایک باغ ہیں، گاؤں ہیں، وہ رات دن گھر میں پڑا رہتا ہے اور اس کا کام صرف نوکروں پر حکم چلانا اور غریبوں پر اپنی ہیکڑی جتانا ہے ! ۔ اور میرے پتا ! صبح کو نو یا دس بجے گھر سے نکل جاتے ہیں اور جب تک سورج ڈوب نہیں جاتا، گھر کے اندر قدم نہیں رکھتے ۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور تیس دن میں ان کو ملتا کیا ہے ؟ ۔ کُل تیس روپئے ۔ وہ سوچا کرتی کہ میرے پتا کو دنیا میں سب سے زیادہ روپیہ ملنا چاہئے تھا ۔ مگر نہیں یہ دنیا کا قاعدہ نہیں ۔ اُس آدمی کو زیادہ روپئے ملتے ہیں جو کم کام کرتے ہیں اور وہ آدمی بھوکوں مرتے ہیں جو کام کرتے ہیں ۔

چمپا اور سوچتی "کیا کبھی میری تقدیر بھی پھرے گی ۔ کیا میں بھی کبھی زیور پہن سکوں گی ؟" مگر وہ سوچتی رہ جاتی !! اور اس کے سوچ کا کچھ اثر نہ ہوتا ! — وہ ٹھنڈی سانس بھرتی اور خاموش لیٹ جاتی ۔

پڑوس میں بڑے دھوم دھام سے شادی ہو رہی تھی ۔ سنا جا رہا تھا کہ لڑکی کو بہت زیور چڑھا ہے ۔ چمپا بھی یہ باتیں کان لگا کر سنتی اور اپنی ماں سے کہتی ! — ماں سنتی ہے ! ۔ کوئی چیز لاکٹ بھی آئی ہے ۔ ماں کیا ہوتا ہے لاکٹ ؟ سُنا ہے نیکلیس بھی آیا ہے ! یہ کیسا ہوتا ہے ۔ ماں ہوں ہاں کر کے خاموش رہ جاتی ۔

"چمپا کا بیاہ کب کرے گی ؟" ایک بڑھیا نے اس سے کہا !

"چمپا کا بیاہ ؟ — ہو جاوے گا ۔ روپیہ چاہئے ؟"

"تجھے روپئے کی کیا ضرورت ۔ اس کو چاہے کوئی بیاہ لے جائے ۔ وہ روپ دتی ہے !!" آج پہلی مرتبہ چمپا کی ماں کو معلوم ہوا کہ روپ ہونا بھی لڑکی کے اندر گن ہے ! آج تک وہ یہی سمجھتی آتی تھی روپیہ ہی بڑا گن ہے !

"تو بتاؤ اس کے روپ کی قدر کون کرے گا ؟"

"دیکھ شیلا کی چاچی آئی ہے ۔ ان کے لڑکے کی بہو ابھی مری ہے ۔ ان کا بڑھاپا ہے ۔ کوئی لڑکی لڑکا نہیں ۔ لاکھوں روپیہ ہے ۔ سیکڑوں زیور ہیں ۔ میری بات مان تو تیری لڑکی رانی بن جاوے گی !! ۔ اس کی ماں سوچ رہی تھی اور سُن رہی تھی !

"ارے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ۔ روزانہ ایسے لڑکے ہاتھ تھوڑے ہی آتے ہیں ۔ اور لڑکوں کی تم خوشامد کرو گی ۔ وہ تم سے روپیہ مانگیں گے ۔ مگر ان کو روپیہ کا ذرا بھی لالچ نہیں ۔ بلکہ یہ تو ایسے امیر ہیں جو غریبوں پر دَیا کرتے ہیں ! ان کو بہو چاہئے اور کچھ نہیں !!

چمپا کی ماں کے دماغ میں سب کچھ آ گیا ! وہ سب کچھ سمجھ گئی ۔ اس نے کہا دروازہ پر آئے ہوئے دیوتا کو واپس نہ کرنا چاہئے ۔ میری لڑکی کی ایسی قیمت کہاں تھی کہ وہ اتنے امیر گھر بیاہی جاتی ! اس کو تو اب ایک نئی دنیا مل جائے گی ۔ اس دلدر سے اس کو چھٹکارا مل جائے گا ۔

چمپا نے بھی سنا اور حیران رہ گئی، وہ اپنی آیندہ زندگی کی تصویر کھینچنے لگی !! — دولت اس کی باندی ہوئی ! — وہ نئی ساریاں پہنے ہر وقت پھرا کرے گی — اس کی نگاہ اپنی میلی دھوتی پر پڑتی تو اس کے دل میں آیا کہ اس دھوتی کو ایسی جگہ چھپائے جہاں اس کو کبھی نظر نہ پڑے !

بہت بڑا مکان ہے۔ مٹی کے فرش کے بجائے یہاں سنگ مرمر کے فرش ہیں جس پر پاؤں پڑتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے! چھوٹے چھوٹے کمروں کی بجائے یہاں بڑے بڑے کمرے ہیں جن کو وہ تعجب سے دیکھتی! اس کی ساس اس کے پاس آئی اور پوچھا — "یہاں طبیعت لگ گئی"۔ مگر چمپا نے اپنا منھ چھپا لیا۔ ایودھیا رانی نے خود ہی جواب دیدیا "یہاں طبیعت کیوں نہ لگے گی۔ شاید اب تم اپنے گھر جانے کا نام بھی نہ لوگی!! وہاں کچے مکان میں۔ تنگ گلی ہیں! چھوٹے چھوٹے اندھے کمروں میں جا کر اب کیا کروگی!" — اس کے پتی نے پوچھا "یہاں تمھاری طبیعت لگ گئی!" — "جی" اس نے جواب دیدیا — "اوہ' میں یہی چاہتا تھا! جب میری پہلی استری مری تو سارے بنگلہ میں مردنی چھا گئی تھی۔ در و دیوار کھانے کو دوڑتے تھے۔ مگر اب وہی در و دیوار ہنس رہے ہیں! یہ تمھاری وجہ ہی سے ہے۔ تم جانتی ہو!! — تم مجھ سے کبھی خفا نہ ہونا"

چمپا کے دل میں خوشی کی گدگدی سی دوڑ گئی!!

چمپا کو پڑوس کی عورتیں دیکھنے آئیں! وہ شرما رہی تھی کیونکہ اس کے لئے نئے کپڑے۔ بہت قیمتی ساریاں اور زیور پہنے تھے۔

"گھر سے کیا آیا!"۔ کسی نے ایودھیا رانی سے پوچھا۔

"ارے یہ امید کر کے تھوڑے ہی شادی کی تھی۔ غریب گھر کی لڑکی ہے"

"تم نے بھی اچھا کیا۔ کہ غریب گھر کی بہو لی"

یہ کہنا چمپا کو کچھ اچھا نہ لگا۔ اس کو زیور مل گئے، اس کو نئی نئی ساریاں مل گئیں۔ اس کی قسمت واقعی جاگ گئی۔ مگر یہ گھر کی فضا کیسی!

بنگلہ میں ہمیشہ خاموشی رہتی۔ جو زور سے بولتا وہ بدتمیزوں میں گنا جاتا تھا — ہر ایک ناپ تول کر بات کہتا!!۔ کھانے کا کمرہ الگ بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کو اسی کمرہ میں کھانا پڑتا تھا — ہر ایک ناک چڑھا کر بولتا تھا۔ ان لوگوں کی کچھ عادت سی معلوم ہوتی تھی۔ خاص طور پہ عورتوں کی!!۔ نوکر بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتے تھے۔ اگر کوئی باہر کا آدمی ان سے کام کرنے کو کہتا تو ایک دو دفعہ تو ٹال دیتے جیسے کہ وہ کام کرنے کے لئے نہ ہوں اور یا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اتنے مصروف ہیں کہ ان کو سننے کی بھی فرصت نہیں!! — ایسی فضا میں چمپا کو پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا پڑتا تھا۔ اس کو ہر ایک دفعہ سوچنا پڑتا تھا کہ کہیں ایسا کام نہ ہو جائے جو ان لوگوں کے رواج کے خلاف ہو۔ اس کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے گھر آئی ہے!! — وہ ایسی فضا میں گھٹی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اس فضا میں آزادی بالکل نہیں تھی!!

اس کے پتی کی بہن جو نئی بہو کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہو رہی تھی، اس کے کان میں کہہ رہی تھی "تم ماتاجی کی بہت خدمت کرنا۔ وہ تم سے ہمدردی کرتی ہیں۔ اگر ان کو تم سے ہمدردی نہ ہوتی تو تم ہی سوچو کہ غریب گھر کی لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ماتاجی ہی کی وجہ سے ہوا" چمپا کو بھی ماننا پڑا کہ ایودھیا رانی ہی کے گُن گانے چاہئیں۔ اس روز سے اس نے ایودھیا رانی کی خدمت اس طرح کرنی شروع کی کہ کوئی لونڈی بھی نہ کرے گی — وہ خیال کر لیتی "اگر میں خدمت نہ کروں گی تو دنیا میرے جنم میں تھوکے گی۔ سارے محلے میں۔ سارے شہر میں ہر ایک آدمی کو یہ معلوم ہے کہ ایودھیا رانی نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ ایودھیا رانی بھی اپنا کام کرانے میں نہ چوکتی تھی دن بھر اس کے سارے حکموں کی تعمیل کرتی اور رات کو ایودھیا رانی کے پاؤں دابتی اور جب تک وہ سو نہ جاتی، دابتی رہتی!! — اس کی اُنگلیاں اکڑ جاتیں! بانہیں درد کرنے لگتیں!! مگر ایودھیا رانی کو اس کی پروا نہ ہوتی۔

انسان تعریف کا بھوکا ہے۔ مگر چمپا تعریف کا ایک لفظ بھی نہ سنتی! وہ روزانہ خیال کرتی کہ آج شاید ایودھیا رانی کہے کہ تو نے بہت کام کیا ہے مگر ان لفظوں کو وہ کبھی نہ سنتی! پھر وہ خیال کرتی: "اسے تعریف نہیں چاہئے! یہ تو اس کا فرض ہے، فرض ادا کرنے کی کیا تعریف؟"

ایک روز صبح وہ جلدی نہ اُٹھ سکی۔ اس کی کمر اکڑی ہوئی تھی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ ہاتھ گرم ہو رہا تھا مگر ایودھیا رانی کو کیا معلوم!! اس نے دو تین مرتبہ دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا دی!

پتی نے کہدیا — "اس کو بخار آگیا ہے!"

ایودھیا رانی نے کہا "بخار — اونھ یوں ہی حرارت سی آگئی ہوگی۔ کیا ایسے میں کھاٹ پکڑ کر پڑ رہتے ہیں!! — ایسا کچھ کام بھی تو گھر کا نہیں کرتی جو بخار آجاوے!!"

چمپا نے سُنا — "ایسا کچھ گھر کا کام بھی تو نہیں کرتی ہے!" اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل پر کسی نے گھونسا مارا ہو۔ چمپا نے خیال کیا کہ کیا اسی دن کے لئے وہ ان کی خدمت کر رہی تھی۔ مانتی ہوں میرے اوپر ان کا بہت بھاری احسان ہے مگر میں بھی تو ان کے احسان کا بدلہ چکا رہی ہوں۔

چمپا کا پتی اندر داخل ہوا۔ چمپا کا منھ اور لال ہو گیا تھا۔ "کیا اور تیز بخار آگیا ہے!!"

"میں گھر کا کچھ کام نہیں کرتی ہوں تو مجھے مر جانے دو !!"

"اوہ" ۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا: ۔ "تم ناراض ہو !! ۔ ماں، ان کو مناؤ ۔ یہ ناراض ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ بہت کام کرتی ہیں" اور وہ ہنس دیا مگر ایودھیا رانی سی نہ آئی ۔ وہ بات سمجھ گئی ۔

ایودھیا نے کہدیا ۔ "میں کیا مناؤں ۔ اگر ناراض ہیں تو ہو جانے دو ! بڑی ناک والی ہیں نا ؟

"تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قدر کچھ بھی نہیں ! اگر وہ غریب گھر کی ہے تو کیا ہوا ۔ کہ یہ معنی ہیں کہ وہ نیچ ہے، ماں کی خدمت بھی کرے اور ذلت بھی جھیلے !"

تمام دن یہی خیالات سر میں چکر لگاتے رہے ۔ اور جیسے کسی بچے کو پالنے کے جھونکے سلاتے اور جگاتے رہتے ہیں اسی طرح سے یہ خیالات اس کو جگاتے اور سلاتے رہے !! ں نے اپنی بابت بہت کچھ سوچا ۔ مگر وہ اپنے پتی اور ایودھیا رانی اور قسمت کے خلاف کچھ نہ سوچ سکی !! ۔ اپنے پتی کے خلاف کیا سوچے ! وہ دیوتا تھا جس کا ہنستا ہوا چہرہ یہ کر وہ خوش ہو جایا کرتی تھی اور ایودھیا رانی کے خلاف کیا کہے ! اگر ایودھیا رانی کے خلاف کچھ سوچے تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی قسمت کی برائی کر رہی ہے ۔

چمپا نے دن بھر کچھ نہ کھایا ۔

"کیوں ری آج سارے دن تو بھوکی پڑی رہی ۔ تجھے ہمارا کچھ بھی خیال نہیں !! ۔ تو کسی کا احسان نہیں مانتی !! تو جب اپنے باپ کے گھر تھی جب کی حالت کو سوچ اور اب کی حالت کو سوچ ۔ یہ گدے تکیے کیا وہاں نصیب آسکتے تھے ۔" اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان گدے تکیوں میں سے آگ نکلنے لگی ہو ۔

آج سارا بھید اس پر کھل گیا جس کو سچائی جان کر وہ کانپ جاتی تھی اور جس کا خیال وہ دل میں لاتے ہوئے بھی گھبراتی تھی ۔ آج اس کے سامنے تھا ۔ کیا یہ سب زیور ی وجہ سے ہے ۔ کیا ان زیوروں نے میری عزت کھو دی ۔ اگر مجھے زیور نہ ملے ہوتے تو چاہے ماتھے پر بہت بڑا غریبی کا ٹیکہ لگا ہوتا مگر پھر بھی میری عزت ہوتی !! مجھے سب بہو کی نظر سے دیکھتے ۔ اس نظر سے کوئی نہ دیکھتا کہ میرے اوپر احسان کیا گیا ہے ۔

وہ بستر سے اٹھی ۔ اس نے گدے تکیے الگ رکھدئے ۔ اس نے اپنی ساری اتار ڈالی ۔ اور اپنی پرانی سفید دھوتی پہن لی ۔ اس نے سونے کے زیوروں کا ڈبہ نکالا اور اس میں ایک ایک زیور اتار کر رکھدیا ۔ اس کو اب ایسا معلوم ہوا جیسے دل کا بوجھ کم ہو گیا ۔

"ہائیں، یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے ؟" اس کے پتی نے کہا ۔ "تمہارے زیور تمہاری ساری کہاں ہے"

"اتار دئے ہیں"

اس نے زیوروں کا بکس نکالا اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک زیور پہنانے لگا ۔ "دنیا کو بکنے دو ۔ زیور تو میں نے دئے ہیں ۔ میں تم کو زیور ہر وقت پہنے دیکھنا چاہتا ہوں"

اس کے چند دن بعد پتی کے بہن کی شادی ہوئی اور اس نے اپنے سارے گہنے بہن کو دیدئے !!

"تم نے پھر یہ کیا کیا ؟ ؟ آج زیور پہننے کا دن ہے کہ ان کو اتار کر بیٹھ جانے کا ۔ بکس نکالو"

بکس نکالا مگر اس میں ایک بھی زیور نہ تھا ۔

"ہائیں زیور کہاں گئے !!"

"مجھے تمہاری بہن کی شادی کی بہت خوشی تھی ۔ میں نے سب گہنے اسے دیدئے ہیں ۔"

اس کا پتی سناٹے میں آگیا ۔ اس کے ہاتھ سے زیوروں کا ڈبہ چھوٹ گیا ۔

"میرا خیال غلط تھا کہ میں زیوروں سے خوش ہو سکوں گی ! وہ تو بچپن کا خیال تھا ۔ اب زیوروں کو اتار کر ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو میں آج سے زیادہ کبھی خوش نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کو مجھے خوش دیکھ کر خوش ہونا چاہئے !!"

پتی چمپا کے بالوں میں انگلی ڈال کر سوچنے لگا ۔

شنکر سروپ بھٹناگر

بازگشت خیال

مے گلرنگ سے لبریز ہے مینائے خیال،　　　میری ہر سانس ہے اک جرعۂ صہبائے خیال
تیرا آئینہ بنا جلوۂ زیبائے خیال،　　　ہے ترے شوق میں آراستہ لیلائے خیال

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

خواب دیکھے ہیں بہت عالم بیداری میں　　　بیخودی میں، کبھی مستی، کبھی ہشیاری میں
عشرتیں لوٹی ہیں تخئیل کی گلکاری میں　　　نظم و ترتیب میں، تزئین میں، طیاری میں،

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شمع فانوس نے یہ حسن نہ پایا ہرگز　　　اس طرح ٹوٹ کے پروانہ نہ آیا ہرگز
میرے مانند جلا دل نہ جلایا ہرگز　　　جان بیتاب کو شعلہ نہ بنایا ہرگز

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شوق جب دل کو ہوا انجمن آرائی کا　　　آگیا سامنے جلوہ تری رعنائی کا
فکر نے کام دیا چشم تماشائی کا　　　دور پہ دور چلا ساغر مینائی کا،

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

زمزمہ زن ہوتی ہے اس طرح تری شوخ نظر　　　دیتی ہے بے خبری عالم بالا کی خبر
چونک پڑتی ہے مری روح پھریری لے کر　　　شعر بن جاتا ہے اک نغمۂ لبریز اثر

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

جاگ اٹھیں وہ تمنائیں جو تھیں سوئی ہوئی ۔۔۔ راہ پر آئیں وہ امیدیں جو تھیں کھوئی ہوئی
آرزوئیں ہوئیں شاداب جو تھیں روئی ہوئی ۔۔۔ لہلہاتی ہے ہر اک کشت مری بوئی ہوئی

دلکشی طرز میں ہے، شگفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

تجھ سے کاشانۂ ہستی مرا آباد ہوا ۔۔۔ جس قدر رنج سہے اور بھی دل شاد ہوا
للہ الحمد کہ ہر قید سے آزاد ہوا ۔۔۔ ایک گلزار طرب عالم ایجاد ہوا

دلکشی طرز میں ہے، شگفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

آئرسس[1]

چوم کر منہ گلِ آئرسس سے یہ میں نے پوچھا ۔۔۔ اس مہک پر تجھے ویرانہ ہوا کیوں مرغوب؟
مسکرا کر یہ کہا، شاعرِ وارستہ مزاج ۔۔۔ راہ چلتے ہوئی مجھ پر بھی عنایت، کیا خوب!
خیر منظور ہے مجھ کو تری خاطر، سُن لے ۔۔۔ آ بتاؤں تجھے، صحرا سے ہوا کیوں منسوب،
تیری ہی طرح مجھے فطرت آزاد ملی ۔۔۔ تیری ہی طرح نمائش کو بھی سمجھا معیوب
ملتفت مجھ سے نہیں ہوتے جو ظاہر بیں ہیں ۔۔۔ حُسن میرا ہے فقط اہلِ نظر کو محبوب

وہ گلستاں ہی سہی قید ہے پھر قید اثر
ذوق پرواز کو ہے وسعتِ لاشئے مطلوب

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

---

[1] آئرسس، کشمیر کا ایک سپید خودرو پھول۔

زار سے اسٹالین تک

اس وقت ساری دُنیا کی آنکھیں اسٹالین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اسٹالین کے معنے "فولادی انسان" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کا مقابلہ کرنے میں اس نے اپنے آہنی عزم و ارادہ کا پورا ثبوت دیدیا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اسٹالین کی یہ کامیابیاں ممکن ہیں عارضی ہوں اور روسی آبادی زیادہ عرصہ تک اس کشاکش کو برداشت نہ کر سکے لیکن اگر انقلاب روس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سوویٹ حکومت کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں اور دُنیا کی کوئی قوت اسے غلام بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں اس وقت تک بہت سے انقلابات ہوئے ہیں جن میں انقلاب فرانس کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس کا انقلاب اس سے کہیں زیادہ اہم تھا، کیونکہ فرانس کا انقلاب دُنیا میں کوئی ایسی حکومت قایم نہ کر سکا جو جماعتی تفریق کو یکسر مٹا دے۔ لیکن انقلاب روس کے بعد سارا ملک ایک ایسے نظریۂ حکومت پر متفق و متحد ہو گیا ہے جس کے بدلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

انقلاب فرانس۔ نے اس میں شک نہیں کہ سارے یورپ کو ہلا کر رکھدیا، لیکن روس اس سے بالکل متاثر نہیں ہوا، بلکہ زار کا اقتدار اور بڑھ گیا اور زاریت اہل روس کے لئے بے پناہ عذاب بنکر رہ گئی۔

صدیاں گزر چکی تھیں کہ روس کا زراعتی طبقہ غلامی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اور زار کے ظالمانہ اقتدار کو دور کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن جب جنگ کریمیا میں روس کو شکست ہوئی تو روسی آبادی کی آنکھیں کھلیں اور اس کے بعد جب ۱۹۰۵ء میں جاپان نے زار کی فوجوں کو شکست دی، تو انقلاب کی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی اور ہڑتالوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اسی دوران میں زار کا چچا (گرانڈ ڈیوک Sergei) قتل کیا گیا اور ملک میں عام بے چینی پیدا ہو چلی۔

ہر چند زار نے لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن حالات بہت کچھ بدل گئے تھے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ الگزنڈر دوم کے قتل کے بعد لینن کے بھائی نے نئے زار کے خلاف سنٹ پیٹرسبرگ میں زبردست سازش شروع کی لیکن حملہ کا جو دن مقرر کیا گیا تھا اسی دن وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا — اسوقت لینن کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ ذہنی انقلاب تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے، اس لئے زاریت کے خلاف پروپاگنڈا شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں سوشلسٹ جماعت برسر اقتدار تھی اور وہاں سب سے پہلی "لیبر یونین" (مجلس اتحادِ عمال) قایم ہو چکی تھی۔ اسکو دیکھکر لینن کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے بھی اپنے چند احباب کی مدد سے روس میں ایسی ہی یونین قایم کرنا چاہی۔ چنانچہ سارے ملک نے ایک زبردست ہڑتال کے ذریعہ سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، لیکن زار نے اس تحریک کو بڑھنے نہ دیا اور لینن کو جلاوطن کر کے سائبیریا بھیجدیا۔

اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی، تو انقلاب پسند دماغ کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا اور ۱۹۱۷ء کے آغاز میں پیٹروگراڈ میں بغاوت شروع ہو گئی زار نے باغیوں پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن فوج نے انکار کر دیا اور زار نے موقع کی نزاکت کا احساس کر کے ۱۵ مارچ کو تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد نئی حکومت قایم ہوئی جس کا وزیر اعظم "پرنس لووف" (Lvov) اور وزیر جنگ، کرنسکی منتخب کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد کرنسکی وزیر اعظم ہو گیا، لیکن یہ نئی حکومت ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی کہ ماڈریٹ اور انتہا پسند جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا۔ ماڈریٹ چاہتے تھے کہ لڑائی جاری رکھی جائے اور انتہا پسند انقلاب چاہتے تھے۔ چونکہ جرمنی اس وقت لڑائی سے تھک چکا تھا اور چاہتا تھا کہ روس میں انقلاب پسند جماعت کو کامیابی حاصل ہو، اس لئے اس نے بھی خفیہ طور پر انقلاب روس کی کامیابی کی کوشش کی اور لینن کو جو اسوقت جرمنی ہی میں تھا مسلح بمقفل ٹرین کے ذریعہ سے روس پہونچا دیا۔ جب لینن یہاں پہونچا، تو کرنسکی بھاگ گیا اور لینن نے پورا اقتدار حاصل کر کے سوویٹ (کونسل) قایم کر دی اور ٹراٹسکی کو وزیر خارجہ بنا دیا۔

انھوں نے اس کے بعد ہی روس کے تعلقات اتحادیوں سے قطع کردئے اور جرمنی کے ساتھ علٰحدہ صلح کرلی۔ اس سے لینن کا مقصود صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح انقلاب کو کامیاب بناسکے اور اپنے ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرسکے۔ ہرچند صلح نامہ کی رو سے پولینڈ، اوکرائن، فن لینڈ، علاقۂ بالٹک سب سے روس کو تہی ہونا پڑا، لیکن بعد کو تاریخ نے ثابت کردیا کہ دراصل فتح لینن ہی کو حاصل ہوئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اب حکومت لینن ہی کے ہاتھ میں تھی، لیکن اس کے متبعین ابھی اقلیت میں تھے اور جب جنوری ۱۹۱۸ء میں ملک کے تمام نمایندوں کا جلسہ ہوا تو بالشویک حکومت کے مخالفین زیادہ نظر آئے۔ لینن نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر پھر لوگوں کے دلوں میں بالشیوک حکومت کے برکات ذہن نشین کرنا شروع کئے اور پایۂ تخت پیٹروگراڈ سے ماسکو منتقل کردیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۸ء میں زار کے خاندان کا قتل عمل میں آیا اور کلیساؤں کی جایداد ضبط کرلی گئی۔

اسوقت تک لینن نے جو کچھ کیا اس سے جنگ کا مسئلہ تو بیشک طے ہوگیا، لیکن اقتصادی اُلجھن بدستور باقی رہی، آخرکار ۱۹۲۱ء میں اس نے اعلان کردیا کہ مزارعین اپنی پیداوار کے مالک ہیں اور وہ اسے اپنے طور پر بازار میں فروخت کرسکتے ہیں۔ لینن سمجھتا تھا کہ اگر اس وقت اس نے اپنی نئی پالیسی کو رائج کرنا چاہا تو انقلاب میں کامیابی نہ ہوگی۔ الغرض لینن نے نہایت ہوشیاری اور ترکیب سے کامل تین سال کی کوشش کے بعد رفتہ رفتہ سوویٹ حکومت کی بنیاد مضبوط کرلی، لیکن بدقسمتی سے ایک دن کسی عورت نے جو اس کی پالیسی کی مخالف تھی اسے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ ایک سال تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

لینن کا جانشین قدرتاً ٹراٹسکی کو ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ ٹراٹسکی بین الاقوامی انقلاب کا حامی تھا اور لینن کی اقتصادی پالیسی کا بھی مخالف تھا، اس لئے لینن کی پارٹی اس کی مخالف ہوگئی اور تھوڑے سے خلفشار کے بعد اسٹالین برسرِ اقتدار ہوگیا۔ اسٹالین، لینن کا بڑا معتقد تھا اور وہ انقلاب کو روس کے اندر ہی محدود رکھ کر پہلے اپنے ملک کو مضبوط بنانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اقتصادی و عسکری، صنعتی و زرعی ترقی کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۸ء میں پنج سالہ اسکیم پر عملدرآمد شروع کردیا۔ اس اسکیم میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۹۳۳ء میں دوسری پنج سالہ اسکیم کا آغاز ہوا جو پہلے سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

اسٹالین کا مقصود اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ صلح و آشتی رکھ کر ترقی کرنا تھا، یہاں تک کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ۱۹۳۹ء میں جرمنی سے بھی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا، لیکن چونکہ اسٹالین جانتا تھا کہ ہٹلر کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے وہ فوجی طیاریاں بھی کرتا جاتا تھا اور آخرکار اسٹالین کا اندیشہ پورا ہوکر رہا اور نازیوں نے روس پر حملہ کرہی دیا۔

روس کا موجودہ عسکری نظام

اس میں شک نہیں کہ اول اول جرمنی کو روس کے مقابلہ میں بہت کامیابی ہوئی، لیکن اب صورت بہت کچھ بدل چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موسم سرما نے بھی جرمن افواج کے اقدام کو روکنے میں بڑی مدد دی ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان گیارہ ماہ کے اندر روسی افواج کے نظام میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے اور مارشل ٹموشنکو نے وہاں کی فوجوں کی حالت بہت کچھ بدلدی ہے۔

اس سے قبل سرخ افواج کا نظام یہ تھا کہ افسر اور معمولی سپاہی میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا، یہاں تک کہ سپاہی اگر راستہ میں اپنے افسر سے ملتا تو سلام کرنے پر بھی مجبور نہ تھا، اس میں شک نہیں کہ یہ جذبۂ مساوات بڑی عمدہ چیز ہے اور بہ حالتِ امن فوج کے لئے بھی برا نہیں، لیکن بحالتِ جنگ اس کا تجربہ اچھا ثابت نہ ہوا چنانچہ مارشل ٹموشنکو نے فوج کی تنظیم بالکل بدلدی۔

نازی طریق جنگ کو دیکھ کر ٹموشنکو نے محسوس کیا کہ فوج کے لئے لازم ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر جلد سے جلد قدم اُٹھائے اور اس کے تمام دستوں میں اتحادِ عمل پایا جائے چنانچہ اس نے سب سے پہلے روس کی تمام افواج کو صرف ایک مرکز سے وابستہ کیا اور اسی کے ساتھ جو غلط قسم کی جمہوریت و مساوات ان میں پائی جاتی تھی اسے دور کیا تاکہ افسر کی طرف سے جب کوئی حکم دیا جائے تو یہ بحث نہ شروع ہو کہ یہ حکم مناسب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ سپاہیوں کی ازسرنو تنظیم کرکے ان کو احکام کی پابندی، جفاکشی اور صبر و استقلال کی تعلیم دی گئی، چنانچہ گیارہ ماہ کے اندر روسی فوج کی حالت بالکل بدل گئی۔

[illegible] افواج کی تنظیم کلب کی تنظیم نہیں ہے، جہاں صرف گپ لڑائی جاتی ہے اور افسر و سپاہی کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ شہری آبادی [illegible] پیدا کی جارہی ہے اور مدارس میں پانچویں درجہ سے فوجی تعلیم شروع ہوجاتی ہے۔ الغرض اب سرخ افواج کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے اور اسی تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ روس نے دفاع کے ساتھ جارحانہ اقدام بھی شروع کردیا ہے۔

روس کے ذرایع دفاع

لڑائی میں کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے، ایک عسکری تنظیم، دوسرے اقتصادی اطمینان اور صنعت حربی کا استحکام۔ روس کی فوجی تنظیم کا مختصر حال ابھی آپ سُن چکے، اب دوسری بات کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ روس اس باب میں بہت مضبوط ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اوکرائن، سفید روس اور کریمیا، روس کے بڑے اہم زرخیز علاقے ہیں جہاں زراعت و صنعت کے مرکز بکثرت پائے جاتے ہیں، لیکن غالباً بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ روس کے اصلی صنعتی مرکز میدان جنگ سے ۱۰۰۰ میل دور کوہستان یورال میں واقع ہیں اور اب کہ مغربی روس میں دشمن کے حملہ کی وجہ سے یہاں کے تمام صنعتی مرکز درہم برہم ہو رہے ہیں، ہر قسم کی کمک یورال ہی کی طرف سے پہونچ رہی ہے۔

مسٹر جان اسکاٹ جس نے خود اس حصۂ ملک کی سیاحت کی ہے، لکھتے ہیں کہ ۲۰۰ سے زیادہ صنعتی کارخانے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان یہاں قائم ہو چکے ہیں جو کوہستان کے اندر نہایت مخفی طریقہ سے رات دن کام کر رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کام کرنے والے سب کے سب روسی ہیں اور حکومت نے ان کے چلانے کے لئے کسی سے قرض نہیں لیا۔

ایک مقام ہے مگنی ٹوگورسک جو ۱۹۲۹ء میں ایک معمولی کوہستانی گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اب وہ دُنیا کی سب سے بڑی معدن کوئلے اور لوہے کی ہے۔ حکومت نے دو ارب روبل کے صرف سے یہاں لوہا اور کوئلہ نکالنے کے کارخانے قائم کئے ہیں جو شب و روز کام کر رہے ہیں اور روس کو بڑی حد تک ان دونوں چیزوں کی طرف سے بے نیاز بنائے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک معدن پٹرول کی بھی ہے جو دُنیا کی سب سے بڑی معدن خیال کی جاتی ہے۔ یہاں سے کم از کم ۵ لاکھ ٹن صاف شدہ پٹرول ہوائی جہازوں کے لئے سالانہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس علاقہ میں بیس ہوائی جہاز بنانے والے کارخانے بھی ہیں جو دشمن کی زد سے محفوظ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی حال یہاں کے ذخایر غلہ کا ہے جو سیکڑوں میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے کسی ملک کو تیل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی روس کو ہے، کیونکہ یہاں کی تمام صنعت اور ساری زراعت بالکل میکانکی صورت اختیار کر چکی ہے اور زندگی کا ہر شعبہ مشین پر قایم ہے، لیکن اگر اوکرائن اور کریمیا کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو بھی اس کی پٹرول کی پیداوار جو کوہستان یورال میں پائی جاتی ہے، اسے سالہا سال تک جرمنی کے مقابلہ پر آمادہ رکھ سکتی ہے۔

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا: ۔ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرایڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد: ۔ شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے قیمت ۸

اقبال کی شاعری: ۔ یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آسکے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ۔

مقام محمود: ۔ مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت پانچ روپیہ۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار کے بعض خاص نمبروں کے متعلق ضروری اعلان

نگار جنوری ۱۹۳۳ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا۔ [illegible] جنوری ۱۹۳۶ء (اردو شاعری نمبر) اور [illegible] جنوری ۱۹۳۸ء (ہندی شاعری نمبر) بالکل ختم ہو گئے ہیں، جن حضرات کو اسکی ضرورت ہو گی [illegible] خرید [illegible] قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے [illegible] دینا پڑے گی۔

نگار جنوری ۱۹۳۸ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب پانچ روپیہ فی پرچہ اور نگار جنوری ۱۹۳۹ء (اصحاب کہف ڈرامہ) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی لی جائے گی۔

جن حضرات کے پاس ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے نمبر نہیں ہیں، وہ ابھی طلب فرمالیں، ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔

منیجر نگار

زندگی

فسردگی سے میں کرتا ہوں تازگی پیدا
مرے شباب سے دنیا ہے خلد کی پیدا

گھٹا سے ہے مجھے تخلیق برق کا ارماں
اندھیریوں سے میں کرتا ہوں روشنی پیدا

تصورات کے بل پر مرے شبستاں میں
شبِ مہیب سے ہوتی ہے چاندنی پیدا

بہار ہو کہ نہ ہو، میرا ذوق کرتا ہے
خزاں کے روپ میں اندازِ دلکشی پیدا

نشاط اور مسرت میں مست رہتا ہوں
مذاقِ غم سے ہے یک گونہ سرخوشی پیدا

روش روش پہ بچھاتا ہوں رات کو تارے
سرشکِ غم سے ہے اک نوع کی ہنسی پیدا

مجھے یبوست زہد و ورع نہیں منظور
گنہ سے کرتا ہوں احساسِ زندگی پیدا

میں چاہتا ہوں کہ ہنگامہ زار ہو دنیا
خموشیوں سے ہو اک شورِ دائمی پیدا

میں چاہتا ہوں رواں و دواں رہے عالم
کہ ہو جمودِ دو عالم میں برہمی پیدا

نگار خانۂ ہستی مرا تبسم ہے
گرفتگی سے مرے دل کی ہے کلی پیدا

حیاتِ نو کا پیامِ شگفتہ لایا ہوں
کروں گا بزم میں اک زندگی نئی پیدا

وہ زندگی کہ جو ہنگامہ در کنار رہے
وہ زندگی نہیں جو سرد و ناگوار رہے

نبی احمد بریلوی

مکتوبات نیاز

مکرمی - گرامی نامہ ملا - ہاں میں اس کو خوب جانتا ہوں
نامرادانہ زیست کرتا تھا
لیکن شاید اس قدر عتاب و سرزنش کا سزاوار نہ تھا

یہ درست ہے کہ مصائب کا زیادہ حصہ خود انسان ہی کی غلطی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، لیکن انسان اسقدر احمق کیوں ہے ؟ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے

اگر ہماری سوسائٹی قدرت کی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر سکتی تو قدرت کے باغیوں کو برا بھلا کہنے کا حق بھی اسے حاصل نہیں - سب سے آخری مرتبہ اب سے دو سال پہلے بہاری ... کو دیکھا تھا، پھر تلاش کے باوجود پتہ نہ چلا - اب آپ سے معلوم ہوا کہ وہ ... اور اس حال میں کہ بجائے رحم کے آپ کو غصہ آرہا ہے

اگر زحمت نہ ہو تو ٹکٹ لیکر اسے ریل پر سوار کرا کے تار دیجئے - مجھے اس سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اور اب تو آپ کے عتاب سے اور زیادہ ہو گئی ہے ؟

حضرت ، خط ملا ، آپ کی ضد کا جواب صرف یہ تھا کہ وہیں آپ کے سامنے پہونچکر خودکشی کرتا، لیکن اسوقت تک آپ کی اور تمام نامعقول باتوں کا معقول جواب کب دے سکا ہوں کہ اب کامیاب ہوتا -

آپ جانتے ہیں مجھے وہاں جانے کے خیال سے روحی تکلیف ہوتی ہے اور آپ کے نزدیک بار بار اصرار کرنا مجاہدانہ ہے، دینی فرض ہے، جس کے پورا کرنے پر آپ خدا و رسول کی طرف سے مجبور ہیں

اگر یہ صرف جبر ہے تو مرے لئے خطرہ سے خالی نہیں اور اگر سنجیدگی ہے تو آپ کو بھی اپنے انجام سے ڈرنا چاہئے مانا کہ میرا مطالعہ ناقص ہے، لیکن معاف فرمایئے میں اس کی تکمیل کا آرزومند نہیں - آپ اگر خوش قسمتوں میں سے ہیں تو آپ کو یہ "قاب قوسین" مبارک ! آپ کیوں اپنی فردوس کو میرے جہنم کے خیال سے بے لطف بناتے ہیں !

مجھے اس زندگی سے آگے جینا نہیں اور اس کے ختم ہونے میں اب صرف چند سال باقی ہیں۔ اگر کوشش کروں تو بھی دل کی سیاہی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی، مجھ سے خدا کی پرستش تو ہوتی نہیں، بندۂ خدا کی کیا ہوگی!
آپ شوق سے تشریف لائیے، غریب خانہ حاضر ہے، لیکن اس غریب کو غیر حاضر ہی سمجھئے گا

جی ہاں، کل ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ کیا کہنا ہے
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

لیکن سچ پوچھئے تو مجھے افسوس ہوا۔ ہر چند جوانی کی باتوں کو جوانی کی نگاہ سے دیکھنے کا زمانہ نہیں، تاہم یہ فصلِ بہار کبھی مجھ پر بھی گزر چکی ہے اور عالم شیب میں قوتِ تصور تو خیر بڑھ ہی جاتی ہے، اس لئے سمجھتا ہوں کہ یہ "انہونی" بات بھی کچھ موقع سے نہیں ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہو بھی کیا سکتا ہے!

بہر حال اس وقت وہ نشہ میں چور ہیں۔ نہ لغزش کا خوف، نہ گرنے کا خیال، نہ ملامت کی فکر، نہ اندیشۂ مآل ——
کچھ دن گزر جانے دیجئے، شاید ہوش آجائے! میں نے آپ سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ خود بین انسان بہت جلد ٹھوکر کھاتا ہے اور وہی ہوا۔ آپ کو اُن کے حسنِ ذوق اور بلندیٔ فطرت پر اعتماد تھا اور مجھے انھیں باتوں سے اندیشہ! خیر، وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی ماحول کو گوارا بنایا جائے اور یہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ آئیے یا کسی ایسے شخص کو بھیجئے جو اِن پر نہیں، اُن پر زیادہ اثر رکھتا ہو!

دیکھئے آپ پھر مہینوں سے چُپ ہیں اور جب یہ خاموشی دور ہوگی تو حسبِ معمول اُلٹا الزام مجھی پر رکھیں گی!
میں جانتا ہوں کہ عورت کو شکایت میں زیادہ لطف آتا ہے اور جب کسی کی طرف سے کوئی بات شکایت کی پیدا نہ ہو، تو اسے غصہ آجاتا ہے! لیکن اگر یہ صرف چھیڑ چھاڑ یا گرمیٔ محبت قایم رکھنے کے لئے ہو تو خیر کوئی حرج نہیں، لیکن جب یہ بات نہ ہو، تو پھر؟

میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ نئے تعلق سے آپ خوش ہیں یا نہیں، آپ نے اس کا جواب بہت مبہم دیا لیکن اندازِ تحریر میں ایک چھُپی ہوئی آہ محسوس کرکے، میں نے عرض کیا کہ ذرا صاف صاف لکھئے، اور اس کے جواب میں آپنے خاموشی اختیار کرلی —— ڈر رہا ہوں کہیں یہ وہ وقفہ نہ ہو جو بات کرنے سے پہلے رونے کے لئے درکار ہوتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے صرف اس لئے ہمدردی ہے کہ آپ میری جنس کی ستائی ہوئی ہیں، اور میں بطور فرض کفایہ سب کی طرف سے اس کی تلافی تو خیر کیا کر سکتا ہوں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اب دوبارہ یہ تلخ نوش آپ کو گوارا نہ کرنا پڑے اور اسی لئے آپ کے اس فیصلہ سے میں خوش ہوا تھا کہ آیندہ اپنی زندگی آپ مردوں کی طرح بسر کریں گی۔

اس کے بعد جب آپ نے اپنی لڑکی کو علیگڑھ تعلیم کے لئے بھیجا تو مجھے آپ کے اس عزم کا زیادہ یقین ہو گیا۔
لیکن اس کے بعد دفعتاً آپ نے اپنے نکاح کی خبر سنائی۔ اول اول تو مجھے اس کے باور کرنے میں تامل ہوا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ عورت بہرحال عورت ہے اور وہ دوسروں کا سہارا لینے کے بعد ہی خوش رہ سکتی ہے، میں نے اس خبر کو مسرت کے ساتھ سُنا اور بے اختیار جی چاہا کہ کچھ تفصیل معلوم کروں۔ مگر۔ آپ کی مبہم تحریر اور اس کے بعد آپ کے سکوت نے پھر اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا کر دئے۔

اگر آپ نے پھر وہی غلطی کی ہے جو پہلے کی تھی، تو بھی مجھ سے کہنے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر اس سکوت کا سبب فرطِ نشاط ہے تو بھی اطلاع دیجئے، یہ سُنکر مجھ سے زیادہ خوشی کسے ہو سکتی ہے۔ اگر نا مناسب نہ ہو تو بچی کے متعلق بھی لکھئے کہ اب وہ کہاں ہے۔ اگر اب بھی علیگڑھ میں ہے تو میں دہلی آتے جاتے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

قبلۂ محترم!

یہ درست ہے کہ اس خار زار نے میرے پاؤں زخمی کر دئے ہیں، لیکن جب آپ ایسے ہمدردی کرنے والے موجود ہوں تو پھر۔۔۔ وانگہ کرا پروائے جاں کز پائے نشتر بر کند

زندگی کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر یہ شکایت کرنا کہ

کیوں ترا راہگزر یاد آیا

شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ۔۔۔۔۔ بالکل درست!

لیکن اس "یوں بھی" کے جمود و تعطل کو تو دیکھئے۔۔۔ یہ لنگر گرانجانی کم از کم میرے بس کی چیز تو ہے نہیں!
اگر یہ واقعی کوئی مرض ہے تو بھی مداوا کی حد سے گزرا ہوا۔ اس لئے ضرورت ہمدردی کی ہے نہ کہ طعن و ملامت کی۔
شکر ہے کہ آپ اس رمز سے واقف ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ۔۔۔۔۔ کہ ۔۔۔۔۔ سعدی در تو حیران ست و مدہوش

حدیثِ حُسن خود از دیگراں پُرس!

میرے ساتھ تمہارا جو معاملہ ہے، وہ تو خیر ایسا ہے کہ مجھے تمہاری اچھی باتیں بھی بُری معلوم ہوتی ہیں، لیکن محلہ میں، شہر میں، ملک میں اور لوگ بھی موجود ہیں، اُن سے پوچھو کہ تم میں اچھائیاں کیا کیا ہیں۔۔۔ میں نے تم سے بارہا کہا کہ اگر تمہارے اخلاق کی تکمیل میں کسی بات کی کمی ہے تو صرف یہ کہ تم کسی کے مُرید نہیں ہو۔۔۔ اگر یہ کمی پوری ہو جائے

تو پھر تمھارا جواب نہیں، لیکن تم سنتے ہی نہیں، مذاق سمجھتے ہو۔

دیکھو بعض باتیں انسان میں وہبی طور پر بُری ہوتی ہیں، سو وہ تم میں موجود نہیں ہیں، لیکن بعض بُرائیاں اکتسابی بھی ہوتی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ "دستِ بیع" ہو جاتا ہے۔۔ اس کوچہ میں آؤ تو پتہ چلے کہ کیسے کیسے "رموز سیات" ابھی تک تمھارے لئے "ناکشودہ" پڑے ہوئے ہیں۔

سُنا ہے تمھارے بھائی صاحب نے تو ایک مزار کو اڈّا بنا لیا ہے اور وہاں "کشفِ حجاب" اکثر ہوتا رہتا ہے پھر تمھیں کیوں تامل ہے؟

جی ہاں، معاملہ کچھ سرد تو ہو گیا ہے لیکن

گیرد صبا خراج زخاکسترم ہنوز

اب بھی "خانوادہائے علم و فضل" سے جو جھونکا ادھر آتا ہے وہ گرم ہی ہوتا ہے! خدا کے لئے آپ ہی ان کو سمجھائیے کہ خدا سے محبت کرنا یہ کب سکھائیں گے۔ صدیاں گزر گئیں کہ خدا کو انھوں نے ہیبت و جلال والا بادشاہ بنا کر پیش کیا۔ اب اسے عرش سے نیچے اُتار کر ذرا فرش پر بھی تو لائیں، خاک نشینوں کو بھی تو دیکھنے کا موقع دیں۔ آخر وہ وقت کب آئے گا جب خدا انسان سے گھُل ملکر اپنی جگہ ان کے دل میں پیدا کرے گا۔

خدا کے جس تصور نے اس وقت ساری دُنیا کو خاک و خون میں تڑپا رکھا ہے، کیا وہ اب بھی ختم نہ ہوگا، کیا عقلاء نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک انسانی آبادی ختم نہ ہو جائے گی وہ خُدا کو اس مصیبت زدہ کرۂ زمین پر آنے کی اجازت نہ دیں گے ـــ کیا خدا کی حکومت اب صرف درندوں اور عفریتوں پر ہوگی ـــ یہ آخر قصّہ کیا ہے ۔ سچ کہتا ہوں، بعض وقت ایسا محسوس کرتا ہوں کہ سینہ شق ہو جائے گا، لیکن کہوں کس سے، ان شقیوں سے! معاذ اللہ!

آپ کیسے ہیں ؟

سنئے

دل میں غم آیا ہے یا شادمانی یہ نہ پوچھ
کس ڈگر پر چل رہی ہے زندگانی یہ نہ پوچھ

میرے دامن میں گل و نسترہیں آنا دیکھ لے
میری آنکھوں میں شرارے ہیں کہ پانی یہ نہ پوچھ

دیکھتی ہے اب بھی یہ دُنیا مجھے ہنستا ہوا
اس ہنسی میں موت ہے یا زندگانی یہ نہ پوچھ

ایک جانب وقت کی قوت ہے اک جانب ہے دل
کون کس پر کر رہا ہے مہربانی یہ نہ پوچھ

فرقتیں میں نے اگر چاہا تو پھر ملجائیں گی
گیت لیکن گا سکے گی پھر جوانی یہ نہ پوچھ

بس یونہی آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے کبھی
کوئی ہوتی بھی ہے وجہ شادمانی یہ نہ پوچھ

دیکھ یہ ہاتھوں سے پوچھا دیکھ چہرے کی خراش
پھر بھی کیوں ہیں ہونٹ صرف نغمہ خوانی یہ نہ پوچھ

زندگی یکسر تڑپ ہے زندگی یکسر گداز
ماورائے شوق باقی ہے کہ فانی یہ نہ پوچھ

میں کہاں پہ ختم کر سکتا ہوں اپنی داستاں
میں کہاں سے کہہ سکوں گا اب کہانی یہ نہ پوچھ

فضل الدین اختر ایم۔اے۔بی۔ٹی

غزل

تری سعیٔ کرم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے
کہ اب کچھ تیز تر عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

وہ کھائے ہیں سرِ منزل فریبِ زندگی میں نے
کہ گردِ رہگزر بھی کارواں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ شوق ہی پروردگارِ حسنِ رنگیں ہے
یہی دریا یہی موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

لرز جاتا تھا جس کو دیکھ کر اپنے نشیمن پر
وہی بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نظر پڑتی ہے جا کر جب مآلِ حسنِ رنگیں پر
کلی کھلنے سے پہلے خونچکاں معلوم ہوتی ہے

مرے احساسِ دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

قیامت ہے تلاطم شورِ دریائے محبت کا
جو موج اٹھتی ہے وہ ساحل نشاں معلوم ہوتی ہے

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

جناب سید علی سجاد مرزا۔ سہارن پور)

مارچ کے نگار میں شرح کلام مومن کا سلسلہ "غم کرتے ہیں" کی زمین تک پہونچا تھا۔ اب اسکے آگے کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں۔ ان پر بھی توجہ فرمائیے۔

۱۔ صورت دکھائے جو کبھی جا کے خواب میں — بیدید آنکھ کھول دے جھنجھلا کے خواب میں

کیا بیدید سے مراد یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے وہ جھنجھلا کے آنکھ کھول دیتا ہے۔

۲۔ شب وہ جو سو رہے مرے پاس آ کے خواب میں — جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

تمنا کے خواب میں کس کے بخت خفتہ جاگے ؟

۳۔ آنکھوں کو بند کر کے وہیں کھولدے گر آئے — یوسف کسی کے محوِ تماشا کے خواب میں

کون آنکھ بند کر کے کھولدے اور کیوں ؟

۴۔ کابوس میں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے — کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے اور اس کا پورے شعر سے کیا تعلق ہے ؟

۵۔ سو رہتے پائے ناقہ زمانِ وداع گر — طالع نہ ہوتے قیس کے لیلیٰ کے خواب میں

دوسرا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے، "لیلیٰ کے خواب میں قیس کے طالع نہ ہوتے"۔ یہ کیا بات ہوئی ؟

۶۔ نیرنگ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ — اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

پورے شعر کا مفہوم چاہتا ہوں۔

۷۔ رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں، — کیوں چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

پورے شعر کا مطلب بیان فرمائیے۔

۸۔ اُس کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر — یاں پاؤں جاگتے ہیں کوئی جا کے خواب میں

کیا مطلب ہے۔

۹۔ سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے — کہتا ہے سوتے ہو مرے بن آ کے خواب میں

دوسرے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے۔

۱۰۔ سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈھوں جو امن آب میں — ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

دوسرے مصرعہ کا کیا مفہوم ہے

۱۱۔ گر ہو وہ دستِ حنائی عکس افگن خواب میں — ہووے مرجاں جوں چنار آتش زنِ تن آب میں

دوسرے مصرعہ کا ٹکڑا کیا مفہوم رکھتا ہے۔

۱۲۔ دی دلِ سوزاں کو تشبیہ سمندر میں نے اب — چھوڑ کر آتشکدہ ڈھونڈھے ہے مسکن آب میں

پورے شعر کا مفہوم درکار ہے۔

۱۳۔ یادِ چشم یار میں دریا پہ رو یا بن گئیں — مردم آبی کی پُتلیاں شمع روشن آب میں

کیا مفہوم ہے۔

۱۴ ۔ دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں　　　کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

کیا مطلب ہے ۔

نگار) ۱ - "بیدید" کے معنی بیمروت و سنگدل کے ہیں۔ اسی معنے میں "بیدیدہ" بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کبھی خواب میں بھی مجھے دیکھ لیتا ہے وہ بیمروت فوراً جھنجھلا کے آنکھیں کھول دیتا ہے ۔

- "تمنا کے خواب ہیں" نہ کہئے۔ دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہوگی "تمنا کے بخت خفتہ، خواب میں جائے تھے"۔ اب مطلب صاف ہوگیا ۔

۱ - وہ شخص جو میرا محو تماشہ ہے وہ اگر یوسف بھی خواب میں نظر آئے تو فوراً آنکھیں کھول دے۔ مطلب یہ کہ جو تیرا تماشائی ہے وہ یوسف پر بھی نگاہ نہیں ڈال سکتا ۔

دوسرے مصرعہ میں کسی کے بعد کے بیکار معلوم ہوتا ہے "کسی محو تماشہ کے خواب میں" ہونا چاہیئے، اس لئے مجھے اس مصرعہ کی صحت میں کلام ہے ۔

۱ - کابوس ایک بیماری ہے جس میں انسان سوتے سوتے چونک پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بار بار چونک پڑنے کو اطبا کابوس کا مرض بتاتے ہیں، حالانکہ اسکا سبب یہ ہے کہ میرا محبوب مجھے خواب میں نظر آتا ہے۔ اس لئے بربنائے رشک میں یہ تو گوارا نہیں کر سکتا کہ میرا محبوب ہی طبیبوں کو خواب میں نظر آئے لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی اور حسین انھیں اسی طرح نظر آئے اور وہ بھی میری طرح چونک چونک پڑیں۔ اور اس طرح انھیں حقیقت کا علم ہو سکے ۔

۱ - دوسرے مصرعہ میں "قیس کے" بعد "اور" محذوف ہے۔ یعنی اگر قیس کے اور لیلےٰ کے طالع خواب میں نہ ہوتے تو وداع کے وقت ناقۂ لیلیٰ کے پاؤں سو جاتے اور وہ روانہ نہ ہو سکتی ۔

۱ - مشہور ہے کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھنچکر زلیخا کے پاس پہونچ گئے۔ مومن کہتے ہیں کہ جو کشش زلیخا کے خواب میں تھی وہی میرے دل بیدار میں بھی ہے، دونوں کا ایک رنگ ہے ۔

۱ - اگر تم مجھے دیکھتے بھی نہیں ہو۔ تو میرا دھیان ضرور تمھیں رہتا ہے ورنہ خواب میں گھبرا کر چونک پڑنا کیسا ؟

۱ - "نالۂ زنجیر" سے خطاب ہے کہ اُس کی گلی میں غل نہ کر کیونکہ یہاں ہر ایک کے پاؤں بہونچکر سو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "استفہام انکاری" ہے اس لئے اسی لہجہ سے پڑھئے ۔

۱ - دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہے :-

خواب میں آکے کہتا ہے کہ مرے بن سوتے ہو ؟

۱ - میرے سوزِ دل کا یہ عالم ہے کہ اگر پانی میں پناہ لوں تو ہر ہر قطرہ گلخن کو بھی داغِ رشک دے ۔ یعنی گلخن بھی اپنی گرمی کو بھول جائے ۔

۱ - اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے دستِ حنائی کا عکس پانی میں پڑے تو پنجۂ مرجاں بھی چنار کی طرح آگ دے اُٹھے ۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں ردیف بیکار معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بحالت خواب دستِ حنائی کا عکس افگن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں "تن" کا لفظ بھی کوئی خاص مفہوم پیدا نہیں کرتا ۔

۱ - سمندر، آگ کا کیڑا ہے، لیکن اگر میں اب دلِ سوزاں سے اسے تشبیہ دیدوں تو وہ بھی آگ سے گھبرا کر پانی میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھے ۔

۱۱ - میں چشمِ یار کی یاد میں دریا پر رویا تو آنسوؤں کی سوزش کی وجہ سے مردمِ آبی کی پلکیں بھی شمع کی طرح جلنے لگیں ۔

۱۱ - جب موت پر سکتہ کا شبہ ہوتا ہے تو چہرہ کے سامنے آئینہ رکھ کر دیکھتے ہیں، کیونکہ اگر ہلکی سی ہلکی سانس ہوگی تو بھی آئینہ پر اس کا دھندلا سا نشان پڑ جائے گا۔ مومن کہتا ہے کہ یہاں تو جان ہی نہیں اور تم سکتہ کا شبہ کرکے آئینہ دکھاتے ہو۔ کیا اسی پر یہ بدگمان نہ ہونے کا دعوےٰ کرتے ہو ۔

مطبوعات موصولہ

دردانہ مجموعہ ہے آنسہ محمودہ رضویہ کے بعض ادبی مقالات کا جسے اس۔ جی کاروانی ام۔اے نے مرتب کیا ہے۔ آنسہ محمودہ کے یہ مقالات بعض رسایل میں شایع ہو چکے ہیں اور اپنے انداز تحریر سے اس دور کی یادگار ہیں جب ٹیگور کی تقلید ذوق عام کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

خیالات کی پاکیزگی اور بیان کی لطافت سے پتہ چلتا ہے کہ آنسہ محمودہ اس سے بہتر خدمت زبان کی انجام دے سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو کراچی۔

دھڑکنیں جناب ندیم اسوقت کے صاحب فکر نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور موجودہ دور کی شاعری میں جو جدید رجحانات نظر آتے ہیں، وہ انکے کلام میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر تاثیر کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے اور میں ان کے اس خیال کا موید ہوں کہ ندیم نے ان قطعات میں شاعری اور افسانہ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان قطعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا فکر کافی غایر ہے، لیکن اس میں فلسفیانہ خشکی یا واعظانہ یبوست نہیں، بلکہ ادبی لطافت ہے، بلکہ قسم کا رومان ہے، ایک خاص قسم کا دردمندانہ احساس ہے، جو پڑھنے والے کو کافی متاثر کرتا ہے۔

قطعات کا زیادہ حصہ سوگوارانہ کیفیت لئے ہوئے ہے، نقاشانہ رنگ کے قطعات بھی کافی ہیں، لیکن انقلابی رنگ کی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی۔ بہرحال مجموعہ بہت پرلطف ہے اور اس کا مطالعہ تھوڑی دیر کے لئے مکروہات زمانہ سے ہمیں علٰحدہ کر دیتا ہے۔ اُردو اکاڈیمی لاہور نے اسے بہت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے قیمت عہ ہے۔

شیخ و برہمن مجموعہ ہے جناب اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا۔ اعظم کریوی بہت مشاق فسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کا مقامی رنگ عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ، کردار اور زبان سب ایک ہی رجحان کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ رجحان زندگی کی طرف ان باتوں سے متعلق ہے جو بغیر کسی تمثیلی اُپج کے ہمیں روز متاثر کرتی رہتی ہیں

گاؤں اور گاؤں والوں کی فطرت و معاشرت سے متعلق جو واقعات فسانہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، انھیں کو اعظم صاحب نے لیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی اس بدنصیب آبادی کا بڑا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ دو روپیہ میں کتابخانہ دانش محل امین آباد پارک سے ملسکتا ہے۔

شان خدا مولانا عبیدالرحمان عاقل رحمانی کی تالیف ہے جس میں وجود خالق سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصود دہریوں اور ملحدوں کو راہ راست پر لانا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے ابھی تک یہی نہیں سمجھا کہ اصل نزاع کیا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور مذاہب نے پیش کیا ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ عاقل صاحب اپنے استدلات میں جو زیادہ تر منقولی اور کمتر معقولی ہیں، کوئی نئی بات نہیں بتائی اور اسی مولویانہ کج بحثی اور کم نظری سے کام لیا ہے جو اس طبقہ کا قدیم شیوہ ہے۔ خدا سے انکار کرنے والوں کا جواب تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ لوگ جو مذہب کے بتائے ہوئے تصور خداوندی پر اعتراض کرتے ہیں، ان کا جواب دینا مشکل ہے، کیونکہ اس صورت میں حشر و نشر وغیرہ کا عقیدہ سب خاک میں ملجاتا ہے جس پر مذہب کی بنیاد قایم ہے۔ اس کتاب کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ :۔ کتابستان پوسٹ بکس ۱۲۶۴ بمبئی۔

محمد رسول اللہ ترجمہ ہے ٹامس کارلایل کی مشہور تصنیف کا جس میں اس نے رسول اللہؐ کی حمایت کی ہے اور معترضین کا جواب دیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی مولانا عبیدالرحمان صاحب عاقل رحمانی کا کیا ہوا ہے اور بُرا نہیں ہے۔ کارلایل نے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی ہے، اسوقت سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی اور اسی لئے اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسوقت کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اب جو اعتراضات خدا اور رسول کے مفہوم پر کئے جاتے ہیں ان کی نوعیت بالکل علٰحدہ ہے اسلئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے ترجمہ سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ دہی۔

جواہر العلوم ترجمہ ہے علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب کا۔ ترجمہ مولوی عبدالرحیم صاحب پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے اور بُرا نہیں ہے۔ اس کتاب میں بصورت مکالمہ دُنیا کے بعض قدیم و جدید عجائبات کو پیش کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب چیز کتاب کا وہ حصہ ہے جس میں قیامت اور جزا و سزا کے ثبوت پر عقلی دلایل پیش کئے گئے ہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس حصہ کا کتاب کے موضوع سے کیا تعلق تھا۔ مغربی زبان کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے جواہر العلوم بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے۔ قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ کتابستان پوسٹ بکس ۱۲۶۴ بمبئی۔

راہگزر جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جناب عاشق حسین صاحب مشاق افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانے متوسط درجہ کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کو سامنے رکھکر لکھے گئے ہیں اور ان تمام اُلجھنوں، بیتابیوں اور نامرادیوں کے آئینہ دار ہیں، جن سے ہمیں اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ پلاٹ، زبان اور ادبیت سب کچھ ان میں موجود ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس رنگ کے افسانے لکھنے میں عاشق صاحب نے جو جگہ حاصل کر لی ہے وہ انکے لئے مخصوص ہے۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور۔

چند عجیب جنسی تصنیف

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (ـــــہ) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (ـــہ) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲/) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادئین کا مذہب

۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)
علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)
علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عـہ) علاوہ محصول

”نگار“ کے خاص نمبر

جنوری ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے - صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین)

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

جنوری ۳۵ء

اور

جنوری ۳۶ء

بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی انکے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کرسکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

جنوری ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف۔ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشاپردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری ۳۸ء

”تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ -

قیمت تین روپیہ (سے ر)

علاوہ محصول

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی - اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۴

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:-

نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

صفحات ۱۶۸

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء

یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے

قیمت دو روپیہ (عہ-)

علاوہ محصول

جنوری ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جنکی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا، یہ نمبر گویا تتمہ ہے جنوری سنہ ۴۱ء کا اور اُنکے ساتھ ہی اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے ان دونوں نمبروں سے ملکر ایک ایسا تذکرہ مرتب ہوجاتا ہے جو اسوقت تک پیش نہیں کیا جاسکا۔ قیمت عہ

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر ا ۔ ۳۶۶



قیمت فی کاپی ۸ر

کم ہوئی ۔

نگار بک ایجنسی

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، اسکی تخئیل، اس کی نزاکتِ بیان، اسکی بلندیِ مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۴ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ قدرتِ بیان، اعلیٰ تخئیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاستِ بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے۔ جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ۸)

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

قیمت آٹھ آنے۔ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۴۲ء | شمارہ ۱

ملاحظات

عرضِ حال

جون کا مہینہ یوں تو تمام شمالی ہند کے لئے قیامت کا مہینہ تھا، لیکن میرے لئے خصوصًا بہت ہی روح فرسا اور ایذا رساں ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کا انتہائی درجۂ حرارت کبھی ۱۱۴ ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ہفتہ عشرہ کے لئے، لیکن اس مرتبہ گرمی ۱۲۳ درجہ تک پہونچ گئی اور لوہ کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان و زمین تنور ہو کر رہ گئے ہیں اور انسانوں کی حالت ایسی تھی جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈالدیا جائے۔ یہ تکلیف تو خیر تھی ہی، اس پر طرہ یہ کہ نینی تال سے واپس آنے کے بعد میں بیمار بھی پڑ گیا اور پورا مہینہ اُس حال میں گزر گیا جس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم!

تفصیل کیا عرض کروں، یوں سمجھئے کہ دل و دماغ دونوں جواب دے چکے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید جولائی کے رسالہ میں آپ کوئی اور خبر سنیں گے لیکن شکر ہے، قدرت نے چند دن کی مہلت اور دیدی اور میں آج ۳۰ جون کو اس قابل ہو سکا ہوں کہ یہ چند سطریں لکھ سکوں

ظاہر ہے کہ ان حالات میں پرچہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب نہ کر سکتا تھا، تاہم "ہوش" میں رہنے کا کوئی لمحہ میں نے ضایع نہیں کیا اور نگار کی خصوصیات برقرار رکھنے کی کوشش رائگاں نہ گئی۔ اب بھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور دے سکوں، لیکن اگر ہفتہ عشرہ میں یہ کیفیت کم ہو گئی تو احباب کے ان خطوں کا جواب بھی دے سکوں گا جو عرصہ سے بند پڑے ہیں اور جن کے جواب نہ دے سکنے کا مجھے سخت افسوس ہے۔

لڑائی کی تیسری منزل

کسی ماہانہ رسالہ میں جنگ پر تبصرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن شکر ہے کہ اب لڑائی کے حالات میں بھی تبدیلیاں اتنی جلد جلد نہیں ہو رہی ہیں کہ آج کی چیز کل باسی نظر آئے۔ علاوہ اس کے ہم لوگوں کا جنگ پر کہنا سننا گپ سے زیادہ کچھ نہیں اور گپ کبھی پرانی ہوتی نہیں!

یوں تو جب تک لڑائی ختم نہ ہو، نہ انجام کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کی جاسکتی ہے اور نہ درمیانی انقلابات کے بابت کچھ کہا جاسکتا ہے تاہم بعض باتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں، جنھیں دیکھ کر ہم ایسے معمولی آدمی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نتیجہ خیز ہونا ضروری ہے، اور زیادہ سے زیادہ ہم انھیں باتوں پر گفتگو کر سکتے ہیں

دوران جنگ میں اول تو ساری خبریں ہم تک پہونچتی نہیں، اور جو پہونچتی بھی ہیں، اُن میں مصلحت آمیزی اس قدر شامل ہوتی ہے کہ قیاس و اندازہ سے بھی کام لینا خطرہ سے خالی نہیں، لیکن نہ چھپ سکنے والی بڑی بڑی باتیں آخر کار معلوم ہو ہی جاتی ہیں اور وہی ہم لوگوں کی بحث کا موضوع ہوا کرتی ہیں

جنگ میں خبروں کی ایک قسم تو وہ ہے جو خانہ پُری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، مثلاً دُشمن کے فُلاں فُلاں مقامات پر کامیابی سے بمباری کی گئی۔ فلاں فلاں جہازوں پر کامیابی کے ساتھ نشانہ بیٹھا۔ فلاں فلاں کارخانوں میں سیکڑوں میل سے شعلے بھڑکتے نظر آئے۔ وغیرہ وغیرہ ان خبروں سے مقصود صرف اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینا دشمن کی ہلاکت سے علٰحدہ ایک چیز ہے جسے ہم صرف "نفسیاتی" دروبست کہہ سکتے ہیں۔ لیکن خبروں کی ایک قسم "ایسی" ہے جن کا چھپانا ممکن نہیں اور انھیں "ناگزیر" قسم کی خبروں سے ہم اپنے جذبات بیم و رجا کی تسکین کر لیا کرتے ہیں

جون میں ہم کو اس طرح کی تین خبریں سننے میں آئیں۔ ایک روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ، دوسرے جرمنی کا سباسٹوپول اور خارکوف پر زبردست اقدام اور تیسرے طبروق کا سقوط اور ان میں، ہر خبر اپنی جگہ بے انتہا وزنی اور درجہ اہم ہے

۱۔ پہلی خبر کے متعلق سوچنے کی ایک بات یہ ہے کہ جب برطانیہ و روس میں اس سے پہلے معاہدۂ اتحاد ہو چکا تھا تو اب دوبارہ اس جدید معاہدہ کی ضرورت کیوں پیش آئی، دوسرے یہ کہ اس جدید معاہدہ کا اثر روس کے حال و مستقبل پر کیا پڑے گا اس معاہدہ کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ پہلے معاہدہ میں امریکہ شامل نہ تھا اور اب شرکت جنگ کے بعد اس کا بھی فریق معاہدہ بننا ضروری تھا۔ لیکن ایک دوسرا پہلو جو اور بھی ہے وہ یہ کہ لڑائی کا فیصلہ چونکہ روس ہی کی سرزمین پر ہوتا معلوم ہوتا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ روس کے مقاصد کو اپنے مقاصد سے قریب تر رکھنے کی احتیاط کر لی جائے تاکہ بعد اختتام جنگ شرائط صلح کی تعیین کے وقت ان خطرات کے پیدا ہونے کا امکان ضعیف ہو جائے، جو اصولاً اشتراکیت اور ڈماکریسی کے تصادم اغراض سے رونما ہو سکتے ہیں

اس معاہدہ سے روس کو فی الحال سب سے بڑا فایدہ یہ پہونچے گا کہ برطانیہ و امریکہ کی امداد بیش از بیش اسے حاصل ہو سکے گی اور ممکن ہے کہ جرمنی کے خلاف برطانیہ کوئی نیا مورچہ قایم کر کے روس میں دشمن کے دباؤ کو بھی کم کر دے۔ اس معاہدہ کا مستقبل البتہ تاریکی میں ہے تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر روس کو شکست ہوتی ہے، تو پھر یہ معاہدہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر روس کو کامیابی ہوتی ہے تو دُنیا کی جدید تنظیم میں اگر ڈماکریسی و اشتراکیت کو ملایا نہ جاسکا تو اشتراکیت کے لئے ایک حد فاصل قایم ہو سکے گی اور "بالشویت" کو زیادہ معتدل صورت اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ اگر روس اس جنگ میں کامیاب ہوا تو اس کامیابی کا بڑا سبب امریکہ و برطانیہ کی مدد ہوگی اور شرائط صلح کی تعیین میں قدرتاً ان کی آواز کو زیادہ با اثر ہونا چاہئے

بہرحال روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ بڑی اہم چیز ہے اس وقت دوران جنگ میں بھی اور جنگ کے بعد بھی اگر جرمنی کو ناکامی ہوئی

۲۔ جرمنی کا تازہ حملہ روس کی طرف ۲۲ مئی سے شروع ہوا ہے اور اس وقت ایک مہینہ ختم ہونے کے بعد بھی کوئی نتیجہ اس کا نہیں نکلا۔ اسوقت جو خبریں آ رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح وہ سباسٹی پول پر قابض ہو جائے

اور خارکوف کی طرف روسیوں کو پیچھے ڈھکیل کر قفقاز کا راستہ ان پر بند کر دے

پچھلے سال روس میں جرمنی کا نقشۂ جنگ کچھ اور تھا۔ اُس وقت تو صورت یہ تھی کہ ہٹلر سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ پولینڈ سے اُٹھکر اوکرائن ۔ سفید روس، ماسکو، لینن گراڈ اور تمام یوروپی علاقہ روس کا فتح کرتا ہوا کوہستان اورال تک آسانی سے پہونچ جائے گا اور اس گلگشت میں کوئی اس کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن اب حالت کچھ اور ہے۔ ہٹلر اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ وہ روس کے پر و بال نوچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور وہ اُسے اس حد تک نیچا نہیں دکھا سکتا کہ اس سے من مانی شرطیں منوا سکے، اسی کے ساتھ خود جرمنی پر پچھلے دو سال میں جتنا دباؤ پڑا ہے وہ اسے زیادہ عرصہ تک جنگ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے ہٹلر چاہتا ہے کہ جلد سے جلد جتنا فایدہ بھی روس کی سرزمین سے اُٹھایا جاسکتا ہے، اُٹھالے ۔۔ اور یہ فایدہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ باکو کے پٹرول پر قابض ہوجائے جس کی اسے شدید ضرورت ہے

اگر سباسٹپول پر اس کا قبضہ ہوگیا اور خارکوف کی طرف اس نے روسی فوجوں کو اتنا پیچھے ڈھکیل دیا کہ وہ قفقاز کی طرف نہ بڑھ سکیں، تو یہ قاف کے کوہستان کو عبور کرکے باکو کی طرف بڑھے گا اور پھر نہ صرف عراق و ایران بلکہ تمام مشرقِ ادنیٰ لڑائی کا اکھاڑا بن جائے گا

اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سباسٹپول میں روسیوں کی حالت نازک ہے اور خارکوف کی طرف بھی حالات زیادہ امید افزا نہیں، لیکن روس کی سخت جانی کو دیکھتے ہوئے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں

بہر حال اگر سباسٹپول، روس کے ہاتھ سے نکل گیا (جو اس لڑائی کا رُخ پھیر دینے والا واقعہ ہوگا) تو بحرِ اسود میں روسی بیڑا بھی ایک حد تک بیکار ہوجائے گا اور خارکوف کی طرف سے روسی فوجوں کی نقل و حرکت بھی دشوار ہوجائے گی۔ اس صورت میں قفقاز کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ تر اتحادیوں کی اس فوج پر عاید ہوگی جو عراق و ایران میں موجود ہے اور اس جنگ میں شاید یہ پہلا سخت معرکہ ایشیا کی سرزمین پر ہوگا

اس میں شک نہیں کہ قفقاز کا راستہ بہت دشوار گزار ہے اور ہٹلر آسانی سے کوہستان قاف کو عبور کرکے باکو تک نہیں پہونچ سکتا، لیکن چونکہ اس جنگ نے ممکن و ناممکن کے فرق کو گھٹا کر بہت کم کر دیا ہے، اس لئے نقل و حرکت کی دشواریوں کو سامنے رکھ کر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ عراق و ایران کی طرف اتحادیوں کی طیاریاں بہت زبردست ہیں اور انھیں پر ہم کو اعتماد ہوسکتا ہے

اگر ہٹلر کو سباسٹپول لینے میں کامیابی نہ ہوئی، تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ ترکی کے راستہ سے عراق ہوتا ہوا باکو تک پہونچے اور یہ وقت وہ ہوگا جب ترکی کو اِدھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا

۴ - آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت ہٹلر نے کریمیا اور خارکوف میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اسی وقت اس نے لیبیا کی جنگ شروع کر دی، حالانکہ سخت گرمی کے زمانہ میں ریگستان لیبیا کو معرکہ زار بنانا معمولی بات نہ تھی، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ برطانوی فوجیں نہایت مضبوطی سے وہاں قدم جمائے ہوئے تھیں

بات یہ ہے کہ ہٹلر نے فی الحال جو نقشۂ جنگ بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ اُدھر روس میں کریمیا کی طرف سے آگے بڑھے اور اِدھر فلسطین و عراق کی طرف سے اقدام کرے۔ گویا وہ مشرق ادنیٰ کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر، عراق، ایران اور باکو کے پٹرول تک پہونچنا چاہتا ہے ۔ وہ ترکی کے راستہ سے بھی یہ گھیرا ڈال سکتا تھا، لیکن اول تو وہ ترکی کی غیر جانبداری کو اس وقت چھیڑنا نہیں چاہتا اور دوسرے یہ کہ جب تک فلسطین، شام اور مصر کی اتحادی فوجوں کی طرف سے وہ مطمئن نہ ہوجائے یہ گھیرا کامیاب نہیں ہوسکتا، بلکہ خود گھر جانے کا اندیشہ ہے

وہ جانتا ہے کہ سواحل مصر سے لیکر سواحل عرب تک اتحادی فوجیں ہر جگہ نہایت کثرت سے موجود ہیں اور صحیح تدبیر جنگ اُن کے درمیان سے گزر جانا نہیں بلکہ اُن کا احاطہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، اور اسی لئے اس نے بیک وقت لیبیا اور کریمیا دونوں طرف اقدام شروع کیا

تاکہ پشت سے حملہ ہونے کا امکان دور ہو جائے

افسوس ہے کہ لیبیا میں برطانیہ کو اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ طبروق بھی ہاتھ سے نکل گیا اور مطروح بھی خالی کیا جا رہا ہے اس کے بعد اب اسکندریہ ہی رہ جاتا ہے جو مصر و لیبیا کی جنگ میں ایک "کلید" کی حیثیت رکھتا ہے

طبروق کا ہاتھ سے نکل جانا سنگاپور اور برما کے سقوط سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی طبروق ہے جس نے اس سے قبل ۲۵۰ دن تک دشمن کا مقابلہ کر کے اور داخل ہونے سے اُسے روک رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ ناکام واپس گیا، یا اب وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لا سکا درانحالیکہ بہترین برطانوی فوجیں وہاں موجود تھیں، چنانچہ اس واقعہ کا اثر برطانوی پبلک پر اس حد تک ہوا کہ اب مسٹر چرچل سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کا جواب دیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں مسٹر چرچل کو پھر ارکان وزارت میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا پڑے

کسی خطرہ یا مصیبت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم ہر بات کو تفاؤلانہ (Optimistic) انداز سے دیکھیں، بلکہ تاریک سے تاریک پہلو کو سامنے رکھ کر ہمیں تدابیر اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے اگر ہم یہ کہدیں کہ طبروق کا سقوط بہت معمولی بات ہے اور اس کا کوئی اثر جنگ پر نہیں پڑتا، یا یہ کہ کریمیا میں جرمنی کی کامیابیاں بالکل بے نتیجہ ہیں تو یہ نہایت غلط قسم کا مداوا ہوگا، لیکن باوجود ان تلخ حقیقتوں کے بھی اتحادی کامیابی کے امکانات بہت قوی ہیں

جنگ کی موجودہ حالات اس میں شک نہیں کہ جرمنی کی موافقت میں ہیں اور اس سے انکار حقیقت کا انکار ہوگا، لیکن جیسا کہ میں نے عنوان میں ظاہر کیا ہے یہ جنگ اپنی تیسری منزل سے گزر رہی ہے، اور یہی منزل اتحادیوں کی کامیابی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے

میں نے تیسری منزل کی تعیین اتحادیوں کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ جرمنی کے زاویۂ نگاہ سے کی ہے، کیونکہ جرمنی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اس کے لئے خستگی کی منزل ہے اور اتحادی اس حیثیت سے پہلی ہی منزل میں ہیں، یعنی وہ ابھی تک اپنے حوصلہ و اندازہ کے مطابق پوری طیاری بھی نہیں کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جب اتحادیوں نے باوجود پوری طرح طیار نہ ہونے کے دو سال تک جرمنی کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، اور اسے تھکا کر اس حد تک پہونچا دیا کہ اگر وہ جلد کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی شکست یقینی ہے، تو اب جبکہ ان کی طیاریاں اپنے شباب تک پہونچنے والی ہیں، جرمنی کو اپنی کامیابی کی کیا توقع ہو سکتی ہے

لڑائی کی درمیانی منزلوں میں کسی مقام کا ہاتھ سے نکل جانا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اس پر قابض رہنے کی حالت میں لڑائی کے پھیلاؤ کو سنبھالے رکھنا، اور اس باب میں اب نازی حکومت کا ضعف ہر جگہ رونما ہو رہا ہے۔ اول تو ابھی کریمیا ہی کا معرکہ اسے سر کرنا ہے، اس کے بعد اسکندریہ، حیفہ، شام و عراق کے ہفت خوان طے کرنا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ یہ سب آسانی سے اور جلد طے کر سکے گا

اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے اب اپنا سب کچھ سامنے رکھ کر یہ قدم بڑھایا ہے اور اسی قدم پر اس کی تمام امیدوں کا انحصار ہے لیکن اسی کے ساتھ جب ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں تو ہم صرف ایک ہی نتیجہ پر پہونچتے ہیں اور وہ یہ کہ وقت کی دوڑ میں ہٹلر کی ناکامی بالکل یقینی ہے اور لڑائی پر جتنے دن گزرتے جا رہے ہیں اتنا ہی زیادہ نازی آفتاب ڈھلتا جا رہا ہے۔ کیونکہ منزل مقصود کا کوسوں پتہ نہیں اور تھک کر بیٹھ جانے میں اب کچھ دنوں کی دیر ہے

اس لئے سوال اس وقت نہ کریمیا و لیبیا کا ہے، نہ عراق و باکو کا، بلکہ صرف ڈٹے رہنے کا ہے اور اس باب میں اتحادیوں کی پوزیشن جتنی صاف و واضح ہے، اس سے شاید دشمن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

ضروری اطلاع

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری درج نہ کیا تو نہ ہم آپ کو دوبارہ پرچہ بھیج سکتے ہیں، نہ آپ کا پتہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ نمبر خریداری ہر مہینہ پتہ کی چٹ پر بائیں طرف انگریزی ہندسوں میں درج رہتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجئے۔

منیجر نگار

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں مسلمان قومیں زیادہ تر ایران اور افغانستان کے راستے سے آئی ہیں اور مسلمانانِ ہند کی تہذیب و معاشرت کی بنیاد بیشتر حصہ ایران ہی کی تہذیب پر قایم ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں دفتروں کی زبان بھی ایران کی زبان رہی اور جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے ۱۹۴۸ء تک سیاسی معاہدات اور تحریرات کے لئے فارسی زبان ہی مخصوص تھی۔ اس کے بعد بھی اکثر تعلیم یافتہ لوگ اُردو کی جگہ فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے اور اب بھی اُردو لکھنے پڑھنے والوں کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ وہ فارسی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں، ان حالات میں اگر ایران اور ایران کی زبان فارسی کے متعلق مختصر طور پر ایک عام اور صاف مفہوم پیش کرنے کی جرأت کی جائے تو ایسی کوشش غالباً غیر موزوں خیال نہ کی جائے گی۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ایران کس خطۂ ملک کو کہتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے کس ابتدائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے منسلکہ نقشہ[1] ملاحظہ طلب ہے۔ اگرچہ یہ نقشہ باقاعدہ طریق پر مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس نقشہ میں ذیل کی حدود نشان کرنے کے قابل ہیں:۔

۱۔ نقشے کے مشرق میں (سیدھے ہاتھ کی طرف) سب سے اوپر بدخشان۔ اُس کے نیچے کابل اور اُس کے نیچے بلوچستان۔

۲۔ شمال میں (اوپر کی طرف) (۱) سُغدیانہ۔ (۲) دریائے جیحون اور بحیرۂ کاسپین کے درمیانی علاقے بلخ۔ مشہد۔ خوارزم۔ استرآباد۔ (۳) بحیرۂ کاسپین کے مغرب میں آرس کا جنوبی علاقہ معہ آذربائجان۔

۳۔ جنوب میں (نیچے کی طرف) مکران۔ لارستان۔ اور پارس۔

۴۔ مغرب میں (اُلٹے ہاتھ کی طرف)۔ (۱) اصفہان اور کاشان سے لیکر آرمینیا کے کوہستان تک (۲) کُردستان۔ (۳) خوزستان۔

قدیم زمانہ میں وہ خطہ جو حدودِ مذکورہ پر مشتمل اور اُن میں داخل ہے ایران کہلاتا تھا۔ پارسی روایاتِ قدیمہ کے مطابق جیسا کہ شاہنامۂ فردوسی وغیرہ میں درج ہے لفظ ایران فریدوں کے بیٹے ایرج نامی سے منسوب ہے لیکن یہ لفظ کتاب اوستان میں ایریانہ لکھا ہوا پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ قوم ایریا کی سرزمین تھی۔ یہی لفظ سنسکرت میں آریہ لکھا گیا ہے اور دونوں زبانوں میں قریب قریب ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب اہلِ یونان کا سابقہ ایرانیوں سے پڑا تو اُنھوں نے اس ملک کا نام "پرسیس" قرار دیا اور اُن کے بعد اہلِ عرب نے بھی اُس کو فارس کے نام سے موسوم کیا۔ نقشے کے دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ ایران کے جنوب میں خلیج فارس سے ملحق ایک علاقہ ہے جس کا نام قدیم زمانہ میں پارسا تھا اور بعد میں پارس کہلانے لگا۔ یہ علاقہ یا صوبہ اپنے اُسی نام کے ایک قدیم شہر سے منسوب تھا جس کو یونانیوں نے اپنی زبان میں پرسیس کے نام سے بدل دیا۔ چونکہ اہلِ یونان اور اہلِ عرب کے حملوں کے وقت اسی علاقے کے بادشاہوں کی سارے ایران پر حکومت تھی اس لئے ان دونوں قوموں نے سارے ایران کو پارس کہکر پکارا۔ ورنہ پارس ایران کے اُس جنوبی حصّہ کا نام ہے جس کا ذکر شیخ سعدی نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے:۔

یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس
چنداں کہ خاک را بود و باد را بقا

اسی نہج پر لفظ 'پارسی' کے معنوں کی کیفیت سمجھنی چاہئے۔ ایک معنی میں 'پارسی' ایران کی زبان کو کہتے ہیں اور دوسرے معنی میں ایران کے باشندہ کو 'پارسی' کہا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت سلمان فارسی۔ لیکن آجکل اہلِ ایران اپنے آپ کو ایرانی کہتے ہیں اور پارسی قوم سے صرف وہ ایرانی

---

[1] نقشہ [illegible] کے آخر میں [illegible] (نگار)

ادمیں جو مذہب زردشتی رکھتے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کا یہ مفہوم ہندوستان کی ایجاد ہے مگر یہ معنی ایران میں بھی ئج ہو گئے ہیں۔

اس تعیین کے بعد کہ قدیم زمانہ میں ایران کی حدود میں بدخشاں۔ سغدیانہ۔ کابل۔ بلوچستان۔ بلخ۔ خراساں۔ مازندران۔ گیلان۔ آذربائجان ۔دستان۔ خوزستان۔ عراق عجم۔ فارس۔ کرمان۔ مکران۔ لارستان۔ داخل اور شامل تھے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ بہ اعتبار تاریخی معلومات کے قدیم ۔ایران کس قوم سے تھے اور موجودہ ایرانی کس نسل سے ہیں۔

فردوسی کا شاہنامہ حقیقی معنی میں ایران کی قدیم روایات کا دفتر ہے اور ہو بہو ساسانیوں کے زمانہ کی سینہ بہ سینہ منتقل شدہ حکایات اور پہلوی کتابوں کی ایات کا مجموعہ ہے۔ روایات و حکایات صرف اس قدر ظاہر کرتی ہیں کہ ایران کے ابتدائی تمدن و تہذیب و حکومت کی نسبت ایسے خاندان سے تھی جس کو بدادی خاندان کہتے ہیں۔ اُس کے بعد کیانیوں کی حکومت ہوئی جو سکندر کے حملہ تک قائم رہی۔ سکندر کے بعد طوائف الملوکی کا دور رہا جسکو ساسانی ۔ومت نے ختم کیا۔ مسلمان مورخوں نے اور اُن کے ساتھ پارسی علماء نے اپنا رسوخ پیدا کرنے کی غرض سے قریب قریب اسی سلسلہ کو قائم رکھا۔ اور یہودی ۔ایات کی بنا پر پیشدادی بادشاہوں کا سلسلہ آدم و نوح سے منسوب کر کے روایاتِ ایرانی میں عجیب و غریب اضافہ کر دیا اور ایرانی قوم کو سامی اقوام ۔مخلوط کر دیا۔

زمانۂ حال کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ جس قوم کو اب آریہ کہا جاتا ہے اُس کے متفرق فرقے کسی قدیم زمانے میں ایران میں وارد ہوئے ۔ر اُنہیں فرقوں کی نسل اُس زمانہ سے ابتک ایران میں آباد ہوتی چلی آئی ہے۔ البتہ اہل عرب کے تسلط کے بعد سے اُن میں عرب۔ مغل۔ ترک اور افغان ۔موں کی کم و بیش آمیزش ہوتی رہی ہے۔ آریہ فرقے کس وقت اور کس ترتیب کے ساتھ ایران میں داخل ہوئے اِس کی بابت کوئی معلومات صحت کے ساتھ ۔ہم نہیں ہو سکی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ اقوام آریہ سے کیا مُراد ہے یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ اہلِ تحقیق نے دنیا کی آبادی کو مختلف النسل قرار دیکر متعدد شاخوں ۔تقسیم کیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے گو سب انسان نفسِ واحد ہی سے پیدا ہوئے ہوں مگر محققین ابھی تک اُس نقطۂ ابتدائی یا مرکز پر نہیں پہونچے ہیں جہاں ۔ یہ شاخیں پھوٹی ہوں۔ اختلافِ نسل کا انحصار بہت کچھ اقوام کے ابتدائی مسکن پر ہے۔ قیاس یہ کیا گیا ہے کہ جس سمندر کو اب بحیرۂ کاسپین کہتے ہیں ۔سی زمانۂ بعید میں بہت وسیع تھا اور خراسان سے لیکر قسطنطنیہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس سمندر کے اوپر کا حصہ وہ علاقہ تھا جس کو وسط ایشیا اور ۔وس کا فرنگی علاقہ کہتے ہیں۔ اُس کے نیچے وہ علاقے تھے جن کو اسوقت ایشیائے کوچک۔ شام۔ عراق عجم اور ایران وغیرہ کہتے ہیں۔ جو فرقے وسط ایشیا اور ۔وس کے علاقے میں پرورش پا رہے تھے اُن کو آریہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرقے کسی وقت خانہ بدوشی کے عالم میں اوقات بسر کرتے تھے اور جب اور جس طرف اُن کو ۔وقعہ ملتا تھا گھس جاتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے یوروپ کی طرف چلے گئے۔ اور اکثر ایران و ہند میں داخل ہو گئے۔ جس وقت تک یہ سب فرقے وسط ایشیا ۔ر علاقۂ روس میں جا گزیں تھے۔ اُن کا ایک ہی قوم سے متعلق ہونا مانا جاتا ہے اور بحیثیتِ مجموعی اُن کا نام ہند یوروپ کی قوم آریہ رکھا گیا ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ اس آریہ قوم کے جو فرقے نیچے کی طرف چلے وہ سب سے پہلے افغانستان میں داخل ہوئے۔ اور یہاں سے ایک طرف ۔نجاب میں چلے گئے اور دوسری سمت ایران کے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ آریہ اولاً پنجاب میں آئے اور وہاں سے ایرانیوں کا افتراق ہوا ۔ل رائے یہ بھی ظاہر کی گئی ہے کہ آریوں کے متفرق فرقے مختلف سمتوں سے ایران میں داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً افغانستان کی راہ سے اور خراسان کی جانب ۔ے اور بحیرۂ کاسپین کی شمال و مغربی سمت سے ۔ یہی رائے قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ امر حقیقت کے طور پر مان لیا گیا ہے کہ موجودہ ایرانیوں ۔ آباؤ اجداد اور ہندوستان کے آریوں کے مورث کسی وقت ایک ہی مقام پر رہتے تھے اور ایک بولی بولتے تھے۔ یہ بات بھی قرینِ قیاس خیال کی گئی ہے ۔ہندوستان کے آریہ ایران اور افغانستان کے راستہ ہی سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں۔ ان خیالات کی تائید میں یہ اُمور بیان کئے گئے ہیں ۔رگ وید میں ایسے مقامات کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق افغانستان سے ہے اور یہ کہ سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کثرت کے ساتھ ایک دوسرے ۔سے ملتے جلتے ہیں۔ قیاس مذکور کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ایران میں جن ابتدائی آریہ فرقوں کا پتہ چلا ہے وہ عناصر پرست اور آفتاب و

ماہتاب پرست پائے جاتے ہیں اور یہی کیفیت اُن آریہ فرقوں کی ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے اور جن سے رگ وید کے ابتدائی حصوں کی تصنیف متعلق ہے ۔ ہندوستانی آریوں میں بت پرستی وغیرہ بعد کا اضافہ ہے ۔

ہندوستان میں آریوں کے ورود کا تعین مختلف طور پر کیا گیا ہے ۔ افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی رائے یہ قرار پائی ہے کہ اقوام آریہ ہندوستان میں سنہ عیسوی سے یقیناً ایک ہزار برس سے ڈیڑھ دو ہزار برس قبل تک پہونچی ہیں ۔ اسی نہج پر قیاس کر لینا چاہئے کہ ایران میں بھی اُسی زمانہ میں یا اُسکے آس پاس کے زمانہ میں اقوام آریہ داخل ہونا شروع ہوئی ہوں گی ۔

ایران میں آریوں کے وارد ہونے سے پہلے جو قومیں آباد تھیں اُن میں سے بعض کا پتہ چلا ہے جس سے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایران میں ایسی قومیں بستی تھیں جو ترکی النسل تھیں یا اُس نوع کی حبشی نسل والی تھیں جس میں ہندوستان کی قدیم ڈراوڑی قوم داخل سمجھی جاتی ہے ۔ ایران میں ... ایک مشہور مقام ہے ۔ آریوں سے پہلے اس علاقہ میں ایک قوم منّدا کا وجود تحقیق سے ثابت ہوا ہے ۔ اس قوم کا ترکی النسل ہونا ثابت ہو چکا ہے ۔ جب آریوں کا وہ فرقہ کوہستان قاف یا خراسان کو پار کر کے ایران کے علاقۂ آذربائجان میں داخل ہوا جس کو اہلِ یونان نے قوم میڈ کہا ہے اور فارسی لٹریچر میں ماد، ماداً، آبادی بیان کیا گیا ہے تو اُس کا تصادم عرصہ تک قوم منّدا سے ہوتا رہا جو رضائیہ کے علاقہ میں آباد تھی ۔ اسی طرح وہ قوم جس کا نام سُمیر ہے اور جس نے عراق میں دریائے فرات کے کنارے عیسوی سنہ سے کئی ہزار برس پہلے شہری حکومتیں قایم کیں ترکی النسل مانی گئی ہے ۔ اس طور پر یہ مان لینے میں ہرج نہیں ہے کہ ایران میں سب سے پہلے ترکی النسل قومیں یا ڈراوڑی قسم کی قومیں آباد تھیں ۔ ڈراوڑی قسم کے فرقے اُس علاقہ میں پائے جاتے ہیں جس کو اب خوزستان کہتے ہیں اور جو قدیم زمانہ میں ایلام کہلاتا تھا ۔ اسی حلقہ میں علاقۂ پارس شامل تھا ۔

دریائے فرات کی حکومتوں کا گہرا تعلق ایرانی علاقہ جات سے پایا جاتا ہے ۔ ابتدائی سُمیری قوم کے بعد فرات کے علاقوں پر سامی نسل کے لوگ مسلط ہو گئے تھے اور اس نسل کی حکومتوں اور سلطنتوں (انھیں میں بابل کی شہنشاہی بھی شامل ہے) سے اور ایرانی علاقوں سے ہمیشہ جنگ رہی ہے ۔ دریائے فرات کے ایک قدیم شہر شُرفورل کے بادشاہ اِین ۔ تی ۔ نا کا ایک سنگین کتبہ برآمد ہوا ہے جس میں ذکر ہے کہ بادشاہ مذکور کے باپ ای ۔ اناّ ۔ توم نے ایلام کو فتح کیا ۔ ای ۔ اناّ ۔ توم کا زمانہ سنہ ۳۲۰۰ ق ۔ م ۔ کا قرار دیا گیا ہے ۔ شُرفورل کے بعد دریائے فرات پر دوسری بادشاہی موسوم بہ کِش قایم ہوئی اور اس شہر کِش کے آثار سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے ایک بادشاہ نے تقریباً تین ہزار آٹھ سو پچاس سال قبل مسیح میں ایلام کو مع علاقۂ پارسی کے فتح کیا اور وہاں سے سنگ مرمر کے پیالے لوٹ کر لایا ۔ سنہ ۲۳۶۰ ق ۔ م میں اہلِ ایلام بابل پر قابض نظر آتے ہیں لیکن یہ قبضہ بہت عارضی تھا اور دو ہزار تین سو چالیس سال قبل مسیح حموربی (معاصر ابراہیم علیہ السلام) نے ایلام والوں کو بابل سے نکال دیا ۔ تاہم سنہ ۱۸۰۰ ق ۔ م میں خوزستان کی ایک کوہستانی قوم قستی خروج کر کے بابل پر قابض ہو گئی اور پانچ سو برس تک بابل میں حکومت کرتی رہی ۔ اس قوم کے شاہی خاندان نے اخیر میں سلطنتِ عسوری کے شاہی خاندان سے رشتہ داری اور میل جول پیدا کر لیا تھا اور سامی اقوام میں یہ لوگ مل جُل گئے تھے لیکن اس کے بعد سلطنتِ عسوری نے عروج کیا اور تقریباً سنہ ۱۳۰۰ ق ۔ م ۔ میں بابل اور ایلام کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔

کیفیتِ مندرجہ صدر سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا کچھ مغربی اور جنوبی علاقہ فرات کی سامی حکومتوں اور عسوری سلطنت سے اثر پذیر رہا ہے ۔ عسوری قوم بھی اُنھیں سامی اقوام کی ایک شاخ تھی جو فرات کے کنارے آباد تھیں ۔ لیکن اس شاخ نے بجائے فرات کے دجلہ کے کنارے اُس مقام کے متصل جہاں اب بغداد واقع ہے اپنی حکومت کی بنیاد قایم کی اور اُس حکومت کو شہنشاہی کے مرتبہ تک پہونچا دیا ۔ اس شہنشاہی کے زیر تسلط ایران کا وہ تمام علاقہ مدتوں تک رہا جس میں اصفہان ۔ کاشان ۔ طہران ۔ ہمدان اور تبریز شامل ہیں ۔ قدیم یونانی مورخ اس علاقہ کو میدیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی قوم مید کا مسکن ۔ غالباً یہ وہی قوم ہے جس کو ایک قدیم پارسی کتبہ میں مدا اور بعد میں ماہ آباد بیان کیا گیا ہے ۔ اقوام آریہ کا یہ پہلا فرقہ ہے جس کا مورخ ذکر کرتے ہیں ۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ کوہ قاف سے گزر کر ایران کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں میں داخل ہوا ۔ عسوری سلطنت کے کھنڈروں سے جو تاریخی مواد برآمد ہوا ہے اُس میں سے ایک شاہی سنگین کتبہ ہے جس کو سنہ ۱۱۰۰ ق ۔ م کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں آمادانہ (ہمدان) کا سلطنتِ عسوری کی ماتحتی میں ہونا بیان کیا گیا ہے ۔ بعد کے دو کتبوں سے بھی جن کا زمانہ سنہ ۸۳۶ ق ۔ م اور سنہ ۸۱۵ ق ۔ م ۔ علی الترتیب بیان کیا گیا ہے علاقۂ میدیا

کا سلطنت عسور کی ماتحتی میں ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ کتب یہود میں بھی ذکر ہے کہ شاہ عسور نے سامریا فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو میدیا کے علاقہ میں جلاوطنی کی سزا دی اور یہ واقعہ ۸۳۵ ق-م کا ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح یونانی مورخ ہرادتوس نے بیان کیا ہے کہ قوم مید صدیوں تک سلطنت عسور کی ماتحت رہی اور یہ کہ ۷۰۰ ق-م کے زمانہ میں اس قوم نے خود مختاری حاصل کی۔ حالات مذکورہ سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا شمال مغربی۔ مغربی اور جنوب مغربی حصہ کس قدر سامی اقوام کے زیر اثر رہا ہے۔ آگے چلکر یہ بھی ظاہر ہوگا کہ ایرانی اقوام کے خیالات اور زبانیں سامی تعلقات سے کس قدر متاثر ہوئے۔

ہرادتوس کے بیان کے مطابق قوم مید نے اپنی خود مختار حکومت قایم کرنے کے بعد ایران کے دیگر علاقہ جات پارس وغیرہ پر بھی قبضہ واقتدار حاصل کر لیا قدیم یونانیوں میں (Laws of the Medes) اور فارسی کتابوں میں آئین مہ آبادی کا حوالہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہے لیکن ان قوانین وآئین کے متعلق کوئی تاریخی مواد ہاتھ نہیں لگا ہے اور نہ اُن کے زمانہ کے کوئی کتبے یا مکتوبات برآمد ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے زمانہ کا کوئی سکہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے حالانکہ اس قوم کا دورِ حکومت تقریباً دو سو برس تک قایم رہا ہے۔ اس لئے تحقیق طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی زبان اور اُنکا مذہب کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اُن میں ایک فرقہ ایسا تھا جو اقوام ہند کے برہمنوں کے مانند پوجا پاٹ کرایا کرتا تھا اور جس کو مگوئی یا مغوش کہتے تھے اور جو بعد میں مجوس ہو گیا۔

ہرادتوس نے قوم مید کے چار بادشاہوں کا ذکر کیا ہے پہلے بادشاہ کا نام یونانی کتابوں میں دیوکس۔ یا دیوکسیس بیان کیا گیا ہے جس نے سلطنت عسور ہی سے آزادی حاصل کی۔ ۷۱۵ ق-م۔ کے ایک عسوری کتبہ میں دیاکو نام کے ایک بادشاہ کے گرفتار کئے جانے کا ذکر ہے اور دوسرے کتبہ میں بیتِ دیاکو کے فتح کئے جانے کا تذکرہ ہے جس کا زمانہ ۷۱۳ ق-م کا ہے۔ دیاکو کے بعد ۶۵۵ ق-م میں دوسرا بادشاہ فرارتس ہوا۔ قدیم فارسی میں اس نام کو فراورتیش لکھا گیا ہے۔ ۶۲۵ ق-م میں فرارتس کا جانشین سیاک زر (قدیم فارسی۔ ہُوخشتر) ہوا جس نے ۶۱۲ ق-م میں سلطنت عسور کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کیا۔ اور ۵۸۵ ق-م میں ملک شام کی قوم آریا سے میدان جنگ میں سورج گرہن واقع ہونے کے باعث صلح کر لی۔ سیاک زر کے بعد استاجس (قدیم فارسی۔ وشتاسپ) قوم مید کا اخیر بادشاہ ہوا۔ اور ۵۵۰ ق-م میں سلطنتِ مید کا خاتمہ ہو کر ایران کے بادشاہی علاقۂ پارس کے ایک خاندان میں منتقل ہو گئی۔

ایران کے شمالی حصۂ میدیا سے پاس کے جنوبی علاقہ کے جن لوگوں میں شاہی منتقل ہوئی وہ بھی قوم آریہ کا ایک فرقہ تھا۔ اس فرقہ کو عموماً فارسی قوم کہا جاتا ہے اور اسی نام سے اُس میں اور قوم مید میں تمیز کی جاتی ہے۔ جس خاندانِ پارس نے شاہی حاصل کی یونانی زبان میں وہ اکیمنس خاندان کے نام سے مشہور ہے لیکن قدیم فارسی زبان میں ہاکہامنش لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ اُردو میں اخمنی کہنے لگے ہیں۔ اس خاندان کے چند ابتدائی بادشاہوں کا مختصر شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ اکیمنیشس (قدیم فارسی۔ ہاکھامنش)
۲۔ ٹیس پس (چائش پش)

۳۔ کمبسس (کمبوجیہ)
۴۔ سائرس۔ (کُروس)
۵۔ کمبسس (کمبوجیہ)

۶۔ اریارمنس۔ (آریارامنا)
۷۔ آرسیمس۔ (ارشمہ)
۸۔ ہسٹاسپس (وشتاسپ)
۹۔ ڈرائس (دارایاوش)

عام طور پر یونانی مورخوں نے اس شجرہ کے چوتھے بادشاہ سائرس کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ تصور کیا ہے۔ اسی بادشاہ نے ۵۵۰ ق-م میں سلطنتِ مید کے اخیر بادشاہ استاجس کو شکست دیکر سارے ایران پر قبضہ کر لیا لیکن اس خاندان کے نویں بادشاہ دارایاوش نے اپنے ایک کتبہ میں اپنے آپ کو اپنے دو شاخہ خاندان کا نواں بادشاہ ہونا تحریر کیا ہے اور یہی بات ہرادتوس مورخ نے بھی بیان کی ہے۔

اس اخمنی، خاندان کے اخیر بادشاہ کا نام بھی دارا یا آوش (دامل) تھا جس پر سکندر یونانی نے فتح حاصل کر کے ایرآن کی بادشاہی اپنی طرف منتقل کر لی اور اخمنی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

سکندر کی وفات کے بعد اُس کے مقبوضات اُس کے سپہ سالاروں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ ایران کی حکومت سکندر کے سپہ سالار سلیوکس نامی کے حصہ میں آئی۔ سلیوکس نے بابل کو دارالحکومت قرار دیا لیکن اُس کے خاندان میں حکومت تھوڑے ہی عرصہ قایم رہی۔ تین چار پشت کے بعد ہی خراسان والوں نے سرتابی کر کے قومی حکومت ایران کے شمالی حصہ خراسان میں قایم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قائم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قایم کی اُن کو انگریزی میں ایک لفظ پارتھیا سے تعبیر کیا گیا ہے اور عربی و ایرانی تاریخ میں اشکانی و اشغانی کے نام سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حکومت کئی سو برس تک قایم رہی لیکن ایران کی قومی کتابوں اور شاہنامہ میں اس حکومت کا محض بالاجمال حوالہ دیا گیا ہے۔ کوئی تفصیلی واقعات درج نہیں کئے گئے ہیں۔

اشکانی حکومت کو اَرتخشتر (اردشیر بابکان) نے سنہ ۲۲۶ء میں اردوآن کو شکست دیکر ختم کیا اور اُس ساسانی سلطنت کا آغاز کیا جو یزدگرد ثالث پر ختم ہوئی اُس کے بعد سے عربوں کا تسلط ہوا اور رفتہ رفتہ تقریباً کل اہلِ ایران مسلمان ہو گئے۔ تھوڑے سے لوگ ایرآن چھوڑ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے اور انھیں کی نسل کو پارسی کہتے ہیں۔ ایک قلیل تعداد ایران میں بھی رہ گئی جو زیادہ تر علاقہ یزد میں اب تک آباد ہے۔

کیفیتِ متذکرہ صدر سے واضح ہوگا کہ ایرانیوں کی تاریخ اجمالی طور پر کئی دوروں پر مشتمل ہے۔

۱- پہلا دور وہ ہے جب ہندوستان اور ایران میں وارد ہونے والے فرقے ایک مقام پر رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے یہ مقام وسط ایشیا میں ہونا چاہئے اور اس دور کے زمانہ کو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی تین ہزار برس پہلے کا سمجھنا چاہئے۔

۲- دوسرا دور وہ ہے جب علاقہ میدیا سلطنتِ اسوری کی ماتحتی میں رہا۔ تقریباً سنہ ۱۲۰۰ ق.م سے سنہ ۸۰۰ ق.م تک۔

۳- تیسرا وہ دور ہے جس میں قوم میدی کی سلطنت کا قیام رہا یعنی سنہ ۸۰۰ ق.م سے سنہ ۵۵۰ ق.م تک۔

۴- چوتھا دور اخمنی سلطنت کا دور ہے۔ سنہ ۵۵۰ ق.م سے سنہ ۳۳۰ ق.م تک۔

۵- پانچواں دور سکندر کے بعد سے اشکانی حکومت کے خاتمہ تک ہے جس کی مدت سنہ ۳۳۰ ق.م سے شروع ہوتی ہے اور سنہ ۲۲۶ء میں ختم ہوتی ہے۔

۶- چھٹا دور ساسانی حکومت کا ہے۔ سنہ ۲۲۶ء سے سنہ ۶۵۱ء تک۔

پہلا دور پہلے دور کے احوال کی کوئی تفصیل معلوم نہیں لیکن اس قدر ضرور پتہ لگتا ہے کہ اُس زمانہ کی چند روایات ہندوستان اور ایران میں اس وقت تک بدلی ہوئی شکلوں میں مشترک طور پر زندہ ہیں۔ نیز جہاں تک ان ملکوں کی زبان کا تعلق ہے زمانۂ مذکور کی زبان کا کچھ اندازہ اُن کثیر التعداد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو سنسکرت اور فارسی میں مشترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رِگ وید کی زبان اور آوستا کے ابتدائی حصہ کی زبان میں جو فرق ہے وہ تلفظ یا املا کی خفیف تبدیلی سے دور ہو سکتا ہے۔

روایات کی ذیل میں ایران کی تاریخ کا وہ حصہ آتا ہے جس کو عربی اور ایرانی مصنفین اور ایرانی روایتیں پیشدادی خاندان سے منسوب کرتی ہیں۔ فردوسی کے شاہنامہ کو قدیم ایرانی روایتوں کا مکمل دفتر مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانی حکومت کے زمانہ میں روایات مذکورہ پہلوی زبان میں جمع کی گئی تھیں اور یہی مجموعہ سامانیوں کے زمانہ میں اول دقیقی شاعر کے سپرد ہوا جس نے لہراسپ اور گشتاسپ کا حال نظم کیا اور اُس کے بعد سلطان محمود کی سرپرستی میں فردوسی نے شاہنامہ کی تکمیل کی۔ پروفیسر براؤن کی رائے ہے کہ ایسی باتوں کے سوا جو خلافِ اسلام ہو سکتی ہوں فردوسی نے پورے طور پر پہلوی افسانوں کو نظم کیا اور جزئیات میں کامل مطابقت قایم رکھی ہے۔ اپنی رائے کے ثبوت میں پروفیسر موصوف نے پہلوی کتاب 'کارنامک ارتخشتر پاپکان' اور شاہنامہ کے اُس حصہ کا جس میں 'اردشیر بابکان' کا بیان ہے لفظ بہ لفظ مقابلہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کتابوں میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔

شاہنامہ کے مطابق پیشدادی خاندان کا دور کیومرث سے شروع ہوتا ہے اور جمشید پر ختم ہوتا ہے اور اُس کا تعلق سرزمین ایرآن سے قایم کیا گیا ہے بعض فرنگی مورخین مثلاً سر جان مالکم نے اس دور کو ایرآن سے تو متعلق سمجھا ہے لیکن شاہنامہ کے اس حصہ کو افسانہ سے زیادہ قرار نہیں دیا ہے اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اہلِ ایران حالتِ وحشت سے گزر کر تمدن کے راستہ پر آ رہے تھے۔ ضحاک کے زمانہ کی نسبت بھی اسی طور پر صاحب

موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عسوری سلطنت کے تسلط کا زمانہ تھا۔

محققین مابعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اس دور کے بادشاہ اور ضحاک کے بعد فریدوں و منوچہر وایرج وغیرہ کوئی تاریخی وجود نہیں رکھتے مگر یہ کہ اُن کے ناموں کا وجود ضرور اُس زمانہ سے متعلق ہے جبکہ ہندوستانی اور ایرانی شاخیں جُدا نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے کہ کیومرث کا نام کتاب اَوِستا میں گیومرتیا لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ کتاب مذکور کے جو اجزا اس وقت موجود ہیں اُن میں سے ایک حصے کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ۵۸۳ھ ق۔م اور ۱۰۰۰ ق۔م کے درمیان کی تصنیف ہے۔ مزید تفصیل اس کتاب کی آگے آئے گی۔ سردست یہاں اس قدر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کتاب میں گیومرتیا کو انسان اول مانا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اَوِستا لکھی گئی اُس وقت ایران میں ایسی روایات موجود تھیں جن کے مطابق گیومرتیا یا کیومرث بمنزلۂ آدم مانا جاتا تھا۔ بعد میں اس روایت نے وہ شکل اختیار کی جس میں کیومرث ایران کا پہلا بادشاہ بن گیا۔ اسی طرح جمشید کی کیفیت ہے۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ یہ نام خورشید کی طرح مرکب ہے الفاظ 'جم' اور 'شید' سے۔ اور 'شید' ماخوذ ہے زبان اَوِستا کے لفظ 'شیتا' سے جس کے معنی سردار۔ بادشاہ اور روشن کے ہیں پس اصل لفظ یا نام 'جم' باقی رہتا ہے۔ آوِستا میں اس نام کو 'یِم' اور سنسکرت میں یَم لکھا گیا ہے۔ ہندوستانی افسانوں میں 'یم' وہ پہلی بزرگ مگر فانی شخصیت ہے جو بحالت حیات عالم ارواح میں پہونچی اور آوِستا کے مطابق 'یِم'، 'ابن' وِوان مہ' ایک خوش رو نوجوان ہے جس نے اہورمزد کی پیغمبری قبول نہیں کی مگر بالآخر چار گوشہ ورن (غالباً کوہ البرز کے آس پاس کا علاقہ) کی تعمیر پر مامور ہوا شاہنامہ میں یہ ایک ایسے عظیم الشان بادشاہ کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جس نے اہل ایران کو چار طبقوں پر منقسم کیا۔ عمارات اور شہر تعمیر کئے۔ جشنِ نوروز قایم کیا اور ہوائی تخت پر بیٹھ کر فضا میں سیر کی۔ اور آخر کار ضحاک کے ہاتھوں اپنے تکبر کا شکار رہا۔ ضحاک کو شاہنامہ میں عربی النسل بادشاہ ظاہر کیا گیا ہے جس کے کاندھوں پر شیطان کی اغوا سے دو سانپ نمودار ہو گئے تھے اور جن سے نے گوشت خوری کا آغاز کرکے اپنے ظلم و تعدی سے اہلِ ایران کو پریشان کر دیا تھا۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ اہل مشرق ضحاک کو عربی لفظ سمجھ کر اُس کے معنی مسخرے یا ہنسنے والے کے لیتے ہیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ صاحب موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ فردوسی نے ضحاک نام کا ظالم اور عربی النسل بادشاہ بنا کر اُن ایرانی جذبات کا اظہار کیا ہے جن سے ایرانیوں کے دل اہلِ عرب کے خلاف بھرے پڑے تھے۔ جیسا کہ فردوسی کے مندرجۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے :۔

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسیدست کار

کہ تختِ کیاں را کنند آرزو تفو بر تو ای چرخِ گرداں تفو

صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ کتاب آوِستا میں قدیم روایتوں کی بنا پر ایک ایسے سانپ کا ذکر ہے جس کے سر پر دو سانپ اور نکلے ہوئے تھے۔ اُس کا نام اژی دہاک تھا جو مائی تھالوجی کے سلسلہ میں ضحاک ہو گیا اور معمولی زبان میں اژدہا رہ گیا۔ دیگر آریہ شاخوں میں تین تین سر والے اژدروں کے قصے پائے جاتے ہیں چنانچہ یہی لفظ سنسکرت میں آہی دہک کی شکل میں موجود ہے۔ 'اہی' بمعنی افعی اور 'دہک' کاٹنے والا۔ فریدوں بھی جم و ضحاک کی طرح ہند و ایران کی مشترک فرضی شخصیت مانی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک پیشدادی خاندان اور اُس کے بادشاہ حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ نہ صرف یہ بلکہ کیانی خاندان اور کیانی بادشاہوں کا بھی کوئی تاریخی وجود تسلیم نہیں کیا جاتا اور شاہنامہ میں کیقباد سے لیکر گشتاسپ و اسفندیار تک جسقدر احوال بیان کیا گیا ہے اُس کو افسانۂ دیرینہ سے زیادہ وقعت نہیں دیجاتی۔ رستم اور اُس کے خاندان کو شاہنامہ میں کیانی بادشاہوں کے خاندان کے احوال سے وابستہ رکھا ہے لیکن اَوِستا میں رستم یا خاندانِ رستم کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا گیا ہے کہ آوِستا کی تصنیف کے زمانوں میں اور اُس علاقہ میں جہاں آوِستا کی تصنیف ہوئی یا جاری رہی رستم پہلوان کے خاندان کے متعلق کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ان روایتوں کی پیدایش کسی مابعد زمانہ سے اور علاقۂ پارس و سیستان سے متعلق سمجھی جاتی ہے یعنی یہ کہ رستم کی داستان اُس مائی تھالوجی کی ذیل میں نہیں آتی جو ہند و ایران میں ورود سے پہلے آریہ اقوام کی مشترک سرمایہ تھی۔ رستم کے متعلق مقامی روایات کے وجود کو قیاساً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن زال و رستم کا کُل افسانہ خود فردوسی کے بیان کے مطابق فردوسی کی شاعری کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔

منش کردہ ام رستمِ پہلواں وگرنہ یلے بود در سیستاں

بعض صاحبان نے کیانی خاندان کے بادشاہوں کی اُن بادشاہوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن کے تاریخی حالات یونانی اور دیگر مورخین کے ذریعہ سے معلوم ہوسکے ہیں۔ مثلاً قوم مید کے متعلق اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ایران کی پہلی آریہ قوم ہے جس کے بادشاہوں کا تاریخی حال معلوم ہوا ہے۔ نقشہ و بیان مندرجہ ذیل سے ظاہر ہوگا کہ قوم مید کے بادشاہوں اور کیانی بادشاہوں کے ناموں میں کس طور پر تطبیق کی گئی ہے :-

نمبر شمار	شاہنامہ کے مطابق	مورخ ہرادتوس کے مطابق	مورخ ٹےسیس کے مطابق	مورخ موسی کے مطابق	کتب یہود کے مطابق	مدتِ حکومت
۱	فریدون	آربسیس	آربسیس	وربسیس	اسیوریس	۱۸ برس
۲	منوچہر		من داسیس	من داسیس		۱۵ برس
۳	نوذر		سوزرس	سوزرس		۷ سال مطابق فردوسی
۴	زو	بدنظمی کا زمانہ	اریتا	ارتوکس		۵ برس مطابق فردوسی
۵	گرشاسپ		اربیانس	کارڈسیس		۹ برس مطابق فردوسی
۶	کیقباد (ارشں)	دیوسیس (دیاکو)	ارسیس	دیوسیس	ارفخشد	۴۰ سال مطابق ٹےسیس
۷	افراسیاب	فراارتس	ارٹائنس	ارٹونس		۳۲ سال مطابق ہرادتوس
۸	کیکاؤس	سیاک زرس	ارتی برس	کیک زرس		۴۰ سال ایضاً
۹		استاجس	اسپدان	استاجس	ڈرائس قوم مید	۳۵ سال

جو صاحبان شاہنامہ کے ناموں کی یونانی مورخوں کے نوشتہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ ضحاک عسوری سلطنت کے اُس بادشاہ کا نام تھا جس نے میدیا کو فتح کیا تھا اور یہ کہ ضحاک کی مدتِ حکمرانی سے وہ سارا زمانہ مراد ہے جو عسوری سلطنت کی ماتحتی میں اہل میدیا کا گزرا۔ عسوری سلطنت سے تقریباً ۸۰۰ ق ۔م کے آس پاس آزادی حاصل کی گئی اور اُسی زمانہ میں بادشاہ اربسیس تھا۔ اس لئے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ اربسیس ہی وہ بادشاہ ہے جس کو شاہنامہ میں افریدون بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تائید میں درفش کاویانی کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ کاوہ نے جب ضحاک سے بغاوت کی تھی تو ایک چمڑے کا جھنڈا بھی طیار کیا تھا جس کو بعد کے ایرانی بادشاہوں نے زر و جواہر سے مرصع کیا۔ اس جھنڈے کے نام سے اور اس امر سے کہ یہ جھنڈا اہلِ عرب کی فتح کے وقت موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہنامہ کا وہ بیان جو فریدوں کی ضحاک پر کامیابی سے متعلق ہے قرینِ صحت ہے۔

فریدوں کے بعد دوسرا بادشاہ جس کی مطابقت کی جاتی ہے کیقباد ہے۔ مطابقت کی دلیل یہ ہے کہ شاہنامہ کے بیان کے مطابق زو اور گرشاسپ کا زمانہ وہ تھا جبکہ افراسیاب نے ایران کو اپنا ماتحت بنالیا تھا اور ایران کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ ہرادتوس نے بھی اُس زمانہ کے حالات کو بدنظمی کا زمانہ تحریر کیا ہے۔ اس بدنظمی کے عالم میں رستم وزال نے بقول مصنفِ شاہنامہ بزرگانِ ایران سے مشورہ کرکے کیقباد کو علاقۂ البرز سے تلاش کرکے بادشاہ بنایا۔ ہرادتوس کا بھی یہی بیان ہے کہ بدنظمی کی وجہ سے اہلِ میدیا نے دیوسیس کا انتخاب کیا۔ دوسری مطابقت یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ یونانی اور ایرانی کتابوں میں اس بادشاہ کا دوسرا نام ارشں یا ارس لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سیاک زرز (ہُوَخشتر) کو کیکاؤس قرار دیا جاتا ہے۔ شاہنامہ میں کیکاؤس، ہاماوران پر حملہ کرکے اُس کو فتح کرلیتا ہے۔ ہاماوران کو سامی ممالک کا کوئی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ سیاک زرنے اہلِ بابل سے ملکر عسوری سلطنت کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کرکے سلطنت مذکور کا خاتمہ کردیا اور عسوری شہزادی سے شادی بھی کرلی۔ شاہنامہ میں بھی ہاماوران کی شہزادی سے کیکاؤس کا عقد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

یونانیوں کے نزدیک قوم مید کا اخیر بادشاہ استاجس ہوا۔ اس بادشاہ کو علاقۂ پارس کے بادشاہ سائرس (کروش یا کرویا کورس) نے زیر کرکے سارے ایران پر قبضہ کرلیا اور ہخمنی سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ مطابقت کرنے والے اصحاب اس بادشاہ یعنی کروش کو کیخسرو ظاہر کرتے ہیں اور وجہ مطابقت

یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح شاہنامہ میں کیخسرو کا کیکاؤس کا پوتا اور افراسیاب کا نواسہ ہونا اور اُس کا توران میں افراسیاب کے سپہ سالار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانا مذکور ہے اُسی طرح یونانی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ کروشس نواسہ تھا استاجس کا ۔ استاجس نے ایک موحش خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے نواسہ سے خائف رہتا تھا اور بالآخر اُس نے اپنے نواسہ کو بغرض ہلاکت اپنے سپہ سالار کے سپرد کر دیا تھا لیکن سپہ سالار مذکور نے بچّہ کو ہلاک کرنے کے بجائے اُس کی خفیہ پرورش کی اور جب کروشس جوان ہو کر استاجس سے لڑا تو وہ سپہ سالار کروشس سے مل گیا ۔ مطابقت کرنے والے اس سپہ سالار کو وہی پیران ویسہ قرار دیتے ہیں جو افراسیاب کا جنرل تھا اور جس نے کیخسرو کی پرورش کی تھی، اسی طرح کیخسرو اور کروشس کے اُن حالات میں بھی کچھ یکسانیت ہے جو اُن کی موت سے متعلق ہیں ۔ اس تطبیق سے ایک مشابہت اور پیدا ہوتی ہے ۔ وہ یہ کہ افراسیاب جس کو شاہنامہ میں ترکوں کا بادشاہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور جس کا ایران کو گاہے بگاہے فتح کر لینا بھی مذکور ہے وہی استاجس اور قوم میڈ کے دوسرے بادشاہ ہیں جن کی حکومت علاقۂ پارس میں رہی ۔

بایں ہمہ محققینِ حال شاہنامہ کے پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے ۔ پیشدادی خاندان کے قصوں کو تو اُس زمانہ کی روایات سے منسوب کرتے ہیں جو ہند و ایران سے باسہر اقوام آریہ کا بسر ہوا ۔ اور کیانی بادشاہوں کے تذکرہ کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں اور صرف اس قدر ممکن خیال کرتے ہیں کہ شاہنامہ میں جن ایرانی و تورانی لڑائیوں کا ذکر ہے اُن سے وہ جنگیں مراد ہیں جو قوم میڈ کے ایران میں وارد ہونے کے زمانہ میں آذربائجان اور رے کے علاقوں میں قوم میڈ اور علاقجات مذکور کے ترکی النسل فرقوں کے درمیان ہوئیں ۔ یا وہ خونریزیاں مراد ہیں جو قوم میڈ کے بادشاہوں اور پارس کے ہخمنی بادشاہوں سے ہوئیں ۔ یا وہ لڑائیاں ہیں جو زردشت کے زمانہ میں بلخ (باختر) کے بادشاہوں اور دریائے جیحون کے اُس پار رہنے والی ترکی اقوام سے باہم ہوئیں ۔ اسی طرح محققین اس امر کے قیاس کرنے کی اجازت دیتے ہیں کہ ضحاک کی حکومت سے عسوری سلطنت کی حکومت مراد لی جا سکتی ہے ۔ زیادہ کچھ نہیں ۔

خلاصہ کے طور پر دور اول کی یادگار میں صرف وہ الفاظ سمجھے جاتے ہیں جو فارسی و سنسکرت میں مشترک ہیں اور وہ روایات ہیں جو بدلی ہوئی شکلوں میں مثل کیومرث ۔ جمشید ۔ ضحاک و فریدوں وغیرہم کی داستانوں کے ہند و ایران میں اب تک رائج و شایع ہیں یا ایسی مذہبی رسوم ہیں جیسی زنار بندی یا آتش پرستی وغیرہ ۔

دوسرا دور باعتبار تاریخی معلومات کے دوسرا دور ایرانی حالات کا وہ قرار دیا گیا ہے جس میں میڈیا اور علاقۂ پارس بابلی اور عسوری سلطنتوں کی ماتحتی میں رہے ۔ اس زمانہ کے تفصیلی حالات کے متعلق کوئی معلومات نہیں بجز اُن واقعات کے جو عسوری کتبوں سے ظاہر ہوتے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے ۔ البتہ یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ جہاں تک زبان اور شاہانہ مراسم کا تعلق ہے عسوری زبان اور عسوری سلطنت نے ایران کی زبان اور شاہی رسم و رواج پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا ۔ قدیم فارسی حروف تہجی عسوری رسم الخط سے اخذ کئے گئے اور سامی زبانوں کے بہت سے الفاظ قدیم فارسی زبان میں اس طور سے داخل ہو گئے کہ لکھنے میں تو الفاظ وہی لکھے جاتے تھے جیسا سامی زبانوں میں اُن کا تلفظ ہوتا تھا لیکن پڑھا جاتا تھا اُن کو ایرانی زبان میں ۔ مثلاً الفاظ تو "ملکان ملک" لکھے جاتے تھے مگر یہی الفاظ شہنشاہ پڑھے جاتے تھے ۔ گویا سامی الفاظ کا جو مفہوم ہوتا تھا، اُس کو ایرانی زبان میں ترجمہ کر کے پڑھا جاتا تھا ۔ شاہانہ رسم و رواج کا یہ اثر ہوا کہ جس طرح عسوری بادشاہ اپنے آپ کو شاہِ شاہان وغیرہ سمجھتے تھے اور خدائی صفات و القاب سے خود کو متصف کرتے تھے اُسی کی نقل ایرانی بادشاہوں نے بھی اُتاری ۔

(باقی)

سید حکیم احمد نقوی

یورپ میں اشتراکیت کی جدوجہد

یورپ میں اشتراکیت کی عملی تاریخ کا سلسلہ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے مگر اس سے پہلے فرانس میں سینٹ سیمون و فوریہ اور انگلستان میں روبرٹ اوون وغیرہ نے اشتراکی خیالات کی تبلیغ اور اقتصادی تحریک کی تنظیم شروع کر دی تھی چنانچہ انگلستان کی لبرل پارٹی کی ابتدا روبرٹ اوون کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس نے ایک "جماعتی بیان" شایع کیا اسوقت سے اشتراکیت ایک مکمل اصول اور لائحۂ عمل کے ساتھ دنیا کے سامنے آگئی چنانچہ ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد یورپ میں جو کشمکش ہوئی اس کی بنیاد یہی اشتراکیت تھی، جرمنی اور فرانس میں اشتراکیوں نے اس کی کوشش کی کہ لیڈری کی باگ ڈور متوسط طبقہ کے ہاتھوں چھین جائے مگر چونکہ اسوقت انگلستان کے علاوہ یورپ کے کسی ملک میں صنعت و حرفت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ مزدوروں کی طاقت ایک منظم اشتراکی تحریک کو چلانے کے لئے کافی ہوتی اس لئے یہ جدوجہد ناکام رہی اور اشتراکی حریت پسندوں کو ہر جگہ ناموافق حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

پچھلی نصف صدی میں اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کی ترقی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد اشتراکی لیڈروں نے پھر اس تحریک کو زور و شور کے ساتھ شروع کیا اور لندن کا شہر جلاوطن اشتراکیوں لیڈروں کا ایک پناہ گاہ ہوگیا جہاں کارل مارکس کی سربراہی میں اشتراکیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

اس کے بعد ۱۸۶۴ء میں جب پہلی مزدور پارٹی[1] قائم ہوئی تو اشتراکی لیڈروں نے اپنی ساری کوشش اس بات پر صرف کر دی کہ یورپ کے مختلف ملکوں خصوصاً جرمنی اور فرانس میں باضابطہ اشتراکی جماعتیں قایم ہو جائیں۔ چنانچہ جرمنی میں ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد ایک جمہوری اشتراکی جماعت قایم ہوئی جس کے بہت سے اصول موجودہ جرمنی میں رائج ہیں۔ یہ جمہوری اشتراکی پارٹی شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے برابر جرمنی حکومت میں نمایاں رہی ہے لیکن جب ہر ہٹلر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت پارٹی کا شیرازہ بکھر کر نیشنل سوشلزم میں مل جل گیا اور آج سارا جرمنی اسی وطنی اشتراکیت کا پرستار ہے

فرانس میں اشتراکیت کا دو بڑی طاقتوں سے سامنا ہوا، ایک براڈون کے متبعین کی جماعت تھی جو قریب قریب انارکسٹ تھے اور ہر اجتماعی مسئلہ کو اشتراکیت کے اصول سے بالکل مختلف طریقے پر جانچنے کے عادی تھے۔ دوسری طاقت بلانکی کے متبعین کی تھی جو اگرچہ کارل مارکس کی رائے سے بڑی حد تک متفق تھی مگر ان کا میلان زیادہ تر انقلاب اور بغاوت کی طرف تھا۔

اسی طرح اٹلی میں بھی اشتراکیت کے لئے راستہ صاف نہ تھا کیونکہ وہاں ایک طرف اس کی مخالف ماتزینی کے متبعین کی جماعت تھی، دوسری طرف ایک دوسری پارٹی تھی جو بکین روسی کے انارکسٹانہ خیالات سے متاثر تھی۔ تقریباً ایسے ہی حالات روس میں بھی پیدا ہوگئے تھے اس لئے کہ اشتراکیوں نے وہاں صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی میں کسانوں کو ورغلانا چاہا اور اس کے لئے ان کی نگاہ میں مارکس کے نظریات سے نارکزم کی راہ بہتر تھی۔

لیکن ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں روس اور فرانس کی جنگ میں نپولین کی ناکامی کے بعد فرانس میں کمیونسٹوں نے زور پکڑا جس سے ان کو حکومت میں دخل حاصل ہوگیا تو اس وقت بین الاقوامی مزدور پارٹی کو یورپ میں ایک بلند مقام حاصل ہوگیا۔ فرانس میں اس اشتراکی حکومت کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی کیونکہ اول تو یہ حکومت مختلف عقیدوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی، دوسرے ان لوگوں نے چند ایسی کارروائیاں کیں جن سے فرانسیسی قوم بگڑ گئی اور

---

[1] یہ بین الاقوامی مزدور پارٹی اپنی یورپین تاریخ میں اسی پہلی پارٹی کے نام سے موسوم ہے تاکہ دوسری اور تیسری بین الاقوامی پارٹی میں ممیز ہو سکے جن کا بیان آگے آئیگا

اس نے موسیو پٹرس کی تائید شروع کر دی جس کی وجہ سے فرانس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جو تقریباً دو ماہ تک (از ۱۸ اپریل تا ۲۸ مئی ۱۸۷۱ء) جاری رہی، اس میں کمیونسٹ پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھن گئی، اب فرانسیسی جمہوریوں کا راستہ صاف ہو گیا، انھوں نے تیسری بار پھر جمہوری حکومت قایم کی جس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ حکومت متوسط طبقہ کی حکومت ہوگی چنانچہ فرانسیسی حکومت کی یہ خصوصیات کے ساتھ قایم رہیں۔

فرانس کی پہلی اشتراکی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد اشتراکی لیڈروں کے حوصلے پست ہو گئے اور یورپ میں اشتراکیت کی حیثیت محض ایک قومی تحریک کی سی ہو کر رہ گئی اور مختلف ملکوں میں اسے عروج و زوال کی منزلوں سے گزرنا پڑا چنانچہ جب جرمنی میں کارل مارکس کے نظریے رواج پذیر ہو رہے تھے اسوقت پرنس بسمارک اس کی مخالفت پر مستعد ہو گئے اور انھوں نے اسے سخت سے سخت قوانین میں جکڑ دیا جس کا سلسلہ تقریباً ۱۸۷۸ء سے لیکر ۱۸۹۰ء تک رہا اور جس کی وجہ سے اشتراکی جرمنی سے نکلنے پر مجبور ہوئے لیکن باہر جاکر بھی یہ لوگ اپنی تحریک چلاتے رہے اور بالآخر ان کی کوششوں سے اسے جرمنی میں فروغ حاصل ہوا اور وہاں کی جمہوری اشتراکی پارٹی نے ۱۸۹۱ء میں قومی سیاست کے اندر ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔ اسی سال سے جرمن اشتراکی، جرمن پارلیمنٹ ریشٹاگ (Riechstag) میں اپنی نشستوں کی زیادتی کے لئے بہت سرگرمی سے کام لینے لگے مگر اس سے پارٹی کے مقاصد میں بہت کچھ انقلاب آگیا اور یہ جماعت ایک دم اعتدال پسند ہو کر رہ گئی۔ اس انقلاب کا بڑا باعث ایڈورڈ برنسٹین تھا گو برنسٹین اور اس کے ہمخیال رفیقوں کو ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں پارٹی سے علحدہ کر دیا گیا مگر اس کے مویدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وجہ سے پارٹی کے اُصول میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اور اس کا مقصد انقلاب کے بجائے اصلاح ہو گیا یعنی اس جماعت کی رگ رگ میں اعتدال پسندی سرایت کر گئی۔ یہ وہی جرمنی کی اشتراکی پارٹی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

انگلستان میں بھی گزشتہ صدی کے آخری حصہ میں لبرل صیغوں کے قیام کا رجحان پیدا ہو چلا تھا مگر آگے چلکر جب اقتصادی اُلجھنیں بڑھ گئیں تو یہ تحریک کمزور پڑ گئی اور اس کی جگہ پر مزدور اپنی اُلجھنوں سے گھبرا کر ایک ایسی جماعت کے طالب ہوئے جس کے مقاصد و مطالبات کافی وسیع ہوں چنانچہ لیبر پارٹی وجود میں آئی جس کی مزدوروں نے پوری تائید کی، اور چند ہی سال میں اس کو تقویت حاصل ہو گئی کہ اس کے نمایندے پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے لگے۔ تاہم بعض لوگوں نے اس سے بڑھکر مارکزم کے اُصولوں پر ایک اشتراکی جماعت قایم کی مگر مزدوروں نے اس کے متعلق کوئی گرمجوشی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے اس تحریک میں کوئی زور پیدا نہیں ہوا۔ پھر جب بیسویں صدی کے شروع میں مسٹر کیر ہارڈی کی رہنمائی میں مزدور پارٹی از سر نو مرتب ہوئی تو اس سے اشتراکی پارٹی کو بہت ٹھیس لگی اور اس کی قوت اور بھی کمزور ہو گئی۔ یہ مزدور پارٹی یورپ کی دوسری اشتراکی جماعتوں سے بالکل مختلف تھی اور گو وہ بعض اشتراکی اُصولوں سے متفق تھی مگر اشتراکیت سے اس کا راستہ کوسوں دور تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مشکلات کی اصلاح کیجائے نہ اشتراکی ہنگامہ آرائی کے ذریعہ، یہ حربے حقیقی اصلاح کے لئے بالکل بے سود ہیں۔

مگر روس کے حالات جرمنی اور انگلستان سے مختلف تھے اس لئے کہ روس اشتراکی وہاں ظلم و تشدد اور جلا وطنی وغیرہ کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے، بڑے بڑے اشتراکی رہنماؤں کو سائبیریا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جلا وطن کر دیا گیا مگر اس تحریک کی آگ برابر مشتعل رہی، آگے چلکر جب ۱۹۰۵ء کے اہم انقلاب میں اشتراکی ناکام رہے تو ان کے اوپر مصائب و مظالم کا انبار اور بھی زیادہ ہو گیا جس کی بدولت ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ روس کی اس اشتراکی تحریک کو باہر سے تقویت دیں۔

ان مظالم کے علاوہ اسوقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، ایک پارٹی کا مقصد کاشتکاروں کی اصلاح تھا مگر چونکہ ان کے نزدیک انقلاب کے بغیر کاشتکاروں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے ان کا رجحان انارکزم کی طرف تھا اور وہ بیکن روسی کے خیالات سے زیادہ متاثر تھے ایک دوسری جماعت کارل مارکس کی پیرو تھی ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں اس کے دو حصے ہو گئے، ایک بالشویزم کی جماعت تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے اس وقت تک روسی اشتراکیت کے نام سے موسوم ہے اور دوسری جماعت کارل مارکس کے اُصول کی پیرو ہونے کی دعویدار تھی مگر درحقیقت اس کا خیال یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت اس وقت قایم ہو سکتی ہے جب متوسط طبقہ سے تعاون کر کے پہلے ایک جمہوری حکومت قایم کر لی جائے، یہ بالشوزم کی انقلاب پسندی اور تدریجی تبدیلی کے بجائے فوری عروج کی مخالف تھی اور اس کے نزدیک یک بیک اشتراکیت کا قیام ناممکن وہم و گمان تھا

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی مگر فرانس کی اشتراکی حکومت کی ناکامی کے بعد آہستہ آہستہ فنا ہو گئی، لیکن ۱۸۸۹ء میں اشتراکی جماعتوں نے ملکر ایک دوسری بین الاقوامی قائم کی جو دوسری بین الاقوامی پارٹی یا بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جماعت پہلی بین الاقوامی جماعت سے مختلف تھی کیونکہ اُس کے پاس کوئی ہمہ گیر مرکزی نظام نہ تھا بلکہ اس کی توجہ صرف اس بات پر محدود تھی کہ مختلف اشتراکی جماعتوں کو کس اسلوب اور کس طرح چلایا جائے مگر اس دوسری پارٹی نے ۱۹۱۷ء تک اس مسئلہ کو بھی اپنے سامنے رکھا کہ امن و جنگ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے اور اس میں اشتراکیوں کی کیا حیثیت ہو؟ یہ موضوع امسٹرڈم (ندرلینڈ) کی ۱۹۰۴ء کی کانفرنس کا خاص موضوع تھا چنانچہ فرانسیسی اشتراکی جورز نے "نئی فوج" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ مگر اشٹٹگرٹ (جرمنی) کی دوسری کانفرنس میں ہرفیہ نے نیشنلزم اور وطنیت کی صدا بلند کی، اور اس میں جرمنی کے دو لیڈروں (سبیل و فولمار) نے صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی پر حملہ ہوا تو جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی سب سے پہلے اس کی مدافعت میں حصہ لے گی۔

اس کے بعد جب ۱۹۱۱ء میں یورپ کی فضا بہت مکدر ہو گئی تو ۱۹۱۲ء میں اشتراکی لیڈروں نے بین الاقوامی تعلقات پر غور و فکر اور اپنی امن پسندانہ پالیسی کی وضاحت کے لئے یکجا ہو کر ایک اہم ریزولیوشن پاس کیا کہ دُنیا کے تمام مزدور اپنی اپنی ملکی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اپنی خارجی پالیسی امن پسندی کے اُصول کی بنیاد پر کرے، تاکہ دُنیا عالمگیر جنگ سے باز رہے۔ امن پسندی کی یہ صدائیں تمام ممبروں کی زبانوں سے بلند ہو رہی تھیں اور ۱۹۱۴ء میں پھر ایک کانفرنس منعقد ہونے کی تجویز تھی مگر جنگ چھڑ جانے سے سارا پروگرام یکایک معطل ہو گیا اور کانفرنس نہ منعقد ہو سکی۔

اس جنگ سے اشتراکیوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیوں نے جنگ کو روکنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں یورپ کی حکومتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں تو ہر اشتراکی پارٹی اپنے بین الاقوامی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اپنی قومی حکومت کی تائید میں مشغول ہو گئیں۔ مگر اس کے باوجود اس وقت چند ایسے اشتراکی موجود تھے جنھوں نے اپنی قومی حکومت کے جنگی رویہ سے اختلاف کر کے اسے جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو جورز نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی جس کا ثمرہ اسے موت کی شکل میں حاصل ہوا تھا، اسی طرح مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بھی انگلستان کے جنگی رویہ پر اعتراض کیا تھا مگر اس پر چنداں دھیان نہیں دیا گیا البتہ اس سلسلہ کا ایک پرلطف واقعہ یہ ہے کہ جب مسٹر میکڈانلڈ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک انگریزی جہاز پر سفر کرنے والے تھے تو اس جہاز کے سارے نوکروں نے اس جہاز میں کام کرنے سے انکار کر دیا جس پر مسٹر میکڈانلڈ سوار ہوں۔ لیکن درحقیقت بہت کم لوگ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس کے نقطۂ خیال پر ثابت قدم رہے یا اشتراکی تحریک کے بین الاقوامی پہلو کو اپنی قومیت پر ترجیح دی اور اسکے فیصلہ کو لائق احترام سمجھا بلکہ اس جنگ میں عموماً ہر شخص اپنی قومیت پر قربان ہوا اور سبھوں نے جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ فرانس اور برطانیہ کی اشتراکی پارٹیاں جنگی وزارتوں سے ملکر پوری طرح سرگرم کار رہیں اور اگر جرمن حکومت جرمنی کی اشتراکی پارٹی کو وزارت میں دعوت دیتی تو وہ یقیناً اس سے انکار نہ کرتی، مگر اس کے باوجود بھی اس کی ہمدردی اپنی گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔

غرض ان حالات میں جب بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ستمبر ۱۹۱۵ء اور اپریل ۱۹۱۶ء میں زمرفولڈ اور کینتال میں دو بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جس میں اشتراکی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کے خیالات کے لوگ شریک تھے، ایک جماعت یہ سمجھتی تھی کہ اس کانفرنس میں جنگ کے انسداد پر زور دیا جائے گا اور دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اس عالمگیر جنگ سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں ان کانفرنسوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اشتراکیت کو ہر جگہ پھیلایا جائے۔ اس خیال کا پہلا حامی لینن تھا۔

اس کے بعد روس کی عظیم الشان اشتراکی بغاوت رونما ہوئی جو درحقیقت حکومت کے مظالم کا نتیجہ تھی۔ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، ایک پارٹی انقلاب پسند اور باغی تھی جس کا مقصد کاشتکاروں کا فلاح تھا! دوسری پارٹی مارکس کی پیرو کار رہتی تھی، اس میں بھی دو پارٹیاں تھیں، ایک اعتدال پسند جو طبقۂ متوسط سے تعاون کی قایل تھی، دوسری پارٹی مزدوری کے انقلاب کی حامی اور مزدوروں کی ڈکٹیٹری کی طالب تھی۔ اس وقت اسے بالشویک کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر جب ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر اعتدال پسند اشتراکی اور متوسط طبقہ کے

آزاد خیالوں نے بغاوت شروع کی تو سب خیال کے اشتراکیوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس انقلاب کے بعد جو وزارت قایم ہوئی اس کا وزیر اعظم کرنسکی تھا لیکن اس کے بعد جب بالشویکوں کی قیادت اور لینن کی رہبری میں دوسرے انقلاب کے شعلے مشتعل ہوئے اور ان لوگوں نے ایک مزدور ڈکٹیٹرشپ کا اعلان کیا تو یورپ میں اشتراکی دو جماعتوں میں منقسم ہوگئے اور دونوں میں اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع اور عمیق ہوگئی۔ جب بالشویک روس کی حکومت پر پوری طرح قابض ہوگئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہی اشتراکیت کے حقیقی پیرو ہیں اور ایک تیسری بین الاقوامی اشتراکی پارٹی قایم کی اور اپنے اُصول کے مطابق دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے لگے جس کے اُصول کارل مارکس کی کتابوں اور اس کے اس بیان سے ماخوذ ہیں جو اس نے ۱۸۴۸ء میں شایع کیا تھا تو اسوقت انھوں نے جمہوری اعتدال پسند اشتراکیوں پر یہ اتہام لگایا کہ وہ کارل مارکس کے نظریات کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے سرمایہ داری قایم کرنے کے لئے متوسط طبقہ سے تعاون کا ڈھونگ نکالا ہے۔ اس کا جواب جمہوری اشتراکیوں نے یہ دیا کہ خود بالشویکی اشتراکیت کے اُصولوں سے منحرف ہوگئے ہیں اور انھوں نے روس کی جمہوریت اور آزادی کا خاتمہ کرکے روسی عوام پر محض قوت و طاقت کے ذریعہ تسلط اور غلبہ حاصل کیا ہے۔ روس کی اس باہم کشمکش کا سلسلہ بہت طولانی ہے اور اس کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

روس کے حالات تبدیل ہو جانے سے اور اشتراکیت کا رخ دوسری طرف پھر جانے کے بعد بھی جمہوری اشتراکیوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنی جدوجہد جاری رکھی چنانچہ جرمنی میں (باوجود اس کے کہ روسی بالشوزم سے متاثر ہوکر وہاں ایک بالشویک پارٹی قایم ہوگئی تھی) جمہوری اشتراکی اپنے اُصولوں پر قایم رہے۔ اسی طرح انگلستان کی بھی اشتراکی تحریک پر بالشوزم کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ فرانس میں بھی جب بعض اشتراکیوں کا میلان بالشوزم ہو چلا تھا تو جمہوری اشتراکی پارٹی کی پھر سے تنظیم کی گئی چنانچہ وزیروں کے انتخاب میں یہ پارٹی سب سے نمایاں اور سب پر فایق رہی۔ رہا اٹلی تو وہاں اسوقت تین جماعتیں ہوگئیں، ایک بالشویک دوسرے وہ جنھیں بالشویک بھی نہیں کہا جا سکتا، تیسرے وہ جو بالشوزم کے مخالف اور فاشزم کے حامی ہیں اور اب تو سارا اٹلی فیسسٹ ہے۔

صدرالدین عظیم

ترہات نظیری

نظیری اُن شعرائے ایران سے ہے جنھوں نے ہندوستان آکر سلاطین تیموریہ کے ابر کرم کے رشحات سے تمتع حاصل کیا ہے اگرچہ دربار اکبری میں پایہ چنداں ممتاز نہیں ہوا لیکن جہانگیر بلکہ شہزادہ مراد کی قدر افزائی نے اس کو گونہ فروغ دیا وہ ایک غزل گو شاعر تھا قصیدہ میں وہ اپنے معاصرین ت پیچھے ہے تغزل میں وہ ایک روش خاص سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں ایک حد تک اس کا مذاق کامیاب ہے وہ حسن وعشق کے تعلقات سے باخبر ت و معاملات بیان کرنے کی قوت رکھتا ہے لیکن اس حد تک جہاں عام عاشق مزاجوں کی رسائی ہے اسی وجہ سے اس کی غزل زیادہ تر عام پسند ہوتی بن جب وہ اسالیب تغزل کی دلآویزیوں سے باہر قدم رکھتا ہے تو اس کے طائر فکر کی قوت پرواز سلب ہو جاتی ہے۔ فلسفہ، عبرت، حکمت، موعظت اور کے مضامین اس کے یہاں محض آورد و تکلف پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ تصوف سے بیگانہ اور حقائق سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان پر قلم اُٹھاتا ہے اور لمستہ بال کی طرح منھ کے بل زمین پر آگرتا ہے اسی وجہ سے اس کے کلام میں ناہمواری ہر جگہ نمایاں ہے غالباً مرزا صائب نے اس کے انداز وقوع گوئی و نگاری پر نظر کرتے ہوئے کہا ہے ؎

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری   عرفی بہ نظیری نرساند غزل را

ے یہ معنی نہیں کہ فلسفہ حسن وعشق و رموز محبت و حقایق میں نظیری عرفی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ قصیدہ میں عرفی ایک اختراعی قوت اور طرز خاص رکھتا ہے فیضی و ظہوری بھی قاصر ہیں۔ لیکن اس کی خود بینی و خود نمائی ہمعصر شعراء کو خیال میں نہیں لاتی وہ اساتذہ متقدمین پر بھی آوازے کستا ہے لیکن بایں نخوت صاحب کی روش کا اتباع سخت دشوار جانتا ہے ؎

بر آں تتبع حافظ روا ست چوں عرفی   کہ دل بکار دو در دسخنورے داند

نظیری قصیدہ میں کوئی پایہ نہیں رکھتا اور غزل میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جب اپنی سادہ تغزل کی روش سے علٰحدہ ہو جاتا ہے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے الغیب حضرت خواجہ حافظ قدس سرہٗ کی متابعت کا اظہار کرتے ہوئے نہایت بدمزگی و بے کیفی کے ساتھ تماسخانہ تعریضات کر کے اپنی بے مائگی کا بین ثبوت دیتا ہے از موسوی کا معارضہ سحر سامری سے کرتا ہے مرزا صائب نے عموماً متقدمین اور معاصرین کا نام ادب و احترام سے لیا ہے اور ان کی غزل کا جواب دیا ہے لیکن صاحب کی غزل پر جب غزل کہی ہے تو اس کو ترک ادب تصور کر کے نہایت معذرت کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

صائب چہ تواں کرد بتکلیف عزیزاں   ورنہ طرف خواجہ شدن بے بصری بود

وں کے اصرار سے یہ جرأت کرنا پڑی کہ خواجہ کی غزل پر غزل لکھی ایک اور مقطع میں کہا ہے ؎

روا ست صائب اگر نیست از رہ دعوے   تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی ست

ئب ہی پر موقوف نہیں ہے تمام ارباب فن خواجہ کا اعتراف کرتے ہیں ان کے تقدم کے معترف ہیں اور بہت ہی ادب سے ان کا نام لیتے ہیں خود نظیری نے اس کا اتباع کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

تا اقتدا بحافظ شیراز کردہ ام   گردید مقتدائے دو عالم کلام ما

بولیت عام حاصل کرنے کے لئے خواجہ صاحب کی پیروی کا دعوے کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً نظیری اپنے کو خواجہ صاحب کا حریف سمجھتا ہے مضامین میں مجادلہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور جوش مخالفت میں دائرۂ تغزل سے باہر ہو جاتا ہے۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ہم اس دیدہ دلیری کی چند مثالیں پیش

یہ معلوم ہوگا کہ اس کا نصب العین تغزل وتفنن نہیں ہے بلکہ صرف خواجہ صاحب کے کلام پر نقض وایراد مقصود ہے۔ سنئے خواجہ صاحب کہتے ہیں ؎

ہنگام تنگدستی در عیش کوش ومستی　　کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

ی تعلیم خواجہ صاحب کا خاص مذاق ہے وہ افکار وعلائق کو منزل اُلفت میں سالک کے لئے خار راہ سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک افلاس وتنگدستی مسرت
بت وجدانی کی راہ میں حائل نہیں، ذہنی دنیوی آلام ومحن میں دامن اُلجھانا تجربہ کے خلاف ہے لیکن بیچارہ نظیری اپنی پست فطرتی سے مجاز کے خارستان
رموز حقیقت سے بےخبر اس نظریہ کے سمجھنے سے قاصر رہا مخالفت کے جنون میں جامہ سے باہر اور تغزل سے بیگانہ ہوکر خواجہ کے رد پر آمادہ ہوگیا اسکو اپنی تفنیق
دامنگیر نہ ہوا کہتا ہے ؎

بافقر وتنگدستی شوم ست عُجب ومستی　　درکشور غیوراں نخوت کشد گدا را

ری میں مستی ادبار ہے اور نخوت گدا کے لئے موجب ہلاکت ہوتی ہے ۔ اکثر شعرائے متصوفین فرقہ جبریہ کے اعتقاد کے مطابق افعال واعمال بشری کو قضا وقدر
دب کرکے عوام طعنہ گویوں کی زبان بند کرتے ہیں نیز اسباب ووسائط قریبہ کو نظرانداز کرکے مبدأ اول پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ فنا کی ایک منزل ہے جسکو ہمہ اوست
ہ سے تعبیر کرتے ہیں اسی رمز کو خواجہ صاحب اپنے الفاظ میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

درکوئے نیکنامی مارا گزر نداوند　　گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یہ کہ نیکنامی سے ہم کو کچھ حصہ نہیں ملا لیکن اگر تجھ کو یہ حالت ہماری پسند نہیں ہے تو تو ہماری قسمت کو پلٹ دے۔ نظیری اس پر سخت برہم ہوتا ہے اور سطحی
ارج از آہنگ الاپتا ہے ؎

برقدر قابلیت دادند ہرچہ دادند　　حق راست بر تو حجت تہمت مکن قضا را

یہ اس کو یہ نظر نہ آیا کہ استعداد وقابلیت بھی اُدھر ہی کا عطیہ ہے لہذا حجت تمام نہیں ہوئی اور قضا پر تہمت قایم ہے نظیری کا یہ فلسفیانہ استدلال بالکل باور
صاحب کا مطمح نظر خلاق عالم کی قدرت کاملہ ومشیت ازلی ہے وہ ایک ذرۂ کائنات کو بھی خداوند تعالیٰ کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں جانتے اور اسی بنا پر
کا عذر پیش کرتے ہیں ۔ اخلاق وموعظت جو خواجہ صاحب کی جولانی فکر کا میدان ہے اس میں فرماتے ہیں ؎

دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست افسوں　　نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

" چند روزہ زندگی یا فرصت کو غنیمت سمجھو اور دوستوں سے نیکی کرلو"۔ لیکن نظیری اس کو پسند نہیں کرتا اور احسان کا دائرہ تنگ کرنا چاہتا ہے۔
ولکروہ جانتا ہے پھر اس کو ایک مہمل نظریہ سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

از کاہش محباں برقدر خود فزائید　　بااین خسیس مردم یاری مگیر یارا

لوگوں سے جو دوستوں کی قدر گھٹاکر اپنی عزت بڑھاتے ہیں حسن سلوک نہ کرو۔ ۶

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یہ صاحب فلاسفہ کے غیر نتیج قیاسات پر خط بطلان کھینچتے ہوئے نغمۂ حقیقت بلند آہنگی کے ساتھ اپنے ساز میں سناتے ہیں ؎

حدیث از مطرب ومے گو وراز دہر کمتر جو　　کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت این معما را

یہ اسرار کائنات کے عقدے حل کرنے سے عاجز آتا ہے تو یہی اعتراف کرتا ہے اور عقل صائب کا یہ فتویٰ تسلیم کئے بغیر حکیم کو کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا لیکن ایک
رۃ مباحث حکمیہ ومسائل فلسفیہ کو بجائے باطل کو غیر مفید ہونے کے ان کی دقت ودشواری کا انکار کرکے خواجہ کا رد کرتا ہے۔ چنانچہ نظیری کہتا ہے ؎

جہاں رانیست آں معنی کہ باید فکر آں کردن　　الف باخوان ہر مکتب شناسد این معما را

ہے کہ ہر طفل ابجد خواں جانتا ہے کہ عالم کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کی ادراک میں کسی کو غور وفکر کی حاجت ہو۔ ایک غلط دعویٰ کو کس دھوم دھام سے پیش کیا

گر ہمیں مکتب است واین مُلّا　　کار طفلاں تمام خواہد شد

سمجھتے کہ اس ترانۂ خالی ویاوہ سرائی کا جنون نظیری کو کس وقت ہوا اور اس نے یہ ہذیان کیوں بکا۔ ایسے اشعار اس کے یہاں اور بھی ہیں جن پر نقد کرنا تضیع وقت

تطویل لاطائل ہے ۔ مذکورہ اشعار میں تغزل کی کوئی شان نہیں ہے اور ان اشعار کو غزل کہنا بھی ازراہِ تفنن ہے ۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ غزل میں ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ان کے بعد جس قدر فحول اساتذہ آئے سب کو ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور کسی کو دعوئ ہمسری نہیں ہوا ۔ خواجہ صاحب کو فارسی شاعری کی طرح عربی شعر میں بھی یدطولیٰ حاصل ہے جو فصاحت و بلاغت ان کے فارسی اشعار کا خمیر ہے وہی عربی میں نمایاں ہے فارسی اوزان و بحور میں عربی اشعار اور مصرعے اس طرح کسی نے نہیں موزوں کئے جیسے کہ خواجہ صاحب نے کئے ہیں اور ان کو کمال برجستگی اور لطافت کے ساتھ فارسی اشعار سے دست و گریباں کیا ہے یہ کمال صرف خواجہ صاحب کے ساتھ ہی مخصوص ہے ۔ اس ہنر میں کوئی ان کی گرد کو نہیں پہونچا ۔ نظیری نے اپنے دیوان کی پہلی غزل میں خواجہ کے تتبع پر مطلع کا پہلا مصرع اور مقطع کا دوسرا مصرعہ عربی کہا ہے ۔ اس جنون کی بھی کوئی حد ہے ؟ خواجہ کے دیوان میں صدہا اشعار اور مصرعے عربی ہیں جن کا جواب ایک عربی شاعر بھی نہیں دے سکتا لیکن نظیری بیچارہ صرف دو مصرعے کہکر خواجہ صاحب کی غزل کا جواب دیتا ہے ۔ ان مصرعوں کو ایک رکیک نقال کی تقلید کا نمونہ سمجھنا چاہیئے ۔ اہل ذوق کے نزدیک وہ مصرعے بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں ۔ نظیری کی پہلی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے :-

اذا ما شئت ان تحیٰ حیوٰۃ حلوۃ المحیا　　　برسوائی برآور سر ز مستوری برون آیا

نظیری گر طمع داری کہ مقبول مغاں باشی　　　فلا تحسد ولا تبخل ولا تحرص علی الدنیا

مقطع میں "مغاں" کی کوئی مناسبت نہیں ہے ، بالکل بے محل اور حشو واقع ہوا ہے اگر "مغاں" کے بجائے "جہاں" ہوتا تو بہتر تھا ۔ نظیری نے خواجہ کی غزلوں پر بہت غزلیں لکھی ہیں ، ہم یہاں پر دونوں کے چند ہم زمین اشعار بالمقابل درج کرتے ہیں جن سے سرسری طور پر نظیری کے حوصلۂ پرواز کا اندازہ ہو :

حافظ		نظیری	
صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را	تا بنگری صفائے مئی لعل فام را	در خور اگر نئیم مئے لعل فام را	لے کاش ترکنند بوئے مشام ما
راز درون پردہ ز رنداں مست پرس	کیں حال نیست صوفی عالی مقام را	خارج ز پردہ دخل غلط تا بکے کنیم	مطرب بما ندادہ نشانِ مقام را
عنقا شکار کس نشود دام باز چیں	کانیجا ہمیشہ باد بدست است دام را	کس جذبۂ بکار دلِ ما نمی کند	تا چند سر بحلقہ در آریم دام را
ساقی بنور بادہ برافروز جام ما	مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما	مستی ربودہ از کفِ ہستی زمام ما	مطرب نمی دہد خبرے از مقام ما
مستی بچشم شاہد دلبند ما خوش است	زاں رو سپردہ اند بمستی زمام ما	خود را برہنہ بر صف شمشیر می زنیم	کاندر فنائے ماست بقا و دوام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما	دانی کہ نور مردمک چشم عالمیم	بینی اگر بدیدۂ معنی خرام ما
چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں	کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما	خرمن بباد رفت دریں دشت پر فریب	مرغے نشود گوشۂ بامے بدام ما
حافظ ز دیدہ دانۂ اشکے ہمی فشاں	باشد کہ مرغ وصل کند قصد دام ما		
دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را	دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا	از مرغزار عقبیٰ تا سبزہ زار دنیا	تا دانم از کجائی حرفے بگو خدا را
کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز	باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را	از خوردہ کہ دارد گل در قبا نگنجد	با اینکہ ہست ذوقی میگردد آشنا را
آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است	با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا	انصاف و مہربانی عہد از جہاں برانداخت	شد راستی خوشامد شد دوستی مدارا
عالم از نالۂ عشاق مبادا خالی ...	کہ خوش آہنگ فرح بخش نوائے دارد	ہر سر شاخ دریں باغ ہوائے دارد	ہر گلے رنگے و ہر مرغ نوائے دارد
محترم دار دلم کیں مگس قند پرست	تا ہوا خواہ تو شد فر ہمائے دارد	یک شکر کام امیدم ہمہ شیریں کردست	نزد خود ہر مگسے فر ہمائے دارد
بود آیا کہ در میکدہا بکشایند	گرہ از کار فروبستۂ ما بکشایند	ہر سحر سلسلہ از پائے صبا بکشایند	گر کشادش گرہے از دل ما بکشایند
بصفائے دل رنداں و صبوحی زدگاں	بس در بستہ بمفتاح دعا بکشایند	ہر کجا فتنۂ آں چشم سیہ در کارست	کفر باشد کہ زباں زاہد بدعا بکشایند

نظیری بیچارہ کیا چیز ہے خواجہ کا مقابلہ غزل میں آج تک کوئی نہ کر سکا ۔ قدماء و متاخرین میں ان کا پایہ ممتاز ہے ۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است　　　کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

[illegible]

خاکِ دامنگیر

حمید خاں میرے والد کے زمانہ کے ملازم تھے۔ یہیں جوان ہوئے اور یہیں بڑھے ہوگئے۔ شادی نہیں کی جوانی میں زیادہ وقت ورزش میں گزارتے۔ کشتی لڑتے یا مجھے کھلایا کرتے۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میرے والد کا انتقال ہوچکا تھا اور حمید خاں کی عمر پچاس سے زیادہ تھی۔ اب ان کا وقت بانس کی چھڑی یا غلیل بنانے میں زیادہ صرف ہوتا، ان چیزوں کا انھیں خاص شوق تھا۔ رات کے وقت خانصاحب اکثر قصے کہانیاں بھی سنایا کرتے۔ ہمارے یہاں اب ان کا وجود نوکر کی طرح نہیں تھا بلکہ ایک بزرگ و مربی کی حیثیت سے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بارعب چہرے اور رکھ رکھاؤ نے محلے والوں میں بھی انکی ایک مستقل شخصیت قایم کردی تھی۔

حمید خاں کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ کم از کم اس قدر "ہموار قسم" کا انسان مجھے نہیں ملا۔ زمانہ کے حوادث ان کی زندگی پر کبھی زیادہ اثرانداز نہ ہوسکے۔ انھوں نے مصیبت کو کبھی مصیبت نہیں سمجھا اور نہ مسرت کے خوشگوار لمحے ان کو زیادہ مسرور کرسکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ حمید خاں کے مزاج میں "افغانسلی" عنصر بھی شامل تھا۔ یعنی یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ کسی لطیف شے کو لطیف سمجھ کر لطف اندوز ہوسکیں۔

دو سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں دفتر میں کام کی زیادتی تھی اس لئے میں اکثر کاغذات مکان پر لے آتا اور صبح نو بجے تک ان کے ساتھ دماغ سوزی کرتا تھا۔ اس روز خلاف معمول فقیروں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ میں مکان کے بیرونی کمرے میں جو کہ سڑک پر ہے بیٹھ کر کام کر رہا تھا۔ اور وہ دن اتفاق سے جمعرات کا تھا۔ جب پہلے فقیر نے آکر صدا دی اور میرے انہماک میں مخل ہوا تو میں نے اس کو ایک پیسہ دیکر ٹالدیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفہ کے بعد رنگ برنگ کے فقیروں نے آنا شروع کیا اور میرے کام میں اس قدر حارج ہوئے کہ مجبور ہوکر مجھے حمید خاں کی مدد لینی پڑی۔ میں نے حمید خاں سے بلاکر کہا "خانصاحب، دیکھئے ان فقیروں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے ذرا یہیں باہر بیٹھ جائیے،" حمید خاں نے ایکبار آنکھیں نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور خفگی کے آثار چہرہ پر پیدا کرکے باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی فقیر کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسرے دن پھر میں صبح کے وقت کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس روز اتفاق سے دفتر کا کام نہیں تھا۔ فقیروں کی آمد نسبتاً کم تھی لیکن پھر بھی دو ایک نظر آچکے تھے۔ خانصاحب کو تو ان سے نفرت ہوچکی تھی وہ باہر چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، بانس کی چھڑی بغل میں تھی اور متجسس نگاہیں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ کسی غریب مسافر کے راہگیر پر بھی فقیر کا شبہ کرتے اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگتے اتفاق سے اسی وقت ایک لڑکی جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ تھی میرے کمرے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ بدرنگ سی گندی اور بوسیدہ ساری اس کے جسم پر تھی۔ ہاتھ میں المونیم کا ایک کٹورہ تھا۔ جس میں ایک پیسہ اور ایک دھیلا نظر آرہا تھا۔ چہرہ پر افسردگی کی وجہ سے اداسی چھائی ہوئی تھی اور نرم نرم ہونٹ سوکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف گیا۔ لیکن فوراً ہی خانصاحب کا خیال آگیا اور میں رُک گیا۔

خانصاحب کی کرخت آواز کانوں میں آئی "کیا ہے؟ وہاں کیوں کھڑی ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ بھیک مانگتی ہے۔ ادھر آ۔ جلدی کر،" یہ تمام سوالات اور احکامات خانصاحب نے ایک ہی سانس میں صادر کردئے۔ وہ بیچاری سہم گئی۔ ہاتھ میں کٹورا کانپ گیا۔ وہ ساری کو سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ خانصاحب کی طرف بڑھی۔ ذانو بدلکر خانصاحب نے حقہ کا ایک لمبا کش لیا چھڑی کو ہاتھ میں دبایا اور کھڑے ہوگئے، میں نے یہ سمجھا کہ خاں صاحب اس غریب لڑکی کو اس بیدردی سے نہ ڈانٹ سکیں گے جس طرح وہ دوسرے فقیروں سے پیش آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے چہرہ کی معصومیت اور مظلومیت ضرور خانصاحب پر اثرانداز ہوگی اور ان کی زبان زیادہ کرختگی اختیار نہ کرسکے گی۔ لیکن خلاف توقع خانصاحب نے اس کو بھی نہایت نامناسب طریقہ سے جھڑکنا شروع کیا۔

بولے یہ بھیک مانگنے آئی ہے - شرم نہیں آتی - جوان ہے - بدن میں قوت ہے - ہر طرح کا کام کر سکتی ہے - کام چور - محنت مزدوری کر کے پیسہ کیوں نہیں پیدا کرتی - مفت مانگ مانگ کر کھانے کی عادت ہو گئی ہے" لڑکی بالکل سہمی ہوئی خانصاحب کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی - آنکھیں نیچی تھیں اور چہرہ کا رنگ اُڑ چکا تھا - خاں صاحب اپنی آواز بلند کرتے جا رہے تھے "تو جوان ہے - کمبخت کسی مصیبت میں پھنس گئی تو بھیک مانگنے کا سارا مزا بھول جائے گا - مگر کیا ٹھیک - مکار کہیں کی کمانے نکلی ہے ....." خانصاحب یہاں تک کہہ چکے تھے کہ یکایک ان کو لڑکی کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطروں کی چمک نظر آئی اور شاید ایک سسکی بھی سنائی دی - میں تو خانصاحب کی طرف سے نااُمید ہو گیا تھا - لیکن نہ معلوم وہ کیا سمجھے اور جلد ہی انھوں نے نرم الفاظ میں اس کو سمجھانا شروع کیا "دیکھ بیٹی! زمانہ خراب ہے تو بھیک مانگنا چھوڑ دے، یہ کام بڑا ذلیل ہے اور تیرے لایق ہرگز نہیں - تو چاہے تو میں تجھے کسی کارخانے میں کام دلانے کی کوشش کروں؟" لڑکی نے خانصاحب کو کوئی جواب نہ دیا - جدھر سے آئی تھی اسی طرف آہستہ آہستہ واپس چلی گئی - کٹورے والا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا — میں اخبار پڑھنا بھول چکا تھا میں نے بڑھکر اس لڑکی کو ایک اکنی دینی چاہی لیکن اُس نے گردن کے اشارہ سے انکار کر دیا - اس کی سسکیاں میری اس حرکت سے تیز ہو گئیں - اور وہ جلد ہی گلی کے موڑ پر گھوم گئی - میں نے خانصاحب کی طرف دیکھا وہ قدرے افسردہ نظر آ رہے تھے - وہ کچھ دیر تک لڑکی کی طرف دیکھتے رہے - جب وہ گلی میں داخل ہو گئی تو آہستہ آہستہ گردن جھکائے ہوئے مکان کے صدر دروازہ کی طرف بڑھے دروازہ کے قریب پہونچکر انھوں نے ایک بار گردن کو جنبش دی اور "آنہہ" کی آواز سنائی دی - گویا سارے حزن و ملال کے اثرات کو انھوں نے چشم زدن میں اس طرح محو کر دیا - وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے - زیادہ دیر تک غمگین رہنا پسند نہیں کرتے تھے -

میرے اوپر اس واقعہ کا خاص اثر تھا ..... کئی روز تک وہ فقیرن مجھے اکثر یاد آتی رہی - جب بھی خانصاحب میرے سامنے آتے ان کے کرخت الفاظ مجھے یاد آ جاتے - میں یہ تو جانتا ہی تھا کہ خانصاحب غیر معمولی طبیعت کے انسان ہیں، مگر اس واقعہ نے میرے خیال میں اور بھی استحکام پیدا کر دیا اور میں نے از سرِ نو خانصاحب کا مطالعہ شروع کیا - اکثر میں موقع نکال کر اُن سے دیر تک گفتگو کرتا اور موضوع کو تھوڑی دیر کے بعد "عورت" کی طرف رجوع کر دیتا - پہلے تو خانصاحب نے مجھے زیادہ منھ نہ لگایا اور نہ مجھے زیادہ موقع ہی ملا کہ اطمینان کی گفتگو ان سے کروں - ایکروز رات میں خانصاحب سے میں نے قصہ کہنے کی فرمایش کی - خیال یہ ہے کہ درمیان سے قصہ کا رخ اپنے مطلب کی طرف پھیر دوں گا - میں چاہتا تھا کہ خانصاحب سے ان خیالات کا علم حاصل کروں جو وہ عورت کی طرف رکھتے ہیں - مجھے اس قسم کا شوق ہمیشہ سے رہا کہ اس قسم کے عجیب الخلقت لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ کروں - خانصاحب نے حُقّے کا ایک کش لیتے ہوئے قصہ شروع کیا - درمیان میں ایک جگہ بیان کیا "شاہزادہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور جنگل میں راہ بھٹک کر کھو گیا - پریشاں حال پیاس کی شدت سے نڈھال - گھوڑے پر چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ اسے ایک جھونپڑی نظر پڑی - خدا کا شکر ادا کر کے وہ وہیں اُتر پڑا تاکہ اپنی پیاس بجھائے - جھونپڑی میں اس کو ایک نوجوان لڑکی ملی - نہایت حسین - چندے آفتاب چندے ماہتاب - اس نے اس کو دیکھا اور فوراً عاشق ہو گیا - میں نے خانصاحب کو روک دیا - "یہ تو بتائیے اس کی کیا وجہ ہے کہ کسی نے جوان لڑکی کو دیکھا اور عاشق ہونا ضروری ہو گیا" "مجھ سے اس قسم کی واہیات باتیں نہ پوچھو" خانصاحب نے ناراضگی کا اظہار کیا -

"آخر کچھ تو بتائیے - ماجرا کیا ہے - ابھی اس روز آپ نے بھی اس نوجوان فقیرن کو دیکھا تھا لیکن آپ تو عاشق واشق نہیں ہوئے"

"تم قصہ سنو گے یا نہیں - اگر مجھے ستاؤ گے تو میں پھر کبھی قصہ نہ کہوں گا"

"خانصاحب! دیکھیے آپ خفا ہو جاتے ہیں لیکن یہ باتیں آپ نہیں بتائیں گے تو کون بتائے گا"

خانصاحب کچھ نرم ہوئے "بھئی، جانتے ہو کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی عورتوں سے دلچسپی نہیں رہی - چاہے وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں .... ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا"

"آپ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو عورتوں سے دلچسپی کیوں نہیں ہے" میں نے اُن کو پھر چھیڑا -

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی"

"دیکھو! - تم قصہ سنو گے یا نہیں - میں اور سب کچھ نہیں جانتا - میں نے شادی نہیں کی نہ سہی"

تک خاموش کچھ سوچتے رہے پھر بولے "میرے والد نے مجھے تعلیم دی تھی کہ عورت سے ہمیشہ ڈروں۔ چنانچہ میں نے ابتدا ہی سے اس پر عمل کیا اور کچھ قدرت نے بھی میرا دل ایسا بنایا ہے کہ وہ جلد ایسی چیزوں کی طرف مایل نہیں ہوتا۔ زندگی میں کئی بار میں نے بھی اپنے قدم میں لغزش محسوس کی ہے لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔۔۔۔۔۔ اب میں تم سے کہاں تک کہوں۔ ایسی ایسی ہزاروں عورتوں کو میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ فقیرن مجھ پر کیا اثر کرتی۔ اور دیکھا تم نے میں اسے اچھی باتیں سمجھا رہا تھا لیکن اس نے بُرا مانا اور لگی رونے"۔ خانصاحب پر پھر غصہ طاری ہو رہا تھا۔ میں نے خانصاحب کو روکا "سنئے تو آپ کو اپنی زندگی میں کسی عورت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کوئی کمی آپ نے اپنی زندگی میں نہیں پائی"۔ "توبہ کرو"۔ خانصاحب نے خاص انداز میں فرمایا۔ "جس چیز کو میں قابل نفرت سمجھتا ہوں اس کی مجھ کو کمی محسوس ہو۔ میں نے تو کہدیا تم سے کہ عورت کو میں نے کبھی اپنا بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عورت بہت کمزور فطرت کی ہوتی ہے۔ معمولی جھٹکے بھی اس کو جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے تو تنہا زندگی گزار دی۔ اسی میں مجھے بہت آرام رہا۔ اب آخری ایام میں میں تو بہت خوش ہوں۔ خدا آپ لوگوں کو ہمیشہ زندہ رکھے"۔ یہ دو کلمات کہکر خانصاحب خاموش ہوگئے اور کچھ سوچنے لگے۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد خانصاحب نے پھر قصہ شروع کیا اور نہ معلوم کب تک کہتے رہے میں تو سوگیا۔

اس کے بعد دور دور تک میری اور خانصاحب کی کوئی خاص گفتگو نہ ہوئی۔ تیسرے دن اتوار تھا۔ میں دن بھر گھر ہی پر رہا۔ شام کے وقت خانصاحب سے مجھے بات چیت کا پھر موقع ملگیا۔ وہ صحن میں بیٹھے بانس کی غُلیل بنا رہے تھے، چاقو سے چھیلکر اسے نہایت شفقت کے ساتھ سڈول کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہونچا کہنے لگے "دیکھو بابو یہ غلیل بہت عمدہ ہوگی یہ جو مرزا صاحب ہیں نا بیچارے بہت دنوں سے کہہ رہے تھے، انھیں کی فرمائش پوری کر رہا ہوں سوچتا ہوں کہ ایسی چیز بنا کر دوں کہ عرصہ تک یاد رکھیں"۔ "جی ہاں، بہت اچھی غلیل طیار ہوگی" میں نے بھی خانصاحب کا دل بڑھایا۔ "آپ تو خانصاحب غلیل چلانے میں بڑے ماہر ہیں۔ آجکل شکار وغیرہ چھوڑ دیا ہے کیا"

"بھئی! اب آنکھوں کی روشنی بہت کم ہوگئی ہے۔ ورنہ تمھیں تو یاد ہوگا میں غلیل ہی سے کبوتر اور فاختہ مار لایا کرتا تھا"۔ خانصاحب نے فخریہ فرمایا۔

"جی ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے" میں نے خانصاحب کو پھر چھیڑنا چاہا "خانصاحب! یہ فاختہ بہت ہی معصوم اور غریب پرندے ہیں تو انھیں مارنا پسند نہیں کرتا"۔ "ہاں بھئی۔ بات تو ٹھیک کہتے ہو" خانصاحب نے میری تصدیق کی۔

"مجھے بھی بڑا ترس آتا ہے۔ بڑا بھولا اور حسین پرندہ ہے"

"تو آپ کو حسین چیزیں پسند آتی ہیں"

"دیکھو" خانصاحب نے اپنے مخصوص انداز سے کہا۔ "تم نے آج پھر مجھے پریشان کرنا شروع کیا"

"جی نہیں"۔ میں نے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ خوبصورت اور حسین چیز ہر ایک کو اچھی معلوم ہوتی ہے"

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عورت کا حُسن میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا" خانصاحب نے اس طرح کہا گویا وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ "میں حسین کو بدصورت کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے پاس حُسن ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ بڑی سے بڑی مہم بھی سر کرسکتی ہے ــــ میں بھی ایکبار اس فریب میں مبتلا ہوچکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو"۔ "کون سی بات خانصاحب۔ ذرا میں بھی سنوں" میں نے اصرار کیا۔

"نہیں نہیں۔ تم کو نہیں بتاؤں گا ــ تم بہت شریر ہو۔ مجھ سے تمام باتیں سننا چاہتے ہو"۔ اس کے بعد میں نے بہت اصرار کیا۔ لیکن خانصاحب نے میری ایک نہ سُنی ۔ ۔ ۔ میرا اصرار ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ خانصاحب کی نظر ایک بیک سڑک کی طرف اُٹھی۔ "دیکھو، وہ فقیرن آج پھر اس طرف آئی"۔ خانصاحب نے میں نے دیکھا تو سڑک پر وہی لڑکی ہاتھ میں کٹورا لئے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑھی عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چلی جارہی تھی۔

خانصاحب اس کی طرف بڑھے۔ میں نے انھیں روکنا چاہا کہ وہ اُسے بُرا بھلا نہ کہیں۔ خانصاحب نے کہا "میں ذرا اُس سے بات چیت کروں گا۔ اس غریب کو سمجھا دوں۔ کہیں کسی بدمعاش کی نظر پڑ گئی تو مصیبت میں پڑ جائے گی"۔ خانصاحب اس لڑکی کے پاس گئے۔ میں دور ہی سے دیکھتا رہا۔ خانصاحب

[illegible]

ان کی واپسی ہوئی ۔ میں نے دریافت کیا " اس لڑکی کے سمجھ میں آپ کی بات آئی یا نہیں "

" جی ہاں " ۔ خانصاحب نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ان کی آواز رُک رہی ہو

" اب تو وہ شاید بھیک نہ مانگے گی "

" معلوم نہیں ۔ ممکن ہے نہ مانگے "

خانصاحب پر اِس خاص بات کا اثر ہو چکا تھا ۔ اُن کی آواز اور گفتگو کا وہ مخصوص طرز بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا ، یہ دو چار جُملے کہکر خانصاحب اپنی کوٹھری میں چلے گئے ۔ میں بھی کچھ سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔

دوسرے روز پانچ بجے شام کے قریب میں دفتر سے واپس آرہا تھا ، میرے مکان کے پاس ہی سڑک پر املی کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے نیچے محلہ کے شریر لڑکے دن بھر جمع رہتے ۔ میں نے اس درخت کے نیچے دیکھا ۔ خانصاحب وہ فقیرن اور بڑھیا تینوں موجود ہیں ، میں دوڑ کر ایک مکان کی آڑ میں ہو گیا تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکیں ۔ میں نے دیکھا اس بڑھیا نے اپنی ساری کے کسی حصہ سے ایک چاندی کا چمکتا ہوا سکہ نکالا اور خانصاحب کے ہاتھوں پر رکھدیا ۔ خانصاحب بُت کی طرح ساکت کھڑے تھے ۔ ان کے جسم میں ذرا بھی جنبش نہیں ہو رہی تھی ۔

تھوڑی دیر تک بڑھیا دھیمی آواز میں خانصاحب سے کہتی رہی ۔ جس کو میں فاصلے کی زیادتی کی وجہ سے سُن نہ سکا ، تھوڑی دیر کے بعد بغیر اپنی باتوں کا جواب سنے ہوئے اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خانصاحب کچھ دیر تک اس کو دیکھتے رہے لیکن جب وہ اندھیرے میں چھپ گئی تو وہ بھی مکان کی طرف واپس چلے گئے ، میں یہ معمہ نہ سمجھ سکا ۔ اس واقعہ کے ہر حصے نے مجھے عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ۔ ۔ ۔ میں بھی مکان کے اندر جلدی چلا آیا کپڑے تبدیل کئے منہ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھ گیا ۔ سوچ رہا تھا کس عُنوان سے خانصاحب سے دریافت کروں کہ آخر ماجرا کیا ہے اس بڑھیا نے ان کو وہ روپیہ کیوں دیا اور ان سے کیا کہتی رہی ۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ میرے چند احباب آگئے ۔ چائے پی گئی ۔ اور میں ان کے ہمراہ ٹہلنے کے لئے نکل گیا ۔

رات کے وقت جب میں سونے کے لئے طیار ہوا تو ارادہ کیا کہ خانصاحب کو پھر کہانی کہنے کے بہانے سے بلاؤں اور بات ہی بات میں ان سے اصلیت دریافت کروں ۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خانصاحب خود آگئے ۔ ان کے چہرے پر میں نے آج تک اس قسم کی کیفیت نہیں دیکھی جیسی اس رات دیکھی تھی ۔ انتہائی اُداسی اور گھبراہٹ کا عالم تھا ۔ قبل اس کے کہ میں ان سے مزاج پرسی کرتا ۔ انھوں نے خود کہا :-

" میاں (وہ مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے) آج میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں ۔ اب میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں "

" کیوں ؟ ۔ کیا ہوا ؟ ۔ کیا بات ہے ؟ " میں نے گھبرا کر اُن سے سوالات کئے ، میں اس اچانک حادثہ سے پریشان ہو گیا ۔ مجھے خانصاحب کی ذات ازحد عزیز تھی ۔ اور میں یہ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں ۔

" جی ہاں " ۔ خانصاحب نے اس طرح کہا گویا انتہائی حد تک مایوس تھے ۔ " اب مجھے جانے ہی دیجئے میرا جانا اب بہت ضروری ہے ۔ مجھے دوسری جگہ نہایت ضروری کام ہے ۔ مجھے اجازت دیدیجے ۔ آپ کا احسان ہوگا "

" آخر کیوں ؟ ۔ کہاں جائے گا ؟ کیا ضروری کام درپیش ہے ؟ ۔ بیٹھ جایئے اطمینان سے ۔ کچھ مجھے بھی بتایئے آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں " میں نے یہ چند باتیں انتہائی خلوص کے ساتھ خانصاحب سے کہیں ۔ وہ ایک طرف فرش پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے ۔ " میں اب یہاں سے دوسری جگہ جاؤں گا ۔ ایک بہت ضروری کام ہے ۔ آپ کو بتا کر کیا کروں گا ۔ اور آپ سُن کر کیا کیجئے گا ۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد واپس چلا آؤں لیکن اگر نہ آسکا تو زیادہ دنوں تک میرا انتظار مت کیجئے گا ۔ مجھے خانصاحب کی گفتگو سنکر یہ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی خانصاحب ہیں جو اپنے مزاج کی سختی اور طبیعت کی پختگی پر نازاں تھے ۔

ان کی آواز اور چہرہ کی کیفیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دل کے اندر طوفان برپا ہے ۔ اور اندر ہی اندر خاموش قسم کی آگ سُلگ رہی ہے ، اس انقلاب کو دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا ۔ میں سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے ۔ جب میں نے دیکھا کہ میرا شدید اصرار بھی خانصاحب کو اپنے راز کے انکشاف کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا میں نے اُن سے آخری اور کارگر سوال کیا " آج شام کو آپ املی کے درخت کے نیچے کھڑے کس عورت سے باتیں کر رہے تھے ۔ میرا خیال ہے

لا اسی وقت سے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے"

"جی نہیں"۔ خانصاحب نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب مجھے اجازت دیجئے میں کل صبح ہی رخصت ہو جاؤنگا"

"ذرا تشریف رکھئے"۔ میں نے دوبارہ خانصاحب سے کہا کہ "اس وقت وہ فقیرن بھی غالبًا وہاں موجود تھی اس بڑھیا نے آپ کو ایک روپیہ کیوں دیا تھا"۔۔۔۔۔ میں اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ خانصاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بول اُٹھے۔ "تو آپ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔۔۔۔۔ اچھا تو سنئے۔ میں آپ کو ایک ایسا قصہ سُناتا ہوں جس کو عرصہ ہوا میں بھی بالکل بھول چکا تھا —— مگر شرط یہ ہے کہ میں کل صبح ہی ضرور چلا جاؤں گا"

میں خاموش عالمِ حیرت میں بیٹھا رہا اور خانصاحب نے اپنی داستان یوں شروع کی :-

"یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میں جوان تھا۔ آپ کے والد کی عمر بھی مجھ سے بہت زیادہ نہ تھی۔ میں ان کے ہمراہ علاقہ پر جایا کرتا تھا۔ اول تو وہ مجھ سے زیادہ مانوس تھے دوسرے میں جایداد کے کام میں ہمیشہ سے ہوشیار تھا مالگذاری وغیرہ کی وصولیابی میں ان کی کافی مدد کیا کرتا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا میں آپکے والد کے ساتھ علاقہ پر تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہ یک بیک آپ کے والد صاحب کو کوئی بات یاد آئی۔ اور مجھے حکم ملا کہ چماروں کے محلہ میں جاکر ایک چمار کو بُلا لاؤ۔ میں تعمیل حکم کے لئے فوراً چل دیا۔ جب میں اس چمار کے مکان کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان چمارن چلی آرہی تھی۔ میں نے اس روز سے قبل اس گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔ شاید کسی کی مہمان تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے اُس میں کچھ کشش محسوس کی لیکن آپ یقین مانئے کہ مجھے صرف ایک ہلکا سا خیال اُس کے چہرے کی جاذبیت کی نسبت پیدا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے اُسی سے اس چمار کی موجودگی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے فوراً گھونگھٹ کر لیا اور دبی ہوئی زبان سے جواب دیا کہ اسے اس کے بارہ میں علم نہ تھا۔ خیر۔ میں آگے بڑھا اور اپنا کام کیا۔ یعنی اس چمار کو ساتھ لیا اور واپس ہوا۔ واپسی پر پھر وہ لڑکی مجھے کنوئیں پر پانی بھرتی نظر آئی۔ نہ معلوم کیوں اس مرتبہ میں اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے قطعی اعتراف ہے کہ اس وقت مجھے اپنے دل میں کچھ کمزوری محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں نے اپنی نگاہ دوسری طرف ہٹالی۔ اس چمار سے کھیتی اور غلّہ وغیرہ کے بارہ میں گفتگو کرنے لگا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد دو روز تک یعنی جب تک کہ میں نے اس کو تیسری بار نہیں دیکھا وہ مجھے پھر یاد نہ آئی۔ تیسرے روز شام ہی کا وقت تھا میں آپ کے والد کے ہمراہ شکار سے واپس آرہا تھا۔ وہ مجھے اسی کنوئیں پر نظر آئی۔ مجھے اس کی طرف دیکھنے میں ایک خاص لطف محسوس ہوا۔ میں اس کو پلٹ پلٹ کر دور تک دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ مجھے یقین ہے کہ اس نے بھی مجھکو دیکھا تھا۔ ممکن ہے یہ میرا خیال ہی ہو۔ خیر۔ اس روز رات میں قریب بارہ بجے میری یکایک آنکھ کھل گئی اور دیر تک اسکے بارہ میں نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ اپنے خیال کو دوسری طرف رجوع کر دوں۔ لیکن ہر ایسی کوشش کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر مجھے یاد آئی"

خانصاحب کچھ اس انداز سے یہ داستان بیان کر رہے تھے کہ گویا اپنے دماغ پر زور دیکر اس واقعہ کی ہر تفصیل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے لب ولہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس واقعہ کے بیان کرنے میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ایسی لذت جس میں حزن وملال کے عناصر بھی پوشیدہ تھے۔ میں نے خانصاحب کی زندگی کا ایک نیا ورق اپنے سامنے کُھلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ خانصاحب کی زبان سے میں آخری کہانی سُن رہا ہوں۔ خانصاحب نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا :-

دوسرے ہی روز شام کو ٹہلتا ہوا میں پھر چماروں کی بستی کی طرف گیا وہ حسب معمول کنوئیں کی طرف آرہی تھی۔ میں اس کو دیکھنے ہی کی غرض سے گیا تھا اور میں نے اس کو دیکھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال آیا۔ جس نے مجھے اپنے اندر کمزوری کا احساس کرایا۔ میں جلد ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔ اس کے بعد دو دن تک میں آپ کے والد صاحب کے ساتھ وہاں رہا اور انھیں کے ہمراہ شہر واپس چلا آیا۔ کچھ دنوں تک وہ مجھے ضرور کبھی کبھی یاد آئی لیکن جلد ہی میں اسے بالکل بھول گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد مجھے پھر کسی ضروری کام سے آپ کے والد صاحب نے علاقہ پر بھیجا۔ جب میں راستہ میں تھا تو وہ مجھے پھر یاد آئی اور پانچ میل کا راستہ میں نے پا پیادہ اس قدر جلد طے کر دیا گویا میں دوڑتا ہوا گیا۔ میں کنوئیں کے پاس کافی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر اسے نہ دیکھ سکا۔ عجیب قسم کی تکلیف مجھے محسوس ہوئی۔ اسی مایوسی کے عالم میں میں ندی کی طرف چلا کہ ذرا پانی کی روانی اور ہوا کی تازگی سے اپنے دل کی افسردگی دور کروں۔ میں ایک ارہر کے کھیت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ وہ مجھے ندی کی طرف سے آتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کو دیکھ کر کسی حد تک چونک اُٹھا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ہمت کر کے اس سے دو ایک

سوال کئے جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک چمار کے یہاں مہمان تھی۔ کیونکہ اس کے گاؤں میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جا رہی واپس چلی جائے گی۔ میرے سوالوں کا جواب دے کر اس نے جلدی جلدی مکان کی طرف قدم بڑھایا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ مجھے اس کی اس حرکت سے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر تیز قدم اُٹھائے کیوں چلی جا رہی تھی ــــ شام کا اندھیرا۔ ہوا کی بھینی بھینی خنکی، فضا کا بھاری پن از حد صبر آزما ثابت ہونے لگا۔ میں نے پھر اسے آواز دی وہ رُک گئی۔ میں اس کے قریب پہونچا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا گفتگو کروں۔ میرے اندر ایک بہت طاقتور قسم کا بھیجان اُٹھ رہا تھا مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اسوقت جو میری کیفیت تھی وہ اپنے وحشیانہ طرز کی وجہ سے صد درجہ مُہلک اور تباہ کن تھی۔ میرے اندر وہ جانور بیدار ہو چکا تھا جس کے متعلق میرا دعوے تھا کہ وہ پوری طرح میرے قبضہ میں ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن میں اس وقت بالکل اندھا تھا اور بالکل اندھوں کی سی حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں۔

جب میں وہاں سے واپس چلا تو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ منھ سے آواز تو نہیں نکلتی تھی لیکن گریہ کی تمام کیفیات جو انسانی قلب و دماغ پر انتہائی غم و اندوہ کا عالم طاری کر سکتی ہیں، موجود تھیں۔ میں اس منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا اور یہ سوچ کر کہ اس غریب کو میری ذات سے جو تکلیف پہونچی تھی وہ شاید اس طرح ختم ہو جائے میں نے ایک روپیہ اس کی گود میں پھینکا اور وہاں سے تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر چلا آیا۔ اُدھر کھیت کے دوسرے سرے تک مجھے اس کی سسکیوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ جیسے گناہ کے کمردہ شیاطین میرا مُنھ چڑھا رہے ہیں۔"

اس کے بعد خانصاحب تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ میں نے بھی سوال کرنے کی ہمت نہ کی۔ "یہ بڑھیا جس کو آپ نے آج شام کو درخت کے نیچے دیکھا ہے وہی چمارن تھی۔" خانصاحب نے آہستہ آہستہ کہا۔ جیسے ان کا دل کیفیات کے ہجوم سے خالی ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی کون تھی۔ میں نے فوراً دریافت کیا۔ بولے "وہ میری لڑکی ہے"۔ خانصاحب نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے اوپر انتہائی افسردگی طاری ہو گئی۔ میں نے پوچھا "اور وہ روپیہ جو اُس بڑھیا نے آپ کے ہاتھ پر رکھا تھا"۔ بولے "یہ وہی روپیہ ہے جو میں نے کسی وقت اس کو دیا تھا"۔

خانصاحب نے اپنی داستان ختم کر دی اور اُٹھکر چلے گئے۔ میں نے روکنا چاہا کہ کچھ مزید سوالات کروں لیکن وہ نہ رُکے میں نے بھی سوچا کہ دوسرے دن صبح پھر گفتگو ہوگی۔

دوسری صبح کو خانصاحب اپنی کوٹھری میں نہیں ملے وہ جا چکے تھے۔

میں بہت دنوں تک تمام شہر میں تلاش کرتا رہا کہ شاید خانصاحب کا سُراغ مل سکے لیکن ناکام رہا۔ دو سال بعد مجھے گوالیار جانے کا اتفاق ہوا وہاں بعد نماز جمعہ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو سیڑھیوں پر فقیروں کے گروہ میں خانصاحب کی جھلک نظر آئی، وہ لڑکی اور بڑھی فقیرن تھی آپ کے ساتھ صدا لگا رہی تھی۔

کلیم اللہ۔ ام۔ اس۔ سی

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (سنہ ۲۸ء) اگست عہ ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۶ار۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ ۳۳ء) فروری عہ ر۔ (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۶ار۔ فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (سنہ ۳۸ء) جنوری سے ۸ فروری ۸ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ، ستمبر عہ ر۔ اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۱ء) جنوری فروری ۶ار۔ مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ ر فی پرچہ۔

ناظورۂ کشمیر

ناظورۂ نازنیں ہے اور میں — کشمیر کی سرزمیں ہے اور میں
قربان بہار ہو رہی ہے — رعنائی نثار ہو رہی ہے
ہر شاخ بجائے خود چمن ہے — اللہ اللہ عجب پھبن ہے
اُٹھتی کوپل کی اُف جوانی — اور اُس پہ لباس ارغوانی
ہر پھول دُلھن بنا ہوا ہے — ڈوبی ہوئی عطر میں ہوا ہے
یوں گرمیٔ حُسن سے ہے تپتی — بوٹے بوٹے کی پتّی پتّی،
گویا کندن کی ڈاک دے کر — یاقوت سے جڑ دیا ہے زیور
ہر گام پہ اک نیا ہے منظر — رنگیں، شاداب، حسن پرور
گُل پھول کھلائے جا رہے ہیں — قالین بچھائے جا رہے ہیں
چھتنار چنار کا وہ سایا — جس سے گھونگھٹ گھٹا نے کھایا
کُہسار جو یوں تنے کھڑے ہیں — اُونچے ہیں کہ بات پر اڑے ہیں

تخئیل پہ حُسن چھا گیا ہے — جب باغ نشاط بن سکا ہے
فوارے چھٹے کہ مور ناچے — منقار میں موتیوں کے مالے
طاؤس سفید جو ہے عنقا — ہے اُس نے یہاں پرا جمایا
جادو فطرت کا چل رہا ہے — پانی گوہر اُگل رہا ہے!
تعمیر جو ایک خواب کی تھی — تعبیر ہے شالامار اُس کی
اک شور ہے آبجو کا ہر سو — اک حشر ہے رنگ و بو کا ہر سو
اُڑتا ہے یہ غول تتلیوں کا — یا قوسِ قزح سے رنگ برسا
اکثر ہوا موجِ گُل پہ دھوکا — بہتا ہوا رنگ کا ہے دریا
دلکش کون ایسا گلکدہ ہے — تو ہی "فردوس گم شدہ" ہے
کشمیر کی مندری میں وہ نگ ہے — جس پہ لہلوٹ سارا جگ ہے
خود حُسن کو تیری آرزو ہے — صنعت کا وہ شاہکار تو ہے

بیمار سے چشمہ کہہ رہا ہے — پی، آبِ حیات بہہ رہا ہے

آغوش میں سائے کے ہو گھاٹی — ہے دور پہ دھوپ چلچلاتی
اک بچّی کے ہاتھ بھیجی پاتی، — "ہوتی جو چھما تو میں بھی آتی"
پتر کا جواب جب نہ پایا — چہرہ غصّے سے تمتمایا
ہلکان ہوئی جو روتے روتے — سونلا گئی شام ہوتے ہوتے

دریا تھم تھم کے بہہ رہا ہے — موجوں کو سمیٹے کہہ رہا ہے
"آؤ کھو جائیں اس فضا میں — سو جائیں گلے میں ڈالے بانہیں"

گُل خطّہ ہے نقشِ زندگانی — چشمے ہیں رنگیں، لہو ہے پانی
کھیتی یوں لہلہا رہی ہے — دریا کو پھریری آ رہی ہے

تاروں بھری رات گو حسیں ہے — چھب ڈل کی نہیں ہے، ہاں نہیں ہے
جب آنکھ سے آنکھ لڑ گئی ہے — ناہید پہ اوس پڑ گئی ہے،
یہ بیچ میں پھول ہیں کنول کے — یا مانگ بھری ہے موتیوں سے
جو ہنسی ادھ کھلی کلی ہے — جھومر ہے، اس کی کھلبلی ہے

گھاٹی میں جو گھر کہیں کہیں ہیں — گھونگھٹ میں چھپائے منہ حسیں ہیں
دوشیزہ شگوفہ یاسمن کا — چلتا ہوا سحر بھوسے پن کا
گو شرم و حیا کی پتلیاں ہیں — آنکھوں میں نہاں وہ بجلیاں ہیں
جو اہلِ ہوس کو خاک کر دیں — ہر سانس میں اتنی آگ بھر دیں
نیکوں کے لئے نویدِ عشرت — صورت پہ اضافہ حُسنِ سیرت
فطرت کی چہیتی بیٹیاں ہیں، — آنکھیں جنت کی کھڑکیاں ہیں

اور شہر کی زندگی کا نقشہ؟ — جو شمع ہے آہ وہ فسردہ!
تاریک فضا ہے، دل رُندھا ہے — چہرے پہ دھواں سا چھا رہا ہے
آنکھوں میں پڑے ہوئے ہیں حلقے — رخ زرد ہے بال اُلجھے، اُلجھے

رنگین خرامیاں تو کیسی ہے موت یہاں شگفتگی کی
وہ بدلی چھنٹی وہ چاند جھانکا درشن کرنے کو شنکرا[1] کا
تاروں کی بھی ٹکٹکی بندھی ہے سنسار خموش آرتی ہے
سانسیں سینوں میں رک گئی ہیں پھولوں کی جبینیں جھک گئی ہیں

کھلتا نہیں اس میں راز کیا ہے موتی سرکوہ جا...
ہے تیاگ کسی کا یا تپسیا جس نے مندر کا چولا بدلا
دینے کو یہ درس ہوشمندی انجام فنا ہے سربلندی

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

غزل : (پروفیسر) شور

جنوں قیدِ تکلم سے نکل جاتا تو اچھا تھا
ترا ہر درد اگر اشکوں میں ڈھل جاتا تو اچھا تھا
مری اک خامشی پر اتنی تنقیدیں زمانے کی
ترے ہی منہ سے اک نالہ نکل جاتا تو اچھا تھا
مرا احوال اب تک پوچھتے ہیں پوچھنے والے،
اگر عنوانِ غمخواری بدل جاتا تو اچھا تھا
وہ غم جو قیدِ لفظ و صوت میں آ ہی نہیں سکتا
حدودِ اشک سے آگے نکل جاتا تو اچھا تھا
میں تنہا رہ گیا ہوں اک فضائے برق و طوفاں میں
نشیمن بھی چمن کے ساتھ جل جاتا تو اچھا تھا
زمانے کی نگاہیں میری جانب اٹھتی جاتی ہیں
ترے رخ پر ترا آنچل سنبھل جاتا تو اچھا تھا
کھڑا ہوں شور اب تک منزلِ عہدِ تمنا پر،
یہ ساحل بھی تلاطم سے بدل جاتا تو اچھا تھا

غزل : سلیمان اریب

چاہتا ہوں انجمن آرائیاں ! !
ہاں ابھی کچھ حوصلہ افزائیاں
کس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئیں
چاند کیوں لینے لگا انگڑائیاں
جیسے کوئی لہر ابھرے اور دبے
اللہ اللہ! ان کی وہ انگڑائیاں
ایک پیکر پھول بھی اور آگ بھی
میں نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں،
ان سے تو اچھی ہے نادانی مری
گر یہی ہیں آپ کی دانائیاں،
تیرے دل کی وسعتوں کے سامنے
ہیچ ہیں آفاق کی پنہائیاں

[1] شنکراچارج یا تخت سلیمان۔ سری نگر میں ہزار فٹ اونچی ایک پہاڑی ہے۔ جس پر ایک مندر واقع ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس پہاڑی کو مقدس مقام سمجھتے ہیں۔ ایک مندر کہتا ہے، ایک مسجد!

قتیل پنجابی تھا

مئی کے نگار میں جناب سید اسد علی انوری فریدآبادی کا مضمون "قتیل کا وطن" شایع ہوا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

اپریل ۱۹۲۸ء میں ذکرِ غالب کی اشاعت کے بعد جب میں نے غالب کے متعلقات پر کام شروع کیا تو قدرتاً قتیل کے خاندان و وطن کا مسئلہ بھی میرے سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں متعدد تذکرے دیکھے لیکن مجھے مصحفی کے سوا کسی اور پر اعتبار نہیں ہوا۔ انوری صاحب فرماتے ہیں کہ مصحفی، قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ نہ معلوم انھیں یہ غلط فہمی کیوں ہوئی۔ عقد ثریا کا جو اقتباس انھوں نے دیا ہے اس کا پہلا ہی فقرہ ہے۔ "دراصل نژادش از قوم کھتری بھنڈاری بٹالی بودہ اند"۔ انھوں نے غور نہیں فرمایا۔ اس میں لفظ بٹالی سے ان کا وطن مراد ہے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں نے دوسرے تذکرہ نگاروں پر مصحفی کے بیان کو اس لئے ترجیح دی کہ ان کے قتیل سے نہایت گہرے تعلقات تھے اور عقد ثریا بھی قتیل ہی کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ اس لئے طبعاً میں نے خیال کیا کہ اس باب میں مصحفی کی معلومات زیادہ صحیح ہوں گی۔

بٹالی یا پٹیالی۔ ضلع ایٹہ میں ایک مختصر سا قصبہ ہے اور اس لحاظ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا کہ اسے حضرت امیر خسرو کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میرا ذہن سب سے پہلے اسی طرف گیا لیکن جب میں نے اس جگہ تحقیق کی تو نتیجہ کوئی نہ نکلا۔ یہاں کسی کو مرزا محمد حسن قتیل کا نام تک معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے اصل میں پٹیالہ ہو جو کاتبوں کی مہربانی سے بٹالی بن گیا ہے۔ لیکن پٹیالہ میں پوچھ گچھ کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چونکہ ایک آدھ تذکرہ نویس نے لاہور کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس لئے میں نے یہاں بھی کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی ناکامی! اگرچہ یہ غالب کے سلسلہ میں ایک ضمنی بحث تھی اور میرے اصل موضوع سے چنداں متعلق بھی نہ تھی کہ میں اسے اتنی اہمیت دیتا تاہم مجھے اپنی محنت کے رائگاں جانے کا افسوس ضرور تھا۔ مگر اس سے زیادہ حیرانی مصحفی پر تھی کہ اگر اس بھلے آدمی کو یقین نہیں تھا تو اس نے بٹالی کیوں لکھدیا۔

یوں جستجو کرنے کو تو میں نے پٹیالی تک کی خاک چھانی لیکن اس دوران میں ایک بات رہ رہ کے میرے ذہن میں آتی تھی کہ قتیل کا اصل وطن کہیں پنجاب ہی میں ہے اول اس لئے کہ بھنڈاری خاندان پنجاب کی پیداوار ہے دوسرے قتیل کے والد کا نام درگاہی مل۔ یہ نام ایسا ٹھیٹھ پنجابی ہے کہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کرسکتا تھا کہ وہ دہلی، لکھنؤ یا فریدآباد کے رہنے والے ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس ابتدائی تگ و دو کی ناکامی کے بعد میں خاموش ہوگیا۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں نگار کا مصحفی نمبر شایع ہوا۔ اس میں ایک مضمون مشیر احمد صاحب علوی کاکوروی کا تھا جس میں انھوں نے "تذکرہ ہندی از مصحفی" کے حوالہ سے قتیل کا وطن بٹالہ لکھا تھا۔ یہ بٹالیا کا وجود خارج میں ہے یا نہیں اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اس وقت مجھے اس سے سروکار نہیں لیکن جونہی یہ پرچہ مجھے موصول ہوا میں نے بٹالہ میں ایک دوست کو خط لکھا کہ معلوم کرکے مجھے مطلع کریں کہ کیا وہاں بھنڈاریوں کے خاندان میں کوئی قتیل کو جانتا ہے اور مجھے کامیابی ہوئی۔

بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کا مشہور قصبہ ہے۔ امرتسر سے جو ریلوے لائن پٹھانکوٹ کو جاتی ہے اس پر واقع ہے اور ریلوے جنکشن بھی ہے۔ یہاں کا بھنڈاری خاندان بہت قدیم اور علم دوست خاندان ہے۔ قتیل اسی خاندان سے تھے۔

میں سب سے پہلے ان کے شجرۂ نسب کا ضروری حصہ درج ذیل کرتا ہوں:۔

اچنت رائے

مہر چند
امر سنگھ
چوہڑ مل
رائے انند سنگھ
رائے کشن چند
رائے بھاگ سنگھ
رائے کانشی رام
رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری ایم ۔ اے ۔

صورت سنگھ
دیوان فتح چند
رائے لعل جی مل

درگاہی مل
دیوانی سنگھ (مسلمان شد تخلص مرزا قتیل در لکھنؤ)
جواہر سنگھ (اولادش در لکھنؤ)

بہادر سنگھ
دھونکل سنگھ (اولادش در لکھنؤ)

مجھے یہ شجرہ رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری ایم ۔ اے سے ملا ہے ۔ اصل ان کے پاس موجود ہے ۔ اس شجرہ سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

(۱) قتیل کے خاندان کا اصل وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور ۔ پنجاب) تھا ـــــ (۲) قتیل کا اصل نام دیوانی سنگھ تھا (Diwani Singh) نہ کہ دیوالی سنگھ ـــــ (۳) بٹالہ سے نقل مکان قتیل کے والد درگاہی مل نے نہیں بلکہ ان کے دادا رائے لعل جی مل نے کیا ـــــ (۴) یہ نقل مکان قتیل کی پیدائش کے بعد ہوا ـــــ (۵) قتیل کے سگے بھائی جواہر سنگھ اور چچا کے بیٹے بھائی دھونکل سنگھ دونوں کے ساتھ لکھا ہے " اولادش در لکھنؤ " اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاندان نقل مکان کرنے کے بعد لکھنؤ گیا ہے نہ کہ فرید آباد یا شاہجہاں آباد ـــــ (۶) اس خاندان کا پیشہ شروع سے ملازمت رہا ۔ فارسی کا ذوق بھی پرانا ہے ۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیری عہد کے مشہور مورخ سبحان رائے بھنڈاری بھی جن کی خلاصۃ التواریخ بعض لحاظ سے نہایت بلند پایہ اور بے نظیر کتاب ہے اسی خاندان سے تھے ۔ گمان غالب ہے کہ رائے لعل جی مل بھی لکھنؤ ملازمت کے سلسلہ میں گئے ہوں گے ۔

انورتی صاحب کے بیان کے مطابق اس خاندان کے جو افراد فرید آباد میں موجود ہیں ان کے پاس شجرہ موجود ہے جو درگاہی مل تک ختم ہوتا ہے جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل نے عمر بھر شادی نہیں کی ۔ بس یہ لوگ جواہر سنگھ کی اولاد ہی ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ ممکن ہے بعد میں درگاہی مل یا قتیل اور جواہر سنگھ دونوں بھائی لکھنؤ سے فرید آباد چلے آئے ہوں اور بہادر سنگھ اور دھونکل سنگھ والی شاخ فیض آباد یا لکھنؤ میں رہ گئی ہو ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ لکھنؤ چھوڑ کر فرید آباد کیوں آئے ؟ ۔ اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب رہ گئی ہیں ۔

اول قتیل لکھتے ہیں :۔

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل کم کسے چوں من زیزد و ایرواں برخاست است

اگر وہ بٹالہ میں پیدا ہوئے تھے تو انھوں نے دہلی کو اپنا مولد کیوں کہا ۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ان کی تعلیم و تربیت یعنی معنوی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی اس لئے انھوں نے " سخن گسترانہ " طور پر دہلی کو اپنا جنم بھوم لکھ دیا ۔ اس میں وہ منفرد نہیں ہیں بعض دوسرے شعرا بھی یونہی اپنی جائے تعلیم کی نسبت سے مشہور ہیں ۔ انوری اگرچہ مہنہ یا بدھنہ کا تھا لیکن طوسی مشہور ہوا چونکہ اس کی تعلیم طوس میں ہوئی تھی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دہلی پایۂ تخت ہونے کی وجہ " خاکِ دہلی " سے انھوں نے ہندوستان مراد لیا ہو ـــ دوم مصحفی نے پٹالی کیوں لکھا ۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ اصل میں بٹالوی ہو جو پٹالی بن گیا ۔ یعنی جس طرح مکہ سے مکی اور مدینہ سے مدنی لکھتے ہیں ، اسی طرح بٹالہ سے نسبت کر کے بٹالی لکھ دیا ہو اور دو نقطوں کے اضافہ سے وہ پٹالی ہو گیا ہو ۔ الغرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قتیل کا خاندان بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کا رہنے والا تھا اور قتیل کی پیدائش بھی بٹالہ ہی میں ہوئی ۔

مالک رام ایم ۔ اے

مکتوبات نیاز

صدیقی ۔ خط ملا - پڑھکر ہنسی آگئی - حیرت ہے کہ تیس سال کی ملاقات کے بعد بھی آپ میرا کمزور پہلو نہ جان سکے آپ نے وہ خدمت میرے سپرد فرمائی ہے کہ بنا بنایا کام بھی بگڑ جائے - عورت کے باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انتہائی گنہگار ہونے کے باوجود بھی اُویس و بایزید سے زیادہ معصوم ہے ! یقیناً آسیہ بیگم نے زیادتی کی ہوگی اور آپ کے دوست کو شوہر ہونے کا پورا مزہ چکھا یا ہوگا، لیکن

کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو !

ان حضرت کو کیا سوجھی کہ خواہ مخواہ اپنے کو "قوامون علی النساء" ثابت کرنے کے لئے اُلجھ پڑے

اے حضرت، وہ کسی پیر فقیر کی لڑکی تو ہے نہیں کہ باپ نے سر کا بوجھ اُتارنے کے لئے اس کی شادی کر دی ہو - نسل میں وہ آپ کے دوست سے بہتر، عزت و اقتدار میں وہ آپ کے دوست پر فائق، جاہ و ثروت میں وہ آپ کے دوست سے بڑھی چڑھی اور رہی صورت کا تو ذکر ہی فضول ہے کیونکہ اگر ایک آفتاب ہے تو دوسرا آفتابہ بردار ! - پھر آپ ہی بتائیے کہ اس حالت میں سوائے ایک 'فدوی' قسم کا شوہر بنے رہنے کے چارہ ہی کیا ہے - لیکن آپ کے دوست کی حماقت ملاحظہ کیجئے کہ بیگم سے وہ توقع رکھتے ہیں چاکری کی، کنیز بنے رہنے کی !

میں اس شادی کی تاریخ سے ناواقف نہیں ہوں - آسیہ بیگم کے والد نواب خاقان حسین پُرانی وضع کے بزرگ تھے اور آپ کے دوست (یوسف) کے والد سے ان کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے، جب یوسف کے والد کا انتقال ہونے لگا تو وہ یوسف کو ان کے سپرد کر گئے - انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی مثال اس دُنیا میں شاید ہی کوئی مل سکے

خود حضرت یوسف سے پوچھئے کہ وہ گریجویٹ کس کی بدولت ہوئے، ملازمت انھیں کس کی کوشش سے ملی - رہنے کو کوٹھیاں، سیر کرنے کے لئے موٹریں، کس کے صدقہ میں انھیں میسر آئیں ـــــ حیرت ہے کہ خاقان حسین خان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے - انسانیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ خود آسیہ بیگم کی خدمت کو سعادت سمجھتے نہ یہ کہ ان کو کنیز بنا کر رکھنا چاہتے ہیں - دماغ خراب ہو گیا ہے - کہدیجئے کہ وہ خود آسیہ بیگم سے جا کر معافی چاہیں مجھے بیچ میں نہ ڈالئے، ورنہ میں گیا تو یوسف کے خلاف ان کا جذبہ اور زیادہ مشتعل ہو جائے گا - میں آپ کی اور

پستی کی سب سے بڑی مدد یہی کرسکتا ہوں کہ خاموش رہوں -

مکرمی - ابواب کی تقسیم، عنوانات کی فہرست اور ترتیب کی نوعیت، آپ کے خط سے معلوم ہوگئی - خوب ہے غالب کے متعلق لکھتے رہنے کا لوگوں کو جنون ہوگیا ہے، لیکن اس دفتر بے پایاں میں کام کی باتیں بہت کم ملتی ہیں شرح کے سلسلہ میں تو خیر لوگوں نے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کی ہیں کہ ہنسی آتی ہے، لیکن تذکرہ و انتقاد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی ہنوز محتاج تکمیل ہے - آپ کی کتاب مجھے زیادہ کام کی چیز معلوم ہوتی ہے، اسے جلد پورا کرکے چھپوا دیجئے

آپ نے چونکہ مشورہ کا شدید تقاضہ کیا ہے - اس لئے "کچھ نہ کچھ کہنے" کے طور پر کہوں گا کہ انتقاد کے سلسلہ میں نفسیاتی پہلو کو آپ نے بھی نظر انداز کر دیا

نقد و تبصرہ کے دو پہلو ہیں، ایک کا تعلق نقاد کے زاویۂ نگاہ سے ہے (اور اسی کو سامنے رکھ کر لوگ زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں) دوسرا پہلو خود شاعر کا نقطۂ نظر ہے اور اس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے

ایک نقاد اسوقت تک صحیح نقد نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنے زمانہ کو چھوڑ کر شاعر کے زمانہ میں نہ پہونچ جائے اور اپنی ہستی سے علحدہ ہوکر شاعر کی ہستی نہ اختیار کرلے - اس کے لئے ایک خاص قسم کے دوربینی (Telescopic) مطالعہ کی ضرورت ہے جو آسان نہیں - مثلاً غالب ہی کو لیجئے کہ جب تک آپ بہادر شاہ کی دلی تک نہ پہونچیں اور غالب کی سی ذہنیت اپنے اوپر طاری نہ کرلیں، اس وقت تک اس کے کلام پر کوئی صحیح تبصرہ نہیں کرسکتے - اسی کو میں نفسیاتی انتقاد کہتا ہوں

اس سلسلہ میں غالب کی ہر غزل، اس کے ہر ہر شعر پر غور کرنا ہوگا یعنی اس کا کلام سامنے رکھ کر ہم کو غالب کی جذباتی زندگی کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنا ہوگی جو اس کے سیاسی، اقتصادی، و تمدنی ماحول سے علحدہ نہ ہو، اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس نے کتنی غزلیں مقررہ طرحوں پر لکھی ہیں اور کتنی غزلوں کی زمین خود اس نے پیدا کی ہے - پھر اگر کوئی زمین خود اس نے پیدا کی ہے تو کیوں ؟ ظاہر ہے کہ پہلے کوئی مصرعہ یا شعر بے اختیار ہوگیا ہوگا اور پھر اس پر غزل کہی ہوگی - مثلاً مشکل زمینوں میں غالب کی ایک مشہور غزل ہے - "زبوں وہ بھی - خوں وہ بھی" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لئے پہلے کوئی طرح مقرر ہوچکی تھی بلکہ خود غالب کی پیدا کی ہوئی زمین معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ زمین کیوں اس کے ذہن میں آئی - یقیناً پہلے کوئی نہ کوئی شعر یا مصرع بے اختیار ہوگیا ہوگا اور پھر اس پر غزل لکھی ہوگی - اب آپ پوری غزل پڑھ جائیے اور غور کیجئے کہ اس میں کونسا شعر یا مصرعہ بے اختیارانہ نظم ہوگیا ہوگا - میری رائے میں سب سے پہلے مقطع غالب کے ذہن میں آیا ہوگا :-

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے کہ جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مقطع کے بعد اس کو فکر ہوئی ہوگی کہ ردیف و قافیہ کیا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بغیر قافیہ کے صرف بھی، ردیف کو سامنے رکھ کر غزل کہہ ڈالتا، لیکن غالب کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کہوں کو قافیہ قرار دیکر غزل کہنا مشکل نہ تھا، جبکہ زبوں، خوں، واژگوں اور جنوں ایسے اچھے اچھے قافیے سامنے موجود تھے۔ "وہ بھی" (ردیف) کو غالب نے اس غزل میں جس خوبصورتی کے ساتھ نبایا ہے وہ ہر شخص کا کام نہ تھا۔ مطلع کہنا اور زیادہ مشکل تھا۔ لیکن باوجودیکہ دونوں مصرعوں میں ردیف کا تعلق ایک ہی چیز یعنی "دل" سے ہے، لیکن وہ کسی جگہ بیکار نہ ہوئی۔ میں اس غزل کو غالب کی زندگی کا خاص کارنامہ سمجھتا ہوں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں ماحول کا جو رنگ تھا اس سے یہ غزل پوری طرح رچی ہوئی ہے اور غالب کے صحیح جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے

آپ غالب کی مشکل زمینوں میں کوئی نہ کوئی شعر یا مصرعہ ایسا ضرور پائیں گے، جو غزل کی بنیادی چیز ہوگا۔ مثلاً چند مشکل زمینوں کے بنیادی مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

ایک غزل ہے "لیالی نے مجھے"۔ "نہالی نے مجھے"، لیکن اس کا بنیادی مصرعہ یہ ہے :۔

عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

غالب نے بہت کوشش کی وہ اس زمین میں پوری غزل کہہ سکے، لیکن اول تو چار شعر سے زیادہ وہ فکر نہ کر سکا اور جو اشعار کہے وہ بھی کسی قابل نہیں ہیں، یہاں تک کہ اس بنیادی مصرعہ پر بھی کوئی اچھا مصرعہ ہاتھ نہ آیا اس غزل کی ناکامی کا سبب صرف یہ تھا کہ جس جذبہ کے تحت وہ ایک مصرعہ ہوگیا تھا اس کو سنبھالنے والے قافیے دوسرے میسر نہ آسکے اور غزل "برائے گفتن" کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکی

یہی حال بالکل پہلی غزل کا ہے کہ سوائے بنیادی مصرعہ "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" کے اور کوئی شعر یا مصرعہ پیدا نہ ہوسکا

بہرحال کلام غالب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے اور اگر آپ نے کوئی عنوان "نفسیاتی" گفتگو کے لئے الگ کر لیا ہے تو اُس سلسلہ میں یہ بحث بہت پُر لطف رہے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو مطلع فرمایئے کہ آپ نے اس خیال کو پسند کیا یا نہیں!

عزیزی - ہاں، شکر ہے، علیل ہوں اور دماغی تعطیل کا لطف اُٹھا رہا ہوں، آپ کو یہ تمام حالات کیونکر معلوم ہوئے؟ میں نے تو کوشش کی تھی کہ گھر سے باہر کسی کو میری علالت کا علم نہ ہو، یہاں تک کہ

بعض مخصوص احباب و اعزہ کو بھی بے خبر رکھا۔ معلوم ہوتا ہے، آپ نے اپنا کوئی جاسوس میرے یہاں چھوڑ رکھا ہے۔ بہتر ہے۔ اس کی فکر بھی کروں گا

واقعی حالت بڑی تھی اور اب بھی کچھ اچھی نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے قدرت نے پھر چند دن کی مہلت دیدی ہے۔ خیر ــ پرسش حال کا شکرگزار

ارے بھئی، اُن کی کیا ہے

وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

مشکل تو ہماری تمھاری ہے کہ "ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب نہیں"!

تم نے اچھا کیا، اپنی توقعات اُدھر سے ہٹالیں۔ اُن کے اچھے ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن اُن کی اچھائی سے فایدہ اٹھانے کے لئے دل خون کرنے کی فرصت درکار چاہئے!

میری رائے میں زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اظہار رنج و بیزاری کے آپ نہایت خوشدلی کے ساتھ علٰحدہ ہوجائیے۔ ہرچند میں جانتا ہوں وہ حقیقت سمجھ جائیں گے، بلا کے ذہین ہیں۔ تاہم یہ بحث بحثی تو ختم ہوجائے گی

میں خود ان سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا، میرے تمھارے تعلقات سے واقف ہیں، فوراً سمجھ جائیں گے۔ ایک اور صاحب کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو چھیڑوں گا۔ امید تو نہیں کوئی اچھا نتیجہ نکلے، لیکن حرج بھی کیا ہے۔

تمھارا فی الحال کسی بہانہ سے رخصت لیکر چلا آنا بھی مناسب نہیں۔ معاملہ تازہ ہے، وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ بھی ایک قسم کا احتجاج ہے۔ بہرحال چند دن صبر کرو اور میرے دوسرے خط کا انتظار۔

"نگار"

جنوری ــــ سنہ ۴۱ء اور جنوری ــــ سنہ ۴۲ء

کیا کہنا!

وہ کاشمیر وہ اُس کی بہار کیا کہنا
وہ تابنائی لیل و نہار کیا کہنا

کیا ہے سنگ میں پیدا مزاج شیشے کا
بنائے جب ہیں ترے کوہسار کیا کہنا

ہجوم یاسمن و لالہ و بنفشہ سے
زمیں ہے رنگ کا اک حشر زار کیا کہنا

ہر ایک قطرے میں اک جوش ہے ترنم کا
بساط نغمہ ہے، یا جوئبار کیا کہنا

نسیم صبح کی سرگوشیاں شگوفوں سے
چُرا کے بوسہ یکایک فرار! کیا کہنا

مہک رہی ہے دُلھن کی طرح کہیں نرگس
بہک رہا ہے کہیں آبشار کیا کہنا

کبھی ہے چشمک گل میں پیام بیداری
کبھی وداع شکیب و قرار کیا کہنا

چمن سے دور کھلے ہیں چمن سے باغی پھول
پسند آئے کھلے مرغزار کیا کہنا

بجائے زرد کے ہر شاخ ارغوانی ہے
تری خزاں بھی ہے رشک بہار کیا کہنا

تمام حُسن کی دنیا، تمام کیف و سرور
زمانہ بھی ہو اگر سازگار کیا کہنا

رباب شعر پہ گاتا ہوں گیت مستی کے
نہ میں ہوں رند نہ میں بادہ خوار کیا کہنا

اثرؔ کہ شاعری اب تک تھی جسکی محبوبہ
ہوا اداؤں کا تیری شکار، کیا کہنا

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثرؔ

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید علی سجاد مرزا صاحب۔ سہارنپور)

پچھلے مہینے جس غزل تک شرح کلام مومن کا سلسلہ پہونچا ہے اس کے آگے کے اشعار پیش کرتا ہوں۔ توجہ فرمائیے:-

۱۔ ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں ... جاں دادۂ شوخ بے وفا ہوں

دونوں مصرعوں کا کیا تعلق ہے۔ ہجراں میں زیست چاہنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

۲۔ اُٹ کر گئی یاد گرمجوشی ... میں آتش مردہ سے جلا ہوں

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا، گرمجوشی کیسے یاد کر گئی اور آتش مردہ سے جلنا کیا؟

۳۔ کیا شکوہ جفائے آسماں کا ... میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔

۴۔ خود بینی و بیخودی میں ہے فرق ... میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

کم نما ہونا کیا معنی؟

۵۔ مجھ رمز شناس سے یہ باتیں ... کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں

معلوم ہوتا ہے اس شعر میں بہت سے محذوفات ہیں۔

۶۔ ہر دم رہین کشمکش دست یار ہیں ... چاہوں کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں

۷۔ کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں ... جتنے وہ بے حجاب ہوئے ہم شرمسار ہیں

۸۔ عمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو ... دیکھو زمان ہجر کے امیدوار ہیں

۹۔ شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ ... لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

۱۰۔ شب وصل اسکے تغافل کی زہرہ تاب نہیں ... تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

مومن کو شکر خواب کی فرصت کہاں سے مل گئی؟

۱۱۔ دل کا کیا حال کرے دیکھئے یکرخی حسن ... ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

۱۲۔ آہ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں ... جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

۱۳۔ ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے ... صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

۱۴۔ اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال ... دشمن سے سُن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

۱۵۔ باتیں وہ تیری ہوشربا ہیں کہ کیا کہوں ... جو کوئی راز داں ہے مرا راز داں نہیں

دوسرے مصرعہ میں رازداں کا رازداں نہ ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔

۱۶۔ نومیدی جواب ہے کیوں اتنے شوق پر ... یہ کیا ہوا کہ میں ہیں قاصد رواں نہیں

۱۷۔ کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر ... پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

۱۸ - اس کو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر
تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

۱۹ - اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار
دُنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

۲۰ - میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

۲۱ - اُس بُت کی ابتدا ءِ جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

(نگار) - ۱ - ہجر کے زمانہ میں کوئی عاشق زندہ رہنا نہیں چاہتا، لیکن مومن ایسا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک شوخ بے وفا کے عاشق ہیں اور بیوفائی کا انتقام ان میں پیدا ہونا چاہئے۔

۲ - اس شعر کے پہلے مصرعہ کو آپ نے غلط پڑھا۔ یوں پڑھئے: "اُف کر گئی - یادِ گرمجوشی"۔ اُف کر جانا یعنی پھونک جانا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی گرمجوشی کی یاد مجھے پھونک گئی۔ گویا یوں سمجھئے کہ مُردہ آگ نے مجھے جلایا۔ مُردہ آگ اسلئے کہا کہ اب وہ گرمجوشی کہاں ہے۔ صرف اسکی یاد باقی رہ گئی تھی جس نے پھونک کر رکھدیا۔

۳ - میں آسماں کا شکوہ کیا کروں گا، میں خود اپنے آپ کو اس سے زیادہ بلند سمجھتا ہوں، یعنی آسمان کا شکوہ کرنا میری خودداری و عالی حوصلگی کی توہین ہے۔

۴ - "گم نما" ہونا یعنی اپنے آپ کو چھپانا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو صرف خود بینی کی وجہ سے پوری طرح کسی کے سامنے نہیں آتے اور یہاں میں اپنی بیخودی کی وجہ سے خود اپنے آپ سے بھی چھپا ہوا ہوں اس لئے میں اس باب میں تم سے بڑھا ہوا ہوں۔

۵ - محبوب نے مومن سے کہا کہ یہ زمانہ دوستی کا نہیں ہے۔ اس پر مومن نے کہا میں یہ باتیں خوب سمجھتا ہوں۔ کیا میں غیر سے بھی بُرا ہوں کہ اسکے لئے تو زمانہ دوستی کا ہوا اور میرے لئے نہیں۔

۶ - جس طرح عاشق کے ہاتھ گریباں کو تار تار رکھتے ہیں، اسی طرح محبوب کے ہاتھ دامن کو بھی تار تار رکھتے ہیں۔

۷ - محبوب جتنا زیادہ بے حجاب ہوتا ہے، اتنا ہی ہم شرم کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔

۸ - اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے زمانِ ہجر سے زیادہ طویل مدت اور کوئی نہیں ہوتی۔

۹ - مومن کے صحیح رنگ کا شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تنہا میں ہی ستم زدہ نہیں بلکہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں پریشان ہے اور کتاں بھی ماہتاب کے عشق میں سینہ چاک ہے۔ اصل مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو تعلق شبنم و آفتاب، کتاں و ماہتاب میں ہے وہی مجھ میں اور میرے محبوب میں ہے۔

۱۰ - شکر خواب مومن کا نہیں، بلکہ محبوب کا مراد ہے۔

۱۱ - آئینہ سیماب سے طیار کیا جاتا ہے، لیکن گرمیِ حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ آئینہ کے پشت پہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر مومن کو خیال آتا ہے کہ دیکھئے گرمیِ حسن سے اس کے دل کا کیا حال ہو۔ سیماب سے دل کو تشبیہ بھی دیتے ہیں۔

۱۲ - دنیا میں اب ہر جگہ تیرے غم سے فلک شگاف آہیں بلند ہوتی ہیں۔ پہلے یہ فتنے آسمان سے نازل ہوتے تھے اور اب تمہارے دور میں زمین ہی سے اُٹھتے ہیں۔

۱۳ - مومن کا خاص شعر ہے۔ آشیاں کی بربادی مسلم ہے، اس لئے اگر صیاد کی نگاہ اُس طرف نہیں تو بجلی کا ڈر ہے۔

۱۴ - تمہارا مجھ سے وصل میں محبت کا اظہار کرنا باعث خوشی نہیں ہو سکتا کیونکہ رقیب سے تمہاری ناآشنائیوں اور بے وفائیوں کا حال سُن چکا ہوں۔

۱۵ - "رازداں" اس لئے رازداں نہیں کہ تیری ہوشربا باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

۱۶ - شوق کا تقاضہ یہ تھا کہ قاصد کے پیچھے پیچھے مومن خود بھی ساتھ جاتے، لیکن جواب کی طرف سے اتنی مایوسی ہے کہ وہ اس کی ہمت نہ کر سکے۔

۱۷ - جب محبوب کو وفا کا امتحان ہی مقصود نہیں تو پھر کس امید پہ وفا کیجئے۔

۱۸ - تم کہتے ہو میں بدگمان نہیں، حالانکہ اس سے مراد تمہاری صرف یہ ہے کہ میں دھوکے میں آ کر وصال غیر کے معاملہ کو بھول جاؤں۔

۱۹ - دُنیا کی باتیں میری نگاہ میں اتنی حقیر ہیں کہ مجھے اپنی ناکامیوں کا خیال بھی نہیں آتا۔

۲۰ - تمھاری شوخیاں مرنے کے بعد بھی مجھے آسودہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے تم نعش پر آئے ہو۔

۲۱ - جس چیز کو فتنۂ آخر زماں کہتے ہیں وہ اُس بُت کی ابتدا ءِ جوانی ہے۔

وقت کی باتیں

مغربی ایشیا کا قدیم ترین دروازہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے، جرمنی کے تازہ حملہ بہار کی خبر سن کر کوہ قاف کے سورچہ کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار "امرت بازار پتریکا" میں کیا ہے، اُن کا اقتباس یہ ہے:-

"اگر جرمن فوجیں کوہستان قاف کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو داہنے ہاتھ پر انھیں عراق اور ترکی کی سرزمین بائیں ہاتھ پر ہندوستان کا راستہ اور سامنے ایران ملے گا اور اگر وہ تمام موانع کو دور کرنے کے بعد شمالی ایران تک پہونچ گئیں، تو اس میں شک نہیں کہ تمام مغربی ایشیا کے لئے یہ نہایت سخت خطرہ کی بات ہوگی۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جرمنی اور جاپان کے مابین کوئی مفاہمت ہوگئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس مفاہمت کی بنا پر جاپان بحیرۂ عرب اور جبرالٹر تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

جب میں نے جریدہ ہائے کرپٹ پر جرمن حملہ کی خبر سنی تو مجھے خیال آیا کہ دیکھئے تاریخ کس طرح اور کتنی بار اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ تقریباً ... سال قبل مسیح کی بات ہے جب سیتھیا والوں (Scythians) نے اسی کوہستان قاف کی بلندیوں کو عبور کر کے سلطنت اسیریا پر حملہ کیا تھا اور وہاں اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ ہیروڈوٹس نے بھی اس حملہ کی داستان ہمیں سنائی ہے اور توریت میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

دوسو سال کے بعد سائرس اعظم کے زمانہ میں پھر اس سرزمین کو تاریخی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور شمال کی وحشی قومیں پھر قاف کے دروں سے گزر کر لوٹ مار شروع کردیتی ہیں۔

اس کے بعد کئی صدی تک تاریخ خاموش نظر آتی ہے، لیکن پہلی صدی عیسوی میں مشہور عبرانی مورخ یوسیفس پھر مغربی ایشیا کے اس پھاٹک کا ذکر کرتے ہوئے اس کی فوجی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے کئی صدی بعد ایران کے ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں، روما کی فوجوں نے پھر اسی راستے سے حملے شروع کئے اور ۵۲۹ء میں، رومن جنرل بلی سیریس نے اپنی مہم اس طرف روانہ کی۔ اس حملہ کا ذکر پروکوپیس نے کیا ہے جو خود بھی فوج کے ساتھ تھا۔

کوہ قاف گویا ایک بلند نگاہ دیوار ہے جس نے شمال کو جنوب سے بالکل علیحدہ کردیا ہے اور قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ایشیا پر حملہ کرنے کے لئے ہر حملہ آور کو یہ دیوار عبور کرنا پڑتی ہے اور اسی لئے مسیح سے ... سال قبل اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ پھاٹک بند کر کے مغربی ایشیا کو حملوں سے محفوظ کردیا جائے۔

اگر آپ نقشہ کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ مشرق کی طرف بحر کاسپین واقع ہے اور مغرب کی طرف بحر اسود، اور کوہ قاف کا سلسلہ ایک کے ساحل سے شروع ہوکر دوسرے کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ گویا قدرت نے اس پھاٹک کے درمیان ایک بلند دیوار اٹھادی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس دیوار کو عبور کرنے کے صرف دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو بالکل پہاڑ کے درمیان ہوکر ہے جو بعد کو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہوا۔ موجودہ نقشوں میں یہ درہ ولاڈی (ولاڈی کاکز) اور تفلس کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ جب سیتھیا والوں نے اسیریا پر حملہ کیا تھا تو شاید اسی راستہ سے کیا تھا۔ دوسرا راستہ پہاڑ کے مشرقی ڈھلوان حصہ کی طرف سے ہے اور بحر کاسپین کے مغربی ساحل کی طرف اس حصہ تک پہونچتا ہے جسے آج کل ... کہتے ہیں اور سائرس کے زمانہ میں شمال کی وحشی قومیں اسی راستہ سے ساحلی مقاموں پر حملہ کرتی تھیں۔

تاریخ سے یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ کب لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ مسیح سے بہت قبل ایک غیر معمولی انسانی کوشش اس بات کی کی گئی تھی کہ مضبوط دیواریں کھڑی کر کے ان دروں کو بند کردیا جائے۔ یہ دیوار، دیوار چین سے قبل کی چیز ہے اور اس لئے تاریخ میں اپنی قسم کی بالکل پہلی کوشش تھی۔ یہ دیوار لوہے کی بڑی بڑی سلاخوں سے بنائی گئی اور بجائے گارے کے پگھلا ہوا سیسہ استعمال کیا گیا تھا۔ اسی لئے جارجیا والے اسے اب بھی "لوہے کا پھاٹک" کہتے ہیں جس کا ترجمہ ترکی زبان میں "دمر قپو" ہے۔

یہ دیوار تو مغربی ڈھلان کی طرف بنائی گئی تھی، لیکن مشرقی ڈھلان کی طرف بھی ایک دیوار بنانا ضروری تھی، چنانچہ اس طرف بھی ایک دیوار تیار کی گئی جو زیادہ

لمبی تھی۔ الغرض دو دیواریں سمندر کے کنارے سے اٹھائی گئیں جن میں سے ایک دو میل لمبی تھی، اور دوسری پچاس میل۔ ان دونوں دیواروں کا فصل ساحل کے قریب ۵۰۰ گز ہے، لیکن جتنی وہ آگے بڑھتی گئی ہیں ان کا فصل کم ہوتا گیا ہے یہاں تک کہ جب یہ فصل ۲۰۰ گز کا رہ گیا تو اس جگہ ایک قلعہ بنا دیا گیا۔

دربند، آذربیجان کا مشہور شہر انھیں دونوں دیواروں کے درمیان واقع ہے۔ پہلی دیوار میں کسی وقت لوہے کا پھاٹک تھا اور اسی کے اندر سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ شہر کی دوسری جانب بھی آہنی پھاٹک تھا جس سے شمالی درہ بند ہوتا تھا اور اسی لئے اس شہر کا نام ساسانیوں کے زمانہ میں دربند پڑ گیا۔

ساسانیوں کے زمانہ میں اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ شمال کی طرف سے حملہ کرنے والوں کی راہ میں یہی ایک بڑا زبردست قلعہ بند شہر تھا۔ چنانچہ تمام عرب مورخین و جغرافیین نے (مثلاً المقدسی والہمدانی) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ الاصطخری، المسعودی، البیرونی اور یاقوت نے لکھا ہے کہ ساسانی بادشاہ اس مقام کو سلطنت کی کنجی سمجھتے تھے۔

جب عربوں نے اس حصّہ کو ساتویں صدی ہجری میں فتح کیا تو انھوں نے بھی اس مقام کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسے "باب الابواب" اور الباب کے نام سے موسوم کیا، مسعودی اور یاقوت نے اس کا نام باب الترک اور باب الخزر ظاہر کیا ہے۔

یہ دیواریں کس نے طیار کیں۔ تاریخوں کے بیانات اس باب میں بہت مبہم اور مجمل ہیں۔ بعض نے "خسرو انوشیرواں" کا نام بتایا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ جوزیفس نے خسرو سے ۵۰۰ سال پہلے ان دیواروں کا ذکر کیا ہے اور پروکوپیس نے سنہ ۵۲۸ء میں خود ان دیواروں کے دیکھنے کا حال لکھا ہے۔ انوشیرواں کا زمانہ تمام مورخوں نے سنہ ۵۳۱ء اور سنہ ۵۷۹ء کے مابین متعین کیا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دیوار انوشیرواں کی بنوائی ہوئی نہیں ہے۔

جوزیفس اور پروکوپیس کا خیال ہے کہ یہ دیوار سکندر اعظم نے بنوائی تھی، لیکن تاریخی شہادتیں اس کے بھی خلاف ہیں۔ میرے نزدیک یہ دیواریں سائرس اعظم نے سنہ ۵۲۹ - سنہ ۵۵۹ ق۔م میں طیار کرائی تھی ہو سکتا ہے کہ ساسانیوں نے ان کی مرمت کرائی ہو۔ اور انوشیرواں نے ان کو از سر نو تعمیر کرایا ہو۔

دربند کی دونوں دیواریں اٹھارویں صدی کے اخیر تک پائی جاتی تھیں۔ ایک روسی سیاح نے سنہ ۱۷۹۶ء میں خود ان کو دیکھا تھا اور اپنی کتاب میں انکا حال لکھا تھا، لیکن جب ولیم جیکسن سنہ ۱۹۰۴ء میں یہاں گیا تو ایک دیوار کے آثار رہ گئے تھے اور دوسری باقی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد جب میں گیا تو میں نے بھی یہ آثار دیکھے۔ آذربیجان کے مشہور پٹرولی چشمے دربند کے قریب واقع ہیں اور باکو انھیں کے جنوب میں ہے۔ باکو کا اصل نام بادکوبہ تھا (یعنی ہوا کا تباہ کیا ہوا شہر)

قدیم ایرانی اس حصۂ زمین کو "آذر پایگاں" کہتے تھے کیونکہ یہاں کی پٹرول ملی ہوئی مٹی، خشک لکڑی کی طرح فوراً آگ پکڑ لیتی تھی (آذر پایگاں کے معنے ہیں "آگ کا مقدس استھان")۔ عربوں نے اس کو آذربیجان کر دیا۔

زمانہ کے انقلابات نے قاف کے ان دشوار گزار دروں اور راستوں میں بھی بہت سے تغیرات پیدا کر دئے ہیں چنانچہ وہ راستے جو آہنی دیواروں سے بند کر دئے گئے تھے اب وہاں رات دن ریلیں چلتی ہیں جو سیکڑوں مسافروں کو پہاڑ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچاتی رہتی ہیں۔

قاف کا اندرونی حصہ تفریح گاہوں، صحت گاہوں اور معدنی چشموں کی دولت سے بھرا پڑا ہے اور زار کی حکومت کے زمانہ میں جتنی بے توجہی اس طرف اختیار کی گئی تھی، اس کی پوری تلافی اب سوویٹ حکومت نے کر دی ہے۔

اگر جرمن فوجیں اس طرف آئیں تو وہ کدھر سے آئیں گی، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آسان راستہ دربند ہی کا ہے۔

حُر جماعت کے تفصیلی حالات

پچھلے مہینے ہم نے اس جماعت کی بابت ایک مختصر سا نوٹ شایع کیا تھا جو بہت مبہم اور غیر واضح تھا۔ چونکہ اس وقت یہ جماعت جو سندھیوں اور بلوچیوں پر مشتمل ہے عام توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ اس کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پیروں کے جس ادارے سے اس جماعت کا تعلق ہے اُس کا سلسلہ محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ سے ملتا ہے۔ لیکن جس زمانہ سے ان کو حُر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اُس کی ابتدا پچھلی صدی کے وسط سے شروع ہوئی۔ یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ سندھ میں ایک مقام کنگری ہے اور وہی اس ادارے کا مرکز رہا ہے۔ جب پچھلی صدی میں حزب اللہ شاہ کنگری میں اپنے باپ کے جانشین قرار پائے تو انھوں نے ضلع حیدرآباد میں اپنا خلیفہ ایک شخص غلام نبی کو مقرر کیا، لیکن ضلع حیدرآباد کے دوسرے حصہ میں حزب اللہ شاہ کے عم زاد بھائی، پیر فضل اللہ شاہ بہت پہلے سے اپنا اثر جمائے ہوئے تھے، اور اپنی پرہیزگاری خوش بیانی

وغیرہ کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ یہ بات حزب اللہ شاہ کو کچھ پسند نہ آئی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۵ء کے ماہ رمضان میں پیر فضل اللہ شاہ کو گاؤں کی مسجد میں قتل کر دیا گیا۔ حزب اللہ شاہ اور غلام نبی دونوں کے خلاف مقدمہ چلا لیکن یہ سزا سے بچ گئے اور ان کے ایک عزیز کو ان کے عوض سزائے موت بھگتنا پڑی۔

خلیفہ غلام نبی چونکہ حزب اللہ شاہ کے بڑے وفادار ارادت مند تھے اس لئے اُن کو حُر کے لقب سے سرفراز کیا گیا (حُر سے مراد وہ مشہور ہستی ہے جو امام حسین کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے تھے)

خلیفہ غلام نبی نے یہ لقب پانے کے بعد ایک جماعت اسی نام سے قایم کی جس کی صورت تقریباً حسن بن صباح کی باطنی جماعت کی سی تھی۔ اس جماعت میں بکثرت سندھی اور بلوچی قبائل شریک ہونے لگے کیونکہ یہ جماعت ایک زبردست اخوت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کر رہی تھی اور بہت سے آوارہ اور جرائم پیشہ لوگ اس جماعت میں شریک ہو کر بہت سے ناجائز فائدے اُٹھا سکتے تھے۔

جب یہ جماعت اپنی دراز دستیوں کی وجہ سے بہت بدنام ہونے لگی تو پیر حزب اللہ شاہ کے ماموں کرم علی شاہ نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کرم علی شاہ کو خود مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۸۹۳ء کا ہے۔ اس کے بعد ایک شخص محمد صالح نے پھر اسی قسم کی اصلاحی کوشش کی لیکن ۱۸۹۳ء میں وہ بھی فنا کر دیا گیا۔ پھر ۱۸۹۸ء میں پیر حزب اللہ کے ایک معتمد ارادت مند نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا لیکن ان کا بھی وہی حشر ہوا رفتہ رفتہ اس جماعت کی ذہنیت زیادہ مجرمانہ صورت اختیار کرنے لگی چنانچہ موجودہ صدی کے اول بیس سال کے اندر صوبہ سندھ کے تمام اطراف میں انھوں نے غارتگری شروع کر دی اور یہاں تک کہ قتل اور ڈکیتی کے الزام میں خود پیر بھی ماخوذ ہوئے لیکن سزا سے بچ گئے۔ البتہ ان کے سوا ذاتی خادموں کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

اس وقت اس جماعت کے پیر صبغت اللہ شاہ جو پیر پگارو کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں اپنے باپ کے جانشین قرار پائے۔ سندھ میں ایک پُرانی پیشین گوئی چلی آتی ہے کہ یہاں کا ایک پیر جو چھکپ رو ہو گا ایک دن سندھ کا بادشاہ بنے گا۔ چونکہ پیر صبغت اللہ چھکپ رو ہیں اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی ان ہی کی ذات سے پوری ہونا ہے۔

جب ۱۹۳۰ء میں اس جماعت کے خلاف شکایتیں بہت بڑھیں تو سکھر کے اعلیٰ پولیس افسر نے پیر کے جائے قیام پر جسے کوٹ کہتے ہیں اور جو ریاست خیرپور میں واقع ہے دھاوا کیا اور کافی تعداد اسلحہ اور گولی بارود کی برآمد کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیر صبغت اللہ آٹھ سال کے لئے جیل بھیجدئے گئے اور دو ہزار روپئے جرمانہ ہوا جب ۱۹۳۶ء میں یہ سزائے قید بھگت کر واپس آئے تو اپنا اقتدار دوبارہ قایم کرنے کے لئے بیج کرنے چلے گئے۔ حالانکہ ان کے مرید بدستور ان کے غلام تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں صوبوں کو خودمختارانہ حکومت کے اختیارات دئے گئے تو اس سلسلہ میں پیر پگارو کو بھی کچھ سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

پیر پگارو کے متبعین میں علاوہ حُروں کے ایک جماعت اور بھی ہے جو شریعت اسلامی کی کافی پابند ہے اور کافی امن پسند ہے۔ پیر پگارو کے ماننے والے تمام اس حصۂ زمین پر پائے جاتے ہیں جو سکھر کے جنوب سے ریاست خیرپور اور سندھ کے دوسرے اضلاع تک پھیلا ہوا ہے چونکہ نئے ریفارم میں رائے عامّہ حاصل کرنے کا سوال تھا اور پیر پگارو کے ہزاروں مرید اُسی شخص کو رائے دے سکتے تھے جنھیں پیر صاحب پسند کریں اس لئے ان کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

پیر پگارو نے اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر اپنے مریدوں کی تنظیم زیادہ وسیع پیمانہ پر شروع کر دی اور جانبازی کا حلف لوگوں سے لینا شروع کیا۔ ایسے لوگوں کو غازی کے نام سے یاد کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان غازیوں کی تعداد چھ ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنا مرکز خیرپور کے جنگلوں کو قرار دیا اور وہیں ان لوگوں کو فوجی تعلیم و تربیت دی جانے لگی لیکن جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ حکومت سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ حکومت کے لئے سول گارڈ کی جماعت طیار کر رہے ہیں اور دس ہزار روپیہ وار فنڈ میں بھی دیا۔ اس کے بعد بھی غازیوں کی بھرتی برابر جاری رہی اور اُن کی فوجی تربیت میں زیادہ انہماک سے کام لیا جانے لگا۔

اس جماعت کے افراد ایک سو پچاس مربع میل سے زیادہ صحرائی رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور گاؤں والے ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی گرفتاری آسان نہیں ہے۔ باوجودیکہ اس وقت وہاں مارشل لا جاری ہے کہا جاتا ہے کہ اس جماعت کے استیصال کے لئے مہینوں درکار ہیں۔

اعتبارات

شاید میں نے یہ سب کچھ خواب میں سنا:۔

فلسفی :۔ خدا کا تصور زمان و مکان کی قید کے ساتھ، آئنسٹائن کے فلسفۂ اضافیت کی طرح ہمارے تصور و خیال میں بھی انحنا چاہتا ہے۔ خدا کے ماضی کا تصور ہم طبقات الارض کے ذریعہ سے کرتے ہیں، حال کا تصور اخلاقیات کی وساطت سے اور مستقبل کا مابعد الطبیعیات کے وسیلہ سے! ۔ کس قدر عجیب بات ہے! ۔۔۔ حالانکہ خالق و مخلوق کے درمیان جو حقیقی رشتہ ہونا چاہیئے، اس پر ان باتوں سے مطلق روشنی نہیں پڑتی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زاویۂ نگاہ جس سے کائنات کے پیدا کرنے والے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا اور اسی زاویہ کی جستجو انسان کا فرض اولین ہے ۔

مذہبی عالم :۔ انحنا ۔ طبقات الارض ۔ مابعد الطبیعیات ۔ زاویۂ نگاہ !۔ یہ کیا بکواس ہے ۔۔۔!

خدا ۔ زبردست قدرت و جبروت والا خدا ۔۔ جو چاہے کرنے والا اور کسی سے بازپرس نہ کیا جا سکنے والا خدا ۔۔ بغیر کسی حجت و دلیل کے مانا جانے والا خدا ۔۔ اپنے قہر و غضب سے نافرمان انسان کو آتشِ جہنم میں جلا سکنے والا خدا ۔۔۔ اور اگر خوش ہو تو فردوس کی لازوال شیرینیوں اور لذتوں سے مالا مال کر دینے والا خدا ۔۔۔ اکتنا صاف، سادہ اور سلجھا ہوا عقیدہ ۔۔۔ مگر تمھاری سمجھ میں نہیں آتا ۔ کتنے بدنصیب انسان ہو ۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید زاویۂ نگاہ کی جستجو ہی تمھیں جہنم کے گوشہ میں لے جائے گی ۔

صوفی :۔ جستجو بری چیز نہیں ۔ لیکن جس طرح مادیات کی جستجو سے خدا نہیں مل سکتا، اسی طرح اُسے ہم فردوس و جہنم میں بھی نہیں پا سکتے ۔ خدا نام ہے "ہمہ اوست" اور "ہمہ از دست" کا ۔ مگر اس کا علم "فنا فی الشیخ" کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

جس طرح خدا فلسفی کے فلسفہ سے بلند ہے، اسی طرح مذہب کی ظاہری قیود سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے ۔ قلب پر لا الہ کی ضربیں لگاؤ تاکہ سویدائے قلب میں لطیفۂ غیبی سے روشنی پیدا ہو اور تم خدا کو دیکھ سکو ۔

سائنس داں :۔ میں نہیں سمجھتا کہ خدا کو سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ مہربانی کرکے آپ لوگ یہاں سے چلے جائیے ۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے، میں سوچ رہا تھا کہ فضا میں کون کونسی شعاعیں ایسی موجود ہیں جن سے ہم دشمن کو میلوں دور بیٹھکر ہلاک کر سکتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ شعاع قریب قریب دریافت کر لی ہے ۔

ناگہاں ایک شخص یہ شعر گنگناتا ہوا ادھر سے گزرا :۔

خدا کو چار دیوار حرم میں ڈھونڈھنے والے
اِدھر آئیں، ذرا دیکھیں مرے ٹوٹے ہوئے دل کو

میری آنکھ کھُل گئی ۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔

[illegible]

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲- مادئین کا مذہب
۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)
علاوہ محصول

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)
علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ ر)
علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عا ر) علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ — معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء

اور

جنوری سنہ ۳۶ء

بالکل ختم ہوگئے ہیں، جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی اُنکے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کرسکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

جنوری سنہ ۳[illegible]ء

[illegible] اسحاب کہف [illegible] آسکر وائلڈ [illegible] ساره بر[illegible] اور مسئلہ [illegible] و امامت پر پانچواں مقالہ ایک [illegible] شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر [illegible] قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے [illegible] اسحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ [illegible] انشاپردازی کا نمونہ ہیں۔ [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ [illegible] دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ — قیمت تین روپیہ (سعہ) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی۔ [illegible] مصحفی کا رتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۴۳

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۴۰

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

[illegible] تذکرہ [illegible] اس وقت کے تمام مشہور [illegible] شعراء نے خود اپنے حالات [illegible] اور خود اپنے کلام کا انتخاب [illegible] اسی کے ساتھ ایک مقالہ [illegible]

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴[illegible]ء

[illegible] ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے ان شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جنکی غزلوں کا انتخاب [illegible] میں شائع ہوا [illegible] جنوری سنہ ۴[illegible] کا اور اُنکے ساتھ ہی [illegible] [illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶



قیمت فی کاپی ۸ ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، اسکی تخئیل، اس کی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے [illegible] ۳۳ تک کے [illegible]

علاوہ محصول

[illegible] میں — قدرت بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ/)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ [illegible] نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ۸/)

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہوگیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔

قیمت آٹھ آنے ۔ علاوہ محصول

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ | فہرست مضامین اگست سنہ ۴۲ء | شمارہ ۲

ملاحظات

رفتار جنگ

پچھلے مہینہ جس وقت ہم نے لڑائی پر تبصرہ کیا ہے، حالت یہ تھی کہ سباسٹپول پر جرمنی کی یلغار جاری تھی اور روسیوں کی طرف سے سخت مدافعت ہو رہی تھی۔ مصر میں طبروق کے بعد مطروح کو بھی انگریزوں نے خالی کر دیا تھا اور اسکندریہ خطرہ کے حدود میں آچکا تھا۔ اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے سباسٹپول کی طرف سے اتنا اندیشہ نہ تھا، جتنا اسکندریہ کی طرف سے، لیکن نتیجہ اس کے بالکل خلاف ظاہر ہوا۔ یعنی روس کی طرف نہ صرف یہ کہ سباسٹپول بلکہ رسٹوف اور بعض دوسرے اہم مقامات پر بھی جرمن قبضہ ہو گیا اور مصر کی طرف العالمین سے آگے نازیوں نے کوئی اقدام نہیں کیا، یا یہ کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے — بہر حال جون کے مہینے جو صورت حال سامنے تھی وہ جولائی میں بہت کچھ بدل گئی اور یہ تبدیلی یقیناً ایسی نہیں ہے کہ آیندہ کسی خوشگوار نتیجہ کی توقع کر سکیں

جیسا کہ ہم پچھلے مہینے ظاہر کر چکے ہیں، روس پر حملہ کرنے سے نازیوں کی وہ تمنا تو پوری نہ ہو سکی جو انھوں نے پچھلے سال قایم کی تھی، لیکن روس بھی باوجود انتہائی مدافعت کے نازی سیلاب کو روک نہ سکا اور اگر فرق ہوا تو صرف اس قدر کہ پہلے سیلاب کا پورا زور ماسکو اور لینن گراڈ کی طرف تھا اب اس کا رُخ قفقاز کی جانب ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ ظاہر ہے، کیونکہ جرمنی پٹرول کی کمی کو اب سختی کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور اس نے سمجھ لیا ہے کہ جب تک وہ ایران، عراق اور باکو کے پٹرولی چشموں پر قابض نہ ہو، لڑائی جاری رکھنا اس کے لئے ناممکن ہے اس طرح گویا لڑائی کا مرکز ثقل اب

وپ سے ہشکر مشرق وسطی پہونچ گیا ہے اور نازی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اب صرف قفقاز اور مصر کی جنگ پر ہے

اس وقت نقشۂ جنگ یہ ہے کہ جرمن فوجیں کریمیا کے سارے علاقہ پر قابض ہو کر قفقاز کے شمالی حصے میں پھیل گئی ہیں اور روسٹوف، استراخان اور اسٹالن گراڈ کے مابین جو مثلث نظر آتا ہے اس پر چھا جانا چاہتی ہیں

روسٹوف دریائے ڈون کے دہانہ پر بحر ازوف کے ساحل کے قریب واقع ہے اور روس کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ پانچ لاکھ سے زیادہ اس کی آبادی ہے اور ایک بڑے تجارتی مرکز ہونے کی حیثیت بھی اسے حاصل ہے۔ اس شہر کا جرمن قبضہ میں چلا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک طرف اس کی فتوحات کریمیا مستحکم ہو گئیں اور دوسری طرف قفقاز کا علاقہ اس کی دسترس سے قریب ہو گیا

لڑائی میں دریاؤں اور پہاڑوں کا عبور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن روسٹو کے فتح ہو جانے سے جرمن فوجوں کو دریائے ڈون کا عبور کرنا آسان ہو گیا، چنانچہ تازہ ترین خبروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ نازی فوجیں شمالی قفقاز میں اُس مثلثی حصہ کے اندر جو روسٹوف، اسٹالن گراڈ اور استراخان کے مابین واقع ہے، پھیلتی جا رہی ہیں اور چونکہ یہ علاقہ میدانی ہے اس لئے ان کو روکنا بھی آسان نہیں

اسٹالن گراڈ، روس کا مشہور شہر اور ٹینک سازی کا بڑا مرکز ہے، یہ دریائے والگا کے ساحل پر واقع ہے اور آبادی ۴ لاکھ کے قریب ہے۔ استراخان والگا کے دہانہ اور بحر کاسپین کے ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اور زیادہ اہم ہے

اس لئے اب لڑائی ایسے علاقہ میں ہو رہی ہے جو روس کے شمالی حصہ کو اس کے جنوبی حصہ سے علٰحدہ کرتا ہے اور اگر نازی اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ماسکو کی طرف سے قفقاز تک کوئی مدد آسانی سے نہیں پہونچ سکتی

ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ باکو کے پٹرول تک پہونچنے کے لئے جرمنی کیا راستہ اختیار کرے گا۔ چونکہ باکو بحر کاسپین کے ساحل پر واقع ہے، اس لئے براہ استراخان وہاں تک بحری راستہ سے بھی پہونچ سکتے ہیں، لیکن چونکہ جرمنی کا کوئی جہاز بحر کاسپین میں نہیں ہے، اس لئے بظاہر اس کا امکان نہیں کہ وہ یہ راستہ اختیار کرے گا۔ دوسرا راستہ بحر کاسپین کے کنارے کنارے داغستان ہوتا ہوا گیا ہے، لیکن اس راستہ میں علاوہ دریاؤں کے کوہستانی موانع بھی حایل ہیں۔ ایک تیسرا راستہ طفلس ہو کر ہے، لیکن چونکہ یہ راستہ کوہستان قاف کے دشوار گزار دروں سے ہو کر گیا ہے اس لئے یہاں موانع اور زیادہ سنگین ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ روس کی حالت بہت نازک ہے اور خطرہ نہایت تیزی کے ساتھ عراق و ایران کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور اب اس کا مداوا مشکل ہے

ہرچند روسی مورچہ پر کامیابی کی وجہ سے جرمنی کی توقعات بلند ہو گئی ہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ باکو اور ایران کے تیل تک پہونچکر یہ آبحیات حاصل کرنا بہت دشوار ہے، کیونکہ اگر شمالی روس سے کوئی مدد نہ پہونچے، تو بھی ایران و عراق میں اتحادی طیاریاں بہت زبردست ہیں اور ان سے عہدہ بر آ ہونا آسان نہیں

اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ جرمنی کے سامنے اسکندریہ اور نہر سویز کا بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک اس طرف سے بحر روم کا دروازہ بند نہ کر دیا جائے، قفقاز اور عراق و ایران تک اتحادی مدد برابر پہونچتی رہے گی اس لئے یہ بات مشکل سے باور کیجا سکتی ہے کہ وہ مصر کی جنگ کو موجودہ معلق حالت میں چھوڑ کر قفقاز پر حملہ کر دے گا

اس کی اسکیم یقیناً یہی تھی کہ محوری قینچی کی ایک نوک روس کی طرف سے اور دوسری نوک فلسطین و شام کی طرف سے آ کر عراق و قفقاز کے پٹرولی چشموں تک پہونچ جائے، اس لئے اگر مصر کے مورچہ پر جو ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے، تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی اسکیم بدل گئی ہے، وہ یقیناً اسکندریہ کی طرف حملہ کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس حملہ کا وقت وہی ہو جو اس نے حملۂ قفقاز کے لئے مقرر کیا ہے

بہر حال اس میں شک نہیں کہ جنگ اب اُس نقطہ پہ پہونچ گئی ہے، جو فریقین کے مستقبل کو واضح کر کے بجائے اوہام و شکوک کے تیقنات کے حدود متعین کر دینے والا ثابت ہوگا اور موجودہ دو بذبذب ختم ہو جائے گا

دوسرا محاذ | اس سلسلہ میں ہم کو اتحادیوں کی تدابیر پر بھی غور کرنا چاہئے۔ جس حد تک انگلستان کے عزم و ارادہ اور امریکہ کی اسلحہ سازی کا

تعلق ہے، ہم کو نتیجہ کی طرف سے مطمئن رہنے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن دشمن کو حقیر سمجھنا بھی خلاف احتیاط و دانشمندی ہے -

جرمنی کو روس کے مورچہ پر جو کامیابیاں ہو رہی ہیں، وہ انگلستان و امریکہ میں، کوئی قنوطی کیفیت پیدا نہ کریں، لیکن خود روس کی آبادی پراس خراب اثر پڑنا بالکل قدرتی بات ہے اور اسی لئے روس کی سب سے بڑی خواہش اس وقت یہ ہے کہ جرمنی کے خلاف کوئی اور محاذ قایم کر کے تفقاز کی طرف سے اس کے دباؤ کو کم کیا جائے

برطانیہ و امریکہ بھی اصولاً اس کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ محاذ کہاں اور کیونکر قایم کیا جائے - اس کے جواب میں کہا جا سکتا کہ یوروپ کا ہر وہ علاقہ جس پر نازیوں کا قبضہ ہے اور مشرق کا ہر وہ حصہ جہاں جاپان قابض ہے، محاذ بن سکتا ہے۔ لیکن یہ جواب اس شخص کا ہو ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھکر حکم لگاتا جاتا ہے

یہ درست ہے کہ روس و برطانیہ کے مابین جو معاہدہ حال ہی میں ہوا ہے، اُس کی رو سے بھی اخلاقاً دوسرا محاذ قایم کرنا ضروری ہے، لیکن کب ا کس طرح " کا فیصلہ - ن واقعات و حالات پر منحصر ہے - برطانیہ اس وقت جن مشکلات میں مبتلا ہے اور جن اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اس کو سنبھالنا پڑ ہے، اس کو دوسرے آسانی سے نہیں سمجھ سکتے - روزانہ کروروں پونڈ مصارف کے علاوہ اور بہت سی اقتصادی و سیاسی اُلجھنیں ایسی ہیں جن کو صرف حکومت ہی سمجھ سکتی ہے، چنانچہ ایلڈرشاٹ نے اپنی ایک تقریر میں اس کا اظہار کیا ہے کہ :-

" اس وقت ہمارے سامنے بڑے خطرات موجود ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ آیندہ دو تین مہینے ہمارے لئے بہت زیادہ پُر خطر ہیں"

انھوں نے وادی ڈان کی لڑائی اور بحر اٹلانٹک میں جرمن آبدوزوں کی نقل و حرکت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے مشرق میں پھر کوئی تازہ زلزلہ نمودار ہو جائے - انھوں نے روس کو مدد پہونچانے کے سلسلہ میں یہ بھی بتایا کہ اس وقت تک جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ اپنی قوت ضرورتوں کے لحاظ سے بہت زیادہ کیا ہے اور اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے

یہ الفاظ برطانیہ کی ایک ذمہ دار ہستی کے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرا محاذ قایم کرنے کے لئے ابھی برطانیہ طیار نہیں ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی نہ نکالنا چاہئے کہ حالات کے موافق ہونے کے بعد بھی دوسرا محاذ قایم نہ کیا جائے گا - ہو سکتا ہے کہ سال آیندہ تک حالات مساعد ہو جائیں یہ کہنا مشکل ہے کہ اسوقت تک روس نازیوں کے موجودہ دباؤ کو اس حد تک برداشت کر سکے گا یا نہیں کہ دوسرا محاذ اس کی خستگی کا علاج ہو سکے .

جاپان

جاپان نے فتح برما کے بعد جیسا کہ خیال تھا، ہندوستان کا رُخ نہیں کیا، اس کا ایک سبب موسم کی خرابی بھی ہو سکتا ہے، لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ چین کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر ہندوستان کی طرف کوئی قدم اُٹھا ہی نہیں سکتا اور اسی لئے اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس جھگڑے کو ختم کر دینا چاہئے

پانچواں سال ہے کہ چین، جاپان سے لڑ رہا ہے اور ابھی تک لڑائی نتیجہ خیز منزل تک نہیں پہونچی - برما کی سڑک جاپانی قبضہ میں چلے جانے کی وجہ سے، چین کو جس آسانی سے برطانوی و امریکی مدد پہونچ سکتی تھی، اب نہیں پہونچ سکتی - اسی لئے جاپانی اقدامات اب زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، لیکن چینی خارزار ایسا نہیں جس سے جاپانی دامن بغیر تار تار ہوئے علحدہ ہو سکے، اور ان حالات میں جاپان کی طرف سے یہ اندیشہ کم ہے کہ وہ ہندوستان یا سائبیریا پر حملہ کر دے گا

گو جاپان محوری حلقہ میں شامل ہے لیکن آجکل حکومتوں کی دوستی بالکل بے بنیاد چیز ہے - جرمنی تو بہت عرصہ سے جاپان کو سائبیریا پر حملہ کرنے کیجانب متوجہ کر رہا ہے، لیکن جاپان سمجھتا ہے کہ اس طرح امریکی خطرہ کو خاص ٹوکیو کے اندر دعوت دینا ہے اور باوجود اس کے کہ منچوریا میں اس کی فوجوں کا کافی اجتماع پایا جاتا ہے، اس نے سائبیریا پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی

ہر چند یہ درست ہے کہ روس کی فوج کا کافی حصہ صرف اس اندیشہ سے کہ مبادا جاپان کسی وقت اس پر حملہ کر دے، سائبیریا کی طرف پھنسا ہوا لیکن اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو بھی سائبیریا میں روسی افواج کا رہنا ضروری تھا، اس لئے اس کا اثر روس کے مغربی محاذ پر نہیں پڑ سکتا - البتہ اگر جاپان حملہ کر دے تو مغربی محاذ کی فوجوں کو بیشک مشرق کی طرف منتقل کرنا پڑے گا اور یہ صورت بُری ہوگی

بہر حال موجودہ حالات روس کے لئے ناموافق ہیں اور مستقبل قریب میں بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی نظر نہیں آتی، لیکن لڑائیوں میں ہوا کا خ پلٹتے دیر نہیں لگتی

پچھلے سال ماسکو اور لینن گراڈ کے دروازوں تک پہونچکر نازی فوجیں مایوس و ناکام واپس آئیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ امسال قفقاز میں بھی ہی صورت پیش آئے۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کرلیں کہ ایران و عراق، فلسطین و شام اور مصر و ہندوستان کی زبردست طیاریاں بھی زی خطرات کو مشرق سے دور نہ رکھ سکیں گی اور ہٹلر پوری جرمن آبادی کی قربانی پیش کرکے باکو و عراق تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جائے گا تو بھی تسی حکومت اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر بفرضِ محال عراق و ایران وغیرہ کے پٹرولی چشموں تک اس کی رسائی ہو بھی گئی تو وہاں سے کیا ملے گا اور اس کی فوری ضرورتیں جو صرف پٹرول ہی کے حصول سے پوری ہوسکتی ہیں، کسی طرح پوری نہ ہوسکیں گی

اگر جاپان ڈچ ایسٹ انڈیز اور برما کے پٹرولی ذخیرہ سے کوئی فایدہ اُٹھا سکا ہے، تو جرمنی کے لئے بھی اس کا امکان ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جب کسی پٹرولی علاقہ میں آگ لگا دیجاتی ہے تو پھر دوبارہ وہاں سے پٹرول حاصل کرنا برسوں کا کام ہے

اس میں بالکل شبہ کی گنجایش نہیں کہ جرمنی کو پٹرول کی سخت ضرورت ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر امسال اسے پٹرول حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو اسے ہتھیار ڈال دینے پڑیں گے اور اسی لئے وہ اپنی پوری طاقت قفقاز کی طرف صرف کر رہا ہے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا وہ قفقاز تک پہونچنے کے بعد بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے برطانیہ اور امریکہ دونوں پٹرولی ذخیرہ کے لحاظ سے اتنی دولت مند ہیں کہ اگر لڑائی دس سال تک جاری رہے تو بھی پٹرول کی کمی کی وجہ سے ان کو شکست نہیں ہوسکتی۔ پھر ایسی صورت میں کہ لڑائی کا انحصار صرف پٹرول پر ہے، ہم آسانی سے نتیجہ کے متعلق حکم لگا سکتے ہیں بشرطِ آنکہ کوئی اور غیر معمولی اسباب حالات میں غیر معمولی تبدیلی نہ پیدا کردیں!

گاندھی جی کی نئی تحریک

جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے بعد غالباً اگست میں شروع ہوجائے گی، اپنی عملی تفصیل کے لحاظ سے ابھی تک پردۂ خفا میں ہے، لیکن اُصول کے لحاظ سے اس کا علم سب کو ہوچکا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد برطانوی حکومت سے اپنے آپ کو علحدہ کرنا ہے، لیکن بالکل دوستانہ طریقہ سے، دشمنی کے اُصول پر نہیں! یعنی اُن سے یہ کہا جائے گا کہ وہ حکومت کا پورا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دیدیں اور خود ایک اتحادی کی حیثیت سے محوری حکومتوں کے حملہ سے بچانے میں ہندوستان کی مدد کریں

اس میں شک نہیں کہ مقصد بہت بلند ہے اور آزادی کی تمنا کو بُرا کہنے کی ہمت غلام رکھنے والی قوموں میں بھی نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا برطانیہ اس مطالبہ کو مان لیگا اور اگر نہ مانا تو اہلِ ملک کیا کریں گے؟

اگر انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر محض اخلاقی حیثیت رکھتا تو ممکن تھا وہ ایک مشنری کی طرح اپنے فرایض تبلیغ ادا کرکے ہم کو ہمارے حال چھوڑکر یہاں سے چلے جاتے، لیکن جب ایسا نہیں ہے، تو پھر یہ توقع کیونکر قایم ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے تمام اقتصادی و سیاسی اغراض کی قربانی ہندوستان سے ترکِ تعلق کرلیں گے اور اگر ایسا ہو بھی تو وہ برطانوی و مستعمراتی فوج سے ہندوستان کی مدد کیوں کرنے لگے؟

بحالاتِ موجودہ جبکہ پچھلے دو سال کی برطانوی زیر باریاں ہندوستان میں برطانوی مستقبل سے بھی بڑا تعلق رکھتی ہیں، کانگرس کا مطا آزادی اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ تعریف کیوں نہ ہو، لیکن عملاً "کج دار و مریز" سے زیادہ نہیں

کسی ایسی مفاہمت میں جس کا تعلق ایک طرف محض اخلاق سے ہو اور دوسری طرف مادیت سے، کامیابی کی راہیں کبھی آسانی کے ساتھ ڈھونڈھی جا سکتیں

بہر حال نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دُنیا دھڑکتے ہوئے دل سے اُس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب گاندھی جی کی نئی تحریک شروع ہوگی ہوسکتا ہے کہ اس کا ردِ عمل بجائے سکون کے اور زیادہ اضطراب پیدا کرنے والا ثابت ہو، لیکن جب ایک شخص اپنے آپ کو طوفان میں ڈالدے فیصلہ کرتا ہے تو پھر اس کو سکون و اضطراب کا فلسفہ سمجھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مارکسیّت

سیاسی بحثوں میں اکثر ہمارے کان لفظ مارکسیت سے آشنا ہوتے رہتے ہیں خصوصاً نوجوان طبقہ اس نظریۂ زندگی کو ہر سیاسی، سماجی، ذہنی اور ارتقائی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے جتنے نام لیوا ہیں شاید اتنے ہی اس کے معنی بھی تراش لئے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مارکسیت ایک اقتصادی نظام ہے تو دوسرا اس کو ہر زاویہ نگاہ میں انقلاب سے تعبیر کرتا ہے۔ عامیانہ تشریح یہ ہے کہ اس نظریہ کا بانی یعنی کارل مارکس اشتراکیت کا بادا آدم تھا اور اسی کی پیشین گوئیوں پر عمل پیرا ہو کر لینن نے روس میں انقلاب برپا کیا۔ لیکن شاید ان تمام حضرات کے تعجب کی انتہا نہ رہے جب ان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تمام تشریحات محض فروعی ہیں اور خود نظریۂ مارکسیت کو زمان و مکان میں نہیں گھیرا جا سکتا۔ اس کا قیام مارکس سے بہت پہلے موجود تھا۔

مارکسیت ایک فلسفہ ہے لیکن وہ دیگر فلسفوں سے مختلف ہے۔ دیگر فلسفے ایک حد پر جاکر ختم ہو جاتے ہیں لیکن مارکسیت آگے قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرے فلسفہ مزعومات اور اعتقاد کے گورکھ دھندے ہیں جبکہ مارکسیت تاریخ کی مادی تشریح کا نام ہے۔ بعض حضرات اس کو تاریخ کی اقتصادی تشریح سمجھتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے مارکسیت محض روٹی اور کپڑے کے مسایل میں محدود ہو جائے گا۔ مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اقتصادی نظریات، سیاسی اصول اور عمل کا پروگرام تو محض اس کی شاخیں ہیں چونکہ مارکسیت زندگی کا فلسفہ ہے اس لئے وہ زندگی کے تمام مسایل کا رازدار ہے۔

مارکسیت ایک مادی فلسفہ ہے لیکن مارکسی مادیت عمومی مادیت سے بہت مختلف ہے۔ نہ تو مارکسیت کارل مارکس کی ایجاد کردہ ہے اور نہ کسی ایک فرد نے اسکو بنایا۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پندرھویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تمام سائنسی خیالات انسانی تجربات، افکار اور خیالات کو اکٹھا کیا۔

یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں زبردست ذہنی ہیجان تھا اور خیالات میں سخت انتشار۔ پرانا نظام چولا بدل رہا تھا بلکہ قدیم سماج کے بطن سے ایک نیا بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ انسانی طبیعتوں میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ پرانی تہذیب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات انسانی ذہن کو پسپا رکھنے کی ناکام کوششیں کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ چنانچہ ایسے نظام کی ضرورت تھی جو سماجی جمود اور ذہنی سکرات کو ختم کر دے۔ جب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات کا مطالعہ کریں تو ہمیں پندرھویں اور سولھویں صدی کا پس منظر نہ بھولنا چاہئے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مارکسیت ایک فلسفہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فلسفہ بذات خود کیا شے ہے؟ اس کے جواب میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ شاید ہی دو فلسفی متفق ہوں۔ لیکن اگر ہم فلسفہ کی تاریخ پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کائنات کی مادی تشریح کا نام فلسفہ ہے۔ اگر ہم قدیم ترین فلسفہ کا مطالعہ کریں تو کیا مشرق اور کیا مغرب ہم یہی پائیں گے کہ اس کی بنیاد عقلیت پر تھی وہ انسان کے احول اور اس کے تعلقات کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا لیکن علوم کی کمی اور عقول کی تنگی کے باعث قدم اولاء کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں فطرتاً موجود ہے اور اعتقاد ایک لابدی امر ہے لیکن انسان کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان کی فطرت میں اعتقاد نہ تھا۔ اس کو اسباب علل معلوم کرنے کا شوق تھا اور وہ فطرتاً غیر مقلد تھا۔ اعتقاد کا قیام انسانی ذہن میں اسوقت ہوا جب وہ تنگ نظری اور کم علمی کی وجہ سے کائنات کا تجزیہ نہ کر سکا لیکن ناکامی کا اعتراف اس کی غیرت کے خلاف تھا چنانچہ اس نے اپنی اس نام نہاد ناکامی کو مفروضات کے سلسلہ سے وابستہ کر دیا۔

سائنسی طریقۂ فکر کے سبب مارکسیت ظہور میں آیا "خیال" کے یہ معنی نہیں کہ کسی شے کو فرض کر لیا جائے۔ اگر کسی شے کی جستجو کے لئے مفروضات کی ضرورت ہے تو وہ جستجو زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے نتائج محکم ہوں گے۔ سائنسدان مفروضات اسی وقت مانے گا جب وہ ان کو تجربات و جستجو کی کسوٹی پر پرکھے

زمانہ جدید کے سائنسی خیالات نے کلاسیکی فلسفہ کو ختم کر دیا جو ہزار بارہ سو سال سے یوروپ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی سائنسی خیالات اور عقلیت پہ اسی وقت پورا پورا بھروسہ کیا جائے گا۔ جب ان کو تجربہ کی بنا پر آزما لیا جائے۔ بعض سائنسی مفکر بھی مفروضات اور مابعدالطبیعیات کے چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ کائنات کے تجزیہ میں علوم اور سائنسی آلات کی کمی کی وجہ سے انھیں اب تک ناکامی ہو رہی ہے۔ مارکس سے قبل جدید فلسفہ اسی اُلجھاوے میں پڑا تھا۔ مفکرین پُرانے مفروضات ترک کرکے نئے نئے مفروضات کے چکروں میں پھنس جاتے تھے۔ مثال کے طور کانٹ کو لے لیجئے۔ اس کے فلسفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حد درجہ کا "مستردکن" تھا لیکن لطف یہ کہ پُرانے مابعدالطبیعیاتی عقاید مسترد کرکے اس نے نئے ایجاد کر دئے۔

مارکس نے قدیم فلسفہ کو ختم کر دیا۔ اس نے کہا کہ "خیالات" حقیقت ہیں۔ قدیم فلسفی خیالات کی حقیقت سے انکار کرتے تھے۔ مارکس پہلا مادی تھا جس نے خیالات میں داخلی حقیقت کو دریافت کیا۔ اس نے کہا جب ایک بار بھی خیالات پیدا ہو جائیں اور انسانی ذہن میں ان کا تسلسل قایم ہو جائے تو وہ اتنے ہی اصلی ہوں گے جیسے کوئی طبعی شے۔ چنانچہ اس کے نزدیک "خیالات" طبعی اور مادی ہوتے ہیں ایک اور سوال تھا جس کا جواب مارکس نے دیا "مادہ یا خیال" پہلے کس کا وجود تھا؟ اس کا تعلق انسانی خیالات اور ارتقا سے ہے ہیگل کے مطابق نوع انسان کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک خیال ہمیشہ سے قایم تھا اور مادہ ان ہی خیالات کا ایک سلسلہ تھا۔ یا بالفاظ دیگر ایک وسیلہ۔ لیکن مارکس نے اس سے اختلاف کیا۔ اس نے یہ سوال اُٹھایا کہ "خیالات وجود ہی میں کیونکر آئے"؟ اس نے کہا کہ اگر بقول ہیگل نوع انسانی کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے تو اس کا راز خیال میں مضمر ہوگا جو فلسفہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں ہی "خیال" پیدا ہو جائے گا انسانی کردار اور ارتقا بھی اسی خیال کے زیر اثر رہیں گے جس کے معنے یہ ہوئے کہ انسان ایک خیالی جال میں پھنسا رہے گا اور اس کی تمام حرکات اور عادات، کردار اور ارتقا، سب قایم شدہ خیال کے ماتحت ہوں گے۔ پھر انسان کبھی بھی خیال کی جبریت سے باہر نہیں آسکتا۔ لیکن تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ ان خیالات کی جبریت سے انسان ہمیشہ جد وجہد کرتا رہا ہے۔ دُنیا کا ارتقا ہی اس جبریت سے گریز کے باعث ہوا۔ ہیگل نے تشفی بخش جواب نہیں دیا اور نہ اس نے یہ بتلایا کہ یہ خیال پیدا کیونکر ہوا۔

سائنسی علوم مثلاً بشریات اور علم آثار قدیمہ کے ذریعہ مارکس نے سماج کی ابتدا کی جستجو شروع کی اور وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ انسان کے خیالات زمانے کے طریق پیداوار کے مطابق قایم ہوتے ہیں۔ معاش کی جستجو میں انسان جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ اس کے خیالات کی بھی عکس کشی کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مادہ پہلے اور خیال بعد میں۔ اس نتیجہ نے مسایل زندگی کی بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے موجودہ فلسفی اور سائنسداں مارکس کی اس تشریح کے قایل نہیں ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کے خیالات اسکے ماحول کا آئینہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں بھی بعض قومیں قدیم تہذیب کو سینے سے لگائے ہیں جبکہ ان کی ہمسایہ قومیں تہذیب نو کا گہوارہ ہیں اگر ایک قوم میں جاگیری نظام موجود ہے تو دوسری میں سرمایہ داری اور تیسری میں اشتراکی۔ مارکس کی اس تحقیق کے بعد فلسفہ کے بہت سے مسائل حل ہو گئے اور انسان پہلی بار ایک خیالی غلام کے بجائے تاریخ کے اصلی رنگ روپ میں نظر آیا وہ اپنی ماہیت سے واقف ہوا۔ اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد مارکس نے فلسفہ کی بالکل نئی تعریف کی۔ اس کا قول ہے کہ فلسفہ دنیا کی تشریح ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو بدل بھی سکتا ہے۔ مارکس سے قبل ہر فلسفی نے دنیا کو جوں کا توں مان لیا اور یہ سوال نہیں اُٹھایا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں اور اپنی موجودہ شکل میں کیونکر آئیں۔ جس شکل میں کائنات کے سامنے موجود تھی اور جو جو حرکتیں اشیا میں ہوتی رہتی تھیں انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور ان حرکتوں اور عمل کی تبدیلیوں ہی پر تجربے کرتے رہے کسی نے بھی اس عمل کی وجہ دریافت نہ کی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشیا کے عقب میں کوئی پوشیدہ قوت موجود ہے جو اپنے اشاروں سے دنیا میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے ہر مشاہدہ کی جڑ کسی خیالی بنیاد پر قایم تھی۔ مارکس نے ان تصورات کو مسترد کر دیا۔ بقول اس کے انسان کائنات کی تشریح کر سکتا ہے کیونکہ کائنات کے بنانے میں اس کائنات کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہے۔

فلسفہ کا کام دنیا کی تشریح کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو تبدیل بھی کر دینا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان دُنیا بنا سکتا ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے پیشرو اور قدما نے اس دنیا کو بنایا تھا جس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ نظریہ مذہبی خیالات و افکار کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اعتقاد کو کالعدم کر دیتا ہے۔ مارکس سے قبل تصوراتی فلسفہ نے مذہبی خیالات رد کرکے تقدیریت قایم کر رکھی تھی۔ جس کے بموجب انسان اپنے ماحول کا شکار تھا نہ اس کو اپنے ماحول پر قدرت تھی اور نہ وہ اس کو بدل ہی سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک بہت بڑے خیالی جیل خانے میں بند ہے جس میں ہر کام کسی غیر فطری قوت کے اشاروں

پر ہوتا ہے۔ اور بے چارہ انسان کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہتا ہے۔ مارکس نے اس کہنہ خیال کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی علوم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقا سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان اس ماحول پر ردِ عمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے۔ اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود — چنانچہ وہ اپنے ماحول ہی کا بنانے والا نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا بھی ہے۔

تاریخ کی مادی تشریح کے ذریعہ مارکس نے انسانی ارتقا کی تاریخ از سرِ نو لکھی اس سے پہلے تاریخ چند غیر معتبر واقعات کا مجموعہ تھی۔ لوگوں کو تاریخی واقعات پر اتنا ہی ایمان تھا جیسے خدا پر یا مذہب پر کبھی ان واقعات کی چھان بین نہیں کی گئی۔ اکثر سینہ بہ سینہ صحیح یا غلط واقعات چلے آتے تھے۔ لیکن کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ چونکہ کوئی مورخ ایک واقعہ کو لکھ گیا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ان کا فرض ہو جاتا تھا تمام مذہبی رزمیہ نظمیں اس کے ثبوت میں موجود ہیں۔ مارکس نے تاریخ کو سائنس کا رتبہ دیا۔ جس طرح سے کہ طبعی دنیا کا کوئی امر بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح تاریخی واقعات بھی گزشتہ واقعات کے مرہونِ منت ہیں۔ تاریخ کے اس بنیادی اُصول پر تہذیب و تمدن کا نشو و نما ہوا اور انسانی ارتقائی منازل پر پہونچا۔ لیکن عمل اور ردِ عمل کے بغیر انسان ہرگز ارتقائی منازل پر نہیں پہونچ سکتا۔ اس نے جب ایک نظام قایم کیا تو اس میں یہ بھی اہلیت تھی کہ وہ اس نظام کو تبدیل بھی کر سکے۔ مثلاً اس نے جب جاگیری نظام کی بنیاد ڈالی تو اسی کو اُکھاڑ بھی پھینکا۔ یہ ہے جدلیات کا اُصول جس کو مارکس نے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ کہتا ہے کہ ہر شے میں اس کے عمل اور ردِ عمل کی قوتیں موجود رہتی ہیں۔

مارکس نے اپنے عہد کے سرمایہ داری نظام کو جدلیاتی کسوٹی پر پرکھا۔ اس نے ثابت کیا کہ اس کے عہد سے قبل انسانی ذہنیت، خیالات، علوم و فنون اور انسانی قدریں سب ہی جاگیری سماج کے محور پر گھومتی تھیں لیکن جس وقت جاگیری سماج کے نقائص عیاں ہو گئے۔ پوشیدہ جراثیم اُبھر آئے اور کمزور نظام اپنی افادیت کو کھو چکا تو سرمایہ داری نے اس کو ایک ہی دھکے میں گرا دیا اور روز افزوں انسانی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام قایم کیا۔ لیکن سرمایہ داری نظام میں بھی اس کے ردِ عمل کی قوت پوشیدہ تھی۔ جب تک یہ نظام بنی نوعِ انسان کی ترقی کی شاہراہ بنا رہا زیادہ سے زیادہ لوگ اس پر گامزن رہے لیکن جب اس شاہراہ کی ملکیت سمٹ کر صرف پانچ فیصدی لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو یہ نظام بھی تاریخ کی چکی میں پیس ڈالا گیا اور اشتراکیت کا قیام ہوا مارکسیت کے بموجب اشتراکیت بھی انسانی ترقی کی آخری منزل نہیں ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے۔ بہت سے اشتراکی اور مارکس کی کتابوں کو طوطے کی طرح رٹنے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مارکسیت کے معنے ہیں ایک اشتراکی نظام جس میں اشیا کی ذاتی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت قایم کر دی جائے لیکن ایسے حضرات کنوئیں کے مینڈک کی طرح مارکسیت کو روٹی اور کپڑے ہی کے سوال پر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ توہم پرستی اور ہیرو پرستی، اعتقاد، تنگ نظری قومیت، استبدادیت اور ریاست کا قاطع ہے۔ وہ محض ایک اقتصادی یا سیاسی اُصول ہی نہیں ہے۔ اسکی ہمہ گیری میں زندگی کا ہر پہلو اور معاشرت کا ہر شعبہ کائنات کی تمام اشیا، تاریخ، سائنس اور علوم و فنون سب ہی داخل ہیں لیکن مارکسیت چند سخت اُصولوں کا مجموعہ نہیں ہے نئے نئے انکشافات کے بعد، سائنسی تجربات ہونے پر، تجرباتی آلات کی ترقی سے اور علوم و فنون کی افزایش کے بعد مارکسیت میں ترمیم ہو سکتی ہے مارکس نے نہ تو پیغمبری کا دعوےٰ کیا اور نہ اس نے اپنی پیشین گوئیوں کو اٹل ہی سمجھا۔ تاریخ کے مطالعہ، سماج کے حالات اور سائنسی خیالات کی روشنی میں مظاہر قدرت کی تحقیق و تدقیق کرنے کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ تاریخ میں ہم آہنگی ہے اور دنیا میں تبدیلیاں ایک خاص اُصول پر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نے جو پیشین گوئی کی وہ یہ تھی کہ آیندہ زمانے میں سرمایہ داری کے شکست کھانے اور اشتراکیت کے قایم ہونے کا بہت امکان ہے۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تبدیلی حتماً اسی طرح واقع ہوگی جیسی وہ سمجھتا ہے۔ خاص فاشیزم کے متعلق مارکس کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اُنیسویں صدی کی سرمایہ داری میں اسکا امکان نہ تھا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ دار نے تاریخ اور سائنس سے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ساکھ کچھ دن اور قایم رکھنے کی غرض سے فاشیزم کو عروج دیا۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ مارکس کے زمانہ میں علم طبیعیات ہنوز ابتدائی منازل میں تھا۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کائنات میں مادہ بہت سے طبعی یا مادی تودوں کی شکل میں موجود ہے۔ مارکس کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن زمانہ حال کی تحقیقات نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے۔ جدید سائنس کے مطابق کائنات میں مادہ برقیوں اور پروٹونوں کی شکل میں موجود ہے چنانچہ اگر ہم مارکس کے کہنے پر سختی سے پابند رہیں، تو ہم غیر سائنسی ذہنیت ہیں۔ آج جو مارکسیت کے متعلق

Electron ... Proton پروٹون کا ترجمہ سالمہ ہونا چاہیے (نیاز)

فرض کیا جائے ایک مارکسی خیالات کا انسان ایسے سماج میں منتقل کردیا جائے جس میں ہنوز قدیم نظام قایم ہے۔ . . . . تو ایسا شخص غیر فرقہ وارانہ سماج کا نظریہ رکھتے ہوئے اپنا ماحول بنائے گا اور کوشش کریگا کہ سماج جلد سے جلد درمیانی منازل طے کرکے اشتمالیت قبول کرے۔ خود مارکس نے کمیونسٹ مینفسٹو میں کہا ہے کہ سماج کی نشو ونما بتلاتی ہے کہ سرمایہ داری جلد ختم ہوجائے گی اور دنیا اشتمالیت کی طرف مایل ہوگی لیکن اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں میں مارکس نے ہمیشہ جاگیریت کے خلاف سرمایہ داری کا ساتھ دیا اور کوشش کی کہ جلد سے جلد جاگیریت ختم ہوکر ایک بہتر نظام قایم ہو۔ وہ مانتا تھا کہ سرمایہ داری نظام بھی بنی نوع انسان کے مسائل حل نہیں کرسکتا لیکن جاگیریت کے مقابلہ میں وہ ضرور انقلابی اور مفید تھا۔

مارکس نے یورپ کی سرمایہ داری حکومتوں کا مطالعہ کرکے اشتراکیت کی پیشین گوئی کی تھی لیکن مارکس کے زمانہ میں یورپی قومیں ہندوستان اور چین کے متعلق بہت کم جانتی تھیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ جو کچھ مارکس نے جرمنی، فرانس اور انگلستان کے لئے کہا اور جن جن تبدیلیوں کی پیشین گوئی کی وہ بجنسہ ہندوستان اور چین پر بھی صادق آتی ہیں اور ان ملکوں میں بھی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں بالکل مغربی ممالک کے اصولوں پر ہوں گی سخت نادانی ہے۔ مارکس نے کبھی اپنے قول کو آخری فیصلہ نہیں کہا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ انسانی ترقی اشتمالیت اور غیر فرقہ وارانہ ریاست قایم ہوجانے پر بند ہوجائے گی۔

مارکسیت اعتقاد نہیں ہے۔ مارکس کے بعد دنیا میں سائنس کو کافی ترقی ہوچکی ہے اور ہمیں چاہئے کہ مارکس کے ہر قول کو جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں دیکھ کر اختیار کریں۔

(جامعہ) علی امام ایم۔ اے

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا:۔ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرایڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

الہامات شاد:۔ شاد عظیم آبادی کے رتبہ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت ۸ر علاوہ محصول

اقبال کی شاعری:۔ یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اردو میں اس سے بہتر انتقادی تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ علاوہ محصول

مقام محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت پانچ روپیہ (صہ)

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار کے بعض خاص نمبروں کے متعلق

ضروری اعلان

نگار جنوری سنہ ۳۲ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا اور نگار جنوری سنہ ۳۵ء (اُردو شاعری نمبر) اور نگار جنوری سنہ ۳۶ء بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی اُن کے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کرسکیں گے، لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔ نگار جنوری سنہ ۳۹ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب تین روپیہ فی کاپی اور نگار جنوری سنہ ۳۸ء (ڈرامہ اصحاب کہف) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی لی جائے گی۔

جن حضرات کے پاس سنہ ۳۶ء سے لیکر سنہ ۴۲ء تک کے نمبر نہیں ہیں وہ ابھی سے طلب فرمالیں ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔

مینیجر نگار

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

تیسرا دور

تیسرا دور ۸۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے اور ۵۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور سلطنتِ میدیہ سے متعلق ہے جس کے دو پایۂ تخت ہمدان اور رَے مانے گئے ہیں۔ اس سلطنت کے بادشاہوں کے نام اوپر آچکے ہیں۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جس کا اقتدار علاقۂ ایران کے علاوہ ملک شام تک قائم ہوگیا تھا۔ اہلِ میدیا کے اُس زمانہ کی زبان اور مذہب کے کوئی حالات یقینی طور پر معلوم نہیں۔ یہ لوگ عناصر پرست معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی مندر یا مورتیں نہیں تھیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پرستش کرتے تھے۔ پوجا کرنے والا فرقہ مجوس کہلاتا تھا۔ اُن میں جو لوگ آگ کی پوجا کراتے تھے وہ آتھ رُوان کہلاتے تھے۔ زبان کی کوئی یادگار کتاب یا کتبہ یا سکہ کی شکل میں دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ بعض نے قیاس یہ کیا ہے کہ آوستائی زبان ہی میدیائی زبان تھی۔ لیکن یہ خیال بالعموم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اہلِ تحقیق کی رائے ہے کہ میدیائی زبان قدیم فارسی کے مانند کوئی زبان ہوگی۔ قدیم فارسی کا ذکر آگے آئے گا۔

یہی وہ دور ہے جس میں زردشت کی بعثت قرار دی گئی ہے۔ زردشت کی وفات ۵۸۳ ق م میں بعمر ۷۷ سال مانی گئی ہے اور اُس کا قوم میدیہ کے فرقۂ مجوس سے ہونا اور آذربائیجان (میدیا) کا باشندہ ہونا قرار دیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ زردشت کو اپنے وطنی علاقۂ میدیا میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے ہجرت کی نوبت آئی۔ یہاں پہونچکر وہاں کے مقامی بادشاہ وشتاسپ یا گشتاسپ نے زردشت کے پیش کردہ مذہب کو قبول کیا۔ اسکے بعد یہ مذہب زردشتی ایران کے سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ زردشت سے ایک صحیفۂ ضخیم منسوب ہے جس کو آوست یا آوستا کہتے ہیں۔ پُرانی روایتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ صحیفۂ بزرگ بیلوں کے چمڑوں پر سنہرے حرفوں سے تحریر کیا جاکر اخمنی سلطنت کے اخیر زمانہ میں مرتب کیا گیا تھا اور سکندر کے حملہ کے وقت اصطخر کی تباہی میں ضائع ہوگیا۔ اب اُس کے صرف چند اجزا باقی ہیں جن میں سب سے قدیم وہ حصہ ہے جس کو گاتھا کہتے ہیں۔ اس حصہ کی نسبت محققین کی رائے ہے کہ گو یقین کے ساتھ نہیں مانا جاسکتا کہ وہ خود زردشت کی تصنیف ہے تاہم اس امر کے باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ حصہ مذکور میں زردشت کی اصلی تعلیم کا صحیح خلاصہ درج ہے اور یہ کہ اُس کی زبان علاقۂ میدیا کی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی زبان ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایران کی بعض دیہاتی زبانیں نیز پشتو آوستی زبان سے ہی ماخوذ خیال کی جاتی ہیں۔

چوتھا دور

چوتھا دور اخمنی سلطنت کے آغاز یعنی ۵۵۰ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ کروش علاقۂ ایلام و پارس کا شہزادہ تھا جس نے خروج کرکے میدیا کی سلطنت کو نیست و نابود کیا اور ایک نئی زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اہلِ میدیا ایران کی شمال مغربی قوم تھے اور اب ایران کی جنوبی قوم پارسی نے اقتدار حاصل کیا اور سلطنت کو ہند، یونان و مصر تک وسعت دی۔ اس حکومت کا ابتدائی پایۂ تخت شہر سوسن علاقۂ ایلام میں تھا جس کے اب محض کھنڈر باقی ہیں خروج کرنے کے بعد اس قوم کا دارالسلطنت شہر پارس ہوا جس کو یونانی پرسی پولس کہتے تھے اور ایرانی اصطخر۔ کیسی مابعد زمانہ میں بلخ بھی دارالسلطنت رہا۔ اس قوم کے کئی بادشاہ ہوئے جو شاہانِ اخمنی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کا آخری تاجدار شہنشاہ دارا تھا جس نے سکندر سے شکست کھاکر اپنے ساتھ ایرانی سلطنت کو بھی صدیوں کے لئے مدفون کردیا۔ اس سلطنت کے اخیر زمانہ میں مذہب زردشتی علاقۂ پارس میں بھی رواج پاچکا تھا لیکن سوائے چند کتبوں کے جو اخمنی بادشاہوں نے پہاڑوں پر کندہ کئے کوئی ایسی تحریری یادگار اُس زمانہ کی باقی نہیں جس سے اُس وقت کے کچھ حالات معلوم ہوسکیں۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ یہ کتبے پڑھے گئے ہیں ورنہ اس سے پہلے یہ محض نقش و نگار سمجھے جاتے تھے۔

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ   آثار پدید ست صنادیدِ عجم را

ان کتبوں کی جو زبان ہے اُس کو قدیم فارسی کہا جاتا ہے اور یہی زبان سنسکرت کی بہن مانی گئی ہے۔ آوستا کی زبان کو ہندوستان کے ویدوں کی زبان کے ہم رنگ تصور کرنا چاہئے۔

پانچواں دور

ہخمنی سلطنت کا دور ۳۳۰ ق م میں ختم ہوا۔ سکندر کے بعد کچھ عرصہ تک یعنی سرف ۸۰ چار پشت تک ایران کی عنانِ حکومت یونانیوں کے ہاتھوں میں رہی لیکن اس کے بعد خراسان کی ایک قوم نے جس کو پارتھی کہتے ہیں یونانیوں سے بے تابی کرکے یونانی حکومت کو برطرف کر دیا اور پارتھی حکومت نے ایران میں شہرستے کو دارالحکومت بنا کر قایم کی۔ اس حکومت کا قیام پانچسو برس سے زیادہ رہا لیکن شاہنامہ اور دیگر مشرقی کتابوں میں اس زمانہ کو بہت مختصر کرکے ظاہر کیا گیا ہے اور صرف چند بادشاہوں کے نام گنے گئے ہیں اور بالعموم اُس کو طوائف الملوکی اور اشکانی حکومت کے زمانہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ساسانی حکومت کا آغاز کرکے اُس کا پچھلی کیانی سلطنت سے جوڑ ملا دیا ہے۔ اس زمانہ کو مختصر بنانے کی وجہ مورخین نے یہ ظاہر کی ہے کہ جب اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت قایم کی۔ اُس وقت لوگوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ ایرانی حکومت سکندر کے بعد ایکہزار برس تک قایم رہے گی۔ چونکہ اردشیر کے وقت تک پانچ سو سے زیادہ سال گزر چکے تھے اس لئے اپنے خاندان کی حکومت کا رعب و داب قایم و برقرار رکھنے کے لئے اردشیر نے قومی تاریخ کے صفحات سے کئی سو برس اُس زمانہ سے کم کر دئے جو سکندر کے وقت سے اُس کے عہد تک گزرے تھے۔ دوسری وجہ اُس زمانہ کو پردۂ خفا میں رکھنے کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ پارس یعنی ایران کے جنوبی علاقہ کے ایرانیوں کے نزدیک پارتھیوں کی حکومت کوئی قومی حکومت نہ تھی۔ انھوں نے اس سارے زمانہ کو ملکی زوال و بدنظمی کا زمانہ قرار دیکر اُس کو بھول میں ڈالدینا ہی مناسب خیال کیا تھا باوجود ان تمام باتوں کے محققین کے نزدیک یہ زمانہ کئی اعتبار سے اہم خیال کیا جاتا ہے۔ اول تو یہ پارتھیا کے ہی بادشاہ تھے جنھوں نے ایران کو سلطنتِ رومائی دست درازی سے محفوظ رکھا۔ دوسرے آوستا کے اوراق پریشان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ تیسرے اس زمانہ میں ایک نئی زبان قدیم فارسی سے نکلی جس کو عام طور پہ پہلوی زبان کہتے ہیں۔ اور قدیم فارسی بول چال کے دائرے سے خارج ہوگئی۔ اس پارتھی یا اشکانی حکومت کا آخری بادشاہ اردوان تھا جس نے اردشیر بابکان سے ۲۲۶ء میں شکست کھائی۔

چھٹا دور

اردشیر بابکان کے وقت سے چھٹا دور ساسانی حکومت کا شروع ہوتا ہے اور اسی وقت سے شاہنامہ کا بیان افسانہ کے پہلو کو چھوڑ کر یونانی مورخوں کے بیان سے ملتا جلتا پایا جاتا ہے۔ یہ دور پہلوی زبان کی ترقی کا دور ہے اس زمانہ کی یادگار ساسانی بادشاہوں کے چند کتبے ہیں۔ علاوہ ازیں آوستا کے جو اجزا مل سکے اُن کی فراہمی کی تکمیل بھی انھیں بادشاہوں کی نگرانی میں ہوئی اور اُن کا ترجمہ بھی پہلوی زبان میں کیا گیا۔ عرب کے تسلط کے زمانہ سے عربی زبان اور عربی قواعد صرف و نحو نے تصرفِ کامل کرکے پہلوی زبان کی وہ شکل بنادی جو موجودہ فارسی ہے۔ پہلوی زبان کی اس وقت جو کتابیں موجود ہیں وہ تقریباً سب عربی تسلط کے زمانہ کی تصنیف ہیں۔

ساسانی دور کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اُس میں دو مذہبی انقلابات رونما ہوئے۔ اولاً ایک شخص مانی نے ایک نئے مذہب کی اختراع کی کوشش کی۔ اُس نے عیسوی مذہب کے بعض اصولوں کو مذہبِ زردشتی سے پیوست کرنا چاہا اور خیر و شر، نور و ظلمت کی نئی بنیادیں قایم کرکے دینِ مروجہ میں ترمیم کی۔ پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق مذہبِ زردشتی دنیوی اور قومی پہلو لئے تھا۔ اس کے برعکس مانی نے ترکِ دُنیا کو اپنے دین کا اُصول قرار دیا۔ مانی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے کئی کتابیں مختلف زبانوں میں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک ارتنگ ہے جس کو اُس نے اپنے ایجاد کردہ حروف میں خطِ گلزار کی طرز پر بہت خوشنما طریقے پہ تحریر کیا تھا۔ مذہبِ زردشتی نے مانی کے دین کو کفر قرار دیا اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ تک یہ فرقہ ہمیشہ معتوب رہا۔ عہدِ اسلام میں اس فرقہ کے عقیدہ رکھنے والوں کو بالعموم زندیق کہتے تھے۔

دوسرے انقلاب کا بانی مزدک تھا جس نے قباد اور قباد کے لڑکے نوشیرواں کے زمانہ میں مذہبِ زردشتی میں ایک اور شاخ پیدا کی۔ اس شخص کے عقائد و اُصول وہی معلوم ہوتے ہیں جو موجودہ زمانہ میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ (اشتراکی) لوگوں کے ہیں۔ اُس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے عورتوں کو بھی مال مشترک قرار دیا تھا۔

مندرجۂ بالا کی دور ... کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کی غرض سے ایک نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

نمبر شمار	شاہنامہ کے مطابق: نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	یونانی مورخوں کے مطابق: نام خاندان یا قوم	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	تشریح
۱	پیشدادی	۱- کیومرث ۲- ہوشنگ ۳- طہمورث ۴- جمشید	۳۰ سال ۴۰ سال ۳۰ سال ۷۰۰ سال	نامعلوم					۱- محققین کے نزدیک کل پیشدادی بادشاہ کوئی تاریخی وجود نہیں رکھتے ان میں سے بعض کے ناموں کے متعلق مثلاً کیومرث جمشید ضحاک فریدوں کی نسبت یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ نام ان افسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان اور ایران کی متحدہ
۲	تازی	ضحاک	ایکہزار سال	نامعلوم					
۳	پیشدادی	۵- فریدوں ۶- منوچہر ۷- نوذر	ایکہزار سال ۱۲۰ سال ۷ سال	[illegible] تقریباً [illegible] ق م	قوم میدہ یعنی علاقہ ہمدان و آذربائیجان کے بادشاہ	۱- آربسس ۲- مین داسیس ۳- سوزرمس	۲۸ سال × ×	تقریباً ۷۹۰ سنہ قبل مسیح کا زمانہ	قوم آریہ کا مشترک سرمایہ ہیں۔ اور ان کا اس سرزمین ایران سے کوئی تعلق نہیں۔ ۲- بعض کا خیال ہے کہ ضحاک کی حکومت کا زمانہ وہ دور ہے جس میں شمالی و
۴	ترکی	افراسیاب	۱۲ سال	نامعلوم	×	×	×	×	مشرقی حصۂ ایران آشوری سلطنت کی ماتحتی میں رہا۔
۵	پیشدادی	۸- زو ۹- گرشاسپ	۱۲ سال بدنظمی کا زمانہ	نامعلوم		۴- ارتیکا ۵- اربیانس	بدنظمی کا زمانہ مطابق بیان ہیرادوتس		۳- اسی طرح بعضوں کا یہ خیال ہے کہ افراسیاب کی یلغار تاتاری قوم کے حملوں کی مترادف ہے۔
۶	کیانی	۱- کیقباد ۲- کیکاؤس ۳- کیخسرو ۴- لہراسپ ۵- گشتاسپ ۶- بہمن ۷- ہما ۸- داراب ۹- دارا	۱۲۰ سال ۱۵۰ سال ۶۰ سال ۱۲۰ سال ۶۰ سال ۱۱۲ سال ۳۲ سال ۱۲ سال ۱۴ سال	نامعلوم	قوم میدہ ایران کا شمالی مغربی علاقہ	۶- دیوسیس (دیاکو) ۷- فراارتیس (فراورتیش) ۸- سیاک زر (ہوخشتر) ۹- استاجس (وشتاسپ)	۵۳ سال ۲۲ سال ۴۰ سال ۳۵ سال	[illegible] ق م ۶۴۷ سنہ ق م ۶۲۵ سنہ ق م ۵۸۵ سنہ ق م	۱- محققین نے فریدوں سے لیکر کیانی بادشاہ گشتاسپ تک سب بادشاہوں کو فرضی قرار دیا ہے بعض لوگوں نے قوم میدہ کے بادشاہوں کی مطابقت شاہان مذکورہ سے کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس مطابقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ۲- شاہنامہ میں جن کیانی بادشاہوں کے نام درج ہیں ان میں سے صرف تین بادشاہوں کے نام ایسے ہیں جو یونانی مورخوں کے بیان کردہ ہخمنی خاندان
					خاندان ہخمنی ایران کا جنوبی علاقہ	۱- اکیمنیس (ہخامنش)			کے تین بادشاہوں کے ناموں سے ملتے ہیں۔ پہلا نام بہمن ہے۔ بہمن قدیم فارسی کا لفظ

شاہنامہ کے مطابق					یونانی مورخوں کے مطابق				
نمبر شمار	نام خاندان	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	نام خاندان یا قوم	بادشاہوں کے نام	مدت حکومت	سنہ	تشریح
					خاندان اخمنی یعنی علاقۂ پارسس کے بادشاہ	۲۔ ٹیس پیس (چائش پش)			داہوآن ہے جس کے معنی ہیں بازو والا ۔ یہی لفظ سنسکرت میں باہوآن اسی معنی کے ساتھ ہے ۔ شاہنامہ میں اس بہمن کا لقب "دراز دست" ہے ۔ اس نام کی مطابقت اخمنی خاندان کے گیارہویں بادشاہ آرٹازرکسس لانگی مینس (ارتخشتر دراز دست) سے ہوتی ہے ۔ اسی طرح شاہنامہ کے کیانی بادشاہ داراب کی اخمنی خاندان کے تیرھویں بادشاہ ڈرایس نوتھس سے ہوتی ہے ۔ اس بادشاہ کو یونانی مورخ ولدالحرام کہتے ہیں ۔ شاہنامہ کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے تیسری مطابقت دارا کی ہے جس نے سکندر سے مقابلہ کیا تھا ۔ ان تین ناموں کی تعیین کے سوا شاہنامہ اور یونانی مورخوں کے بیانات کوئی مطابقت نہیں رکھتے ۔ شاہنامہ کا بیان محض افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔
						۳۔ کمبیسس (کمبوجیہ)			
						۴۔ سائرس (کُروش)			
						۵۔ کمبیسس (کمبوجیہ)			
						۶۔ اریارنس (اریارمنا)			
						۷۔ ارسیمیس (ارشمہ)			
						۸۔ ہسٹاسپس (وشتاسپ)			
						۹۔ ڈرایس (دارایاوش)			
						۱۰۔ زرکسس (شایارشا)			
		بہمن دراز دست	.	.	.	۱۱۔ آرٹازرکسس لانگی مینس (ارتخشتر دراز دست)			
		پسر اسفندیار				۱۲۔ زرکسس ثانی (شایارشا)	۱ سال		
		داراب	.	.	.	۱۳۔ ڈرایس نوتھس (داراب)	۱۹ سال		
						۱۴۔ آرٹازرکسس	۴۶ سال		
						۱۵۔ آرٹازرکسس تیمن اوکس	۲۰ سال		
						۱۶۔ ارسیس	۲ سال		
		دارا	.	.	.	۱۷۔ ڈرایس کوڈومنس (دارا)			

نمبر شمار	شاہنامہ کے مطابق: نام خاندان	شاہنامہ کے مطابق: بادشاہوں کے نام	شاہنامہ کے مطابق: مدت حکومت	شاہنامہ کے مطابق: سنہ	یونانی مورخوں کے مطابق: نام خاندان	یونانی مورخوں کے مطابق: بادشاہوں کے نام	یونانی مورخوں کے مطابق: مدت حکومت	یونانی مورخوں کے مطابق: سنہ	تشریح
۸	یونانی	سکندر	غیر معلوم	غیر معلوم	یونانی	۱۔ سکندر ۲۔ سیلیوکس ۳۔ اینٹیوکس سوٹر ۴۔ اینٹیوکس تھیاس	سنہ ۳۳۰ ق م سے تقریباً سنہ ۳۰۰ ق.م تک		سکندر کے سوا کسی اور یونانی بادشاہ کا ذکر شاہنامہ یا دیگر مشرقی کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔
۹	ملوک الطوائف	اشک وغیرہ	•	•	قوم پارتھیا	ارسیس	سنہ ۳۰۰ ق.م سے سنہ ۲۲۶ عیسوی تک		یونانیوں کے بعد خراسان کے ایرانیوں نے یونانیوں کے قبضہ کو برطرف کیا۔ اولاً چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم ہوئیں اور ان سب نے ملکر یونانیوں کو علیحدہ کیا بعد میں یہ سب حکومتیں ایک ہوگئیں اور اشکانی یا اشغانی خاندانوں سے یہ حکومت منسوب ہوئی اور اس کا پایۂ تخت شہر رے قایم ہوا۔ ایرانی کتابوں میں ان بادشاہوں کے نام بہت مختصر درج کئے گئے ہیں اور وہ بھی اختلاف کے ساتھ۔ اسلئے اس نقشہ میں نہیں لکھے گئے۔ انکا زمانہ کئی صدیوں پر حاوی ہے لیکن ایرانی مصنفین نے اس مدت کو بھی کم کرکے دکھایا ہے۔ اس حکومت کا آخری بادشاہ اردوان تھا جس کو ساسانی خاندان کے بانی اردشیر بابکان نے علاقہ پارس (اصطخر) سے خروج کرکے شکست دی اور ساسانی شہنشاہی کی بنیاد سنہ ۲۲۶ء میں قایم کی۔
۱۰	ساسانی	اردشیر بابکان وغیرہ			ساسانی	آرٹازرکسس وغیرہ	سنہ ۲۲۶ء سے سنہ ۶۵۲ء تک		شاہنامہ اور یونانیوں کے بیانوں میں اس خاندان سے تطبیق شروع ہوجاتی ہے۔ اس خاندان میں ہیں بادشاہ ہوئے ہیں۔ آخری بادشاہ یزدگرد ثالث اہل عرب کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ سنہ ۶۵۱ء سے عربی حکومت کا آغاز ہوا۔ عربی حکومت کا سلسلہ خود بیوزنوں کے سر آوردہ خاندانوں نے بغاوت کرکے دور کیا اور مغلوں اور دیگر قوموں نے یکے بعد دیگرے ایران کو اپنی حکومت میں رکھا اب کئی صدیوں تک ایران میں خالص ایرانی حکومت ہو گو شاہی خاندان بدلتے رہے ہیں۔ انہیں ایک خاندان کی بنا رضا خاں پہلوی نے ڈالی ہے۔

تاریخ کی امداد سے واقعات کی جو صورت پیدا ہوتی ہے اُس میں اگر روایات اور افسانوں کے اعتبار سے قیاس کو دخل دیا جائے تو حسب ذیل نتیجے مترتب ہوتے ہیں:۔

(۱) ایران میں ابتدائی تورانی قومیں آباد ہونا پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً علاقہ رَے و آذربائیجان وغیرہ میں۔

(۲) قوم میدیہ سے عسوری سلطنت کا تصادم عیسیٰ سے گیارہ بارہ سو سال پیشتر ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے یقیناً اس سے بہت پہلے آریہ اقوام کی آمد علاقۂ میدیا میں شروع ہو گئی ہوگی اور اس آمد کا سلسلہ بحر کاسپین کی غربی سمت سے کوہ قاف کے دروں میں سے جاری ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہیں سے آریہ قومیں ایران کے مشرق میں پھیل کر براہ افغانستان پنجاب میں داخل ہوئیں۔ ورود کا زمانہ ڈیڑھ اور دو ہزار سال قبل مسیح کے درمیان سمجھنا چاہئے۔ یا اس سے بھی کچھ پہلے۔

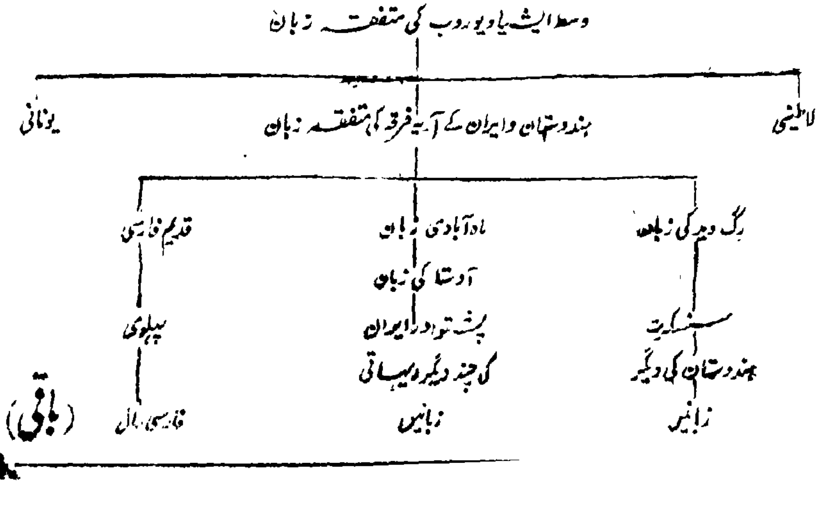
(۳) زردشت کا ظہور ۸۰۰ ق۔م کے آس پاس کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ شاہنامہ کے کیومرث و جمشید۔ کتاب آوستا کے گیومرتیا اور یم اُس زمانہ کے ہیرو ہوں جب آریہ قوم زردشت سے ہزار بارہ سو سال پہلے ایران میں داخل ہوئی۔ ہزار برس کا زمانہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔

(۴) ایرانیوں اور ترکوں کی لڑائیوں سے جن کا شاہنامہ میں ذکر ہے وہی جنگیں مراد ہیں جو علاقۂ رَے کے رہنے والے ترکوں اور نئے آنے والے فرقوں کے درمیان واقع ہوئیں اور جن کو صدیوں بعد کی روایات نے دریائے جیحون اور دریائے سیحون کے کنارے لاکر جا دیا اور اُن جنگوں سے سلسلہ ملا دیا جو بلخ کے بادشاہوں اور تاتاری اقوام کے درمیان ان دریاؤں پر ہوتی رہیں۔

(۵) چونکہ روایتی افسانوں اور بعض تاریخی حالات میں یک گونہ تطبیق پائی جاتی ہے اس لئے جہاں تک تطبیق ہوتی ہے وہ حالات افسانوں کی شخصیتوں کی ہستی کی دلیل قرار دئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً عسوری حکومت اور ضحاک کے عہد کی مطابقت۔ کیخسرو اور کردش کے حالات کی یکسانیت۔ کیکاؤس اور میدیا کے بادشاہ سیاک زر (ہوخشتر) کے بعض واقعات کا ایک سا ہونا۔ کیقباد کا انتخاب۔ وغیرہ ایسی باتیں ہیں، کہ طبیعت یہاں اٹکتی ہے اور قیاس یہ چاہتا ہے کہ قدیم روایتیں بگڑی ہوئی شکلوں میں انھیں تاریخی واقعات سے متعلق ہیں۔

ملکی حالات کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اُس سے امید ہے کہ ملک ایران کی پُرانی اور نئی زبانوں کی کیفیت سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ چونکہ ان زبانوں کا گہرا تعلق ان ملکی دوروں سے ہے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اس لئے زبان کی تلخیص کیفیت بھی اُسی سلسلہ سے عرض کی جاتی ہے:۔ پہلے دور کی زبان کی نسبت یعنی اُس زمانہ کی زبان کے متعلق جب ہندوستان اور ایران کے آریہ فرقے ایک ہی جگہ رہتے سہتے تھے یقین کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس قدر ظاہر ہے کہ فارسی اور سنسکرت کے الفاظ بے انتہا تعداد میں ایک ہی جگہ سے ماخوذ ہو کر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ کم و بیش تغیر کے ساتھ قدیم فارسی یا آوستی اور ویدک زبانوں کی سی کوئی زبان متفقہ طور پر بولی جاتی ہوگی۔

اس دور کے بعد کی زبان قوم میدیہ (ماد آباد) کی زبان ہونا چاہئے لیکن اس زبان کے کوئی نشانات نہیں پائے جاتے۔ اس لئے محققین صرف اس امر کے اظہار تک قانع رہے ہیں کہ کتاب آوستا کی جو زبان ہے وہ قوم میدیہ ہی کی زبان ہے یا اُس سے ماخوذ ہے ۔۔ ماد آبادی زبان کے ساتھ ساتھ اُس زبان کا نام لیا جاتا ہے جس کو عام طور پر قدیم فارسی کا لقب دیا گیا ہے۔ اس زبان کے کئی کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن کو پڑھ لیا گیا ہے اور جن کے معنی بھی معلوم کر لئے گئے ہیں ۔۔ قدیم فارسی کے بعد وہ زبان رائج ہوئی جس کو پہلوی کہتے ہیں۔ اور یہی پہلوی زبان ہے جس نے عربی کی آمیزش سے فارسی حال کی شکل اختیار کرلی ہے ۔۔ آسانی سے سمجھنے کے لئے شجرۂ ذیل ملاحظہ ہو:۔



(باقی)

نئی نارنولی

اک چھیل چھبیلی نار آئی، 　　 جوڑے میں لپیٹے ہار آئی
آنکھوں میں لئے خمار آئی 　　 گیسوؤں سے بھرے کنار آئی
روٹھی تھی قسمت اتار آئی
آئی آئی بہار آئی

صورت گری خیال کرتی 　　 آرائشِ خد و خال کرتی
ہر نقش کو بے مثال کرتی 　　 افزوں حُسن و جمال کرتی
تابندہ و تابدار آئی،
آئی آئی بہار آئی

میخانۂ رنگ و بو میں آئی 　　 کشمیر کی آرزو میں آئی
"جھن جھن" کرتی لہو میں آئی 　　 گویا مستی نمو میں آئی
ہنگامے لئے ہزار آئی
آئی آئی بہار آئی

پھولوں کو لگاوٹیں سکھاتی 　　 غنچوں کو بغل میں گدگداتی
سوتی ہوئی خواہشیں جگاتی 　　 سسکی بھرنے پہ مسکراتی
اک آفتِ روزگار آئی
آئی آئی بہار آئی

کلیاں کھلتے جھجک رہی ہیں 　　 اندر اندر مہک رہی ہیں،
جو ڈھیٹ ہیں وہ چٹک رہی ہیں 　　 کچھ آپ ہی آپ بک رہی ہیں،
ایک ایک کو آنکھ مار آئی
آئی آئی بہار آئی

خوشبو بن کر برس گئی ہے 　　 پتی پتی میں بس گئی ہے
ترانہ گلوں میں دھنس گئی ہے 　　 آوازہ دیں پہ کس گئی ہے
بدمست و شرابخوار آئی،
آئی آئی بہار آئی۔

اُڑتی ہوئی تتلیاں سنہری 　　 وہ سینے کی جوت میں رات گزری
لی بادِ صبا نے سانس گہری 　　 غنچوں نے سنبھالی اپنی گٹھری
رقصاں سوئے شالامار آئی
آئی آئی بہار آئی

مستی ہر شے پہ چھا رہی ہے   نرگس آنکھیں لڑا رہی ہے
شبنم موتی لٹا رہی ہے   لو دھوپ بھی مسکرا رہی ہے
مشاطۂ برگ و بار آئی
آئی آئی بہار آئی

وہ بادلہ پوش آبشاریں   پگھلی چاندی وہ جوئباریں
جھل جھل کرتی وہ مرغزاریں   سیمیں بدنوں کی رہگزاریں
اک سادہ و عشوہ کار آئی
آئی آئی بہار آئی

ہر جنبش موج میں ترانہ   پیغام نشاطِ جاودانہ
جیسے ہو کلام عاشقانہ   دلکش، رنگیں، والہانہ
بربط زن و نغمہ بار آئی
آئی آئی بہار آئی

ہمت کا بلند ہمہمہ تھا   گردش میں لہو کی زمزمہ تھا
دل بے ہمہ ہوتے باہمہ تھا   ہر غم کا خوشی پہ خاتمہ تھا
اُس عہد کی یادگار آئی
آئی آئی بہار آئی

آیا آیا شباب نغمہ   چھایا رنگیں سحاب نغمہ
برسا، بنکر شرابِ نغمہ   طالع ہوا آفتابِ نغمہ
یا جوگن، بین کار آئی،
آئی آئی بہار آئی

اک شوق کہ ہوگیا مجسم   تکوین کے وقت جیسے عالم
اک نغمۂ سرمدی کی سرگم   دل کی دھڑکن ہے جس کی محرم
بر ہمزنِ صد قرار آئی
آئی آئی بہار آئی

ناظورۂ خوش جمال رخصت   گلگونہ کش خیال رخصت
اے دلبرِ بے مثال رخصت   ہے اور مرا مآل، رخصت
[illegible] ہے گھر غم و محن کا،
وہ میرا ہے اور میں وطن کا

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

جرمنی اور مغربی یورپ

نومبر ۱۹۱۸ء میں فرانس، برطانیہ، اٹلی اور امریکہ کی فوجوں نے پوری کامیابی حاصل کرلی تھی - بحری، بری اور فضائی مقابلوں میں اُنھیں نمایاں فتح ہوئی۔ جرمنی اور اس کے ساتھی پورے طور پر پسپا ہو چکے تھے - معلوم ہوتا تھا کہ فتحمند قوتیں ایک دائمی امن قایم کرنے کی طیاریاں کر رہی ہیں - اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے صدر اعظم ولسن نے بحر اٹلانٹک کو عبور کرکے پیرس کے خوبصورت شہر میں قدم رکھا -

رسل و رسائل اور صلح کے واقعات دُہرانے عبث ہیں - جمہوریت کا پیدا کیا ہوا سیاسی توازن عہدنامۂ ورسائی (Versailles Pact) کے چند دن بعد ہی قومیت کی آہنی دیواروں سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہونا شروع ہوگیا - زخم خوردہ قومیت پر جمہوری آئین کا مرہم اس امید پہ استعمال کیا گیا تھا کہ حکومت کی قوت عوام کے ہاتھوں میں آکر خود بخود صلح پسند ہو جائے گی - چنانچہ فرانس اور برطانیہ نے قیصر سے صلح کی بات چیت کرنے سے انکار کر دیا اور ویمر کے دستور العمل (Weimar Constitution .) نے بڑھے شہنشاہ کو جلاوطن کر دیا - بعض ملکوں میں تو کئی قوموں کو ملا کر ایک قوم بنائی گئی - یوگوسلیویا کی مثال سب سے زیادہ سبق آموز ہے - وہاں سرب، کروٹ اور سلاقیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر جمہوری آئین رائج کیا گیا - جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے تو جمہوریت کے علمبرداروں کی طرف سے جواب ملا کہ سرب، کروٹ اور سلافی درحقیقت ایک قوم ہیں - غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا - اب جبکہ بیرونی جوا کندھوں سے اُتر گیا ہے، وحدتِ قومی کے احساس کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ قدیم جغرافیائی تقسیم جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا - منسوخ کر دی جائے - اور مقامی نظم و نسق کے لئے از سرِ نو صوبجاتی تقسیم ہونی چاہئے تاکہ پُرانے صوبوں کی حدبندیاں نسلی حلقے (Racial - Groups.) نہ بنا سکیں[1]۔

لیکن خود جرمنی میں یہ غیر ملکی پودا سرسبز اور ثابت نہ ہوسکا - ہزاروں سال کے تاریخی واقعات کے خلاف جمہوری حکومت قایم کی گئی جس کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہوسکتا تھا - لائڈ فرانس منگلاخ جرمنی کے لئے نہ تھا - اس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ حکومت عوام کے ہاتھوں میں ہو - اس لئے اس آئینی ردوبدل نے ایسی رجعت پسندی پیدا کر دی کہ حکومت اور سلطنت دونوں کا نظریہ ہی بدل گیا - سیاسی مرکز فرد سے ہٹکر قوم میں پہونچ گیا اور جرمنی کا احیاء افراد سے نہیں بلکہ قوم سے وابستہ ہوگیا اور قومیت کی روح نے ہٹلر میں جنم لیا -

اس نئے روپ میں جرمنی کو اس کا کھویا ہوا قیصر مل گیا - جس کی انھیں مدتوں سے تلاش تھی - ہر اسٹیفان لورانیٹ اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں لکھتا ہے کہ :-

" جرمن باشندے جنگ، تکبر، بے روزگاری، بھوک اور مفلسی و لاچاری سے پست ہوگئے تھے - ان کا مستقبل تاریک تھا — کہ ایک شخص شعاع امید لیکر اُٹھتا ہے - وہ اُن کو یقین اور اعتبار کی تعلیم دیتا ہے — ایک شخص، جو شاندار مستقبل کا وعدہ کرتا ہے، کہتا ہے کہ " اس وقت نہ کوئی بے روزگاری ہوگی، نہ کوئی بھوکا رہے گا اور نہ کوئی تکلیف باقی رہے گی" اُنھوں نے فوراً اس شخص کی رہبری قبول کرلی ...... ! ایک مسیح کے لئے یہ وقت سازگار تھا — خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو"

مگر اس نئے دیوتا کو اپنی بقا کی تلاش ہوئی اور اس کی بقا کے لئے تصادم ضروری تھا - موجودہ جنگ کی سب سے اہم وجہ یہی ہے - ہٹلر کا مقصد اقتصادی آزادی نہیں، سیاسی توازن نہیں بلکہ صرف عالمگیر قوت حاصل کرنا تھا - چنانچہ ہٹلر نے برسرِ اقتدار آتے ہی وطنیت کے تخیل کو اس قدر سنگین بنا دیا کہ اس میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہ رہی

---

[1] اے - ایچ - مارے - " یورپ کا نیا جمہوری آئین"

ہٹلر کے برسرِ اقتدار آتے ہی لوگوں نے سمجھا کہ وہ مشرق میں پھیلنا چاہتا ہے اور مغرب کی جانب کسی کا خیال بھولے سے نہیں گیا حالانکہ شروع ہی سے ہٹلر فرانس کی خارجی پالیسی کی سخت مذمت کرتا رہا تھا۔

ہٹلر کے عزائم کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مشرقی یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور مغربی ممالک میں اس کا مقصود فرانس برطانیہ اور اٹلی کو غیر جانبدار رکھنا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہ تھا۔

مائن کیمپف میں وہ صاف صاف لکھتا ہے کہ[1] "فرانس ہمارا زبردست ترین ناقابلِ معافی دشمن ہے اس کے باشندے سخت مکار ہیں اور ان کا مقصد دنیا میں یہودیوں کا اقتدار قائم کرنا ہے جو یورپ کی سفید نسل کے لئے ایک دل دہلا دینے والا خطرہ ہے۔

اُسکے ایک صفحہ پہلے وہ نہایت کھلے ہوئے الفاظ میں تحریر کرتا ہے کہ "جرمن باشندوں کا سنگین ترین دشمن فرانس ہے، خواہ وہاں کوئی بھی پارٹی برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو۔"

مذکورہ بالا بیانات سے جو ہٹلر کی دلی خواہشات کی آئینہ دار ہیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرانس کا سخت دشمن تھا۔ فرانس کا اعلیٰ فوجی نظام، رائن پر فرانس کا اقتدار اور خود فرانس کی اندرونی سیاست میں یہودیوں اور اشتراکیوں کا غلبہ ہٹلر کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

اس کی نظر میں فرانس ہی معاہدۂ ورسائی کا ذمہ دار تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ برطانیہ سے زیادہ فرانس سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ بعد میں جب وہ چانسلر منتخب ہو گیا تو فرانس ہی نے جرمنی کے خارجی اُمور میں مداخلت کرنا چاہی اور بارتھو (Barthou) کی زیر قیادت ہمیشہ جرمنی کی مسموم پالیسی کو روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ جب کبھی ہٹلر نے معاہدہ کی شرط سے انحراف کیا تو ہمیشہ فرانس نے اس پر جوابی قدم اُٹھانے کی دھمکی دی بلکہ اس کے اُنھوں نے روس سے بھی ایک عمرانی معاہدہ کیا جو ہٹلر کی دائمی پریشانی کا باعث تھا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر نے سب سے پہلے فرانس کو ختم کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر یہ تصور کرنا کہ ہٹلر فرانس سے دائمی صلح چاہتا تھا یا زیادہ سے زیادہ اسے غیر جانبدار رکھنا چاہتا تھا غلطی ہے۔ ہاں یہ ہوا کہ اس نے مغرب کی طرف اُسوقت تک قدم نہیں اُٹھایا جب تک کہ مشرق کی طرف سے مطمئن نہیں ہو گیا۔

ہٹلر کو شروع ہی سے اس بات کا احساس تھا کہ اگر جرمنی کسی طرف اقدام کرتا ہے تو فرانس جوابی و قبلی حملہ کر دے گا۔ کیونکہ فرانس کا رشتۂ اتحاد تقریباً یورپ کے ہر ملک سے استوار تھا اور اس کے معاہدات ہرگز ہرگز جرمنی کو نا پالنز نابید، رائن کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہٹلر مشرق کی طرف دیکھتا، جنوب کی طرف دیکھتا، بالٹک کی طرف دیکھتا حتیٰ کہ سمندر پار کے ممالک پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتا اور ہر جگہ اسے فرانس سپر کی مانند اس ملک کی محافظت پر آمادہ نظر آتا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ جب تک وہ فرانس کو تباہ و برباد نہ کر دے گا اس وقت تک اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اسی خیال کے ماتحت ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء نازی انجن، ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کی پُر فضا اور سرسبز وادیوں سے ہوتا ہوا جنھیں ہٹلر کی دیرینہ خواہشات اور روزنبرگ کے تباہ کُن ہمہ گیر اور خیالی نقشے کے نازی یونین میں شامل رہنا چاہئے تھا، فرانس کے سبزہ زاروں پر پھیل گیا!

اسپین و اٹلی

خارجی پالیسی کی موافقت کی وجہ سے اٹلی و جرمنی کا رشتۂ اتحاد کافی استوار ہو گیا تھا۔ ادھر مسولینی نے ہٹلر کو معاہدات کی شرائط توڑنے میں کافی مدد دی، اُدھر جرمنی نے اٹلی کی فتح حبشہ کو تسلیم کر لیا۔

کاونٹ چیانو (Count Ciano) کی سفارتِ برلن کے بعد دونوں کے تعلقات اور مضبوط ہو گئے۔ اسپین میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ محوری طاقتیں اس بغاوت کو فروغ دینے کے لئے پسِ پردہ پوری کوششیں کر رہی تھیں۔ ہٹلر، فرینکو کا پشت پناہ بن چکا تھا۔ چنانچہ جب بغاوت کامیاب ہوئی اور جنرل فرینکو نے میڈرڈ میں فاتحانہ قدم رکھا تو اس کے فوراً ہی بعد جرمنی اور اٹلی دونوں نے ایک متحدہ اعلان کرتے ہوئے اسپین میں اس کی حکومت کو جائز مان لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین بھی (National Socialism) کا مرہونِ منت ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور فرینکو ظاہری غیر جانبدار

---

[1] اسٹیفن ایچ۔ رابرٹس — "ہٹلر کا تعمیر کردہ مکان" (صفحہ ۳۴۴)

وجود ہٹلر کا آلۂ کار بن گیا۔

خود جرمنی اور اٹلی کے تعلقات پہلے تو برابری کے رہے اس کے بعد رفتہ رفتہ ہٹلر اٹلی پر اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اٹلی کا تجارتی کاروبار بھی جرمنی کے ہاتھ میں آگیا اور اب اٹلی کے ہر فرم، ہر ریل یہاں تک کہ پولیس کا انتظام اور شہروں میں بھی جرمن سپاہی امن و امان قایم رکھنے کے لئے نظر آتے ہیں۔ ان آئینی پالیسی سے ہٹلر نے اپنے ایک زبردست حامی کو بھی ایک ادنیٰ غلام بنا لیا۔

ہٹلر کے تمام مقبوضات یورپ میں فرانس کی حالت سب سے زیادہ اندوہناک ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں اس بدقسمت فرانسیسی قوم کو کتنے مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں! انھیں کن خطرناک اور مایوس کن راستوں پر چلنا پڑا ہے۔ کتنی مرتبہ اس نے اپنے اعتبار کی زمام مختلف رہنماؤں کے ہاتھ میں دی ہے اور کتنی مرتبہ اسکو ناامیدی ہوئی ہے۔ ڈیلیڈیا و رینال کی داستان غم طاقِ نسیاں پر رکھی جاچکی ہے۔ اب وہ افسانے خواب و خیال ہوچکے ہیں۔ مارشل پیتاں کے کارنامے کچھ دنوں تک سرگرم رہے لیکن جرمن مظالم نے بڈھے جنرل کو بھی فرانس کی عنانِ حکومت جرمنی کے طرفدار لاوال کے ہاتھ میں دے دینے پر مجبور کردیا۔

لاوال نے برسرِ اقتدار آتے ہی اعلان کیا کہ وہ فرانس کو تباہی و بربادی کے محیط غاروں کی طرف نہیں لے جائے گا بلکہ وہ جرمنی سے رشتۂ اتحاد استوار کرکے کام کرے گا۔ لاوال کی بھیک سے شاید جرمن سامراج پر کچھ اثر پڑے۔ لیکن ہٹلر اپنے ارادوں سے کیسے انحراف کرسکتا ہے۔ وہ اپنے الفاظ کہ "فرانس ہمارا سنگین ترین دشمن ہے خواہ وہاں کوئی بھی پارٹی برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو" کیسے بدل سکتا ہے۔ پرانی دشمنی چند ہی دنوں میں خوشگوار تعلقات سے کیسے تبدیل کی جاسکتی ہے جنگ کے شروع میں ہٹلر نے روس سے بھی ایک تحفظاتی معاہدہ کیا تھا، لیکن اس معاہدہ کا جو حشر ہوا ظاہر ہے۔۔۔ امریکہ، برطانیہ اور اتحادیوں نے اس راز کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا ہے۔ اس لئے انھوں نے فرانسیسی مقبوضات کو اپنی نگرانی میں لے لیا ہے تاکہ محوری طاقتیں ان سے فایدہ نہ اٹھا سکیں۔ مڈغاسکر اور مارٹینک (Martinique) کی سبق آموز مثال ہمارے سامنے ہے۔

کچھ دنوں سے ہٹلر کی دیرینہ خواہشات پوری کرنے اور فرانس کی رہی سہی آبرو تباہ کرنے کے لئے مارشل گوئرنگ پیرس میں مصروفِ کار ہیں! لیکن آزاد فرانسیسی طاقت بھی ساتھ ہی ساتھ بڑھ رہی ہے۔ جنرل ڈیگال نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ "فرانس نے اپنا راستہ تجویز کرلیا ہے اور وہ راستہ آزادی اور فتح کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔

اصغر عثمانی

نگاہ بازگشت

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء)

اس عنوان سے جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار پر جناب علی سجاد قمر اکبرآبادی کا تبصرہ ماہ جولائی ۱۹۴۱ء کے نگار سے شایع ہونا شروع ہوا تھا جو دسمبر ۱۹۴۱ء تک جاری رہا، لیکن اس مضمون کا کچھ حصہ باقی تھا کہ جنوری ۱۹۴۲ء کے انتقاد نمبر کی اشاعت کا وقت آگیا اور اس طرح اس مضمون کا باقی حصہ شایع ہونے سے رہگیا۔

اب اس اشاعت میں ہم اس حصہ کو تمام و کمال شایع کئے دیتے ہیں تاکہ ایک اور مکمل تبصرہ قارئین نگار کے سامنے آجائے۔ نیاز

۲۷۔ نوح ناروی

حضرتِ نوح ناروی ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر اور داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ آپ کی شاعری پُرانے دور کی شاعری کی یادگار اور آپ کا رنگِ سخن تقلید و اتباع کا نمونہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں فرسودہ اور پامال مضامین حسن و عشق کی کثرت ہے مگر سادگی بیان اور محاورات کا برمحل استعمال آپ کی وہ خصوصیات ہیں جو آپ کو دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہیں۔ آپ نے اپنے اس رنگِ شاعری میں اس قدر پختگی حاصل کرلی ہے کہ ہم آپکے شعر سننے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرتِ نوح کی آواز ہے۔

حضرتِ نوح کی شاعری کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ عموماً مختلف فعلوں کے اجتماع سے ایک مصرع پورا کرلیتے۔ مثلاً:۔

دکھائے پانچ عالم اک پیامِ شوق نے مجھ کو　　اُلجھنا۔ روٹھنا۔ لڑنا۔ بگڑنا۔ دور ہو جانا

آپ کے یہاں تکرار الفاظ بھی ہے لیکن اس میں آورد نہیں بلکہ روزمرہ کے ساتھ کلام شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے:۔

اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا ان جھمیلوں سے　　چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے نفرت ہے　　مگر اتنا سمجھ رکھو۔ محبت پھر محبت ہے

اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے　　دُنیا میں نادان آئے۔ نادان رہے۔ نادان گئے

غریقِ بحرِ ستم کیوں نہ ہوں۔ یہ جانفشانی ہے اور ہم ہیں　　کہ آپ ہیں۔ آپ کی چھُری ہے۔ چھُری کا پانی ہے اور ہم ہیں

وادیٔ اُلفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل　　گر پڑے۔ گرکر اُٹھے۔ اُٹھکر سنبھلتے ہی رہے

نکھر آئی۔ نکھار آئی۔ سنور آئی۔ سنوار آئی　　گلوں کی زندگی لیکر گلستاں میں بہار آئی

ان چند مثالوں سے نوح کے مخصوص رنگِ سخن کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ سادگی میں جناب نوح نے اپنی مشاقی کی بدولت اس قدر عبور حاصل کرلیا ہے کہ آپ نازک سے نازک جذبات اور بلند سے بلند مضمون کو نہایت سادگی و بے ساختگی سے نظم کرجاتے ہیں۔ جیسے:۔

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے　　اِک طرح کا انکشافِ راز ہے

کیونکر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے　　سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے

کعبہ یہی ہے۔ دیر یہی۔ طور بھی یہی　　اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھئے

ہوگئیں ختم ہجر کی گھڑیاں　　اور تھوڑی سی رات باقی ہے

ہم بڑی دیر سے یہ دیکھتے ہیں   اس طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں

آپ کے یہاں توالی اضافت ۔ غیر مانوس تراکیب اور پیچ در پیچ تشبیہات و استعارات نہیں پائے جاتے ۔ آپ کی شاعری نہایت سادگی اور روانی لئے ہوئے ہے اور اس میں کہیں کہیں محاورہ کا استعمال چار چاند لگا دیتا ہے

۲۸ ۔ وحشت کلکتوی

جناب وحشت کلکتوی مشاق سخن گو ہیں ۔ مگر آپ کے کلام میں اساتذۂ فن کی سی پختگی نہیں پائی جاتی ۔ آپ نے اپنے تغزل میں غالب کا رنگِ سخن اختیار کیا ہے اور اس پر فخر کرتے ہیں ۔ چنانچہ وہ اپنے سوانح حیات میں بھی (جو نہایت مختصر ہیں) اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "بقول مولانا حالی حقیر نے تتبع غالب کا حق ادا کیا" آپ نے اپنے اشعار میں فارسی الفاظ و فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں لیکن یہ غنیمت ہے کہ مہمل نہیں ہیں ۔ البتہ کہیں کہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو شعر کے اثر کو کم کر دیتی ہیں ۔ اور لہجۂ تغزل کے منافی ہیں ۔ مثلاً :۔

دلِ آشفتہ کو گم گشتۂ کوئے وفا پایا   سرِ شوریدہ کو منت گزارِ سنگِ در دیکھا

اندیشۂ سود و زیاں زنجیرِ پائے شوق ہے   کچھ جذبۂ دل کی بھی سن ۔ اے عقل خودداری نہ کر

فقط بیگانہ خوئی ہی نہیں ہے شانِ محبوبی   کتابِ آشنائی دیکھ اٹھا کر طاقِ نسیاں سے

غزل کے شعر میں جو لطافت و کیفیت ہونی چاہئے اس سے یہ اشعار خالی ہیں ۔ اس قسم کی مثالیں ہمیں اور بھی جناب وحشت کے کلام میں ملتی ہیں ۔ کہیں کہیں تقلیداً جناب وحشت نے اپنے محبوب کے خارجی اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں مگر طرزِ ادا میں وہی فارسیت نمایاں ہے ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو :۔

نرگسِ مستانہ میں کیفیتِ جامِ شراب   قامتِ رعنا پہ عالم مصرعِ استاد کا

آنکھوں نے تیری ہوش اڑائے شراب کے   چھونے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

کہیں کہیں آپ کے کلام میں مخصوص لکھنوی رنگِ تغزل بھی نمایاں ہے ۔ جیسے :۔

سرِ بالیں تم آجاؤ ذرا بیمارِ ہجراں کے   کہ اک ہچکی میں وہ کہہ دے کہانی زندگی بھر کی

تہ مرقد قرار آئے گا کیونکر مرنے والوں کو   جو تم کو دوستوں کا غم نصیبِ دشمناں ہوگا

پھر ہوا میرے لئے شوق آفریں اس کا شباب   پھر مرا دل عہدِ پیری میں جواں ہونے لگا

ہے نظر بازوں میں ہلچل سب ہیں گرمِ جستجو   وہ پری ہے کون وحشت جس کا دیوانہ ہوا

جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی ہیں اس کے گیسو کی   بہت سے ہاتھ اب صرفِ گریباں ہوتے جاتے ہیں

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشت   بات اگر کر نہیں سکتے تھے اشارا کرتے

جیساکہ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں جناب وحشت کو فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا بہت ذوق ہے اور اُن کے اس شوق نے انہیں اس جگہ بھی فارسی لفظ سے احتراز نہ کرنے دیا جہاں وہ اُردو کا ایک سیدھا سادا لفظ استعمال کر سکتے تھے ۔ مثلاً :۔

جو حق پوچھو ۔ کتابِ آرزو کا حرفِ باطل ہوں   مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھ کو مٹا دینے کے قابل ہوں

اس شعر کے مصرعۂ اولے میں "حق" کے بجائے اگر "سچ" نظم کرتے تو زیادہ مناسب تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ جناب وحشت کے مفہوم میں بھی کوئی فرق نہ ہوتا ۔ آپکا ایک شعر

عجب حسرت فزا ہوتی ہیں وہ شبہائے تنہائی   کہ میں ہوتا ہوں اور میرا دلِ ناشاد ہوتا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں آورد ہے ۔ وہ بہ آسانی یوں نظم ہو سکتا تھا :۔ "عجب حسرت فضا ہوتی ہیں تنہائی کی وہ راتیں"

رہی یک چند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی   وہ اک بیکار سی تحریر تھی میں نے مٹا ڈالی

اس شعر کے بھی مصرعۂ اولے میں "یک چند" کی ترکیب "وہی یک نفس بیش نہیں" غالبیت کے تتبع و پیروی کا نتیجہ ہے ۔ یہ مصرعہ یوں بھی نظم ہو سکتا تھا کہ :۔

رہی کچھ دیر نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی

کہیں کہیں جناب وحشت کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور اُن کے بعض بعض اشعار میں ہمیں غلط محاورے اور حشو وغیرہ کی مثالیں ملتی ہیں

جیسے کسی شعر میں "ہائے وائے" "ہے ہے" وغیرہ کہکر مصرعہ کو پورا کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

سادہ دل کتنے ہیں ارباب محبت ہے ہے ۔۔۔ کہ تیرے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں

حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم ۔۔۔ آرزوؤں کا تجمع دیکھئے

"ہے ہے" اور "ہائے ہائے" یہ شعر کو پورا کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں ورنہ ان کے بغیر بھی شعر کا مفہوم پورا ہو سکتا تھا۔ دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی اگر یوں نظم کرتے کہ:۔ "حسرتوں کا میرے دل میں وہ ہجوم" تو "ہائے رے" کا نامناسب ٹکڑا نکل جاتا۔ ایک شعر ہے:۔

اس انجمن میں کہ بہتی ہو بیخودی کی شراب ۔۔۔ وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار نہیں

اس شعر کا مصرعۂ اولیٰ لفظ "جہاں" کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے پہلے مصرعہ کی اگر نثر کیجائے تو یوں ہوگی کہ "اُس انجمن میں کہ بیخودی کی شراب بہتی ہو" اور اس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا جب تک کہ لفظ "جہاں" نہ صرف کیا جائے جیسے "اُس انجمن میں کہ جہاں بیخودی کی شراب بہتی ہو"۔ اور یہ ادائے بیان کی ایک خامی ہے

مرے گریۂ الم پر نہ بہا ئیں جائیں آنسو ۔۔۔ کہیں تم ہنسی نہ کرنا مری چشم خونفشاں کی

غالباً جناب وحشت نے "ہنسی نہ اُڑانا" ۔ یا "ہنسی نہ کرانا" کے مفہوم میں "ہنسی نہ کرنا" استعمال ہے جو غلط ہے۔ ہنسی اُڑانا۔ ہنسی کرانا۔ محاورہ ہے مگر ہنسی کرنا یہاں محاورے کے خلاف ہے اور غیر فصیح ہے۔

نہ پردا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی ۔۔۔ بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

اس شعر میں "کارواں" اور "ہماری" ایسے متصل ہوگئے ہیں کہ "ہماری کارواں" پڑھا جاتا ہے اور یہ نشستِ الفاظ کی ایک بڑی خرابی ہے۔

ہر چند کہ جناب وحشت کے کلام میں سوز و گداز اور اثر آفرینی بہت ہی کم پائی جاتی ہے مگر پھر بھی آپ کے یہاں تغزل کے عمدہ نمونے نظر آجاتے ہیں۔ جیسے:۔

معاذ اللہ اتنی ناامیدی ۔۔۔ کہے گی وہ نگاہِ آشنا کیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی ۔۔۔ خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں ۔۔۔ ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں

وہ آئیں یا نہ آئیں انھیں اختیار ہے ۔۔۔ اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں کہ تو تو ہے

ابھی تو تیری مایوسی سے اطمینان ہے اے دل ۔۔۔ مجھے اسوقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا

کسی سے کہتی ہے چتون کسی کی ۔۔۔ کہ تو کیا اور تیرا مدعا کیا

آپ اپنا روئے زیبا دیکھئے ۔۔۔ یا مجھے محوِ تماشا دیکھئے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ ۔۔۔ کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

۲۹۔ یگانہ چنگیزی

جناب یگانہ لکھنوی اب سے کچھ قبل "یاس عظیم آبادی" تھے مگر لکھنؤ کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے ان پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہ رہیں کے ہو رہے اور وہیں شادی بھی ہوئی۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے اب یگانہ تخلص کرتے ہیں۔ آپ ہندوستان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اشعار کا انتخاب نہایت بیدلی سے کیا ہے۔ نیز آپ کا انتخاب بہ نسبت اور دیگر شعراء کے مختصر بھی ہے۔ یعنی آپ نے صرف ۴۳ غزلوں میں سے اپنے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ مختصر انتخاب کلام آپ کے رنگ شاعری کو سمجھنے میں مساعدت کرتا ہے۔

جناب یگانہ کی شاعری لکھنوی رنگ تغزل کی یاسیت و مرثیت کے خلاف ایک آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے اپنے زمانہ کے مروجہ رقتی اسکول شاعری سے انحراف کیا اسی لئے وہ عجز و فتادگی جو ان کے ہمعصر لکھنوی شعراء کا طرۂ امتیاز بھی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ آپ کے یہاں مشاہدۂ حسن اور احساس عشق ضرور ہے مگر جذبات کا کھلنڈراپن نہیں۔ آپ کے یہاں محرومی و مجبوری کی داستانیں نہ ملیں گی۔ آپ کے احساسِ عشق میں ایک خودداری و خودی کی جھلک نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں سوز و گداز کی کیفیات کا عنصر بہت ہی کم ہے۔ مگر ایک شخص جناب یگانہ کے شعر سُنکر اپنے آپ کو اُن میں گم کر سکتا

ہے۔ آپ کے عشق کا تصور ہمارے دوسرے بعض شعراء کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے لہجہ میں ایک جرأت رندانہ ہے۔ آپ کے اشعار کا لب ولہجہ اور تیکھا پن ملاحظہ ہو:۔

ہاں! کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیلکر — ڈوبے مری بلا عرقِ انفعال میں ،
گنہگارِ محبت کو اسی عالم میں رہنے دے — سزاوار جب سہی لیکن بہشتِ جاوداں کیوں ہو

تمکنت وخودداری ملاحظہ ہو:۔

نہ سُنا ہوگا راگ فطرت کا — جانتے ہو مری صدا کیا ہے
یگانۂ فکر حاصل کیا۔ تم اپنا حق ادا کردو — بلا سے تلخ گزرے زندگانی رائگاں کیوں ہو

ان کے اشعار میں ایک طرح کی قوت وتازگی ہوتی ہے۔ جیسے:۔

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے — مبادا رنگ وبو آئینہ بردارِ پامالِ نظر ہوکر
پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی — دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
نگاہِ شوق کی دُنیا خدا جانے کہاں تک ہو — جہاں دیکھا وہیں حُسنِ یگانہ شمع محفل تھا

آپ کے رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے — وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
آوازِ بازگشت پہ کیا دیتے ہو صدا — کس سے اُلجھ رہے ہو جواب و سوال میں
کرے گا پرورشِ نخلِ آرزو کے دن — وہ بدنصیب جسے ذوقِ انتظار نہیں
کیوں انقلابِ عشق یہ کیسی ہوا چلی — جی سن سے ہوگیا رُخِ بیمار دیکھ کر
کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا — زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو
غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے — کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا
گناہ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری — کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

۳۰۔ آزاد انصاری

جناب الطاف احمد صاحب آزاد انصاری ایک کہنہ مشق شاعر اور مولانا حالی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ آپ کے رنگِ سخن کو بلحاظ سادگی اپنے اُستاد کی شاعری سے غایت درجہ مناسبت ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کے قدیم رنگ کا پتہ نہیں ملتا اور آپ کے یہاں محبوب کے ظلم وستم کی شکایتیں، مقتل وخنجر کے مضامین۔ ہجر کی مجبوریاں اور وصل کی کامرانیاں قطعی نہیں ملیں گی۔ ہرچند کہ آپ کے کلام میں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے مگر ان سب وعریاں مضامین سے بری۔ آپ کا تغزل آپ کے دلی جذبات وقلبی تاثرات کا عکس ہے۔ زبان کی صفائی، انداز بیان کی بے ساختگی، تکرارِ الفاظ۔ اور مناسب تراکیب۔ آپ کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے بڑے مضامین کو نہایت سادگی سے ادا کر جاتے ہیں اور آپ کا طرزِ بیان اس میں کچھ نہ کچھ جدت کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔

طبیعت ہی دردآشنا ہوگئی — دوا کا نہ کرنا دوا ہوگیا
الٰہی کامیابی رہنما ہو — کوئی امیدوار نہ بیٹھا ہے
اب فریبِ مہربانی رائگاں — زندگی بھر کو نصیحت ہوگئی
میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں — کوئی دردآشنا نہیں نہ سہی

خیالِ نگاہِ محبت عبث — کہ تابِ نگاہِ محبت کہاں

مندرجۂ بالا سب اشعار صحیح تغزل کا نمونہ اور سادگی وطرزِ ادا کے لحاظ سے نہایت پرلطف ہیں۔ کہیں کہیں لہجہ کا سکون اور دھیما پن شعر کے اثر کو دوبالا کر رہا ہے اور شاعر کی ادائے بیان کی قدرت کا غماز ہے۔ اور بعض بعض اشعار میں طنز کی ایک ہلکی سی چاشنی شعر کو بہت پرکیف بنائے دے رہی ہے۔

جناب آزاد انصاری کی ایک اور اہم خصوصیت اِن کے کلام میں "مماثل ترکیب" کا نہایت خوبی کے ساتھ پایا جانا ہے۔ اور یہی چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شعر میں نہایت زور واثر پیدا کردیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :۔

اِک وہ ہیں کہ بے خوف وخطر گرم شکایات — اک ہم ہیں کہ اظہارِ تمنا نہیں ہوتا
تم اور چارۂ غمِ فرقت۔ خوشا نصیب — دکھ کو دوا نصیب۔ مرض کو شفا نصیب
تو۔ اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے — امید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں! خدا کرے
تدبیر کیا ہے آپ کی جانب سے حکم کار — تقدیر کیا ہے؟ آپ کا منشا کہیں جسے
کرم ہیں اور طلب سے بھی زیادہ — ستم ہے اور بہ اندازِ دگر ہے،
تم۔ اور دل آزاریٔ اربابِ محبت — اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا

آپ کے اشعار میں کہیں کہیں الفاظ کی تکرار نہایت پرلطف وپرکیف ہوتی ہے اور شعر دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :۔

امیدِ سکوں رخصت تسکین دروں رخصت — اب درد کی باری ہے اب درد مزا دے گا
وہ دِل جس میں تمنا کی خوشی تھی — اُسے صرفِ تمنا دیکھتا ہوں،
دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر — دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ
بے خبر کار خبر مشکل نہیں — بے خبر ہوجا۔ خبر ہوجائے گی

غرض آپ کے یہاں مماثل ترکیب۔ الفاظ کی تکرار۔ فقروں کی نشست۔ یہ سب چیزیں اس قدر حُسن وخوبی کے ساتھ نظم ہوتی ہیں کہ شعر میں ایک کیفیت اور ایک اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ آپ کے یہاں، شوخی بھی ہے مگر حدودِ سنجیدگی کے اندر۔ آپ کے یہاں رعنائی بھی ہے، لیکن متانت لئے ہوئے۔ آپ کے یہاں شگفتگی بھی ہے مگر مذاقِ سلیم کے مطابق اور آپ کے یہاں رنگینی بھی ہے مگر بقیدِ سنجیدگی۔ آپ کے صحیح رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی — یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم وگماں نہ تھا
اُٹھو۔ درد کی جستجو کرکے دیکھیں — تلاشِ سکون طبیعت کہاں تک،
نازِ خودداری غلط ثابت ہوا، — عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی،
دل اور ترے خیال سے راحت نہ پاسکے — شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی
جو وہ ملتا نہیں ہے آپ کھوجا — کہ یہ بھی اک طریقِ جستجو ہے
آ۔ مگر اس قدر قریب نہ آ، — کہ تماشا محال ہوجائے
بندہ پرور میں وہ بندہ ہوں کہ بہرِ بندگی — جس کے آگے سر جھکا دوں گا خدا ہوجائے گا

۱۳۱- افسر میرٹھی

جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی دورِ جدید کے ایک خوش گو شاعر ہیں۔ فراق گورکھپوری کی طرح آپ نے بھی انگریزی ادب سے کافی استفادہ کیا ہے جس کا اثر ہمیں آپ کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ افسر صاحب کی شاعری رسمِ کہنہ کے مطابق غزل گوئی ہی سے شروع ہوئی لیکن کچھ تو اُن کی آزاد طبیعت کا اثر اور کچھ انگریزی ادب کا پرتو کہ آپ نے اپنے احساسات وتاثرات کی ترجمانی کے لئے غزل گوئی کے میدان کو محدود پایا اور پرانی شاعری کے قید وبند سے آزاد ہوکر نظم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ آپ نے نظم گوئی میں بھی اپنے لئے ایک علٰحدہ راہ نکالی اور بچوں کے لئے

سہل و نرم زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں جو ملک میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اور یہ نظمیں اپنی سادگی، شگفتگی، طرزِ ادا اور معصومانہ ادب و تہذیب کے لحاظ سے بچوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ چیزیں ہیں - آپ نے نظموں میں مناظرِ فطرت کی بھی عکاسی کی ہے اور اس [illegible] کہ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی مناظر کی عکاسی پائی جاتی ہے - مثلاً :-

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا مرے [illegible] فسانے کا

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوہسار کا
شاید ان کو [illegible]

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں - یا
کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

تیری بھی اے ابرِ نیساں ہر صورت دلکش ہوتی ہے
جب جانِ بہار قطرہ ہے جب زیبِ تاج موتی ہے

کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو
اس بادل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہو گا

آپ حقیقی شاعر ہیں اور اپنے قلبی تاثرات و دلی جذبات کے صحیح ترجمان ــــ آپ کی شاعری روایتی تغزل اور پامال و فرسودہ مضامین حُسن و عشق سے پاک ہے - تقلید کو آپ نے اپنا سرمایۂ شاعری قرار نہیں دیا ہے - آپ کے میلانِ نظم گوئی اور شاعرانہ جبلت نے جہاں پُرانے رنگِ شاعری سے گریز کیا وہاں نئی نئی باتوں کو اپنے یہاں جگہ بھی دی - ماحول اور فضا کے مطابق آپ کی غزلوں میں بلبل کے بجائے کوئل و پپیہا - اور سرو و گل کے بجائے آموں کے باغ ہیں اور بعض جگہ نغمہ و دشت کے الفاظ کے بجائے راگ اور جنگل کے الفاظ نظر آتے ہیں - ہر چند کہ آپ کی غزلیات فارسی کی گوارا تراکیب اور فارسی الفاظ سے خالی نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کے کلام میں ہندی الفاظ کا بھی فقدان نہیں ہے اور انھیں آپ آزادانہ استعمال کرتے ہیں - مثلاً :-

نظر کے سامنے آ - جنگلوں میں بولنے والے
کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

آپ کے صحیح رنگِ تغزل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسرؔ
ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویرِ خوابِ ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

وہ دولت جس کا دُنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلووں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے

مصلحت کا ہے تقاضہ احتیاط
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

للہ ! یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو
کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

اللہ رے جنوں کی یہ ذرہ نوازیاں
بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لئے ہوئے

یہ نظر کی جنبشیں - یہ چال اٹھلائی ہوئی
کچھ تمھیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

تجھ کو پا لینے میں یہ بیتابِ کیفیت کہاں
زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی

نہ صرف مضامین میں بلکہ آپ کے اسلوب بیان میں بھی جدت و ندرت پائی جاتی ہے مثلاً - دمِ نزع محبوب کا مزاج پرسی ہونا بہت پامال مضمون ہے - مگر جناب افسرؔ اس مضمون کو یوں نظم کرتے ہیں - ملاحظہ ہو :-

نیچی غمِ رخصت سے وہ معصوم نظر ہو
اور مجھکو کہیں دور کا درپیش سفر ہو

آپ کی شاعری میں ذاتی تجربات کا بھی عکس نظر آتا ہے - آپ کا مشاہدہ نہایت وسیع ہے اور آپ نے اپنے تجربات کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنے اشعار میں سمویا ہے - جیسے :-

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے کاروانِ بہار دیکھا ہے
محو تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے
ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغامِ حیاتِ جدید ہو وہ یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں
سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار دُکھ میں اللہ یاد آتا ہے

حضرتِ آفسر کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں قنوطیت بالکل نہیں پائی جاتی اور اپنے اندر ایک پیغام بھی رکھتی ہے۔ وہ جہاں حیات و کائنات کے تلخ حقایق کی منظر کشی کرتے ہیں وہاں وہ پیغامِ عمل بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں نمایاں ہو حیاتِ نو اگر ذروں کے دل چیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

آپ کی شاعری میں حقیقت اور فلسفہ کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں:۔

قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اُٹھانے کی
ہائے انجامِ تجسس کی عجائب کاریاں تم ملے اور ڈھونڈھنے والے تمھارے کھو گئے

بعض بعض اشعار میں محاکاتی رنگ بھی بہت گہرا ہے۔ مثلاً:۔

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھُل کھُل کر رہ جاتے ہیں

کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں جو اُن کے معیارِ شاعری سے گرے ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں نام لے لے کر نہ کوسا کیجئے

عامیانہ رنگِ تغزل کی غمازی کر رہا ہے۔

مگر اس قسم کے اشعار آپ کے کلام میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں جناب آفسر کی غزلوں میں وہ پختگی۔ حلاوت اور عظمت بھی نہیں پاتی جو حضرات ثاقب۔ آرزو۔ یگانہ وغیرہ کے یہاں ہے۔

علی سجاد قہر اکبرآبادی

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (سنہ ۲۸ء) اگست عہ ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ (سنہ ۳۲ء) جنوری للعہ ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ ۳۳ء) فروری عہ ر۔ (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری عا ر۔ فروری عہ۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (سنہ ۳۸ء) جنوری سے ر۔ فروری ۸ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ (سنہ ۴۱ء) جنوری، فروری عا ر۔ مارچ تا دسمبر ۶ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ، مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ ر فی پرچہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

میں تو آپ کو صرف "خداوند" کہتا تھا۔ "خدا" کب سے ہوگئے؟ لیکن اگر آپ یہ پوچھ بیٹھے کہ ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ تو سوا چُپ رہنے کے اور کیا کر سکتا ہوں!

بندہ نواز، خدا جانے کتنے ناتمام شکوے ایسے ہیں جو ایک زمانہ سے سینے میں چُبھ رہے ہیں، لیکن میں نے کبھی آپ پر ظاہر نہیں ہونے دئے ــــ اب آپ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ "واشگاف" ہو جائے شاید اسلئے کہ آپ کے نزدیک ہم بندگانِ ضعیف میں صدائے "لنترانی" سننے کی تاب نہیں ہے یا پھر اس لئے کہ

تاکجا خواہم فشردہ ایں دامنِ نمناک را

بہرحال آپ خدا ٹھہرے اور خدا کی نیت کا حال خدا ہی کو معلوم ہو سکتا ہے، اس لئے میں زیادہ قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ڈرتا ہوں، مگر اتنا ضرور عرض کرونگا کہ یہ دور "عدمیت" کا ہے۔ یعنی بادشاہ اور بادشاہ کے قسم کی جتنی چیزیں ہیں سب دُنیا سے محو ہوتی جا رہی ہیں، اس لئے اگر حرج نہ ہو تو "کارگاہِ کبریائی" کو زیادہ وسیع نہ ہونے دیجئے اور ہو سکے تو اسے مختصر کر کے انسانی دسترس سے قریب کر دیجئے، ورنہ دنیا میں جُنید و شبلی کے پاس بھی اس کا جواب نہیں کہ

رہ گم شدگانیم، چہ جوئیم خدا را

پھر میں یہ تو نہیں کہتا کہ جن کو آپ نے خفا کر دیا ہے، انھیں خود ہی بلائیے، لیکن اگر وہ آنا چاہتے ہیں، تو کم از کم انھیں ٹھکرائیے بھی نہیں۔ "یوسفِ بے کارواں" بھی کوئی "یوسف" ہیں "یوسف" ہے!

مکرمی تسلیم۔ شعر و شاعری میں آپ کی ژرف نگاہی کا قایل ہوں، لیکن بعض اوقات آپ اس قدر میکانکی (mechanical) قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان کا جواب ممکن ہو یا نہ ہو، لیکن شعر کا لطف یقیناً خاک میں مل جاتا ہے

جس زاویۂ نگاہ سے آپ نقد فرماتے ہیں، وہ اتنا تنگ ہے کہ مشکل ہی سے شعر کی وسعتیں اس سے ناپی

جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ اس میں منطق ہوتی ہے، اس لئے کوئی معقول جواب بھی نہیں دیا جا سکتا
پھول، خوشبو، رنگ، موسیقی اور شاعری سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں جن سے ریاضی والی ذہنیت بہت کم لطف اُٹھا سکتی ہے۔ مگر پھول کے رنگ و بو سے لطف اُٹھانے والے پنکھڑیوں کی ناہمواری کو نہیں دیکھتے، اور موسیقی پر وجد کرنے والے ساز کے حسن و قبح سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

آپ کی کیمیاوی اور میکانکی ناپ تول اپنی جگہ بالکل درست، لیکن شعر سے اس کو کیا تعلق۔ اس کا مقیاس تو صرف وجدان ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:—

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور !

کتنا پاکیزہ شعر ہے، ذوق اس کو سن کر کس قدر آسودہ ہوتا ہے، لیکن آپ کے منطقیانہ نقطۂ نظر سے یہ بالکل مہمل قرار پائے گا۔ جلاد کا کام یہ ہے کہ وہ تلوار لیکر ایک بار سر اُڑا دے، اس میں "ہاں اور" کی گنجائش کہاں ؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ایک ہی ضرب میں سر اُڑ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ جلاد کی پہلی ضرب میں، غالب کی گردن کا صرف ایک حصہ کٹا ہو اور جب جلاد نے ہاتھ روک لیا ہو تو محبوب نے "ہاں اور" کہا ہو۔ لیکن یہ جواب اعتراض سے زیادہ لغو ہوگا

ایک اور شعر سنئے:—

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانے میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

اہلِ ذوق کے نزدیک یہ شعر غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ لیکن منطق سے کام لیجئے تو یہ بھی مہمل نظر آئے گا۔ "مرا ہونا" — کہاں ہونا ؟ قفس میں۔ بالکل ٹھیک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "نوا سنجانِ گلشن" کو غالب کا وجود چمن میں کیوں ناگوار ہے، کیا اس لئے کہ وہ قفس میں ہے، نہیں، بلکہ صرف اس بناء پہ کہ وہ شیون کرتا رہتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں کہ "نوا سنجانِ گلشن" غالب کے شیون ہی کو پسند نہیں کرتے، خواہ وہ قفس میں ہو یا قفس سے باہر، یہ کہنا کہ "مرا ہونا بُرا کیا ہے" کوئی معنی نہیں رکھتا اور غالب کی طرف سے گلشن میں رہنے کے لئے یہ استدلال بالکل مہمل ہے

ایک اور شعر:—

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اول تو رنگ اُڑنے کے بعد اس کا اور زیادہ کھُل جانا ضروری نہیں، لیکن اگر ایسا ہو بھی تو نزاکت سے اسے کیا واسطہ۔ نزاکت کا تعلق رنگ سے نہیں بلکہ جسم کی ساخت سے ہے۔ لیکن غالب نزاکت کے ثبوت میں صرف رنگ اُڑجانا پیش کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے "پری رُخ" کا فقرہ بھی قابل غور ہے۔ کسی کو "پری رُخ" کہنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ رنگ و نقشہ کے لحاظ سے وہ معیاری حسن رکھتا ہے اس لئے رنگ اُڑنے کے بعد اس میں رنگ کھُلنے کی گنجائش کہاں؟ بہرحال اس قسم کی گفتگو سے ہر اچھے سے اچھے شعر کو مکروہ دکھا سکتے ہیں

آپ میں بھی کبھی کبھی یہی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے آپ کے ([illegible]) پر توصیقل ہو سکتی ہے، لیکن لطفِ شعر سے آپ محروم ہو جاتے ہیں۔ اسے چھوڑئے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، پھول کی پنکھڑیاں نہ دیکھئے، بلکہ صرف اس کی خوشبو سے لطف اُٹھائیے۔ علاوہ اس کے یوں بھی شاعروں کو دُنیا میں جینے کا حق حاصل ہے، اگر آپ نے اتنا پریشان کیا تو وہ غریب کیا کریں گے!

صدیقی - آپ کو جولائی کے نگار سے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں اس زمانہ میں بہت علیل رہا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا ہوگا کہ "دورانِ مایوسی" میں آپ کتنی بار یاد آئے

جس وقت "ضغطۂ قلب" کا دورہ پڑتا تھا اور نوبت نفس شماری کی آجاتی تھی، تو صرف ایک خیال میرے سامنے ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ میرے بعد نگار کا کیا حشر ہوگا اور ساتھ ہی بے اختیارانہ آپ یاد آجاتے تھے۔ کیوں؟ — اس کو آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں اگر بغیر کسی شاعرانہ انکسار کے اپنی اہلیت کو سامنے رکھیں

اب میں اچھا ہوں، لیکن نہیں کہہ سکتا، کب، کیا انقلاب پیدا ہو، اس لئے یہ عریضہ استمزاج یا استصواب کی غرض سے نہیں لکھ رہا بلکہ آپ سے یہ مستحکم وعدہ حاصل کرنے کے لئے کہ میرے بعد نگار کے لئے اپنے وقت کی تھوڑی سی قربانی ضرور گوارا کریں گے، جس کا معاوضہ آپ میری بیوی سے طے کرلیں گے

یہ میں ابھی سے اس لئے لکھے دیتا ہوں کہ معلوم نہیں بروقت اس کی مہلت بھی ملے یا نہ ملے! مجھے یقین ہے کہ آپ کو میرے بعد بہت دن جینا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے بہتر میری جگہ پُر کریں گے بغیر اس زحمت کے کہ آپ ترک وطن کر کے یہاں تشریف لائیں۔ موعودہ مقالہ کا انتظار ہے

تمھاری بزم میں شرکت کی تمنا کس کو نہ ہوگی، لیکن مشکل یہ ہے کہ

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں!

تمھارا جلوہ ارزاں اور یہاں جرأت رندانہ مفقود! تمھیں بتاؤ زندگی کی کیا صورت ہے ؟

میں جانتا ہوں تبدیل مقام کی مجھے ضرورت ہے، لیکن تمھارے یہاں! جہاں "مقام" کا وجود ہی معدوم ہے!
تم نے جس محبت سے بلایا ہے اس کی تعمیل بیشک مجھ پر فرض ہے لیکن تمھارے مہمانوں کا ہجوم مجھے اس فرض سے کب عہدہ برآ ہونے دیتا ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے تنہائی کا کچھ زمانہ تمھیں مل جائے تو لکھنا۔ لیکن جانتا ہوں یہ کبھی نہ ہوگا اور مجھے بغیر تبدیل مقام ہی کے اچھا ہونا پڑے گا۔۔۔ خیر۔۔۔ خوش رہو

حضرت - آپ مجھ پر ظلم کرتے ہیں صرف اس لئے کہ میں آپ کا بندہ ہوں - اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہوسکتی ہے!

بر پائے دوست بند گرانے نہادہ ٔ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ ٔ

لیکن سوال یہ ہے کہ اس عذر کی ضرورت ہی کیا تھی - کیا خدانخواستہ آپ کو میری طرف سے شکوہ و شکایت کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا یا یہ بھی کوئی تازہ "طرح ستم" تھی ؟

مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ صرف اعتماد کی بنا پر اور میں کبھی آپ کو اپنے اعتماد سے شرمندہ نہ ہونے دونگا مطمئن رہیئے - میں بیشک اس قابل نہیں رہا کہ وہاں جاکر منھ دکھاؤں، لیکن آپ سرخرو ہوگئے یہی کیا کم ہے ؟

جی ہاں، میں نے جگر کی فارسی غزل مدینہ میں دیکھی - اوّل تو "مدیر مدینہ" نے اس کا عنوان "جگر پارے" غلط رکھا۔ اُردو کی غزل ہوتی تو مضایقہ نہ تھا - فارسی غزل کے لئے "جگر پارہ" یا "پارہائے جگر" مناسب تھا

نفس غزل کے متعلق سوا اس کے کیا عرض کروں کہ وہ فارسی تو ہے نہیں، البتہ اسے مشکل اُردو کہہ سکتے ہیں - مطلع کا پہلا ہی مصرعہ ملاحظہ ہو:-

بہ سرت کہ ساقی مستِ من بہ سرور بے طلبی خوشم

درمیان کا ٹکڑا "ساقی مستِ من" صرف وزنِ شعر کو پورا کرتا ہے - "کہ" غلط جگہ استعمال ہوا ہے اور "مست" کا لفظ بالکل بیکار ہے - اسی طرح دوسرے اور تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ بالکل انشار ما دھورام کی فارسی ہے - چوتھے شعر میں "حسن" کے بعد تمام کا لفظ بیکار ہے اور دوسرا مصرعہ بالکل مہمل!

مقطع غنیمت ہے - لیکن وہاں بھی "بہ نگاہ عشوہ طراز" کے جگہ "زنگاہ عشوہ طراز" ہونا چاہئے -

ان کے اُستاد "اصغر" کو بھی کبھی کبھی یہ خبط ہوجاتا تھا کہ وہ فارسی میں شعر کہہ سکتے ہیں، اگر جگر بھی اپنے اُستاد کی سنت پر چلکر کسی وقت ایسی غلطی کر بیٹھیں تو قابل عفو ہیں ؟

باب الاستفسار

رسالۂ "عصمت" - جناب سیماب اکبرآبادی
اور
نظم "طاعتِ شوہر"

(جناب علی گوہر صاحب - لاہور)

جولائی کے رسالۂ عصمت میں حضرت سیماب اکبرآبادی کی ایک نظم "طاعتِ شوہر" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے عہد رسالت کا ایک واقعہ نظم کیا ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار) آپ کا استفسار موصول ہونے کے بعد میں نے اس نظم کو دیکھا۔ اس میں جو واقعہ درج ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

"عہد نبوی میں ایک سوداگر مسجد نبوی کے پاس رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ باہر سفر پر جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے تم گھر سے باہر نہ جانا۔ تین دن کے بعد عورت کے میکے سے خبر آئی کہ اس کا بوڑھا باپ زخمی ہوگیا ہے اور اپنی بیٹی کی صورت دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ سوداگر اپنی بیوی کو جانے سے منع کر گیا تھا اس لئے اس نے رسول اللہ کے پاس خادمہ کو بھیجکر زخمی باپ کے پاس جانے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے فرمایا "نہیں، ہرگز نہیں" چند دن بعد میکے سے پھر آدمی آیا کہ اس کا باپ نزع کی حالت میں ہے اور اپنی بیٹی کے دیکھنے کے لئے تڑپ رہا ہے، اس نے پھر رسول اللہ سے التجا کی کہ:-

اب خدارا اُس سے ملنے کی اجازت دیجئے
رحمۃ اللعالمیں ہیں آپ، رحمت کیجئے

لیکن "رحمۃ للعالمین" نے پھر بھی اجازت نہ دی۔

اس کے بعد باپ کے مرنے کی خبر آئی اور یہ اس وقت بھی نہ جاسکی۔ جب شوہر واپس آیا تو اسے یہ سارا حال معلوم ہوا اور اپنی بیوی کی وفاداری کا حال سُنکر دل میں بہت خوش ہوا۔ کچھ دن بعد اس عورت نے اپنے باپ کو خواب میں دیکھا کہ وہ فردوس میں خوش خوش پھر رہا ہے۔

اس نے - "پوچھا، ابا جان یہ رتبہ ہوا کیونکر نصیب"

تو جواب ملا کہ تو نے جو طاعتِ شوہر کی تھی — اس کے بدلہ میں مجھے اللہ سے جنت ملی —"

نظم تو خیر جیسی ہے ہے، لیکن جس روایت کو نظم کیا گیا ہے وہ یقیناً بہت عجیب و غریب ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ قصہ حلیمہ دائی، ہرنی نامہ اور نور نامہ کا عہد ختم ہوگیا لیکن تعجب ہے کہ ابھی تک یہ ذہنیت موجود ہے اور سیماب صاحب ایسے حضرات کی دنیا میں بھی موجود ہے ! !

یقیناً یہ روایت معمولی "میلاد" کی کتابوں سے لی گئی ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو کبھی درایتاً رد کر دینے کے قابل ہے، خواہ وہ صحاح ستہ ہی میں کیوں نہ درج ہو، یہ روایت ان لوگوں کی اختراع ہے جنھوں نے عورت کو ذلیل سمجھ کر اس پر حکومت بلکہ جبر و تعدی کرنے کو جایز قرار دیا اور عہد سعادت میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔

اسلام نے عرب سوسائٹی میں سب سے بڑے دو انقلاب پیدا کئے، ایک غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا، دوسرے عورت کی پوزیشن کو بلند کرنا، لیکن عربوں کی ذہنیت ان دونوں باتوں کو آسانی سے قبول نہ کرسکتی تھی کیونکہ وہ غلام و عورت دونوں کو مملوکہ شے کی حیثیت سے دیکھنے اور ان کو ہر طرح سے تصرف میں لانے کے عادی تھے ۔ جب تک رسول اللہ زندہ رہے اس وقت تک تو خیر کسی کو مخالفت کا یارا نہ تھا، لیکن آپ کی رحلت کے بعد جب عہد بنی امیہ و بنی عباس میں بعض بندشوں کو توڑنے اور بعض نئی باتوں کو اختیار کرنے کے لئے وضع احادیث کی ٹکسالیں قایم ہوئیں، تو اسی وقت اس قسم کی بھی بہت سی حدیثیں وضع کی گئیں جنکا تعلق عورت اور اس کے تمدنی موقف سے تھا اور یہ روایت بھی (اگر واقعی یہ کوئی روایت ہے) انھیں میں سے ایک ہے ۔

اس میں شک نہیں، جس نے یہ روایت گھڑی ہے وہ بہت ذہین شخص تھا، کیونکہ عورت کو مرد کا محکوم و غلام ثابت کرنے کے لئے وہ اس سے زیادہ سخت روایت کوئی، پیش نہ کرسکتا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ اس کا یہ مبالغہ ہی اس کے کذب کا ثبوت بن جائے گا ۔

اس میں شک نہیں رسول اللہ نے بیویوں کو شوہروں کی اطاعت کی تعلیم دی تھی، لیکن صرف اسی حد تک کہ اخلاق و انسانیت مجروح نہ ہوں ۔ لیکن یہ روایت اس روح کے بالکل منافی ہے ۔

رسول اللہ بالطبع بے انتہا رحمدل تھے اور آپ کبھی کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے، لیکن اس روایت میں رسول اللہ کو نہایت سنگدل انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ آئین و قانون کے باب میں آپ سخت گیر بھی تھے، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے اطاعتِ شوہر کے مسئلہ کو نہایت دلشکن حد تک سخت بنا دیا تھا حالانکہ یہ "الدین یسر" کی تعلیم کے بالکل منافی تھا ۔

سوال یہ ہے کہ اگر سوداگر موجود ہوتا اور وہ ایسی حالت میں اپنی بیوی کو گھر جانے کی اجازت نہ دیتا، تو کیا رسول اللہ اس کے اس عمل کو پسند فرماتے ۔ غالباً نہیں پھر ایسی حالت میں جبکہ سوداگر موجود نہ تھا اور اس کی بیوی نے رسول اللہ سے اجازت طلب کی، آپ نے کیوں وہی طرز عمل اختیار کیا جو سوداگر کی طرف سے آپ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتا ۔

رسول اللہ تمام قوم کے سردار تھے اور آپ کو اختیار حاصل تھا کہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو حکم مناسب سمجھیں صادر فرمائیں، اس لئے اگر آپ عورت کو گھر جانے کی اجازت دیدیتے، تو کیا یہ اجازت تعلیم اسلام یا آپ کی پوزیشن کے منافی ہوتی ؟ اور کیا آپ یہ نہ سمجھتے تھے کہ وہ اجازت نہ دیکر عورت پر ناجایز سختی کرنے کی ایک بُری مثال قایم کر رہے ہیں ۔

اس روایت کا آخری ٹکڑا سب سے بڑا ثبوت اس کے غلط ہونے کا ہے اور وہ یہ کہ خدا نے عورت کے باپ کو صرف اس لئے فردوس مرحمت فرمائی کہ اسکی بیٹی نے اپنے شوہر کی اطاعت کی تھی ۔ اول تو یہ عقیدہ نص قطعی کے خلاف ہے، ایک کے اچھے یا بُرے کام کا اثر دوسرے پر پڑے ۔ علاوہ اس کے اصول درایت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس حدیث میں چھوٹی سی بات پر بڑا اجر یا عذاب بیان کیا جائے وہ روایت موضوع ہے ۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت عصمت کے اڈیٹر پر ہے کہ انھوں نے کیوں اس نظم کو شایع کیا ۔ مولانا راشد الخیری مرحوم کی زندگی اس کوشش میں ختم ہوگئی کہ عورت پر جو سختیاں مردوں کی طرف سے ہورہی ہیں ان کو دور کیا جائے اور آج اُن کے پسماندان یہ روایت شایع کررہے ہیں جو عورت کو ذلیل ترین غلامی کی حدود میں کھینچ لانے والی ہے ۔

شتان ما بین الیزیدین فی الندی
یزید سلیم و آخر ابن حاتم !

کیا یزیدی جماعت شیطان پرست ہے

(جناب محمد ادریس صاحب ۔ کلکتہ)

ماہ رواں کے "اورینٹ" میں ایک مضمون یزیدی جماعت کے متعلق شایع ہوا ہے، جس میں تحریر ہے کہ یہ لوگ شیطان پرست ہیں ۔ کیا یہ

درست ہے ؟ اس جماعت کو یزیدی کیوں کہتے ہیں اور اسکی تاریخ کیا ہے ؟

(نگار) چونکہ لڑائی قفقاز تک پہونچ گئی ہے، اس لئے اخبارات اب قاف و چار قاف کی قوموں کی طرف بھی متوجہ ہونے ہیں، لیکن عام طور پر جو حالات شائع ہوتے رہتے ہیں وہ کسی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ سطحی و سرسری ہوا کرتے ہیں، چنانچہ اورینٹ کا یہ لکھنا کہ یزیدی "شیطان پرست" ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے مولویوں کا سوائے اپنے ساری دُنیا کو کافر کہنا!

یزیدی قوم، کُردستان کی قوم ہے جو موصل، دیار بکر، حلب اور طفلس تک پھیلی ہوئی ہے۔ موصل کے شمال میں ۳۰ میل کے فاصلہ پر ایک مقام بعذری ہے جہاں انکا امیر رہتا ہے اور "وادی شیخ عدی" میں جو لالش کے جنوب میں تین گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے، شیخ عدی کا مقبرہ ہے، جسے اس جماعت کا مکہ کہنا چاہئے۔ انکی آبادی کسی وقت ایک لاکھ سے اوپر تھی، لیکن اب ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

اس جماعت کا تعلق نہ یزید بن معاویہ سے ہے، نہ یزید بن انیسہ سے اور نہ ایران کے شہر یزد سے۔ بلکہ اس کی اصل ایزدی ہے یعنی "خدا پرست"! — یہ لوگ خود اپنے آپ کو داسن، دسنی اور دسینی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ایک مورث اعلیٰ کا نام "حسین بیگ داسنی" تھا جسے [illegible] میں سلطان سلیمان نے بر گیر جو عطا کی تھی۔

صورت شکل میں یہ جماعت کُرد جماعت سے بہت مشابہ ہے گو دونوں کے عادات و خصایل ایک سے نہیں ہیں یہ لوگ بڑے محنتی، جفاکش اور عہد و پیمان کے پابند ہیں۔ کاشتکاری اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے، اور معاشرت کے لحاظ سے بہت صاف ستھرا رہتے ہیں۔ یہ جماعت مختلف قبایل میں منقسم ہے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض قبایل خانہ بدوش زندگی کے بھی عادی ہیں اور مویشیوں کو ادھر اُدھر لئے پھرتے ہیں۔

ان کی زبان قریب قریب وہی ہے جو کُرد قوم کی لیکن بعض قبایل میں عربی بھی بولی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے سب کی زبان عربی رہی ہو اور بعد کو کردستان کی طرف منتقل ہونے سے وہ کُردی زبان بولنے لگے ہوں۔

ان کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، کیونکہ ان کے عقاید و مراسم میں زردشتی، مانوی، یہودی، عیسوی اور مسلم عناصر بہت کچھ ملے جلے نظر آتے ہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں جنھیں وہ الہامی کہتے ہیں دو ہیں:۔ کتاب الجلوہ اور مصحف رش (یعنی سیاہ کتاب۔ شیعوں کی طرح سیاہ رنگ ان کے یہاں بھی عزت و احترام کا رنگ سمجھا جاتا ہے) اور دونوں عربی میں ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کا منشاء و مولد عرب ہی کی سرزمین ہے۔

زردشتی مذہب کی طرح ان کے یہاں بھی "ثنویت" پائی جاتی ہے۔ زردشت کے یہاں یزداں و اہرمن کا وجود ہے، ان کے یہاں خدا اور ملک طاؤس کا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف دنیا کا خالق ہے، لیکن اس کا نظام ملک طاؤس سے متعلق ہے اور اسی فرشتہ نے شیخ عدی میں جنم لیا تھا۔

ان کا عقیدہ ہے کہ ملک طاؤس سے جو غلطی ہوئی تھی (یہ غلطی غالباً یہ تھی کہ اس نے سانپ کو جو دراصل شیطان تھا فردوس میں پہنچا دیا تھا) اسکی سزا میں وہ مردود بنا دیا گیا لیکن بعد کو وہ بہت پچھتایا اور رویا یہاں تک کہ اس کے آنسوؤں سے جہنم سرد ہو گیا۔ اسی لئے یہ لوگ جہنم کے وجود کے قائل نہیں ہیں اور نہ مرنے کے بعد عذاب کے! بعض کا خیال ہے کہ طاؤس کا ماخذ تموز، تاموز یا تاؤز ہے جو بابل اور اسیریا والوں کا خدا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ جو روایت ملک طاؤس کے متعلق انکے یہاں پائی جاتی ہے وہ اس کی موید نہیں۔

طاؤس کے مجسمے یا بُت لوہے پیتل کے طیار کئے جاتے ہیں جنھیں سنجق کہتے ہیں۔ ان کے یہاں سات سنجق پائے جاتے ہیں (جو سات فرشتوں کے وجود کو ظاہر کرتے ہیں) اور ان کا نام بھی انھوں نے اُن سات مختلف انسانوں کے نام پر رکھا ہے جنھوں نے ذریعۂ تناسخ درجۂ الوہیت حاصل کر لیا تھا۔ ان میں سے چھ کے نام یہ ہیں:۔ داؤد۔ شیخ شمس الدین۔ یزید بن معاویہ۔ شیخ عدی، حسن البصری، منصور حلاج ——— آخری سنجق (منصور حلاج) کا ۶۷۹ پونڈ وزن کا ہے جو شیخ عدی کے مقبرہ میں رکھا رہتا ہے۔ ساتویں سنجق کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ان کے لٹریچر میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔

یہ جماعت سب سے الگ تھلگ رہتی ہے، کیونکہ انکا عقیدہ ہے کہ وہ آدم کے اس نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو ایک ظرف میں بند کر کے علٰحدہ رکھدیا گیا تھا۔ چونکہ ان کا معاشرتی تعلق اور کسی قوم سے نہیں ہے، اس لئے انکے یہاں سب سے سخت سزا یہ ہے کہ ایک شخص کو جماعت سے علٰحدہ کر دیا جائے، اور اس کا اثر ان کے اخلاق پر بہت اچھا پڑا ہے۔

ان کی عبادت کا وقت صبح و شام ہے جو سورج کی طرف رُخ کر کے ادا کی جاتی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ آفتاب پرست ہیں۔ سورج کی طرف ان کا رُخ کرنا محض اس لئے ہے کہ ملک طاؤس روشنی کا فرشتہ ہے اور سورج میں بھی ملک طاؤس ہی کا جلوہ پایا جاتا ہے۔ عبادت کے وقت یہ پتھر رکھ کر اس کے چاروں طرف

طواف بھی کرتے رہتے ہیں۔ دسمبر میں تین دن روزہ بھی رکھتے ہیں اور بدھ کا دن ان کے یہاں بہت مبارک مانا جاتا ہے۔ ان کا سالانہ حج ۱۵ سے ۲۰ دسمبر تک شیخ عدی کے مقبرہ پر ہوتا ہے۔ بڑا ہجوم ہوتا ہے اور گانا بجانا، حال قال سبھی کچھ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اسوقت دریا میں نہاتے ہیں اور سنجق کو بھی پانی میں غوطہ دیتے ہیں۔ سنجق کا جلوس نکالا جاتا ہے، قربانیاں ہوتی ہیں اور چراغاں کیا جاتا ہے۔

شیخ عدی کے مقبرہ کی مٹی سے چھوٹے چھوٹے گیند بنائے جاتے ہیں اور انھیں تبرکاً لوگ لیجاتے ہیں مریضوں کو کھلاتے ہیں اور آسیب دور کرتے ہیں۔ یہ گویا ان کی خاکِ شفا ہے۔ خانقاہ شیخ عدی کے اندر جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں انھیں کوئی غیر شخص نہیں دیکھ سکتا۔ خانقاہ کے درخت بھی متبرک سمجھے جاتے ہیں، ان کے چاروں طرف دیواریں اُٹھا دی گئی ہیں اور لوگ یہاں آکر منتیں مانتے ہیں۔ ان کا مشہور قومی تہوار جسے یہ سرِ سال (یعنی نوروز) کہتے ہیں اپریل کے پہلے چہارشنبہ کو ہوتا ہے۔ بڑے اہتمام سے شیخ عدی کے مقبرہ پر منایا جاتا ہے، لیکن اس میں گانا بجانا نہیں ہوتا۔ سُرخ رنگ کے پھولوں سے آراستگی البتہ بہت کی جاتی ہے۔

ان کے یہاں کسی نہ کسی دینی بھائی یا بہن کا ہونا ضروری ہے جس کے ہاتھ کو روز بوسہ دیا جاتا ہے۔ شادی قبیلہ سے باہر نہیں ہوتی اور صرف ایک ہوتی ہے۔ لیکن امراء ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ شادی کے وقت مقامی پیر روٹی کے دو ٹکڑے کرکے ایک ایک میاں بیوی کو دیدیتا ہے۔ دُلہن سُرخ لباس میں ہوتی ہے اور شادی کے بعد تمام معبدوں میں جاتی ہے جن میں مسجدیں اور گرجا بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب بیوی شوہر کے گھر میں داخل ہوتی ہے تو شوہر پتھر کا ایک ٹکڑا لیکر اسے مارتا ہے جس سے گویا یہ فال لیجاتی ہے کہ وہ ہمیشہ مرد کی مطیع رہیگی۔ زنا کی سزا ان کے یہاں موت ہے اور طلاق کا رواج بھی کم ہے۔ بیوہ عورت چھ مرتبہ شادی کر سکتی ہے اور اگر کوئی یزیدی ایک سال سے زیادہ غائب رہے تو پھر وہ نہ اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے، نہ دوسری شادی کر سکتا ہے۔ ان کے یہاں عیسائیوں کی طرح بپتسمہ کا بھی رواج ہے۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو خانقاہ کے حوض میں اسے غوطہ دیتے ہیں یا حوض کا پانی اس پر چھڑکتے ہیں۔ بپتسمہ کے بعد ختنہ کا بھی رواج ہے لیکن ضروری نہیں مُردہ کو مشرق کی طرف سر کرکے دفن کرتے ہیں اور جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے تو لکڑی پر اس کے کپڑوں کو لٹکاکر تین دن تک جلوس نکالتے ہیں جس کے ساتھ گانا بجانا بھی ہوتا ہے، مرنے کے بعد تیسرا، ساتواں اور چالیسواں دن عزاداری کا دن ہے اور خاص خاص رسمیں اسوقت ادا کی جاتی ہیں۔

یزیدیوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک اونچی جماعت جسے مُرید کہتے ہیں۔ اس جماعت میں دولت کے لحاظ سے بڑے چھوٹے کا کوئی نہیں، سب برابر سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری جماعت روحانی کہلاتی ہے۔ یہ کاہنوں یا پیروں کی جماعت ہے۔ ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ یہ سکھوں کی طرح اپنے بال نہیں کٹا سکتے۔

یہ جماعت بھی چھ طبقوں میں منقسم ہے۔ سب سے اونچا طبقہ شیخ کہلاتا ہے جو براہ راست شیخ عدی کی نسل کے پانچ خانوادوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا لباس سفید، عمامہ سیاہ ہوتا ہے اور اوپر سے سُرخ یا زرد رنگ کی چادر اوڑھتے ہیں۔ ان کے گھر گویا معبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا طبقہ پیر کہلاتا ہے، ان کا لباس سیاہ، عمامہ سفید ہوتا ہے جس پر ایک سیاہ پر لگا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور موت زیست کی تمام رسمیں انھیں سے متعلق ہوتی ہیں۔

تیسرا طبقہ فقیروں یا قرہ باشوں کا ہے (قرہ باش ترکی زبان میں سیاہ سر کو کہتے ہیں) ان کا لباس و عمامہ دونوں سیاہ ہوتے ہیں ان کی بسر اوقات کا ذریعہ صدقہ و زکوٰۃ ہے۔ یہ گویا ایک قسم کے گداگر ہیں اور خانگی نزاعات طے کرانے اور شادیاں ٹھہرانے کا بھی کام کرتے ہیں۔

چوتھا طبقہ قوالوں کا ہے۔ جو مذہبی تہواروں میں گانے بجانے کا کام کرتے ہیں، پانچواں طبقہ کوچاق کہلاتا ہے، یہ خانقاہوں میں رقص کرتے ہیں، چھٹے طبقہ کو اودحان کہتے ہیں یہ گویا مجاوروں کا طبقہ ہے جو شیخ عدی یا دوسرے مقدس مزاروں پر دربانی اور جاروب کشی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

یزیدیوں کی ہیئت اجتماعی کا نظام دو آدمیوں کے ہاتھ میں ہے، مذہبی یا روحانی نظام میر شیخان کے ہاتھ میں ہے جو لالش میں رہتا ہے۔ مذہبی مسائل میں اسکی رائے بالکل آخری رائے سمجھی جاتی ہے اور شیخ عدی کے مقبرہ کے بعد اسی کا مکان سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔

دنیاوی معاملات امیر الامراء کے سپرد ہیں۔ یہ بعذری میں رہتا ہے اور یزیدیوں کا بہت بڑا سیاسی لیڈر سمجھا جاتا ہے۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنو امیہ کے زمانہ میں یزیدی تحریک شام میں شروع ہوئی۔ یہ لوگ تیمور کے زمانہ میں بصرہ سے آئے اور سنجر و کردستان تک پھیل گئے بعض مسلم مورخین نے ان کو یزید بن معاویہ اور بعض نے یزید بن اُنیسہ سے منسوب کیا ہے، لیکن خود یزیدی جماعت اس کی منکر ہے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید ترکِ اسلام کرکے اس جماعت میں شامل ہوگیا تھا جو اس کے نام سے موسوم تھی، لیکن یزیدی کہتے ہیں کہ یزید ان کے مذہب کا بانی نہ تھا بلکہ اس کا احیاء کرنے والا تھا۔ بہرحال اس مذہب کی اصل بنیاد کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاتا، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ نہ شیطان پرست ہیں اور نہ یزید بن معاویہ ان کا مورث اعلیٰ تھا

کاروانِ نمود

(جہیز دیکھ کر)

مضمحل ہو کر سمٹتا جا رہا ہے آفتاب   نیند سے بوجھل ہو جیسے فاختہ کی چشم خواب
سو چلی ہے رفتہ رفتہ شورش دنیائے دوں   جھٹ پٹا برسا رہا ہے، اپنے جادو کا سکوں

اک مسہری پر سجا ہے کبر کا باطل وقار
ہنس رہی ہے زینت ہستی کی مصنوعی بہار

صف بصف رنگین حُلّے ریشمین و زر نگار   جیسے رومانی فضاؤں میں ہو پریوں کی قطار
سرد سائے گرم شالیں، کہکشاں گوں ساریاں   جن میں ہیں سلمہ ستارے کی خنک چنگاریاں
قیمتی مقیش کی دامن میں زریں جھالریں   جیسے نکلی ہوں شعاعیں حلقۂ قندیل میں
نرم گدّے، گدگدے قالین خواب آور لحاف   میز، کرسی، کوچ، صوفے، آئینے، پردے، غلاف
جن میں تصویریں مناظر کی ہیں اور گلکاریاں   بعض میں سرو و چنار اور بعض میں مرغابیاں
مخمل و کمخواب کے زربفت اور اطلس کے تھان   کر رہا ہے تبصرہ ان پر ہر اک بوڑھا جوان
کانچ اور چینی کے ساغر سونے چاندی کے گلاس   تشنگی بجھ جائے ایسا رنگ کا ہے انعکاس
فرش پر آراستہ ہیں شوخ و درخشندہ ظروف   چرخ کے صفحہ پہ جیسے چاند تاروں کے حروف

بزم میں ہوا، غنا کے جگمگاتے شعبدات
خوشۂ پروین کی صورت اک لگن میں زیورات

خوبصورت جانماز اک رحل سے لپٹی ہوئی   ہے برائے بیت وہ بھی پائنتی رکھی ہوئی
اک طرف ہے خوشنما جزدان میں قرآن بھی،   تاکہ لوگوں کو یقیں ہو "ہیں یہ باایمان بھی"

بہرِ آرائش حسیں گلدان اور فانوس بھی
رسم کے گندے صنمخانے میں ہیں ناقوس بھی

خواب کے وہمی مناظر کا طلسمی سلسلہ   یا مسلسل حسرتوں کا ایک جھوٹا قہقہہ
شوق کی گرمی سے بیہودہ رواجوں کا اُبال   یا کفِ افسوس پر آسودہ حالی کا اُگال،

ایک ناجائز نمائش شفقت و احساں کی ہے
برملا توہین گویا دخترِ انساں کی ہے

دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اک رنگیلا آدمی
جس کی آنکھوں میں ہے افسردہ شرار زندگی
اس کے چہرے سے عیاں ہے غیر آسودہ فراغ
بتکدے میں مشتعل ہو جیسے بے روغن چراغ
قلب تیرہ، ذہن ناقص، جہل پرور دہ دماغ
سر میں شہرت کا جنوں ہے، قرض کا سینے میں داغ

وائے دولت کا جنازہ مفلسی کے دوش پر!
کیوں نہیں گرتی ہے بجلی ان کے عقل و ہوش پر

اللہ اللہ یہ سجاوٹ، یہ غرور رائگاں،
منزلِ فانی میں ان کا یہ مزین کارواں
ضو فشاں، یہ سیکڑوں سوغات کا انبار دیکھ!
عرصۂ ہستی میں آب و رنگ کا بازار دیکھ!
اس بہارستاں میں اب بوئے خزاں پاتا ہوں میں
بطنِ مستقبل میں آسیب گراں پاتا ہوں میں،
کس طرح دیتی ہے اُمت دعوتِ ادبار دیکھ
آنے والی پستیوں کے دور سے آثار دیکھ!

دوسروں کو جو دیا کرتے تھے درسِ زندگی
خود انھیں گھیرے ہوئے ہیں ظلمتیں اسراف کی

ابوالاسرار افری اٹاوی

غزل

بے ہوش آشیاں سے، بے قید گلستاں سے
کھیلا کیا ہوں برسوں ہر برقِ بے اماں سے
ایسے بھی ہم نے منظر دیکھے ہیں آشیاں سے
سو بار آ کے بجلی پلٹی ہے گلستاں سے
کیا واسطہ جبیں کو اب تیرے آستاں سے
یوں بھی تجھی کو دیکھا، دیکھا جہاں جہاں سے
منزل پہ جا رہا ہوں یوں ہٹ کے کارواں سے
جیسے میں بے خبر ہوں منزل کے ہر نشاں سے
بھولے ہوئے فسانے دہرا رہا ہے کوئی
اے میری عمرِ رفتہ لاؤں تجھے کہاں سے
کیا پوچھتا ہے مطرب دل کی نزاکتوں کو
نغمہ بھی کم نہیں ہے اب تو خراشِ جاں سے
اے عشقِ کار فرما اب تو یہ کیفیت ہے
پڑتے ہیں پاؤں جس جا اُٹھتے نہیں وہاں سے

منزل کی جستجو میں کھو جائیں کھونے والے
بڑھتے ہیں شورؔ آگے اب ہم تو کارواں سے

(پروفیسر) شورؔ

وقت کی باتیں

کبوتر اور جنگ

موجودہ جنگ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ برطانیہ کے محکمۂ جنگ نے حکم نافذ کیا کہ تمام پلے ہوئے کبوتر آزاد کر دئے جائیں۔ اس سے مدعا تھا کہ غیر ملکوں کے جتنے کبوتر ہیں وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں اور ان میں جرمنی کے کبوتر بھی شامل تھے۔

چونکہ پچھلی لڑائی میں یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ غیر ملکی جاسوس یا ایجنٹ جرمنی کے کبوتروں کے ذریعہ سے یہاں کی خبریں وہاں پہونچایا کرتے تھے اور اس سے سخت نقصان پہونچا تھا، اس لئے اس مرتبہ یہ احتیاط کی گئی کہ پہلے ہی سے تمام غیر ملکی کبوتر ملک سے باہر کر دئے گئے۔ لیکن نازیوں نے اب ایک اور ترکیب اختیار کی ہے رات کو ان کے ایجنٹ چھوٹے سے ہوائی جہاز میں بیٹھکر برٹش چینل کو عبور کرتے ہیں ان کے ساتھ بید کی ٹوکری میں ایک یا دو جوڑے کبوتروں کے بھی ہوتے ہیں اُتر کر ان کبوتروں کو چھوڑ جاتے ہیں اور پھر یہاں سے انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے خبریں پہونچائی جاتی ہیں۔

برطانیہ کے محکمۂ جنگ نے اس سے بہتر طریقہ اختیار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گیس بھرے ہوئے غبارے جو وقت مقررہ پر کھلتے ہیں، کبوتروں کی ٹوکری میں لٹکائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح دشمن کے مقبوضہ علاقہ میں یہ پیغامات پہونچاتے ہیں کہ فرانسیسی، ڈچ یا بلجیک جس علاقہ میں بھی یہ کبوتر پہونچیں، وہاں کے لوگ انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے مفید اطلاعات فراہم کریں۔ اس طرح دشمن کے بہت سے کارخانوں، ہوائی اڈوں اور فوجی مرکزوں کا پتہ چلا ہوتا ہے۔

محکمۂ بحریہ میں بھی کبوتروں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سرنگیں ہٹانے والے جہاز جن میں وائرلس کے آلات نصب نہیں ہوتے کبوتروں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جب کوئی خطرہ ہوتا ہے تو انھیں کبوتروں کے ذریعہ سے اطلاع دی جاتی ہے۔

پچھلی جنگ سے قبل امریکہ کی افواج میں خبریں دینے والے دستے کبھی کبھی کبوتروں کے ذریعے سے بھی اطلاعات دیا کرتے تھے لیکن ۱۹۱۷ء میں اس چیز کو باقاعدہ بنا دیا گیا اور ہر فوج کے ساتھ ایک خاص دستہ کبوتروں کے ذریعہ سے پیام پہونچانے والا مقرر کر دیا گیا۔ کبوتروں کی یہ خصوصیت کہ ان سے ہر وقت ہر موسم میں یہ کام لیا جا سکتا ہے، بہت مفید ثابت ہوئی اور اشتہار دیدیا گیا کہ جو کوئی کبوتروں سے اس قسم کا کام لے سکتا ہے وہ اپنی خدمات پیش کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولہ ہزار ماہرین جمع ہو گئے اور ایک باقاعدہ محکمہ اس کا قایم ہو گیا۔ چنانچہ پچھلی جنگ میں ہزاروں امریکن کبوتروں سے فرانس میں کام لیا گیا۔

ٹیلیفون کے ذریعہ سے خبر رسانی جبکہ تار کاٹ دئے جائیں ناممکن ہو جاتی ہے، اسی طرح جب موسم خراب ہوتا ہے یا زہریلی گیس فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے تو ہوائی جہازوں سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا، لیکن کبوتروں کے لئے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی اور وہ اپنی منزل تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جاتے ہیں، چنانچہ پچھلی جنگ میں ۹۰ فی صدی پیغامات کبوتروں ہی کے ذریعہ سے پہونچائے گئے۔

اب اس فن میں اور زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ پہلے ایک دن میں دو سو میل یا زیادہ سے زیادہ فی منٹ ایک میل کی پرواز بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی لیکن آج کل جو کبوتر دن بھر میں ۵۰۰ میل پرواز کرتا ہے وہ کسی کام کا نہیں سمجھا جاتا۔ اب اوسط پرواز ۶۰ میل فی گھنٹہ ہے اور اس رفتار سے وہ رات دن پرواز کر سکتے ہیں۔

پہلے کبوتر دن ہی دن میں اُڑتے تھے۔ جب شام ہو جاتی تھی تو وہ کسی درخت میں پناہ لیتے تھے اور صبح کو پھر پرواز شروع کرتے تھے۔ اس سے بعض اہم پیغامات بعد از وقت پہونچتے تھے، لیکن اب ان کو رات کے وقت بھی اُڑنا سکھایا گیا ہے اور اس طرح بغیر ایک لمحہ ضایع کئے ہوئے خبریں ٹھیک وقت پر پہونچائی جا سکتی ہیں۔

پہلے خبریں پہونچانے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کاغذ پر پیام لکھ کر کبوتر کے دُم کے پروں سے باندھ دیا جاتا تھا، لیکن اب یہ پیام ایک چھوٹی سی سلولائڈ کی نلکی میں رکھ دیا جاتا ہے اور نلکی کبوتر کے پاؤں میں باندھ دی جاتی ہے، اسی کے ساتھ بعض کاغذات اور تصویریں سینہ پر بھی باندھ دیتے ہیں جس سے اس کی پرواز میں کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پہلے پیام کو موٹے حرفوں میں لکھتے ہیں اور پھر اس کا بہت ہی چھوٹا فوٹو لیکر نلکی میں رکھ دیتے ہیں۔ بعد کو اس فوٹو کا عکس بڑا کرکے پیام پڑھ لیا جاتا ہے۔

کبوتروں کے ذریعہ سے تصویریں بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ جاپان اور جرمن کی فوجی درسگاہوں میں اس قسم کی تصویریں لینے کا فن سکھایا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک دو انچ کا الیومینیم کا کیمرا کبوتر کے سینے پر باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کیمرے میں ربڑ کا ایک چھوٹا سا گینڈ لگا ہوتا ہے جو ہوا کے دباؤ سے کھ

الشن کو کھولتا بند کرتا ہے اور اس طرح ایک وقت میں دو درجن تصویریں لی جا سکتی ہیں۔ جب کبوتر واپس آتے ہیں تو ان کے سینے سے فوٹو کے کیمرے کھول کر تصویریں
اب لی جاتی ہیں اور دشمن کے بہت سے اہم مرکزی مقامات کا پتہ ان سے چل جاتا ہے۔

چونکہ جانوروں میں موسم کے پہچاننے کے طبعی حس موجود رہتی ہے۔ اس لئے کبوتر جانتے ہیں کہ انھیں بادلوں، ہواؤں، برفباریوں اور کوہر وغیرہ سے بچکر کس طرح
رہنا چاہیے، چنانچہ جب پہاڑوں کی بلندی پر ہوا بہت تیز ہوتی ہے تو وہ نیچے وادیوں میں سے گزرتے ہیں اور جب نیچے ہوا تیز ہوتی ہے تو وہ میلوں بلند ہوکر پرواز کرتے ہیں
اگر اپنے مرکز پر پہونچتے وقت موسم طوفانی ہوتا ہے تو یہ گھنٹوں فضا میں اُڑتے رہتے ہیں اور جب طوفان ختم ہوجاتا ہے تو ہزاروں فٹ کی بلندی سے ڈھیلے کی طرح
گرکر اپنے اڈے تک پہونچ جاتے ہیں۔

ایک ہی محاذ پر پھیلی ہوئی فوج کے مختلف حصوں میں بھی کبوتروں کے ذریعہ سے اطلاعات پہونچائی جاتی ہیں اور ایک خبر رساں دستہ دوسرے خبر رساں
دستہ کو بھی ان کی وساطت سے اپنا پیام پہونچا سکتا ہے۔

عہدِ حاضر کا سپاہی

اس وقت سپاہی بننا بہت مشکل ہے۔ پہلے صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ جسمانی اعضا مضبوط ہیں یا نہیں اور کوئی ایسی بیماری تو
اسے لاحق نہیں ہے جو اسے جلد تھکا دے۔ لیکن اب علاوہ صحت جسمانی کے دماغی صحت کا بھی امتحان لیا جاتا ہے اور بہت
کم ایسے ہیں جو اس "نفسیاتی امتحان" میں پورے اُترتے ہوں۔

اس نفسیاتی امتحان کے ذریعہ سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ وہ کس کام کا زیادہ اہل ہے اور وہی کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس امتحان کے سلسلہ میں
بعض بہت عجیب و غریب سوال کئے جاتے ہیں جن کا جواب اس کو فوراً دینا چاہیئے۔

مثلاً ایک رنگروٹ سے پوچھا گیا "اگر ایک برقی ٹرین شمالی مشرقی سمت ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہے تو اس کا دھواں کس رُخ کو جائے گا"
ظاہر ہے کہ برقی ٹرین میں دھواں کہاں، لیکن فوراً ذہن کا اس طرف منتقل ہونا مشکل تھا اس لئے اس نے کچھ جواب دیدیا کہ دھواں فلاں رُخ کی
طرف جائے گا۔

ایک دوسرے رنگروٹ سے کہا گیا "ایک آدمی سڑک پر سے گزرتے ہوئے موٹر سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کا سر پاش پاش ہوکر فوراً دم نکل جاتا ہے
لوگ اسے اسپتال لیجاتے ہیں لیکن وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں"

اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جب وہ مر گیا تھا تو پھر بچنے کی امید کا کیا سوال۔ لیکن ہر شخص کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔

ایک تیسرے شخص سے کہا گیا "ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ اسے پھانسی دیجانے والی ہے، اسی خواب کی حالت میں اس کی گردن پر کوئی بھاری چیز گری
اور وہ اس صدمہ سے مر گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ مر گیا تھا تو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ اس نے یہ خواب دیکھا تھا۔ مگر فوراً یہ بات سمجھ میں آنا آسان نہیں۔

الغرض اسی طرح کے بہت سے امتحانات کئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کس خدمت کے قابل ہے۔ چنانچہ ایسا شخص جو افسر بننے
کا اہل ثابت ہو بہت کم نکلتا ہے۔

اس قسم کے امتحانات کا رواج جرمنی میں بہت ہے اور وہاں نہایت سختی سے ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہوا بازوں کے لئے جو امتحانات مقرر ہیں وہ اور زیادہ
سخت ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ یورپ کی فوج اس وقت بہترین انسانوں کا مجموعہ ہے اور دنیا انھیں بہترین انسانوں سے خالی کی جا رہی ہے۔

چاء کی پیالی میں طوفان

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات بہت معمولی معمولی باتیں بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث ہوئی
ہیں اور ذرا سی چنگاری نے برسوں تک قایم رہنے والی آگ دنیا میں مشتعل کر دی۔

ایکبار ترکی اور وینس میں صرف اس لئے لڑائی لڑی گئی کہ ترکی کے ایک مغربی داشتہ کا تمسخر کیا گیا تھا اور اب سے ۴۰۰ سال پہلے نصف یورپ میں لڑائی
کی آگ صرف اس لئے مشتعل ہوگئی کہ لوئی … کے کسی کنیز سے ایک ڈول پانی چرا لیا گیا تھا

چین میں ایک بار نہایت خونریز جنگ صرف ایک چاء دانی کی بدولت چھڑ گئی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ کوئی چینی سردار اپنی چاء دانی کو بہت پسند کرتا تھا
بدقسمتی سے اسکا ملازم جسکے پاس چاء دان رہتا تھا فرا اون کے … گر پڑا اور چاء دان ٹوٹ گیا۔ چینی سردار نے … کی قسم کھائی اور بادشاہ

کو آمادہ کیا کہ ان قزاقوں کا قلع قمع کر دے۔ چنانچہ قزاقوں کے خلاف یہ لڑائی تقریباً سو سال تک جاری رہی اور دس لاکھ جانیں اس میں ضایع ہوئیں چنانچہ تاریخ میں اس لڑائی کو "چار دان کی لڑائی" کہتے ہیں۔

کوئی شخص مشکل سے یقین کر سکتا ہے کہ صرف بچہ کا نام رکھنے پر لڑائی چھڑ سکتی ہے، لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا۔ فرانس میں فرانسیس اول کی حکومت کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بچہ بادشاہ کے پیدا ہوتا تھا تو پڑوس کے کسی فرمانروا کو دعوت دی جاتی تھی تاکہ وہ آ کر بچہ کا نام تجویز کرے۔ چنانچہ اس موقعہ پر سوئٹزرلینڈ کے بادشاہ کو دعوت دی گئی، وہ آیا اور اس نے بچہ کا نام (Shadrach) رکھا لیکن فرانسیس نے اسے منظور نہ کیا۔ شاہ سوئٹزرلینڈ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور آخر کار دونوں ملکوں میں لڑائی چھڑ گئی جو ایک سال تک جاری رہی اور جس میں سوئٹزرلینڈ کو سخت شکست اٹھانا پڑی۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یورپ میں ایک کھڑکی کی وجہ سے دس سال تک لڑائی جاری رہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرانس کے بادشاہ لوئی چہار دہم کا ایک وزیر تھا جس کا نام Louvois تھا۔ اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک نیا مکان تعمیر کرایا اور بادشاہ کو وہاں دعوت دی۔

لوئی نے مکان کا معاینہ کرتے وقت ایک کھڑکی کو دیکھ کر کہا کہ یہ ٹھیک نہیں بنی، اوپر کی طرف زیادہ چوڑی ہے۔ وزیر نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا اور اس پر اصرار کیا۔ آخر کار پیمایش ہوئی اور کھڑکی واقعی اوپر کی طرف آدھ انچ زیادہ چوڑی نکلی۔ گستاخی کی سزا میں وزیر کو علحدہ کر دیا گیا، لیکن چونکہ یہ بڑا ذی اثر شخص تھا اس لئے اس نے قرب و جوار کی حکومتوں سے ملکر فرانس کے خلاف محاذ جنگ قایم کرا دیا، یہ جنگ جو نو سال تک قایم رہی۔ اور ۱۶۹۷ء میں ختم ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوئی کو پھر اپنے وزیر کو بلانا پڑا اور فرانس کو انگلستان کے مقابلہ میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

ایکبار تمباکو کے صرف ایک ڈبہ کی وجہ سے دو قوموں میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نپولین سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اور برطانیہ کی طرف سے جہازوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی کہ کوئی ممنوعہ شے تو ان میں نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک بار برطانوی جہاز Leopard نے امریکہ کے ایک تجارتی جہاز کو گولوں سے کچھ نقصان پہونچایا۔ Calhoun نے جو امریکن کانگرس کا ممبر تھا، معاوضہ طلب کیا۔ اتفاق سے اسکے چند دن بعد ہی برطانوی جہاز نے امریکہ کے ایک اور تجارتی جہاز کو روکا جس کا کپتان Calhoun کا عزیز تھا۔ یہ جہاز بھی دیکھ بھال کے لئے روکا گیا تھا۔ اول اول تو کوئی ممنوعہ شے برآمد نہیں ہوئی، لیکن بعد کو خود کپتان کی جیب سے تمباکو کا ایک ڈبہ نکلا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ Calhoun نے کانگرس کو جنگ پر آمادہ کر دیا اور امریکہ نے کناڈا پر حملہ کر دیا۔

کبھی کبھی ڈاک کا ٹکٹ بھی لڑائی کا سبب بن سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں Dominicia نے ایک ٹکٹ جاری کیا جس میں ریاست کا نقشہ چھپا ہوا تھا، لیکن اس نقشہ میں ریاست کے جو حدود دکھائے گئے تھے وہ درست نہ تھے اور دوسری ملحقہ ریاست Haiti کی زمین کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے تھے۔ اس پر دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں اور اگر یہ ٹکٹ منسوخ نہ کیا جاتا تو جنگ یقینی تھی۔

ایک تازہ ترین واقعہ سنہ ۱۹۲۷ء کا سنئے۔ حکومت Purayuay نے ایک ٹکٹ چھاپا جس کے نقشہ میں ایک ایسے حصہ زمین کو بھی شامل کر لیا جو کسی کا نہ تھا۔ تین سال بعد Bolivia نے اپنا ٹکٹ شایع کیا اور اس میں اس حصۂ زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کیا۔ دونوں حکومتوں میں اس پر بحث ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آخر کار کامل دو سال تک آپس میں لڑتی رہیں اور ہزاروں آدمی دونوں طرف کے جان سے مارے گئے!

مطبوعات موصولہ

نئے ادبی رجحانات

اُردو ہندی کی نزاع، سیاسی نقطۂ نظر سے بیشک نقصان رساں ثابت ہوئی لیکن علمی حیثیت سے اس نے فایدہ بھی پہونچایا یعنی اگر ایک طرف ہندی میں تصانیف و تالیفات کی گرم بازاری شروع ہوئی تو دوسری طرف اُردو میں بھی اچھی اچھی کتابیں شایع ہونے لگیں۔ گو تعداد کے لحاظ سے مقابلتاً اُردو پیچھے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تالیفات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بہ حیثیت مجموعی، اُردو کا پلّہ اب بھی بھاری ہے، لیکن یہ بھی چند دن کی بات ہے، کیونکہ ہندی والے جس جوش و خروش سے ہندی زبان کے احیا میں مصروف ہیں اور ہندو پبلک جس فراخ دلی سے ہندی کتابوں کی اشاعت میں مدد دے رہی ہے، ہندی لٹریچر کی "کمیت" کے ساتھ اس کے معیار کو بھی بلند کر دے گا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے اُردو داں پبلک مفید سبق لے سکے گی یا نہیں۔ بہرحال اس نزاع کی بدولت اس وقت اُردو میں بھی اچھی کتابیں شایع ہو رہی ہیں اور انھیں میں سے ایک "زیرِ تبصرہ" کتاب بھی ہے۔

ادب اُردو کی تاریخ پر اس دوران میں متعدد کتابیں، اچھی بری، چھوٹی بڑی شایع ہو چکی ہیں، لیکن "رجحانات جدیدہ" پر کوئی کتاب نہ لکھی گئی تھی۔ اس لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ سید اعجاز حسین صاحب لکچرر الٰہ آباد یونیورسٹی نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔

یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں نظم و نثر دونوں کے نئے رجحانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ شروع میں پہلے انھوں نے دورِ متقدمین پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ اُس وقت ادبی رجحانات کیا تھے اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد جو مختلف تحریکیں ہندوستان میں شروع ہوئیں ان کو سامنے رکھ کر نظم و نثر کے تاثرات سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد تیسرا لیکن اہم دور جنگِ عظیم کے بعد کا تھا اور اسی دور پر خصوصیت کے ساتھ انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ زمانہ قدامت پسندی کے خلاف جہاد کا زمانہ ہے اور ایک نوع کی بحرانی کیفیت اہل قلم کے نوجوان طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہے، اس لئے جذبات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان میں بھی اک قسم کا ہیجان رونما ہوا جس میں سلامت روی، بیراہ روی، تناسب و عدم تناسب سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے جوش اور اُبال کے زمانہ کے لٹریچر کو سامنے رکھ کر کوئی معقول گفتگو کرنا آسان نہ تھا، لیکن سید اعجاز حسین صاحب نے جس خوبصورت اختصار کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے وہ کامیاب ایجاز کی بہت اچھی مثال ہے۔ وہ حضرات جو تاریخ ادب کے مطالعہ کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے، یا مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ کتاب طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی کافی دلکش ہے۔

قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ سید انصار حسین۔ نشیمن ۔ ۷ ۔ منٹو روڈ مراد آباد۔

متین کے سو شعر

سو سو اشعار کے انتخاب کی بدعت یا سنت جامعۂ ملیہ نے ایسی قایم کر دی ہے کہ جس شاعر کو دیکھئے وہ اسی خبط میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ہر چند اس وقت جبکہ کاغذ گراں ہے، یہ خیال بُرا نہیں، لیکن اس کا ایک نقصان ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس طرح پبلک کو رائے قایم کرنے کا صحیح موقع نہیں ملتا۔ جناب متین مچھلی شہری، جن کے سو اشعار کا انتخاب "سبحۂ صد دانہ" کے نام سے جناب سید سعدی جعفری نے شایع کیا ہے، پُرانے شاعر ہیں اور تلامذۂ داغ کی اولین صف میں شمار کئے جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت سایل دہلوی نے کتاب کی تمہید میں اس کا اظہار کیا ہے۔

ان کے کلام میں تمام وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو داغ کی شہرت عام کا باعث ہوئیں، مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ایمان کی تو یہ ہے پرستش کی چیز ہے — ہر ایک سنگ اس بُتِ کافر کی راہ کا،

وہ اپنا شوق پنہاں اور انداز حیا ان کا — مگر پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اقرار ہو جانا

ممکن نہیں عیاں نہ ہو کچھ فتنۂ خرام — تلوار چل گئی ہے، گئے ہیں جدھر سے آپ

چونکہ اس قسم کی شاعری کا دور اب ختم ہو رہا ہے، اس لئے جناب سعدی جعفری نے اچھا کیا کہ یہ انتخاب شایع کر دیا۔

یہ انتخاب مکتبۂ ادب ۔ فاطمہ اسٹیٹ ۔ پریاگ الٰہ آباد سے دو آنے میں مل سکتا ہے۔

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۲۱ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت مجلد تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گفتنی فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲- مادئین کا مذہب
۳- ذکاوت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر) علاوہ محصول

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

اپنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اسانید سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

[illegible]

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء (غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۶۶ — مع تصویر غالب (رنگین) قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول	**جنوری سنہ ۳۵ء** اور **جنوری سنہ ۳۶ء** بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی اُنکے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کرسکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہوسکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔	**جنوری سنہ [illegible]ء** ڈراما اصحاب کہف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچوں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشاپردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عا ر علاوہ محصول	**جنوری سنہ ۳۸ء** تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ - قیمت تین روپیہ (سعہ) علاوہ محصول
جنوری سنہ ۳۹ء (مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۲۴ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول	**جنوری سنہ ۴۰ء** (نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول	**جنوری سنہ ۴۱ء** یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے قیمت دو روپیہ (عا) علاوہ محصول	**جنوری سنہ ۴۲ء** اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جنکی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ نمبر گویا تتمہ ہے جنوری سنہ ۴۱ء کا اور اُسکے ساتھ ہی اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے ان دونوں نمبروں سے ملکر ایک ایسا تذکرہ مرتب ہوجاتا ہے جو اسوقت تک پیش نہیں کیا جاسکا۔ قیمت عہ ر علاوہ محصول

نگار

قیمت فی کاپی ۸؍

چندہ سالانہ ۵؍ — اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ — فہرست مضامین ستمبر سنہ ۶۲ء — شمارہ ۳

ملاحظات

رفتارِ جنگ

نتیجہ کے لحاظ سے ہم ابھی تک اسی جگہ ہیں، جہاں پچھلے مہینے تھے، لیکن جنگ کی شدت کے لحاظ سے اگست کا مہینہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس دوران میں سرزمین قفقاز میں جو رن پڑے ہیں، وہ دُنیا کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے

سباسٹپول کے بعد سب سے بڑا معرکہ جرمنی کے سامنے یہ تھا کہ وہ دریائے ڈون کو عبور کرکے اس میدان میں آجائے جو استراخان، اسٹالن گراڈ اور رسٹوف کے درمیان ایک مثلث بناتا ہے اور ہرچند ہم جرمنی کے اُن نقصانات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے جو اس مہم میں اسے اُٹھانا پڑے، تاہم اسنے یہ معرکہ کسی نہ کسی طرح سر کرہی لیا اور اب اُس کی فوجیں دریائے ڈون کے نہ صرف اس موڑ کو عبور کرگئی ہیں جو اسٹالن گراڈ سے قریب تر واقع ہے؛ بلکہ اُن مورچوں تک پہونچ گئی ہیں جو اسٹالن گراڈ کی حفاظت کے لئے قایم کئے گئے تھے اور شہر تک کا فاصلہ ہر ساعت کم ہوتا جارہا ہے

روس جس جرأت و دلیری سے دشمن کا مقابلہ کررہا ہے، وہ بھی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے، لیکن جرمنی کی بری و فضائی فوج کی کثرت اور بڑھی ہوئی میکانکی قوت کا مقابلہ آسان نہ تھا اور یقیناً یہ سرخ افواج کی تنظیم و اخلاقی برتری کا معجزہ ہے کہ اس نے مہینوں تک جرمن افواج کو دریائے ڈون عبور کرنے سے باز رکھا اور اب بھی کہ وہ اس دریا سے گزر کر اسٹالن گراڈ کے حدود میں داخل ہوچکی ہیں، ایک ایک انچ پر ہزاروں جانوں کا خراج ان سے وصول کیا جارہا ہے

اس میں شک نہیں کہ اسٹالن گراڈ جتنا قریب ہوتا جارہا ہے، جرمن افواج کو اتنی ہی سخت مقاومت سے واسطہ پڑتا جاتا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جس طرح پچھلے سال، ماسکو اور لینن گراڈ کے سامنے جرمن اقدامات روک دئے گئے تھے، اسی طرح اسٹالن گراڈ کے سامنے بھی روک دئے جائیں گے، کیونکہ سردی شروع ہونے کو ابھی کم از کم ڈیڑھ مہینہ باقی ہے اور اتنی مدت تک جرمنی کے سیلاب آہن و آتش کو روکے رکھنا آسان نہیں۔

پھر اگر اسٹالن گراڈ روس کے ہاتھ سے نکل گیا، تو اس میں شک نہیں کہ روس کے محاذ پر جرمنی کا پلہ بہت بھاری ہوجائے گا اور اگر آئندہ موسم سرما تک وہ کوئی اور اقدام نہ کرسکا تو بھی وہ اپنی اس کامیابی سے بڑا فایدہ حاصل کرلیگا اور روسی فوجیں اس استفادہ سے اسے باز نہ رکھ سکیں گی

اسٹالن گراڈ اور استراخان کی اہمیت کا ذکر ہم پچھلے مہینے کے ملاحظات میں کرچکے ہیں اور اگر آپ نقشہ اُٹھاکر دیکھیں گے تو آپ خود اس اہمیت کا اندازہ کرسکیں گے۔ روس کا جنوبی حصہ جسے قفقاز کہتے ہیں، اس حصۂ زمین کا نام ہے جو بحرِ اسود اور بحرِ کاسپین کے درمیان واقع ہے اور جس کی چوڑائی ایک ہزار اور ۵۰۰ میل کے درمیان ہے۔ یقیناً یہ کوئی بڑا حصۂ زمین نہیں، لیکن اس کی جغرافی و سیاسی پوزیشن بڑی اہم ہے۔ ہرچند یہ علاقہ کوہستانی ہے لیکن قدرت کی معدنی و زرعی پیداوار سے مالامال ہے۔ اس قطعۂ زمین میں اس قدر کثرت سے دریا پائے جاتے ہیں کہ بحرِ اسود اور بحرِ کاسپین کا تعلق خشکی و تری دونوں طرف سے بہت آسان ہوگیا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ان دونوں سمندروں کے ساحلوں پر ریلوے لائن بھی پائی جاتی ہے اور بحرِ اسود و بحرِ کاسپین کے درمیان ایک بڑی چوڑی سڑک بھی موجود ہے

پٹرول کی پیداوار کے لحاظ سے امریکہ کے بعد قفقاز ہی کا مرتبہ ہے یہی حال ان دوسری معدنی پیداواروں کا ہے جو جنگ کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں اور یہ بالکل واقعہ ہے کہ جرمنی کا قفقاز کی طرف اقدام صرف پٹرول حاصل کرنے کے لئے ہے جس کی کمی کو وہ اب بُری طرح محسوس کررہا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو اس میں بھی شک نہیں کہ جنگ جاری رکھنے کے لئے اس کو بڑا ذریعہ ہاتھ آجائے گا

لیکن نقشہ دیکھنے سے یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی کہ قفقاز کو اسٹالن گراڈ سے کیا واسطہ ہے اور جرمنی کیوں سیدھا قفقاز تک نہیں بڑھا

بات یہ ہے کہ جنگ کا اولین اُصول حملہ کرنا نہیں، بلکہ فریق مقابل کے ذرایع کمک اور وسایل نقل وحرکت پر قابض ہونا ہے۔ پھر چونکہ بحر کاسپین اور دریائے والگا کے ذریعہ سے ماسکو، لینن گراڈ اور قفقاز تک پورا سلسلہ نقل وحرکت کا پایا جاتا ہے، اس لئے جرمنی کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس سلسلہ کو درمیان سے قطع کر دے تاکہ ماسکو کی طرف سے کوئی مدد قفقاز کو نہ پہونچ سکے

دریائے والگا اتنا اہم دریا ہے کہ اگر ہم اسے روس کی شہ رگ سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا، اس کی لمبائی ۲۳۲۵ میل ہے اور ماسکو ولینن گراڈ کے درمیان کوہستان ولڈائی سے نکل کر اسٹالن گراڈ ہوتا ہوا بمقام استراخان بحر کاسپین میں گرتا ہے اور علاوہ اُن متعدد نہروں کے جو اس دریا سے نکل کر روس کے وسطی وشمالی علاقوں تک پہونچی ہیں، خود یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ استراخان سے لیکر لینن گراڈ تک اس میں بڑا بڑا اسٹیمر چلتے ہیں اور اسی طرح اس دریا نے تمام قفقاز کے علاقہ کو مرکزی حکومت سے قریب تر کر دیا ہے۔ پھر چونکہ دریائے والگا اسٹالن گراڈ ہی سے ہوکر گزرتا ہے اس لئے جرمنی نے شمالی وجنوبی روس کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق کرنے کے لئے، اسٹالن گراڈ پر حملہ کیا، کیونکہ اس شہر پر قابض ہو جانے کے بعد استراخان کی ساحلی اہمیت مفقود ہو جاتی ہے اور بحر کاسپین کے تمام ساحلی مقامات معہ قفقاز کے علاقہ کے مرکزی حکومت سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر اسٹالن گراڈ روسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو یہ بڑی سخت ضرب ہوگی اور جرمنی اس سے فایدہ اُٹھاکر جنگ کو کافی عرصہ تک جاری رکھنے کے قابل ہو جائے گا

ہر چند قفقاز کی حفاظت کے لئے بحر اسود کے بعض ساحلی مقامات ابھی تک روس کے قبضہ میں پائے جاتے ہیں، لیکن آپ نے خبروں سے یہ بھی معلوم کیا ہوگا کہ جرمن افواج جنوب کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جنوب سے مراد بحر اسود کا ساحلی حصہ ہے، اس لئے اگر نازی فوجیں ایک طرف اسٹالن گراڈ کی جانب بڑھ رہی ہیں اور دوسری طرف سواحل بحر اسود کی طرف، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قفقاز کے تمام امکانی ذرایع امداد کو بند کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں اور ان کی یہ چال کوئی معمولی چال نہیں ہے

بہر حال اگر اسٹالن گراڈ فتح ہو گیا، تو پھر قفقاز کی مدافعت کا سارا بار اُن اتحادی فوجوں پر پڑ جائے گا جو ایران وعراق میں مجتمع ہیں اور اگر ہمارا یہ خیال غلط نہیں کہ اتحادی طیاریاں ایران وعراق میں بڑی زبردست ہیں تو پھر یہ معرکہ بھی کوئی معمولی معرکہ نہ ہوگا اور نازیوں کے پاس اس کا کوئی علاج نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان اور خلیج فارس کی طرف سے پہونچنے والی کمک کو روک سکیں

ان حالات میں یہ کہنا مشکل ہے کہ آیندہ سرما تک نازیوں کا اقدام کوئی ایسی صورت اختیار کر سکے گا کہ جنگ قفقاز کسی فیصلہ کن منزل تک پہونچ جائے لیکن اسی کے ساتھ جرمنی کو اس کے مقبوضہ علاقہ سے نکالنا بھی روس کے لئے ناممکن ہو جائے گا

بہر حال اس وقت تو یہ لڑائی ایران کی سرحد تک پہونچتی معلوم نہیں ہوتی اور غالبًا سال آیندہ کی گرمیوں تک پھر دنیا کو دور انتظار وتذبذب سے واسطہ پڑنے والا ہے، جو انسانی دماغ واعصاب کے لئے جنگ سے زیادہ تباہ کن ہے۔ ہاں، اگر اس دوران میں مصر کی جنگ پھر شروع ہو گئی، جس کے امکانات روز بروز قوی ہوتے جاتے ہیں، تو اُس جنگ کا پس منظر جو ایشیا کی سرزمین پر چھڑنے والی ہے، البتہ زیادہ واضح ہو جائے گا اور پھر موسم سرما میں دونوں طرف سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانے کا اندیشہ بھی جاتا رہے گا

مسٹر چرچل اور اسٹالن

اگست کے تمام واقعات میں سیاسی حیثیت سے اہم ترین واقعہ مسٹر چرچل کا سفر کریملین تھا۔ مسٹر چرچل کا مصر کے مورچوں کا معائنہ کرتے ہوئے اسٹالن سے ملنے کے لئے ماسکو تک پہونچنا اس وقت تک ظاہر نہیں ہوا جب تک وہ واپس نہیں آگئے، لیکن جب وہ واپس آگئے تو پھر یہ راز راز نہ رہا کہ اس سفر کا بڑا مقصود دوسرے محاذ کے قیام کے متعلق اسٹالن کو اطمینان دلانا تھا۔ چنانچہ مسٹر چرچل اور اسٹالن کے درمیان یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ برطانیہ نے ساحل ڈیپ پر فوجیں اُتار کر دوسرے محاذ کی داغ بیل ڈال ہی دی

مغربی ساحل فرانس کا بڑا حصہ اس وقت جرمنی کے قبضہ میں ہے اور ڈیپ اسی ساحل کا ایک اہم مقام ہے جہاں برطانوی فوجیں صرف یہ دیکھنے کو اُتاری گئی تھیں کہ دوسرا محاذ قایم کرنے کے لئے اتحادیوں کو کیا کیا طیاریاں کرنا ضروری ہیں

یہ شگون کس حد تک مبارک ثابت ہوا، اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس وقت تک جو خبریں موصول ہوئی ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ فرانس اور بلجیم کے ساحلوں پر جو جرمنی کے قبضہ میں ہیں، اتحادی حملہ کا واقعیت کی صورت اختیار کر لینا اگر ناگزیر نہیں تو محال بھی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ سنہ ۴۳ء میں ہم کو اس جدید محاذ کی بھی دلچسپ خبریں سننے میں آئیں

جاپان اور بحر پاسفک

بحر پاسفک میں جزایر سلیمان کے آس پاس جاپانیوں کو جو نقصانات حال ہی میں اُٹھانا پڑے ہیں ان سے ہم اس نتیجہ پر تو نہیں پہونچتے کہ بحر پاسفک سے زرد خطرہ دور ہو گیا ہے، لیکن اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا وہ جارحانہ اقدام جس کی خوشخبری ہمیں پچھلے سال سنائی گئی تھی شاید شروع ہو گیا ہے، اور اگر چین کی یہ خبریں صحیح ہیں کہ جاپان کو وہاں سخت نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے تو پھر ہمیں بہت کم پس و پیش کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ جاپان کی پہلی دوڑ ختم ہو چکی ہے اور دوسری دوڑ میں اس کے حریفوں کا اندازہ زیادہ نبرد آزما نظر آتا ہے

اس دوران میں کئی بار یہ خبر سننے میں آئی کہ جاپان، سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرنے کی طیاریاں کر رہا ہے، لیکن یہ خبریں ہمیشہ چینی ذرایع سے آئی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کی بنیاد واقعہ سے زیادہ احتیاط و اندیشہ پر قایم ہو، کیونکہ جاپان کے سامنے فتوحات میں اضافہ کرنے سے زیادہ اہم سوال موجودہ مقبوضات پر اقتدار قایم رکھنے کا ہے اور وہ بحر پاسفک سے اپنی توجہ کسی اور طرف ہٹا ہی نہیں سکتا، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ امریکی طیارے روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور آسٹریلیا و ہندوستان کی طرف جاپانی اقدام امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر چینیوں کے نزدیک جاپانی قوت واقعی اتنی زبردست ہے کہ وہ بیک وقت بحر پاسفک پر بھی چھائی رہ سکتی ہے اور سائبیریا پر بھی حملہ کر سکتی ہے تو پھر روس سے زیادہ چینیوں کو اپنی فکر کرنا چاہئے، کیونکہ جس طرح جرمنی کے سامنے اب صرف روس کا سوال ہے، اسی طرح جاپان کے سامنے چین کا ہے اور انھیں دونوں جگہ اس لڑائی کا فیصلہ ہونا ہے

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پچھلے پانچ سال میں چین نے جس بری طرح جاپان کو اُلجھائے رکھا ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ چین کے ذرایع مدافعت پر اس دوران میں کافی اثر پڑا ہے — ایک طرف روس کا اپنی مصیبت میں مبتلا ہونا، دوسری طرف برما کی سڑک ہاتھ سے نکل جانا، یہ دونوں واقعے ایسے ہیں جنھوں نے برطانیہ و روس دونوں طرف سے چین کی امداد کے ذرایع کو بہت تنگ کر دیا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نقصان کی تلافی کی کیا کیا امکانی صورتیں اتحادیوں نے سوچی ہیں اور ان پر کس حد تک عمل ہو سکتا ہے۔

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

قدیم فارسی قدیم فارسی وہ زبان ہے جو شاہانِ اخمنی بولتے تھے یعنی یہ زبان بہمن داراب اور دارا کی زبان ہے۔ اس خاندان کے بادشاہوں کا عہد ۵۵۰ ق م کے لگ بھگ سے شروع ہوا اور ۳۳۰ ق م میں سکندر کے ہاتھوں ختم ہوا۔ اس زمانہ کی کوئی تصنیف کتاب کی شکل میں موجود نہیں ہے البتہ کوہ بہیستون اور قدیم شہر اصطخر کے پرانے محلوں پر چند کندہ عبارتیں پائی گئی ہیں جو شاہانِ وقت نے لکھوائی ہیں۔ یہ کتبے پہلے نقش و نگار سمجھے جاتے تھے لیکن محققین فرنگ نے اب ان معموں کو حل کر لیا ہے۔ یہ کتبے صرف چار سو مختلف الفاظ پر مشتمل ہیں۔ اس زبان کا رسم الخط عسوری کتابت سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے اور اُس کے حروف تہجی اُس محرفی شکل کے ہیں جس کو خط میخی کہتے ہیں ان حروف کی تعداد اکتالیس ہے۔ اس زبان کا ایک فقرہ نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے:۔

"دارایاوُش۔ شایۂ تھیہ۔ وزرک۔ شائے تھیہ نام شائے تھیہ۔ دہیونام۔ وِشتاسپہیہ۔ پُترا۔ ہاکھامنشیہ۔ ہیا۔ اِمَم۔ تچرم۔ اکوناش" (کتبۂ کھنڈرات قدیم شہر پارس)

ترجمہ:۔ "دارا۔ شاہِ اعظم۔ شاہان شاہ۔ شاہِ ممالک۔ پسرِ وِشتاسپ اخمنی۔ جس نے یہ عبادت گاہ بنائی"

عسوری اور قدیم فارسی کے رسم الخط میں اہم فرق یہ ہے کہ عسوری زبان میں ایسے حروفِ تہجی موجود نہ تھے جن کا صوت سے تعلق ہو۔ قدیم فارسی کی یادگار صرف چند کتبے اور گنتی کے الفاظ باقی رہ گئے ہیں لیکن کتاب آوِستا کی زبان قدیم فارسی کی بہن سمجھی جاتی ہے۔

آوستا کی زبان آوستا کی زبان کتاب کی صورت میں اب بھی دستیاب ہے۔ اسلام کی اشاعت سے قبل کل ایران کا مذہب زردشتی تھا زردشت کا حال قوم میدیہ کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ قوم میدیہ کے فرقہ مجوس کی اُس شاخ میں جس کو آتھرون یا آتش رُوان کہتے ہیں ایک شخص پیدا ہوا جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کتاب آوستا پیش کرکے نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ میکس مُلر سنسکرت کا ایک مشہور محقق گزرا ہے۔ اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتدا آریہ اقوام پنجاب میں داخل ہوئیں اور کسی بعد کے زمانہ میں ایک فرقہ مذہبی اختلافات کی بنا پر علیٰحدہ ہو کر ایران چلا گیا اور وہاں ہندی آریوں کے عقاید اور اُصولوں کے برعکس نئے مذہب کی بنیاد قایم کی گئی۔ مثلاً ہندی آریہ دیو یا دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن زردشت نے ایران میں دیو کو شیطان کا قایم مقام قرار دیا۔ چنانچہ سنسکرت میں دیو نورانی ہستی کے معنی میں مستعمل ہے مگر فارسی میں اُس کے معنی برعکس ہیں۔ اسی طرح "آسُر" سنسکرت میں شیطانی ہستی کے معنی دیتا ہے لیکن یہی لفظ "آہورہ" فارسی میں نورانی ہستی کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مگر میکس مُلر کی یہ رائے قابلِ تسلیم تصور نہیں کی گئی ہے اور رد کر دی گئی ہے۔ بعض لوگ شروع سے زردشت کی ہستی ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اُس کی شخصیت کو فرضی قرار دیتے ہیں لیکن یہ خیال بھی قابلِ وقعت نہیں مانا جاتا اور مجموعی طور پر محققین زردشت کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس بارہ میں پھر اختلافِ عظیم ہے کہ زردشت کی بعثت کس زمانہ میں ہوئی۔ بعض کے نزدیک زردشت کا زمانہ عیسیٰ سے پندرہ سو یا دو ہزار سال قبل کا ہے مگر ایسے محققین جن کو اپنے جذبات پر قابو ہے شہادت کی بنیاد پر یہ رائے قایم کرتے ہیں کہ زردشت کی پیدائش ۶۶۰ اور ۵۸۳ ق م کے درمیان ہوئی۔ مقام پیدائش کے متعلق بھی اختلاف ہے لیکن مرجح رائے یہ ہے کہ زردشت کا پیدائشی علاقہ آذربائیجان ہے۔ اور یہ کہ وطن میں کامیابی نہ ہونے کی وجہ سے زردشت کو علاقہ باختر میں جانا پڑا۔ باختر میں بلخ کے ایک بادشاہ وشتاسپ نامی نے اس نئے مذہب کو قبول کیا اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قوم میدیہ کی حکومت قایم تھی اور ہنوز اخمنی سلطنت کا دور کورش کی سرکردگی میں شروع نہیں ہوا تھا۔ کتاب آوستا زردشت سے منسوب کی جاتی ہے اور الہامی کتاب مانی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مذہب کورش کے بعد کے زمانہ میں اخمنی سلطنت میں پھیل گیا اور سارے ملک ایران کا مذہب آتش پرستی ہو گیا۔ یہاں یہ نکتہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاہنامہ میں کیخسرو کے غائب ہونے کے بعد لہراسپ و گشتاسپ و اسفندیار کا سلسلہ جوڑ دیا گیا ہے۔ لہراسپ و گشتاسپ کی داستان فردوسی کے شاہنامہ سے پہلے مرتب ہو چکی تھی اور اُس میں لہراسپ کو خدا پرست ظاہر کیا گیا ہے اور آتش پرستی کے رواج کو گشتاسپ و اسفندیار سے منسوب کیا گیا ہے۔ نیز ان دونوں بادشاہوں کا دارالسلطنت بھی شہر بلخ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس روایت سے اُس رائے کی تائید ہوتی ہے جو ابھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ بلخ کے وشتاسپ یا گشتاسپ نامی نے زردشت کو پیغمبر تسلیم کرکے اُس کا مذہب قبول کیا اور بعد میں یہ نیا مذہب اخمنی سلطنت کے زمانہ میں سارے ایران میں پھیل گیا۔

تحقیق کے طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جب اس مذہب کی اشاعت ہوئی اُسوقت شاہانِ اخمنی کے زمانہ تک یعنی سکندر کے حملہ تک آوستا کتاب کی شکل میں موجود تھی لیکن پارسی روایات کہتی ہیں کہ بیلوں کے چمڑے پر آبِ زر سے لکھا ہوا مکمل نسخہ شاہانِ اخمنی کے خزانہ میں موجود تھا جو سکندر کے حملہ میں بالکل تلف ہوگیا۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ زردشت کے زمانہ یا اخمنی حکومت کے زمانہ کی کوئی کتاب اس وقت موجود نہیں ہے۔ جو کتاب اس وقت رائج ہے اُس کی ترتیب و تالیف عیسیٰ سے پچاس ساٹھ سال بعد اشکانی حکومت نے شروع کی اور ۶۵۱ء تک ساسانی حکومت کے اہتمام میں جاری رہی۔ اس نسخہ کو ساسانی نسخہ کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی اس وقت مکمل صورت میں موجود نہیں۔ اُس کے صرف چند اجزا باقی ہیں۔ عام طور پر کتاب کا نام آوستا ہے اور اُس کی زبان آوستی زبان کہتے ہیں۔ کوئی خاص نام اُس زبان کا نہیں ہے اور نہ اِس ایک کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب یا کتبہ اُس زبان میں ہے۔ لفظ آوستا کا سُراغ بھی ساسانی زمانہ سے پیشتر نہیں چلتا۔ البتہ ایک فرنگی محقق نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ اخمنی بادشاہ دارا یا وش کے کوہ بیستون والے کتبہ میں لفظ آبستام مستعمل ہوا ہے۔ اُسی سے لفظ آوستا ماخوذ ہے۔ پہلوی کتابوں میں یہ لفظ آوستاک اور آپستاک تحریر ہوا ہے۔ شامی زبان میں آپستاگہ لکھا ہوا ہے اور عربی میں اَبستاق۔ ایک دوسرے محقق نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ لفظ مذکور قدیم فارسی کے لفظ اُوپستا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں 'امداد' یا 'سہارا'۔

اس زبان کا رسم الخط قدیم فارسی اور پہلوی سے مختلف ہے۔ حروف تہجی کی تعداد اُنتالیس بیان کی جاتی ہے جن میں سے تیرہ حروف علت ہیں۔ تحریر دائیں جانب سے بائیں طرف کی جاتی ہے اور الفاظ کی ترکیب میں پورے حروف بغیر ملائے ہوئے لکھے جاتے ہیں۔ الفاظ کے دو نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

لفظ — دو ملیلے ہاما ——— لفظ — جہاتی دے م

تلفظ — آرشیم ——— تلفظ — وُوُ ہُو

قیاس کیا جاتا ہے کہ اِس کتاب میں تین لاکھ سینتالیس ہزار الفاظ تھے لیکن اُن میں سے اس وقت صرف تراسی ہزار موجود ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مکمل کتاب آوستا اکیس جلدوں پر مشتمل تھی جن کو نسک کہتے ہیں۔ بہ اعتبار نوعیتِ مضمون یہ جملہ نسک تین برابر کے حصوں پر منقسم تھے لیکن اس ساری کتاب کی جان ایک آیت یا شعر سمجھا جاتا ہے جس کو 'آہون ویریہ' کہتے ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رگ وید میں اسی طرح ایک اشلوک ہے جس کو 'گاتیری' کہتے ہیں اور جس کو کل وید کی روح خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی دیگر مذہبی کتابوں میں اہل ہند اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور لفظ 'اوم' میں کائنات کا تمام راز اور خالق و مخلوق کی پوری حقیقت مخفی ہونا تصور کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کے حروف مقطعات خیال کئے جا سکتے ہیں۔ نیز وہ روایت جو حضرت علیؓ سے منسوب ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ قرآن شریف کی کنجی سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ ہے۔ بسم اللہ کا راز بائے بسم اللہ میں پنہاں ہے۔ بائے بسم اللہ کی حقیقت کا جامع اُس کا نقطہ ہے اور حضرت علی وہ نقطہ ہیں۔ بابی فرقہ نے اسی نقطہ کو جامۂ الوہیت سے ملبوس کر دیا ہے اور اپنے پیشواؤں کو اسی لقب سے اپنی کتابوں میں یاد کیا ہے۔

اسوقت جو آوستا موجود ہے وہ مشتمل ہے صرف ایک کل نسک پر جس کو 'وینڈیداد' کہتے ہیں۔ چار نسک ایسے ہیں جن کے کچھ اجزا اُس جلد میں شامل ہیں جن کو یَسن کہتے ہیں۔ باقی سولہ نسک کے بہت مختصر اجزا کہیں کہیں پہلوی کتابوں میں نظر آجاتے ہیں ورنہ سب ضایع ہو چکے ہیں۔ موجودہ شکل میں آوستا مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم ہے:۔

(۱) یَسنہ — اس حصہ میں بہتر ابواب (ہائتی یا ہا) ہیں۔ یہی تعداد اُن دھاگوں کی ہے جن سے 'کُشتی' (زنار) بٹی جاتی ہے۔ جس طرح ہندوؤں میں جنیئو پہنایا جاتا ہے اور بچہ ہندو مذہب میں داخل کیا جاتا ہے اُسی طرح پارسیوں میں کُشتی پہنانے کی وہ رسم ہے جس کے ذریعہ سے بچہ مذہب زردشتی میں داخل ہوتا ہے۔ اس حصہ میں وہ تمام بھجن درج ہیں جو فرشتوں اور روحانی ہستیوں کی حمد میں گائے جاتے ہیں۔ اسی حصہ میں وہ قدیم جزو شامل ہے جس کو 'گاتھا' کہتے ہیں۔

(۲) وِسپیرد — اس میں تقریباً ستائیس باب (کَرد) ہیں۔ یہ حصہ بطور خود کوئی مستقل یا مسلسل کتاب نہیں ہے بلکہ وہ مجموعہ ہے ایسے اوراد و وظائف اور منتروں کا جو ضمنی طور پر یَسنہ سے متعلق ہیں اور اُس کے ساتھ عبادت کے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

(۳) وِینڈیداد — اس میں بائیس باب (فَرگَرد) ہیں۔ اس کو ایسا سمجھنا چاہئے کہ یہ زردشتیوں کے مذہبی قانون یا فقہ کی کتاب ہے۔ اس میں

طہارت۔ کفارہ ۔ ریاضت ۔ مجاہدہ ۔ نفس کُشی کے عقاید کا اور اُن مراسم کا اندراج ہے جو اُمور مذکورہ سے متعلق ہیں۔ اسی کتاب کے پہلے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُرمزد (آہور مزد) نے یکے بعد دیگرے کون کون سی نیک چیزیں پیدا کیں اور اُس کے برعکس اہرمن (آنگرومینش) نے اشیا مذکور کے مقابلہ میں کیا کیا بدی خلق کی۔ آہورمزد کی تخلیق کے سلسلہ میں جن مقامات کے نام گنائے گئے ہیں اُن میں نمبر ۱۵ پر ہپتہ ہیندو (سات دریا) یعنی پنجاب کا نام بھی درج ہے۔ محققین نے اس امر کے متعلق بہت رائے زنی کی ہے کہ جس سلسلہ سے مقامات کے نام اِس کتاب میں درج ہیں اُسی کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ اقوام آریہ ایران میں داخل ہونے کے بعد ایک مقام سے دوسرے مقام تک آگے بڑھی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا علاقہ وہ ہے جس کو اب آذربائجان کہتے ہیں اور جس کو آوستا میں "ایران واجُو" لکھا گیا ہے۔

(۴) یشت ــــ یہ تعداد میں اکیس ہیں اور اُن میں اُن فرشتوں اور روحانی ہستیوں کے حمد کے بھجن درج ہیں جن کو اشما سپند اور ایزد کہتے ہیں۔ آوستا میں مہینہ تیس دن کا قرار دیا گیا ہے۔ اخیر سال پر پانچ دن اور بڑھا دئے جاتے ہیں۔ مہینہ کے ہر دن کے لئے ایک ایزد یا اشما سپند نامزد ہے اور دن کا نام بھی اُسی ایزد یا اشما سپند کے نام سے قایم ہوتا ہے۔ مہینہ میں کوئی ہفتہ کا دن مقرر نہیں ہے بلکہ ہر ماہ کا جو پہلا دن ہوتا ہے وہ تیوہار کے طریق پر مانا جاتا ہے۔ اور مہینہ کا نام بھی اُسی روحانی ہستی کا نام ہوتا ہے جو اُس دن کے لئے نامزد ہے۔ بابی مذہب میں بھی مہینوں اور دنوں کا حساب اسی طرز پر قایم کیا گیا ہے۔ یعنی ۱۹ دن کا مہینہ اور ۱۹ مہینوں کا سال مقرر ہے اور اُن میں کوئی ہفتہ کا دن مقرر نہیں ہے۔ آوستی اور بابی ترتیب میں تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ بابی مذہب میں دن اور مہینوں کے نام صفات الٰہی سے منسوب کئے گئے ہیں اور اُن کے نام جُدا جُدا ہیں۔ آوستی مذہب میں دن اور مہینوں کے نام ایک ہی ہیں اور اُن روحانی ہستیوں سے منسوب ہیں جو خدائی دربار میں عملہ کے طور پر متعین ہیں تقریباً اُسی طرح جس طریق پر عام مسلمانوں کے ذہن میں فرشتوں کے طبقے اور درجے قایم ہیں۔

(۵) خورد آوستا ــــ اس کو ایسا خیال کرنا چاہئے کہ یہ زردشتیوں کی عبادت یا نماز کی کتاب ہے۔ اس کتاب کو شاپور ثانی کے زمانہ میں (سنہ ۳۱۰ء لغایت سنہ ۳۷۹ء) دستور آذر پادہ مہر سپند نے عوام کے استعمال کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس میں آوستا کا کچھ انتخاب شامل ہے اور چند ارکان و عقاید دینی پاژند میں تحریر کئے ہوئے ہیں۔ نیز اسی کتاب میں نیایش ہائے پنجگانہ (آفتاب ۔ ماہتاب ۔ متھرا ۔ موکل آب ۔ آتش بہرام کے حضور میں دعائیں یا نماز) گاہ پنجگانہ۔ سیروزہ صغیر و کبیر ۔ آفرینگان اربعہ (برکت ہائے چارگانہ) مذکور ہیں۔

مجموعی طور پر پروفیسر براؤن نے آوستا کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے:-

"Speaking for myself, I can only say that while my appreciation of the Quran grows the more I study it and endeavour to grasp its spirit, the study of the Avesta, save for Philological, mythological, or other Comparative purposes, leads only to a growing weariness and satiety.."

پہلوی دور

اس زبان کا آغاز اخمنی سلطنت کے اخیر زمانہ سے متعلق ہے۔ (پارتھی (اشکانی) حکومت کے دور میں اُس کا رواج شروع ہوا اور ساسانی دور میں اُس کو عروج حاصل ہوا۔ دراصل لفظ پہلوی سے اس زبان کا رسم الخط مراد ہے لیکن عام طور پر اُس کا اطلاق زبان پر کیا جاتا ہے اور اس معنی میں اُس کا ایک غیر متعین مفہوم ہے۔ وہ یہ کہ عام بول چال میں یا محاورہ میں کسی لفظ کو فرس قدیم کہدیتے ہیں خواہ وہ آوستی ہو یا قدیم فارسی کا یا خاص پہلوی زبان کا۔ اس زبان اور اس رسم الخط کا عام رواج اب سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر بند ہو چکا ہے گو اب بھی علمائے زردشتی میں اس زبان اور رسم الخط کا استعمال تھوڑی بہت بگڑی ہوئی جاری ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ یہ زبان قدیم فارسی شاہانِ اخمنی کی زبان سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اُس کا رسم الخط بھی قدیم فارسی کے رسم الخط سے حاصل کیا گیا ہے۔

لفظ پہلوی کی نسبت محققین کی رائے ہے کہ یہ لفظ پارتھی سے نکلا ہے۔ قدیم فارسی میں یا ستیا کو پر تھو لکھا ہوا پایا گیا ہے۔ جس طرح الفاظ چتھر اور تھر چہر اور مہر سے تبدیل ہوئے اُسی طرح لفظ پرتھو کی تغیر اول پلہو میں اور بعد ش پہلو میں قیاس کی گئی ہے۔ اس کی تصدیق اور تائید اس طور پر کی جاتی ہے کہ عربی شکل میں لفظ پہلو ایرانی کے عربی جغرافیہ کی کتابوں میں فہلو لکھا گیا ہے اور اُس کا اطلاق اُس علاقہ پر کیا گیا ہے جو وسط ایران اور مغربی ایران پر مشتمل ہے اور جس میں اصفہان رے۔ ہمدان وغیرہ شامل ہیں۔ پارتھیوں کی نسبت پورے یقین کے ساتھ قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی قومیت کیا تھی یعنی وہ ترکی تھے یا آریہ لیکن اس امر سے کہ ہندوستان میں پہلو قوم کا وجود ظاہر ہوا ہے اور ایرانی کتابوں میں بھی پہلوانوں (Heroes.) کا ایک دور قرار دیا گیا ہے۔ نیز دیگر وجود کی بنیاد پر پارتھیوں کو آریہ اقوام میں سے ہی قیاس کیا گیا ہے۔ بہر حال جو امر یقینی ہے وہ یہ ہے کہ پہلوی زبان اور رسم الخط کا رواج پارتھیوں کے زمانہ ہی میں ہوا۔

لفظ —— [illegible]

تلفظ —— عام

معنی —— رعایا

اس رسم الخط کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ اُس کے بعض حروف تہجی ایسے ہیں جن میں سے ہر حرف مختلف آوازوں کا مترادف ہے۔ مثلاً ایک ہی حرف 'یا' کی بھی صورت رکھتا ہے اور دال اور زا کی بھی۔ ابتدا میں یہ مختلف الصوت حروف یا تو شکل میں مختلف تھے یا اُن پر ایسی علامتیں لگا دی جاتی تھیں جن سے اُن کی شکلوں میں فرق ہو جاتا تھا اور آواز بھی مخصوص ہو جاتی تھی لیکن بعد میں شکلوں میں تبدیلی یا علامتوں کے معدوم ہو جانے سے الفاظ کا تلفظ بہت مبہم ہو گیا اور اس ابہام سے الفاظ کے معنی بھی بدل گئے۔ اس لئے جو پرانی کتابیں پہلوی زبان کی اس وقت موجود ہیں وہ اغلاق سے بھری ہوئی ہیں۔

رسم الخط اور زبان سے متعلق پہلوی کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلوی زبان عسوری۔ آرمی اور دیگر سامی زبانوں سے بہت اثر پذیر رہی ہے اور اُن زبانوں کے الفاظ سے مملو رہی ہے۔ اس خصوصیت کا کچھ حوالہ اوپر آچکا ہے جس کی تفصیل اس جگہ بیان کی جاتی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ پہلوی تحریری زبان اُس زبان سے مختلف ہے جو بولی جاتی تھی۔ تحریری عبارت کا اکثر حصہ سامی الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس وجہ سے بعض محققین نے تو یہ رائے قایم کی ہے کہ تحریری پہلوی میں بجز اس کے کہ جملہ کی ترکیب و ترتیب پہلوی ہو یا جہاں ضمائر کا استعمال کیا گیا ہو یا مصادر کی علامت ظاہر کی گئی ہو یا حروف رابط ہوں باقی کل عبارت سامی زبان کی عبارت ہوتی تھی۔ گو یہ رائے مبالغہ آمیز ہے تاہم سامی الفاظ کا استعمال تحریر میں کثرت کے ساتھ ہے۔ اِس طرزِ تحریر کو ہزوارش کہتے ہیں (اور زوارشن بھی)۔ لیکن جب تحریری پہلوی پڑھی جاتی تھی تو عبارت میں جو سامی الفاظ ہوتے تھے وہ نہیں پڑھے جاتے تھے بلکہ پہلوی زبان کے لفظ اُن کی بجائے پڑھے جاتے تھے اور بات چیت اور بول چال میں پہلوی زبان ہی کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ مثلاً جب لکھنے بیٹھتے تھے اور شہنشاہ کا مفہوم ادا کرنا چاہتے تھے تو اُس کو کتابت میں ملکان ملک لکھتے تھے اور جب اُس کو پڑھتے تھے تو شاہان شاہ پڑھتے تھے اور یہی لفظ عام بول چال میں داخل تھا۔ یہ طریقہ یہاں تک رائج تھا کہ فارسی کے مصادر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مثلاً فارسی کا مصدر نوشتن (بمعنی لکھنا) ہے۔ اگر اس لفظ کو لکھنا مقصود ہوتا تو سامی لفظ 'یکتبون' لکھ کر اُس پر فارسی مصدر کی علامت 'تن' اور بڑھا دیتے تھے اور یکتبون تن لکھ دیتے تھے مگر پڑھتے وقت اُس کو 'نوشتن' ہی پڑھتے تھے۔

اس امر سے کہ سامی الفاظ تحریر میں تو استعمال کئے جاتے تھے لیکن تقریر میں، اُن کا کوئی وجود نہیں تھا ظاہر ہے کہ سامی الفاظ۔ الفاظ کے طور پر مستعمل نہیں ہوتے تھے اور نہ ان الفاظ کا کوئی صوتی تعلق پہلوی زبان سے سمجھا جاتا تھا بلکہ الفاظ مذکور کی شکلیں کسی خاص مفہوم کے اظہار کے لئے معین سمجھی جاتی تھیں۔ جب تک حروف تہجی یعنی صوت کی علامات مقرر نہیں ہوئی تھیں اور اُن کے ذریعہ سے الفاظ کی ترکیب ایجاد نہیں ہوئی تھی دنیا میں ایسی شکلوں ہی سے کام لیا جاتا تھا مثلاً اگر شیر کے مفہوم کا اظہار مقصود ہوتا تھا تو شیر کی شکل بنا دی جاتی تھی۔ یا۔ اگر بیت (گھر) کا مفہوم سمجھانا ہوتا تو گھر کی شکل دو دیواریں اور چھت بنا کر (لـــا) بتایا جاتا تھا۔ یہی شکلیں چپنند چپٹا کر اور مختصر ہو کر حروف کی صورت میں آگئیں اور اُن کو اصوات سے متعلق کر دیا گیا۔ پہلوی زبان سے پہلے یہی کیفیت کچھ کمی کے ساتھ محمود عسوری زبان کی بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فرات کے کنارے ابتدا میں تورانی قومیں سمیر وغیرہ آباد تھیں۔ ان کی زبانوں میں۔ لفظ باپ کے معنی دینے والا تھا وہ 'آد' تھا۔ عسوری زبان میں اس لفظ کو لکھتے تو 'آد' ہی تھے لیکن پڑھتے تھے 'اب'، کیونکہ یہ اُن کی زبان کا لفظ باپ کے

معنی میں مستعمل تھا۔ یہ خصوصیت زمانۂ حال کی زبانوں میں بھی ہے لیکن نہ ہونے کے برابر۔ انگریزی میں etc لکھتے ہیں مگر ایٹ سیٹرا پڑھتے ہیں۔ لکھتے ہیں e.g. اور پڑھتے ہیں For example ۔ اُردو فارسی میں بھی لکھتے ہیں ؑ اور پڑھتے ہیں علیہ السلام۔ لکھتے ہیں ؐ اور پڑھتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ تحریر کرتے ہیں الخ اور پڑھتے ہیں الی آخرہ۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ تقریری پہلوی زبان کیا اور کیسی زبان ہے زمانۂ حال کی فارسی کو سامنے رکھا جائے۔ اُس میں سے تمام عربی الفاظ نکال دئے جائیں۔ باقی جو زبان رہے گی وہ اصل فارسی زبان ہوگی جس کے الفاظ شستہ اور نکھرے ہوئے ہوں گے۔ انھیں الفاظ کی پُرانی شکل پہلوی ہوگی۔ یعنی موجودہ فارسی اور پہلوی میں ایسا ہی فرق ہوگا جیسا کہ آج کل کی اُردو اور ابتدائی زمانہ کی اُردو میں ہے۔ مثلاً "تلک" اور "تک" کا جو فرق اُردو میں ہے ایسا ہی فرق فارسی حال اور پہلوی میں سمجھنا چاہئے۔ تحریری پہلوی میں جو اغلاق ہے اُس سے تقریری زبان پاک وصاف ہے اور فارسی حال (عربی الفاظ کو علٰحدہ کرکے) اور پہلوی میں زیادہ فرق نہیں۔ موجودہ زمانہ کا ایرانی پہلوی کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے لیکن جو فرق پہلوی اور قدیم فارسی میں ہے وہ بہت زیادہ ہے اور اس قدر ہے کہ اگر ساسانی زمانہ کا کوئی شخص اخمنی زمانہ کی قدیم فارسی کی بول چال سمجھنا چاہئے تو نہیں سمجھ سکتا۔

ساسانی زمانہ میں یعنی پہلوی زبان کے زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام نہیں تھا اسی لئے اس زبان کی کتابت میں اغلاق تھا۔ یہ امر تھا کہ طبقۂ اُمرا فوجی ہنر ہی کو ہنر سمجھتے تھے اور لکھنے پڑھنے کو دوسروں کا کام سمجھتے تھے۔ بہر حال جب تک پہلوی حروفِ تہجی اور زوارشی طرزِ تحریر جاری رہا اُسوقت تک لکھنا پڑھنا خصوصاً لکھنا زردشتی مُغ پات اور دستوبار (ملّایان رقوم) تک محدود تھا یا پیشہ ور کاتبوں کا کام تھا۔ جب عربوں کے تسلط کے بعد عربی حروف کا استعمال شروع ہوا تو لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی اور یہی آسانی عربی حروفِ تہجی اور رسم الخط کے استعمالِ عام کا باعث بھی ہوئی جو اس وقت تک جاری ہے۔ عربی رسم الخط کے رواج نے عربی الفاظ کو بھی پہلوی عبارت میں کثرت کے ساتھ داخل کر دیا اور عربی قواعد صرف و نحو بھی پہلوی جملوں کی ترکیب میں شامل ہوگئے۔

لفظ پہلوی کے ساتھ ساتھ ایران کی پُرانی زبان کے سلسلہ میں الفاظ ژند و پاژند کا بھی استعمال غیر متعین طریق پر کیا جاتا ہے۔ آپ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ آدستی زبان کے حروف تہجی اور پہلوی زبان کے حروف تہجی جدا جدا ہیں اور یہ کہ پہلوی حروف اور تحریری زبان کی یہ خصوصیتیں ہیں کہ حروف مختلف الاصوات ہیں اور تحریر میں سامی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں لیکن دیگر طریق پر پڑھے جاتے ہیں۔ اِس صراحت کے بعد آپ ژند کے معنی یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب آدستا کی کسی عبارت کی تفسیر یا تشریح پہلوی زبان میں پہلوی تحریر کے ذریعہ کی جائے تو اُسکی تفسیر یا تشریح کو ژند کہتے ہیں۔ اور جب اِس تحریری پہلوی تفسیر کی تشریح پہلوی تقریری زبان میں آدستی حروف تہجی کے ذریعہ کی جائے اور پہلوی تحریری عبارت کے سامی الفاظ کے بجائے یعنی زوارشی طرزِ تحریر کو ترک کرکے پہلوی تقریری زبان کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو اُس کو پاژند کہتے ہیں۔ یعنی خالص پہلوی الفاظ کو آدستا کے رسم الخط میں لکھا جائے تو ایسی تحریر پاژند کہلائے گی۔ اور اگر اُس کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے تو وہ زبان ہوگی جس کو ہم معمولاً فارسی کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تحریری پہلوی اپنے مختلف الصوت حروف اور زوارشی طرزِ تحریر کی وجہ سے ایک عجیب خصوصیت رکھتی ہے جس کے باعث اُس کو اِسوقت تک فارسی حال سے علٰحدہ طور پر ایک علٰحدہ زبان سمجھا جاتا ہے ورنہ ہُزوارشی طرزِ تحریر کو حذف کرکے پُرانی شکل میں یہ وہی زبان ہے جو فارسی حال سے عربی الفاظ کو کم کرکے باقی رہتی ہے۔

ہُزوارش طرزِ تحریر کی ایک توجیہ گزشتہ بیان میں یہ ظاہر کی جا چکی ہے کہ اُس کا رواج مفہوم ذہنی کی تصویر کے طور پر ہونا ممکن ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ زبان کو عام طور پر مغلق کرنے کے لئے یہ ترکیب سوچی گئی ہو تاکہ عوام اُس کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ توجیہ اس لئے قابل قیاس ہے کہ الفاظ ہُزوارش اور زوارشن مصدر زواریڈ سے ماخوذ سمجھے جاتے ہیں جس سے چھُپانے یا گمراہ کرنے یا دھوکا دینے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے یعنی بجائے پہلوی الفاظ کے تحریر کرنے کے سامی الفاظ کا استعمال ایک طرح سے مضمون کو مخفی کر دیتا ہے اور یہی نتیجہ حروف تہجی کے مختلف الاصوات ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

ہُزوارش طریقِ تحریر کے ساتھ ساتھ ایک اور بات یہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بہت سے الفاظ جن کو مفرد خیال کیا جاتا ہے دراصل مرکب الفاظ ہیں۔ جب الفاظ پہلوی میں لکھے جاتے تھے تو کتابت میں اُن کے پورے اجزا لکھے جاتے تھے جن سے وہ مرکب ہوتے تھے لیکن اُن کو مفرد الفاظ کے طور پر دیگر تلفظ سے پڑھا جاتا تھا۔ مثلاً فارسی مصدر پنداشتن ہے۔ عام طور پر اس کو مفرد لفظ خیال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ اجزائے ذیل سے مرکب ہے:-

پاوان - (پا بمعنی لئے یا واسطے)۔ ہانا (این بمعنی یہ)۔ یخسنون تن (داشتن بمعنی رکھنا یا تھامنا)۔

مطلب یہ کہ جب لفظ پنداشتن لکھا جاتا تھا تو اُس کے مذکورۂ بالا اجزا لکھے جاتے تھے اور اُس کو پنداشتن کے تلفظ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اسی طرح لفظ 'مگر' ہے جو دو آرمی الفاظ سے مرکب ہے جن کے معنی 'نہیں' اور 'اگر' کے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ اور ملکوں کی طرح ایران کے بھی مختلف حصوں میں عام زبان فارسی مختلف خصوصیات کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اگر اردو زبان کی مثال لی جائے تو اُس میں دیہاتی۔ قصباتی۔ شہری۔ گنواری وغیرہ کئی قسم کی زبانیں پائی جائیں گی۔ اسی طرح ایران کے دیہات وقصبات کی زبانیں ہیں جو ایک دوسری سے مختلف طرز یا نوعیت کی ہیں۔ ان زبانوں میں الفاظ اور محاورات کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض میں تو اتنا فرق ہے کہ بغیر خاص محنت کے اُن کا سمجھنا مشکل ہے۔ آج کل کی مشہور بولیاں حسب ذیل ہیں:-

شمالِ ایران میں مازندران اور گیلان کی بولی۔ شمال ومشرق میں سمنان کی۔ وسطِ ایران میں قہرود اور کاشان کی زبانیں۔ یزد اور کرمان میں گبری زبان مغرب میں کُردستان اور لورِستان کی بولیاں۔

اسی طرح اور بھی بولیاں ہیں جن میں مشہور شاعروں (مثلاً سعدی وحافظ وغیرہ) نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور بالعموم فہلویات کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔ باباطاہر عُریاں ایران کا ایک مشہور پرانا شاعر ہے جس کے اشعار ایران میں عام طور پر گائے جاتے ہیں۔ یہ لورستان کی بولی میں اشعار لکھتا ہے۔ دو آسان نمونہ درج ذیل ہیں:-

(۱) چہ خوش بی مہربونی از دو سر بی ۔۔۔ کہ یک سر مہربونی درد سر بی
اگر مجنوں دلِ شوریدۂ داشت ۔۔۔ دلِ لیلیٰ از اوں شوریدہ تر بی

اس قطعہ میں مقامی بولی کا فرق تین جگہ ہے۔ ایک تو مہربونی میں الف کی جگہ واؤ۔ دوسرا لفظ بی کا استعمال بجائے بود کے تیسرا بجائے 'آں' کے 'اوں'

(۲) دِشُم واشُم ازیں عالم بدر شُم ۔۔۔ وِشُم ازچیں وماچیں دیر تر شُم
وِشُم از حاجیانِ حج بپرسم ۔۔۔ کہ ای دیری بسے یا دیر تر شُم

اس قطعہ میں وِشُم بجائے بشوَم بمعنی چلا جاؤں گا۔ واشُم بجائے باشَم یا باز شوَم یعنی ٹھیروں گا یا پھر چلا جاؤں گا۔ شُم بجائے شوَم۔ دیر تر بجا دُور تر۔ اِیٌ بجائے ایں۔ اور 'بسے' بجائے بس است کے استعمال ہوئے ہیں۔

اِن بولیوں کے متعلق سرسری طور پر یہ تحقیقات کی گئی ہے کہ کون سی بولی آوستی زبان سے ماخوذ ہے اور کون سی قدیم فارسی سے۔ رائے یہ ظاہر کی گئی کہ ایران کے شمال مغرب کی بولیاں یعنی جس علاقہ کو پہلے میدیا کہتے تھے اُس کی بولیاں اور یزد وکرمان کی گبری بولیاں آوستی زبان سے ماخوذ ہیں۔ آوستی زبان اور قدیم فارسی کی زبان آپس میں بہنوں کی طور پر مانی گئی ہیں۔ اکثر الفاظ کی اصل دونوں میں ایک ہے لیکن اُس اصل سے جو مشتقات دونوں زبانوں میں ہو وہ ذرا مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر دو الفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن میں سے ایک کی اصل دونوں زبانوں میں ایک ہے اور دوسرے لفظ کی اصل ایک سے دوسری زبان میں علیحدہ ہے۔ کرنے کے معنی میں جو الفاظ آوستا کی زبان اور قدیم فارسی کی زبان میں ہیں اُن کی اصل کر ہے۔ قدیم فارسی میں 'کردن' سے کُنُو (صیغۂ امر) اور کُنَم (مضارع) قایم ہیں۔ آوستی زبان میں کرم (صیغۂ مضارع) ہے۔ قدیم فارسی میں فارسی لفظ گفتن کی اصل گوب ہے اور آوستی زبان میں جو لفظ کہنے کے معنی دیتا ہے اُسکی اصل 'واچ' ہے۔ محققین نے اس اعتبار سے جن جن بولیوں میں فرق پایا ہے اُسی لحاظ سے اُن کو آوستی یا قدیم فارسی سے ماخوذ خیال کیا ہے۔ مثلاً باباطاہر کی بولی میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے بجائے کُنم کے 'کرم' کا استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اُس کو آوستی زبان سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

(باقی) سید حکیم احمد نقوی

الحق — اور — سیماب

اپریل ۱۹۴۲ء کے "نگار" میں "سیماب اور شیطان" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں بعض اعتراضات علم و فن سے متعلق ہیں اور بعض مفہوم نظم سے۔ دوسری قسم کے اعتراض کا جواب حضرت مولانا نیاز فتحپوری مضمون کے آخری حصہ میں دے چکے ہیں امید ہے کہ الحق صاحب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ لیکن چونکہ علمی و فنی اعتراضات کے سلسلے میں حضرتِ نیاز نے مولانا سیماب کو مخاطب کیا ہے اس لئے جواب ناگزیر ہے۔

تقریباً ایک سال سے نظم "موحدِ اعظم" ملاؤں اور حاسدوں کے تیروں کا نشانہ بنی ہوئی ہے لیکن مولانا سیماب نے بجز اپنے مسلک کی توضیح کے نہ کسی مُلا کو جواب دیا اور نہ الحق جیسے کسی ناقد کو — ہاں دوسرے حضرات جواب دے رہے ہیں۔

علمی - ادبی اور لسانی مسائل میں خاموشی بسا اوقات طالبانِ علم و فن اور اہلِ نظر کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے میں ایک اجمالی جواب پیش کر رہا ہوں مولانا سیماب انسان ہیں اور انسان سہو و خطا کا مجموعہ ہے اس لئے اُن سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتابت کی غلطی اور سہوِ نظر کو آلۂ اعتراض بنانا کسی طرح شایانِ تنقید نہیں — الحق صاحب کے اعتراضات یہ ہیں:-

(۳) الف - "فرشتوں کا معلم عالمِ ملکوت کا عالِم" اس میں (ملکوت) بسکونِ ثانی نظم ہوا ہے۔ یہ غلط ہے "ل" پر زبر ہونا چاہئے۔
ب - "خدا کے ساتھ آعوذ میں استحکام ہے اس کا"۔ یہاں آعوذ (مد کے ساتھ) پڑھنے [illegible] تا ہے۔ جہلا آعوذ کہا کرتے ہیں۔
ج - "سرشتاً تجھ کو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت" فارسی لفظ (سرشت) پر عربی تنوین [illegible] کے قلم سے عجیب ہے۔

(۴) سیماب صاحب یہ آمیزش عربی و فارسی اور جگہ بھی کر چکے ہیں "وضع قدیم کے پابند جوان العمر رئیس تھے" اس حساب سے اُن کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جائز ہوگا۔

(۵) "ادھر یہ ضد کہ ہو مسجود خاکِ آدمِ اولیٰ" سیماب صاحب کو اس بات کا علم نہیں کہ اولیٰ مونث ہے۔ آدمِ اوّل کہنا چاہئے۔

(۶) "بذہنِ عشق حکمِ سجدۂ آدم نمی گنجد" یہ ہندوستانی فارسی ہے۔ ایرانی اسلوب کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

(۷) "کبھی ہیں کعبۂ مسجود دروازے قیادت کے" کعبۂ مسجود نامانوس ترکیب ہے۔ کعبہ کبھی مسجود نہیں ہوتا۔ کعبۂ مقصود ہونا چاہئے۔

(۸) سیماب صاحب نے اس نظم میں ذوق کا ایک شعر اس طرح تضمین کیا ہے۔

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا
قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

تضمین کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ شعر گویا اپنا کر لیا جائے۔ اس کا مضمون اپنی نظم میں کھپا لیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔

(۹) سیماب صاحب نے مرزا داغ کا یہ شعر بھی اپنی نظم میں چسپاں کیا ہے۔

تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

داغ کا یہ شعر اُن کے عامیانہ شعروں میں سے ہے۔ جس میں بوالہوس عاشقوں کا جذبہ و معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو ظرافت کے موقع پر بطور ضرب المثل کے لکھ سکتے ہیں اس لئے نظم میں اس شعر کے آنے سے نظم کا توازن و لہجہ بدل گیا۔

(۱۰) بزرگوں اور شاعروں نے ابلیس کو موحدِ اعظم اور عارفِ کامل قرار نہیں دیا۔

جواب: — (۳) الف - عروض کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایک رکن میں تین حرکتیں متواتر آئیں تو وسط کی حرکت کو ساکن کر دیتے ہیں اس کا نام

تسکینِ اوسط" ہے۔ جیسے فَعِلَاتن میں تینوں حروف متحرک ہیں، عین کو ساکن کر دیا تو فعْلاتن بہ سکونِ عین رہ گیا۔ اسی کو مفعولن سے بدل دیتے ہیں ایسی
لت میں یہ رُکن مسکن کہلاتا ہے۔ "تسکین اوسط" زحافاتِ عامّہ میں سے ہے ہر بحر اور ہر مقام پر آسکتا ہے۔ "دریائے لطافت" میں "توالیٔ حرکات" کا
یان شاید الحق صاحب کی نظر سے نہیں گزرا خیر اب ملاحظہ فرمالیں۔

" عربی میں ایک کلمہ میں توالیِ حرکاتِ اربعہ ممنوع ہے۔ یہی حال ہندی میں توالیِ حرکاتِ ثلاثہ کا ہے مثلاً "شرف النساء" دوسرے حرف "ر" کو سکون کے ساتھ بولنا اچھا ہے اس کے فتح کے ساتھ غلط اور مکروہ ہے۔ اگرچہ اصل کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اسی طرح "شکرانہ" "کاف" کے سکون کے ساتھ اور "نظروں"، "ظ" کے سکون کے ساتھ بولنا اور باندھنا صحیح اور فصیح ہے۔"

تسکینِ اوسط کی مثالوں سے شعرا کے دواوین بھرے پڑے ہیں اور یہاں اشعار کے اخذ و نقل کی چنداں ضرورت نہیں۔ "دریائے لطافت" کی مندرجۂ بالا عبارت ہی کافی ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق مولانا سیماب نے "ملکوت" (بہ سکونِ لام) نظم فرمایا ہے۔

ب ۔ حیرت ہے کہ الحق صاحب نے یہ اعتراض کیا حالانکہ اُنھیں علم ہے کہ مولانا سیماب کا صحیح مصرع یوں ہے ؎

خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا

ہوا یہ کہ کاتب نے "بھی" حذف کر کے الف پر مد لگا دیا اور نقل در نقل کی وجہ سے یہ غلطی ویسے ہی چلی آئی۔ ایک دن ایک خاص ضرورت کے تحت جب مولانا سیماب نے مطبوعہ نظم دوبارہ دیکھی تو کتابت کی اس غلطی کا احساس ہوا اور اس کی تصحیح اخبار "زمزم" لاہور اور رسالہ "شاعر" آگرہ میں کر دی گئی۔ جناب الحق پورے ۷ ۔ ۸ ماہ بعد اعتراض فرما رہے ہیں۔ حالانکہ "شاعر" کا ہر شمارہ اُن کی نظر سے گزرتا ہے۔

ج ۔ "سرشتاً" پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ بھی پُرانا ہے۔ اس کا جواب کئی اخبارات و رسائل میں دیا جا چکا ہے کہ یا تو یہ سہوِ نظر ہے یا رواج کی تائید۔ ہندوستان کے مستند ادبا اور شعرا کے مضامینِ نظم و نثر میں سرشتاً ۔ نمونتہً ۔ اندازاً اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ الحق صاحب کے مضامین کی تو میں نے چھان بین نہیں کی۔ پھر بھی اُصول بہرحال اُصول ہے اور یہ غلطی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی خواہ کسی سے ہو۔ مگر میرا ایمان ہے کہ سب سے ایسی غلطیاں غیر ارادی طور پر ہو جاتی ہیں۔ الحق صاحب ذرا اپنے ضمیر پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ کیا مولانا سیماب دیدہ و دانستہ ایسی فروگزاشت کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ ان معاملات میں خود بہت محتاط ہیں۔

(۴) "جوان العمر" سراسر کتابت کی غلطی ہے یا پھر نقل مضمون میں یہ غلطی ہوئی ہوگی۔ عام طور پر مولانا سیماب کے مضامین نقل کر کے بھیجے جاتے ہیں۔ الحق صاحب کا یہ کہنا کہ مولانا کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جائز ہوگا۔ محض اپنی بات کی پچ ہے حالانکہ "شاعر" کے پُرانے پرچوں میں مولانا کئی بار اس قسم کی غلط تراکیب پر طلبہ کو متنبہ کر چکے ہیں۔

(۵) جی ہاں سیماب صاحب کو اس کا علم ہے کہ "اولیٰ" مونث ہے لیکن ضرورتِ قافیہ کو آپ کیا کریں گے۔ پھر اول اور "اولیٰ" باعتبارِ معنیٰ ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی تراکیب مستند حضرات نے بے محابا استعمال کی ہیں ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) غیر مطبوعہ خط بنام مرزا نبو صاحب۔ از مرزا رجب علی بیگ سرور صاحبِ "فسانۂ عجائب"
فقط دولت سے جُدا، مصیبت کا مبتلا۔ خوشی سے دُور، رجب علی بیگ سرور عفی عنہ ۔ ۱۲ "ربیع الاولیٰ"[۱] چار شنبہ کانپور

(۲) ید علیا بہ ید سفلیٰ چہ ماند[۲] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (شیخ سعدی)

(۳) ملائکہ سفلیٰ[۳] نہ واقف سوند آں جمیعت را ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرح تاویل الحکم از مولوی محمد حسن مارہروی

---

[۱] اول تو سرور کی عبارت سے کسی لفظ کے صحیح استعمال پر استناد درست نہیں، دوسرے ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ (نیاز)

[۲] عربی میں لفظِ ید مونث استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے صفت بھی مونث استعمال کی گئی۔ (نیاز)

(نیاز)

لیجئے کلام پاک سے بھی ایک مثال پیش کی جاتی ہے :-

(۴) " والاخرۃ خیر لک من الاولیٰ"[1] اس میں "اولیٰ" کی تانیث موجوداتِ مذکر کو مستثنیٰ نہیں کرتی -

(۵) " ۲۲ جولائی ۱۹۴۲ء کو مولانا عرشی امرتسری کی تازہ تصنیف "ملتِ ابراہیم" بغرضِ تنقید و تبصرہ وصول ہوئی ہے - اس کے صفحہ ۵ پر مولانا محمد اقبال سلمانی مدیر رسالہ "البیان" امرتسر کی مختصر تقریظ ہے جس کا عنوان جلی حروف میں " نقطۂ اولیٰ" قایم کیا گیا ہے - حالانکہ "نقطہ" بالاتفاق مذکر ہے[2] اور اولیٰ مونث - ربیع الاولیٰ - ید سفلیٰ - ملائکۂ سفلیٰ اور نقطۂ اولیٰ وغیرہ کی موجودگی میں "آدمِ اولیٰ" پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے ؟ جن لوگوں کی سندیں پیش کی گئی ہیں - وہ عوام میں سے نہیں بلکہ خواص میں سے ہیں"

عربی قاعدہ کے اعتبار سے صفت و موصوف کی حالت یکساں ہونی چاہئے لیکن مولانا سیماب کے شعر میں "اولیٰ" آدم کی نہیں بلکہ "خاک" کی صفت ہے[3] لہذا اعتراض کا محل ہی نہیں - الحق صاحب اُس وقت کہاں تھے جب مولانا کی نظم "موحدِ اعظم" کے جواب میں اخبار "مدینہ" بجنور میں ایک نظم "مشرکِ اولیٰ" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی - اس پر بھی اعتراض کیا ہوتا !

(۵) الحق صاحب کا یہ اعتراض اتنا کم وزن اور بے معنی ہے[4] کہ جواب دینے کو جی نہیں چاہتا - ہندوستان میں بسنے والے فارسی گو شعراء سے یہ مطالبہ کہ اہلِ فارس کی طرح شعر کہیں کسی طرح جائز نہیں - جب عرفی - نظیری[5] اور بیدل جیسے باکمال شعراء کی فارسی شاعری کو ہندوستانی اسلوب سے تعبیر کیا گیا تو پھر مولانا سیماب اس اعتراض سے کیونکر بچ سکتے ہیں ؟ ڈاکٹر اقبال کی فارسی شاعری کے متعلق بھی یہی اعتراض ہوتا ہے - لیکن افسوس ہے کہ اکتسابی اور مادری زبان کے نکتہ کو بھی ہمارے الحق صاحب نہیں سمجھتے -

(۶) الحق صاحب بھی معترض ہیں کہ "کعبۂ مقصود" ہونا چاہئے ظاہر ہے کہ ہر شخص "کعبۂ مقصود" ہی لکھتا لیکن نکتہ یہ ہے کہ مولانا سیماب نے قیادت کے دروازوں کو "کعبۂ مسجود" کہا ہے اس لئے کہ خوشامدانہ سجدے قیادت کے دروازوں ہی پر ہوتے ہیں - لہذا وہ دروازے مسجود نہ ہوئے تو کیا ساجد ہوئے[6] ؟

(۷) اگر الحق صاحب نیتِ صادقہ کے ساتھ مولانا سیماب کی نظم "موحدِ اعظم" کا مطالعہ فرماتے تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ دوسرے شعراء کے جو تین شعر مولانا نے اپنی نظم میں پیش کئے ہیں وہ بطور تضمین نہیں ہیں بلکہ علٰحدہ علٰحدہ اپنے مفاہیم کو پورا کرتے ہیں اور نظم کے ساتھ بھی اُن کا ایک خاص ربط و علاقہ باقی رہتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے شعر کے مصرعوں میں تقدم و تاخر کر کے الحق صاحب نے کیا نتیجہ اخذ کیا ؟ - میں تو اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ علمی و ادبی حلقوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا سیماب میں تضمین کرنے کی بھی اہلیت نہیں ! جب ذہنیت پستی کی اس منزل میں ہو تو بجز خاموشی اور چارۂ کار ہی کیا ہے -

(۸) الحق صاحب کو اتنا بھی علم نہیں کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے - حالانکہ مولانا سیماب نے تحتِ نظم مضطر خیرآبادی مرحوم کا نام لکھ دیا تھا - رہا یہ امر کہ مضطر خیرآبادی مرحوم کے شعر سے نظم کا توازن و لہجہ بدل گیا یا نہیں - یہ ہر شخص کا کام نہیں - شعر سے صرف اہلِ مجاز کا مسلکِ محبت معلوم ہوتا ہے اور اُس سے پہلے اور بعد کے اشعار کو عشقِ حقیقی کی بنیاد بنا دیتے ہیں - آگے چلکر ناظرین اس سلسلہ کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں گے -

(۹) اس اعتراض کا جواب اتنا تفصیلی دیا جا سکتا ہے کہ "نگار" کے تمام صفحات اس کی نذر ہو جائیں لیکن مصلحت اجازت نہیں دیتی - صرف الحق صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے چند اشارات ہی پر اکتفا کروں گا -

---

[1] صحیح عبارت یوں ہے " ولآخرۃ خیر لک من الاولیٰ" چونکہ آخرۃ سے آنے والا زمانہ یا آیندہ واقعات مراد ہیں اور اُولیٰ سے پچھلے واقعات - اس لئے اولیٰ ہی ہونا چاہئے نہ کہ اول اور اگر موجودات ہی مراد ہے تو بھی یہ جمع ہونے کے لحاظ سے مونث ہیں (نیاز) - [2] "نقطہ" مونث ہے جسے آپ ۃ سمجھتے ہیں وہ تائے تانیث ہے اس لئے اس کی صفت اُولیٰ ہونا چاہئے - (نیاز) - [3] یہ جواب بھی درست نہیں - اگر اولیٰ صفت خاک کی قرار دیجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آدم کی کوئی خاک اس کے بعد بھی ہوئی - علاوہ اس کے خاک اُردو میں مونث ہے نہ کہ فارسی میں یہاں تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہی نہیں ہے اس لئے فارسی داں ... خاک کی صفت میں اول کا لفظ استعمال کریں گے نہ اُولیٰ، پھر چونکہ سیماب صاحب کے شعر میں فارسی ترکیب استعمال ہوئی ہے اس لئے اُولیٰ صحیح نہیں - (نیاز) - [4] عرفی و نظیری تو ایرانی تھے اور ان کی شاعری پر یہ اعتراض کسی ... [illegible] تخیل کا ارشاد تھا جس میں ایرانی روزمرہ کیا کام دیسکتا تھا - (نیاز) - [6] کعبہ تو جہاں ہے مسجود ہے اس لئے "کعبۂ مسجود" کہنے سے کوئی خاص بات ...

م حیرت ہے کہ الحق صاحب شیطان کو "موحد" نہیں مانتے۔ بالفاظِ دیگر شیطان ان کی نظر میں "مشرک" ہے۔ غالباً انھیں "موحد" اور "مشرک" کے معنی کا علم
ں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ "موحد" اسے کہتے ہیں جو خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہ کرے اور "مشرک" کے معنی ہیں خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرنے والا۔
الحق صاحب ثابت کرسکتے ہیں کہ ابلیس نے مردود ہونے سے پہلے یا مردود ہونے کے بعد خدا کی ذات میں کسی کو شریک کیا؟ اگر وہ "ماسوا اللہ" کو سجدہ کرلیتا تو
ں یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ وہ مشرک ہے۔ لیکن اس نے تو کسی درجہ میں بھی ایسا نہیں کیا! "اسلام سے پہلے جو لوگ خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتے تھے وہ بھی موحدین
ماتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کو "موحدِ اعظم" کہدیا جائے تو کیا اس سے اسلام یا اور کسی مسلمان کی توہین ہوجائے گی؟"

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے۔ فاضل دیوبند مدیر "برہان" دہلی)

رہا ابلیس کے "عارف کامل" ہونے کا سوال تو اس کے لئے معترض کو وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ حیاتِ ابلیس ماقبل واقعۂ آدمؑ جو کتب عربیہ معتبرہ
سے ثابت ہے۔ انھیں میں سے بطور نمونہ کچھ مختصر اقتباسات پیش کرتا ہوں:۔

(ترجمہ) "وہ ایک مدت تک زمین کا "بادشاہ" فرشتوں کا "عالم" اور جنت کا "خازن" رہا اور اڑتا تھا عرش سے سپلی زمین تک۔ ساکنانِ ارض و سما اسکو دیکھتے
تھے اور اس کے امر کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تو رکھا زمین کے ساتویں طبقہ کے نیچے سپلی زمین پر بس اُس نے اس جگہ ایک ہزار
برس عبادت کی۔ پھر ساتویں طبقہ پر لایا گیا وہاں دو ہزار برس عبادت کی۔ پھر چھٹے طبقہ پر تین ہزار برس۔ پھر پانچویں طبقہ پر چار ہزار برس۔ پھر چوتھے
پر پانچ ہزار برس۔ پھر تیسرے پر چھ ہزار برس۔ پھر دوسرے پر سات ہزار برس۔ پھر پہلے پر آٹھ ہزار برس۔ پھر اُٹھایا گیا آسمان دنیا پر وہاں نو ہزار
برس۔ پھر دوسرے پر دس ہزار برس، پھر تیسرے پر گیارہ ہزار برس، پھر چوتھے پر بارہ ہزار برس۔ پھر پانچویں پر تیرہ ہزار برس۔ پھر چھٹے پر چودہ ہزار برس
پھر ساتویں پر پندرہ ہزار برس۔ یہ کل مدت ایک لاکھ بیس ہزار برس ہوئی۔ پھر عبادت کی عرش کے سامنے اس سے دو چند یعنی دو لاکھ چالیس ہزار برس۔
آسمان اور زمین پر ایک بالشت کبھی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جہاں ابلیس (عزازیل) نے سجدہ نہ کیا ہو"

(تاریخ الخمیس علامہ شیخ حسین ابن محمد ابن حسن دیار بکری)

(ترجمہ) "نافرمانی سے پہلے ابلیس فرشتوں میں سے تھا اور اس وقت اس کا نام عزازیل تھا اور وہ ساکنانِ ارض میں سے تھا۔ فرشتوں کی جماعت میں وہ
بہت بڑا مجتہد اور علم میں سب سے زیادہ تھا" (تفسیر ابنِ جریر)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی قرآنِ مجید کے ترجمہ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں:۔ "روئے زمین پر اللہ پاک نے جنات کو آباد کر رکھا تھا۔ جب جنات
میں فسق و فجور اور معصیت کی کثرت ہوئی تو اللہ پاک کا فرشتوں کو حکم ہوا کہ یہ شریر اور مفسد مخلوق اس سطحِ ارض پر آباد رہنے کے قابل نہیں ان کو پہاڑوں
اور جزیروں میں بسادو اور زمین ان سے خالی کرالو اور ان کی جگہ تم آباد ہوجاؤ غرض جنات کے قایم مقام فرشتے ہوئے اور ان سب کا مرشد و افسر
عزازیل کو مقرر کیا گیا اور "معلم الملکوت" کے لقب کا اعزاز بخشا۔ ہزاروں برس اس نے اللہ پاک کی وہ طاعت کی کہ جو واقعی اُسی کا کام تھا۔ سطحِ ارض و سما
پر بالشت برابر ایسی جگہ نہ چھوڑی جس پر اُس نے سجدہ نہ کیا ہو"

کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:۔

(ترجمہ) "ابلیس ملعون (عزازیل) چالیس ہزار برس تک جنت کا خازن رہا اور ملائکہ کے ساتھ اسی ہزار برس تک رہا اور تبلیغ کی ملائکہ کی جماعت میں
بیس ہزار برس اور سرداری کی مقرب فرشتوں کی تیس ہزار برس اور روحانیوں کا سردار رہا ہزار برس اور طواف کیا عرش کے گرد چودہ ہزار برس۔ اُس کا
نام پہلے آسمان پر عابد دوسرے میں زاہد تیسرے میں عارف۔ چوتھے میں ولی۔ پانچویں میں تقی، چھٹے میں خازن۔ ساتویں میں عزازیل اور لوحِ محفوظ میں
ابلیس تھا اور اُس کو اپنے انجام کی خبر نہ تھی۔ (تفسیر جمل)

ابلیس (عزازیل) کے "عارف کامل" عابد و زاہد اور متقی ہونے کے سلسلے میں اور بھی متعدد مستند کتب عربیہ کے اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں۔
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا اقتباسات ہی سے جناب الحق مطمئن ہوجائیں گے۔ الحق صاحب کا مقصد تو صرف بزرگ شعرا ہی سے تھا میں نے تو اُن علما کے

حسنِ عقیدت اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم یا اور کسی اُردو فارسی کے شاعر کے کلام کو جو ابلیس کی ذات سے متعلق ہے قبول کرتی ... کیا مولانا سیماب کی نظم اور کیا کسی دوسرے شاعر کا کلام سب کا پس منظر ایک ہی ہے۔ جناب مسعود احمد قریشی کا ایک مضمون ... اقبال کا تصور ابلیس ... کا کچھ اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔

"انکارِ سجدہ کی دوسری وجہ داخلی ہے اور یہی اس کا زیادہ شاندار رُخ ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ ابلیس کا انکار تکبر و غرور کا نتیجہ نہیں۔ ابلیس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ اقدام کیا۔ ابلیس اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جو جبین نیاز خدائے لم یزل کے سامنے جھکائی جا چکی ہے وہ کسی اور کے حضور میں بھی جُھکے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ وحدت کسے کہتے ہیں اور لاالٰہ کا کیا مطلب ہے۔ وہ انسان کو بتانا چاہتا تھا کہ لاالٰہ کا منشا ... اپنی عزیز ترین مطاع کو کھو کر بھی کیا جانا چاہئے ۔

نہ ہر کس خو گرد ہم خود گداز است ‏ ‏ نہ ہر کس مست ناز اندر نیاز است

بقائے لاالٰہ خونیں قبائے است ‏ ‏ کہ بر بالائے نامرداں دراز است

دوسرے وہ عشق کے رمزوں سے خوب واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ وصالِ محبت کی موت کا پروانہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر مولانا سیماب نے بھی تو یہی کہا ہے ۔ مختلف اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

بشر سمجھا نہ اب تک مرتبہ دُنیا میں ٹھیک اُس کا ‏ ‏ کہ ترکِ شرک و بدعت ہی نہیں کوئی شریک اس کا

وہ صرف اللہ کو ارض و سما میں پوجنے والا ‏ ‏ علی الرغم ملائک جس نے نظم ... ڈالا

وہ ناری جس کا سوزِ عشق میں کوئی نہیں ثانی ‏ ‏ سراپا آگ جس کا ... لیکن ... نورانی

محبت کب پرستش غیر کی تسلیم کرتی ہے ‏ ‏ محبت اقتضائے حُسن ہے، تقسیم کرتی ہے

محبت میں سوا غیروں کو سجدا ہو نہیں سکتا ‏ ‏ سجود ماسوا ہرگز گوارا ... ہو سکتا

یہی جذبہ رہا ہے فطرتِ عشق مجاز اب تک ‏ ‏ کہ عاشق احترامِ غیر سے ہے بے نیاز اب تک

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

تو پھر عشقِ حقیقی میں کہاں گنجائش شرکت ‏ ‏ حقیقت دوست کو زیبا نہیں آلائش شرکت

عزازیل اور خدا میں واسطہ تھا حُسنِ اُلفت کا ‏ ‏ ہوا طغیان سرزد ... تقاضا تھا محبت کا

خدا کے سامنے سجدہ بشر کو نقصِ غیرت تھا ‏ ‏ یہی فرضِ عبدیت، یہی حق محبت تھا

ذرا الحق صاحب فرمائیں کہ مولانا سیماب نے جو تقابلی عنصر اپنی نظم میں پیدا کیا، یا کارشہ عبادت کے خلاف جہاد فرمایا ہے وہ ڈاکٹر اقبال یا کسی اور اُردو فارسی کے شاعر کے یہاں اتنی صراحت سے ملتا ہے ؟ یہ تو سب شاعر کہتے ہیں کہ ابلیس کا انکارِ سجدہ ... وحدت پرستی کا بہترین ثبوت ہے لیکن ... کسی نے ریاکار مسلمانوں کو متنبہ بھی کیا ؟ - شعرائے پیشین نے جو کچھ ابلیس کے متعلق کہا ہے اس کی بے اثری کا اندازہ اسی سے کر لیجئے کہ آج مسلمان ... بھاگ رہے ہیں - ذرا الحق صاحب بتائیں کہ سو میں سے کتنے مسلمان ایسے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور ان پڑھنے والوں میں ریاکار کتنے ہوں گے ۔ مسلمانوں کی ایسی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر مولانا سیماب نے یہ نظم لکھی جس میں ... ورنہ ابہام وہ تو ... کہتے ہیں :-

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا ‏ ‏ قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا

اور شعرائے پیشین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ زیادہ سے زیادہ تشریح طلب ہے اور ایک حد تک گمراہ کن بھی ۔ دونوں کی ... حیثیت کا اندازہ الحق صاحب خود کریں۔ اس اجمالی گزارش کے بعد میں چاہتا تھا کہ الحق صاحب کی اُس غلط بیانی کے متعلق کچھ عرض کروں جو انھوں نے ... ابہام ... ذات سے ... ۱۳ ... ۱۱ ... استعمال کئے ... مضمون ... ۲ ... اور یا اللہ کی توہین کے سلسلے ...

صاحب نے "شاعر" کا جو اقتباس پیش کیا ہے اُس پر وہ دوبارہ غور فرمائیں۔ کسی مضمون کی چند سطور لیکر اُن پر ہر قسم کا اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن بہ اعتبار موضوع سلسلے کی کڑیوں کو اگر جوڑا جائے تو ہر اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ الحق صاحب چاہیں تو وہ اس بحث کو نگار میں جاری رکھ سکتے ہیں۔ انشا اللہ اُنھیں مطمئن کر دیا جائیگا

ہاں میرا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ مولانا سیماب، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق اور سیدنا حضرت حاجی وارث علی شاہ قبلہ کے پرستار ہیں۔ اُن سے بہتر اولیا کی قدر اور عزت کون کر سکتا ہے۔ الحق صاحب حضرت سیدنا حاجی بہاؤ الدین شاہ کے مرید ہوتے ہوئے بھی اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ حیرت ہے!

الحق صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا سیماب کی دو رباعیاں دیکر سوال کیا ہے کہ ان میں کیا درس و پیام ہے؟ آگے چلکر فرماتے ہیں کہ "یہ اعتراضات اس لئے وجہ سے ہیں کہ سیماب صاحب کی طرف سے بار بار دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ پیامی شاعر ہیں اور اُن کا کلام ملک و قوم کے لئے ایک پیغام ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کچھ بات نہ تھی" دیکھا آپنے

خارِ حسرت زبان سے نکلا   دل کا کانٹا زبان سے نکلا

ہمارے الحق صاحب کو بس یہ بات ناگوار ہے کہ مولانا سیماب کا شمار "پیامی شعرا" میں کیوں ہوتا ہے؟ ان کے خیال میں تو سوائے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اور کسی کا کلام درس و پیام کا حامل ہی نہیں۔ خیر یہاں تقابلی بحث کا موقع نہیں۔ الحق صاحب ثبوت دیں کہ مولانا سیماب نے یہ کہاں اور کب لکھا ہے کہ:۔
"میں پیامی شاعر ہوں"۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں الحق صاحب نے جو رباعیاں پیش کی ہیں اسی سلسلہ میں میں اُنھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ کسی اپنے شاعر کا نام لیں جسے وہ پیامی سمجھتے ہوں۔ میں اس کے سیکڑوں انفرادی اشعار ایسے پیش کر دوں گا جن میں درس و پیام تو کیا حقیقی جذبات بھی نہ ہوں گے۔ اُنھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ کسی شاعر کا رنگ اُس کے کل کلام کو سامنے رکھ کر پہچانا جاتا ہے۔ انفرادی اشعار کبھی اس سلسلہ میں کام نہیں دیتے۔ بہرطور کسی بات کو زبان سے کہدینا تو آسان ہے لیکن دلائل و براہین سے ثابت کرنا بہت مشکل ہے!۔

اگر گنجایش ہوتی تو میں دکھاتا کہ مولانا سیماب کے کلام میں "درس و پیام" کے کتنے محل ہیں اور اُن کی شاعری نے وطن اور قوم کو کتنا بیدار کیا ہے۔

الحق صاحب! خود کوئی پیامی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ ہاں کلام ناقدین کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ شاعر "پیامی" ہے۔

سیماب کے کلام میں درس و پیام کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ ہر غزل میں چند شعر اس موضوع پر مل جاتے ہیں........'

سیماب کی نظمیں اپنے اندر عالمگیر جذبہ رکھتی ہیں۔ اُس کی تخیل اپنے ماحول ہی میں چکر نہیں کاٹتی۔ وہ کہیں تمام عالم کو پیغام دیتا ہے ....."

محی الدین قائد بی۔ اے سابق مدیر الجمعیتہ دہلی ۱۹۳۶ء

"ان کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ آگرہ کے بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دئے جاتے ....."   (شمس العلماء) تاجور نجیب آبادی

"سیماب کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطری طور پر نظام کائنات اور اہم سیاسی مسائل پر غور و خوض کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اس غور و فکر کا نتائج انھوں نے جا بجا اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک علم و حکمت کا ایک درس ہے ....."

(ڈاکٹر) محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لاہور

مولانا سیماب کے پیامی شاعر ہونے کے ثبوت میں مجھے کسی کاوش کی ضرورت نہیں اور جو رائیں میں نے پیش کی ہیں وہ بھی وجہ تفاخر نہیں محض "سخن گسترانہ" کی وجہ سے زبان کھولنی پڑی۔

اعجاز صدیقی

(**نگار**) حضرت سیماب کی نظم "موحد اعظم" ایک زمانہ سے موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے، نظم کی حیثیت سے بھی اور اپنے مفہوم و موضوع کے لحاظ سے بھی۔ جس حد تک فنِ شعر کا تعلق ہے یقیناً یہ نظم جناب سیماب کی بہترین نظموں میں سے نہیں ہے۔ انھوں نے اس سے بہتر نظمیں کہی ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ رہا موضوع، سو وہ بھی نیا نہیں۔ شیطان کے موحد ہونے پر بہت سے صوفیہ اور شعرا نے وہی لکھا ہے جو جناب سیماب نے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ [illegible]

یا نہیں؟ اور اس صورت میں فریق سیماب صاحب نہیں قرار پاتے بلکہ تمام وہ حضرات جو اس سے پہلے شیطاؔن کی شان میں مدح سرائی فرما چکے ہیں۔

اگر یہ نظم عقل و درایت سے کچھ بھی تعلق رکھتی تو میں صاف صاف کہدیتا کہ شیطان یا ابلیس کا وجود خارجی تھا کب، جس پر یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے لیکن چونکہ یہ نظم ابلیس کے متعلق اسی روایت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے جو عیسائیوں سے مسلمانوں میں منتقل ہوئی تھی اور چونکہ عام طور پر غلطی سے واقعی شیطان کے وجود کو ایک مستقل ہستی مان لیا گیا ہے، اس لئے اسی اعتقاد کو سامنے رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہئے کہ شیطان کی تعریف میں جو کچھ اسوقت تک لکھا گیا ہے وہ قابل اعتنا ہے یا نہیں۔

اسلامی لٹریچر میں ہم کو بالکل دو متضاد خیال نظر آتے ہیں، یعنی ایک جماعت تو اس پر ہر نماز کے بعد لاحول پڑھتی ہے اور دوسری جماعت اس کے انکار سجدہ کو "تصورِ توحید" کی اعلیٰ منزل قرار دیکر اس کی تعریف کرتی ہے۔ چنانچہ اعجاز صاحب نے بھی تاریخ الخمیس اور تفسیر ابن جریر کے حوالہ سے ابلیس کی عظمت ثابت کرنے کے لئے چند اقوال نقل کئے ہیں جن سے ابلیس کے علم و فضل اور تخلیق آدم سے پہلے اس کی عبادت و ریاضت کا حال تو ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن انکار سجدہ کے بعد اس کے موحد باقی رہنے کا کوئی ثبوت ان سے نہیں ملتا اور اگر ایسا ہو بھی تو یہ اقوال اس قدر لغو و مہمل اور مضحک ہیں کہ ایک ذی فہم انسان خود اپنی غلطی تو تسلیم کر لیگا لیکن اس قسم کی روایات و بیانات سے استناد پیش کرنے کی توہین کبھی گوارا نہ کرے گا۔ بہرحال شیطاؔن کی مذمت میں ہمارے یہاں مزخرفات کا ایک انبار نظر آتا ہے اور ایسی صورت میں کہ اختلاف رائے کھلے ہوئے تضاد کی حد تک پہونچ گیا ہے، ہمارے لئے محفوظ طریق کار صرف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں کیونکہ اس سے بہتر حکم کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کے سلسلہ میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں، ابلیس و شیطاؔن کی حقیقت، کفر و شرک کا فرق، توحید کا صحیح مفہوم، لیکن چونکہ مسئلہ زیر بحث میں ان تمام مسائل علیٰحدہ علیٰحدہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور مابہ النزاع صرف یہ ہے کہ "شیطان موحد تھا یا نہیں اور اگر موحد تھا تو کیا وہ واقعی تعریف کا مستحق ہے" اس لئے میں زیادہ تر اسی پر غور کروں گا۔ قرآن مجید میں، ابلیس کا لفظ چھ سات جگہ سے زیادہ نہیں آیا اور شیطاؔن، الشیطاؔن اور شیاطین کے الفاظ بہت جگہ استعمال ہوئے ہیں ——— بعض مفسرین نے یہ خیال قایم کیا کہ ابلیس خاص اس فرشتہ کا نام تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور شیطان اسم صفت ہے اسی لئے اس پر آل داخل کر کے الشیطاؔن بھی کہا گیا ہے اور اس کی جمع شیاطین و الشیاطین بھی استعمال ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں، اور اس کی تصدیق سورۂ سبا اور الشعراء سے بھی ہوتی ہے۔ سورۂ سبا میں یمن والوں کی گمراہی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ "ولقد صدق علیھم ابلیسُ ظنہ فاتبعوہ الافریقا من المومنین" (ابلیس کا گمان ان لوگوں کے متعلق صحیح نکلا اور سوائے ایک فریق کے سب نے اس کی پیروی کی) ظاہر ہے کہ یہاں ابلیس سے مراد وہ خاص ابلیس نہیں جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ عام مفہوم میں شیطان مراد ہے۔

سورۂ الشعراء میں "جنود ابلیس" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس و شیطان میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر ہم ماہرین زبان کے اس بیان کو صحیح مان لیں کہ یہ لفظ مادہ "ب-ل-س" سے مشتق ہے جس کے معنے مایوس و متحیر ہو جانے کے ہیں نیز یہ کہ ابلیس کی جمع ابالیس اور ابالسہ مستعمل ہوتی ہے، تو بھی شیطاؔن اور ابلیس کو ایک ہی چیز ماننا پڑے گا۔

یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں کہ ابلیس یا شیطاؔن کس قسم کی مخلوق سے تھا یعنی وہ جنات میں سے تھا اور ناری مخلوق تھا یا کچھ اور، کیونکہ اصل موضوع سے اس کا تعلق نہیں۔ بہرحال وہ جو کچھ تھا اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس جرم میں وہ مردود قرار پایا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ موحد تھا یا نہیں۔ کلام مجید میں لفظ واحد تو اکثر جگہ آیا ہے، لیکن لفظ توحید یا اس کے مشتقات کہیں نظر نہیں آتے۔ اسی لئے توحید کا مفہوم متعین کرنے میں (جس کا اسم فاعل موحد ہے) اختلاف خیال پایا جاتا ہے۔ صاحب لسان العرب کا بیان ہے کہ توحید سے مراد "علم التوحید والصفات" ہے جسے بقول علامہ تفتازانی ہم علم کلام سے متعلق کر سکتے ہیں۔

(نیاز)

معتزلہ "علم التوحید" میں صفات کو شامل نہیں کرتے اور دوسرے لوگ "توحید ذات" کے بھی مختلف مفہوم قرار دیتے ہیں - - - - - - - - - -)
یعنی بعض تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ایک کہنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے تنہا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ حقیقی معنی میں صرف خدا کو "موجود" ماننا "توحید" ہے اور بعض ایک کے معنی کُل کے لیتے ہیں، یعنی خدا کو کُل سمجھنا توحید ہے۔ صوفیہ کا مسلک یہ ہے کہ توحید کا صحیح مفہوم "مشاہدۂ حق" کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

پھر معلوم نہیں کہ جناب سیماب کا شیطان کو نہ صرف موحّد بلکہ موحدِ اعظم کہنا، توحید کے کس مفہوم کے اعتبار سے ہے؟ خود قرآن مجید میں تو شیطان کو کسی جگہ موحّد بھی ظاہر نہیں کیا گیا، موحدِ اعظم ہونا تو خیر بڑی چیز ہے۔ علاوہ اس کے نفسِ توحید میں کمی یا زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہم خدا کو ایک سمجھتے ہیں تو ہم موحّد کہلائیں گے، چھوٹا موحد یا بڑا موحّد کیسا؟ - لیکن اصطلاح سے ہٹ کر البتہ ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر ہم ایک شخص کو موحدِ اعظم یا موحدِ اصغر کہہ سکتے ہیں اور اس کا تعلق طاعت و فرمانبرداری سے نہ ہو گا۔ فرض کیجئے ایک شخص خدا کو ایک تو کہتا ہے لیکن اس کے احکام نہیں مانتا تو وہ موحد تو ضرور ہے مگر اس موحّد سے کمتر درجہ کا ہے جو احکام خداوندی کی تعمیل بھی کرتا ہے۔ پھر کیا شیطان کو اس معنی میں "موحدِ اعظم" کہنا درست ہو گا؟

اس سلسلہ میں ہم کو دیکھنا چاہئے کہ خدا نے ابلیس یا شیطان کو کن الفاظ سے یاد کیا ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ ص میں ارشاد ہوتا ہے :- "ابیٰ استکبر و کان من الکافرین"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انکارِ سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوا بلکہ چونکہ وہ پہلے ہی سے کافر تھا اس لئے اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کیا۔

اس آیت سے تو شیطان کا ماضی بھی ہمیں ایسا شاندار نظر نہیں آتا، جیسا کہ عام مفسرین بیان کرتے ہیں۔

سورۂ حجر میں ارشاد ہوتا ہے :- "فاخرج منہا، فانک رجیم" یعنی اسے مردود قرار دیا گیا۔ سورۂ "الشعراء" میں صاف صاف ابلیس اور جنودِ ابلیس کے جہنم میں ڈالے جانے کی خبر دی جاتی ہے۔

یہ اقتباسات ہے صرف اُن آیات کا جن میں ابلیس کا ذکر ہے ورنہ شیطان کے متعلق تو بہت سی آیتیں ملتی ہیں :- چند ملاحظہ ہوں!

سورۂ نساء :	"یرید الشیطان ان یضلہم"	(شیطان گمراہ کرتا ہے)
اسرائیل :	"وکان الشیطان لربہ کفورا"	(شیطان ناشکر گزار ہے)
نور :	"لا تتبعوا خطوات الشیطان"	(شیطان کی پیروی نہ کرو)
اسرائیل :	"ان الشیطان للانسان عدو مبین"	(شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے)
مریم :	ان الشیطان کان للرحمٰن عصیا"	(شیطان خدا سے منحرف ہے)

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس ہستی کو خدا نے کافر، مردود، جہنمی، گمراہ اور دشمنِ انسانیت قرار دیا ہو، وہ کیونکر مدح و ثنا کا مستحق ہو سکتا ہے اور قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی قول و روایت کو ترجیح دیکر اس سے استناد و استشہاد کیا معنی رکھتا ہے۔

اول تو خود قرآن سے ابلیس کا کافر ہونا ثابت ہے، لیکن اگر اس کے بعد بھی ہم اسے موحّد سمجھنا چاہتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو محض موحد ہونا کوئی ایسی بات نہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتنا سمجھا جائے۔ عہدِ رسالت میں بھی موحدین پائے جاتے تھے، لیکن غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے انھیں کافر ہی سمجھا جاتا تھا۔

سیماب صاحب نے شیطان کو موحدِ اعظم، غالباً صوفیہ کے نقطۂ نظر سے کہا ہے جو آدم کو سجدہ نہ کرنے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ نہ کرنا چاہتا تھا اور یہ عظمت خداوندی کے اظہار کا نہایت اعلیٰ معیار تھا، لیکن کلام پاک سے کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے اس خیال سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ اس کی وجہ اس نے یہ ظاہر کی تھی کہ "میں آگ سے پیدا ہو رہا ہوں اور آدم مٹی سے، اس لئے آگ مٹی کے

[illegible] کافر تھا اور اسی لئے اسے

حکم خداوندی سے سرتابی کی۔

اعجاز صاحب نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا سیماب عاشق رسول ہیں اور حاجی وارث علی شاہ صاحب کے پرستار۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ رسول اللہ کی کوئی ایک حدیث یا حاجی صاحب کا کوئی ایک قول ایسا پیش کرسکتے ہیں، جس میں شیطان کو "موحد" کے لقب سے یاد کیا گیا ہو؟ پھر حیرت کا مقام ہے کہ جب خدا، رسول اور پیر تینوں اس باب میں سیماب صاحب کے ہم آہنگ نہیں تو وہ کونسی چوتھی قوت ایسی ہے جو اُن سے شیطان کی مدح سرائی کراتی ہے۔ سُنا ہے کہ گوسالۂ سامری پر شیطان کے پاؤں کی خاک ڈالدی گئی تھی تو وہ بولنے لگا تھا، لیکن یہاں تو سیماب صاحب کی ہستی تو ایک جیتی جاگتی ہستی ہے اور انھیں گویا کرنے کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے صرف اُسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جو اس وقت سیماب صاحب اور اُن کے مخالفین کے سامنے ہے۔ ورنہ میرے نزدیک ابلیس وشیطان کا کوئی خارجی وجود نہ تھا جس کے موحد یا غیر موحد ہونے پر بحث کی جائے ۔ قرآن میں اس کا ذکر صرف تمثیل کے طور سے ہوا ہے، ابلیس یا شیطان سے مراد خود انسان کی بُری فطرت ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے اگر سیماب صاحب نے بھی اسی تمثیل کو سامنے رکھ کر آج کل کے مدعیان مذہب واخلاق کو شیطان سے بدتر ظاہر کیا تو کوئی غلط بات نہیں کہی۔

سیماب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے شاعری ہی سمجھنا چاہئے تھا، اس پر مذہبی نقد وتبصرہ کی ضرورت نہ تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ شاعر اگر موسیٰ، عیسیٰ، یوسف کی توہین کرے تو اہل مذہب خاموش رہیں اور اگر ایکبار شیطان کی تعریف کردے تو قیامت برپا کردیں۔

معترضین سے زیادہ مجھے سیماب صاحب پر حیرت ہے کہ وہ اسے کیوں پسند کرتے ہیں کہ جواب دیتے وقت مذہبی پہلو اختیار کیا جائے اور استناداً وہ اقوال پیش کئے جائیں جو یکسر پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں اور جو قرآنی شہادت کے مقابلہ میں کسی طرح قابل اعتنا نہیں۔

جناب اعجاز نے مولانا سیماب کے پیامی شاعر ہونے کے متعلق جو رائیں پیش کی ہیں، اُن سے انکار نہیں، لیکن میرے نزدیک پیامی شاعر صرف وہ شاعر ہے جو اپنے پیام پر عمل بھی کرے، ورنہ صرف "نظریے" پیش کردینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر جناب سیماب واقعی اپنے ہر پیام کی صداقت کو اپنے عمل سے بھی ثابت کرتے ہیں، تو وہ نہ صرف پیامی شاعر بلکہ "نبی شاعر" ہیں اور یہی "یقین عمل" ان کے "نفس" کو اس حد تک مطمئن کردینے کے لئے کافی ہے کہ وہ اس قسم کی بحث ونزاع سے علیحدہ رہیں لیکن چونکہ ہندوستان میں اس وقت کوئی پیامی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے حال وقال دونوں یکساں ہوں اسی لئے لوگ جناب سیماب کے بھی پیامی شاعر ہونے سے انکار کرتے ہیں اور چونکہ سیماب صاحب نے نظم "موحد اعظم" لکھ کر ایک ہی ہستی میں بیک وقت "کفر وتوحید" کا اجتماع ممکن ثابت کردیا ہے، اس لئے افسوس ہے کہ ہم ان منکرین کو شیطان کہکر بھی ان کے جحود وانکار کا انتقام نہیں لے سکتے۔

پورب اور پچھم

دو ہواؤں کا تصادُم

(ایک چینی خاتون کے خطوط)

بسلسلۂ نگار اپریل ۴۲ء

میرے دل کی کیا کیفیت ہے، اسے کیونکر ظاہر کروں۔۔۔۔۔ آخر کار گھر سے روانگی کا دن آہی گیا۔ کیسا اُداس اور خاموش دن تھا!

سال کا دسواں مہینہ ختم ہورہا تھا، زرد زرد خاموش پتیاں درختوں سے زمین پر گرنا شروع ہوگئی تھیں اور بانس کے درخت صبح و شام کی خنکی میں ہلتے ہوئے ایسا معلوم ہوتے تھے جیسے وہ کانپ رہے ہوں ــ میں مکان کے ایک ایک گوشہ میں جاتی اور ہر جگہ دیر تک کھڑی ہوکر اس کی دلچسپی و دلکشی پر اس طرح غور کرتی، گویا میں ان کو اپنے ساتھ لیجانا چاہتی تھی۔ میں حوض کے پاس دیر تک کھڑی ہوکر دیکھا کی کہ ہوا کس طرح نیلوفر کے پتوں سے کھیل رہی ہے۔ میں ایک گھنٹہ تک جونیپر کے درخت کے نیچے بیٹھی رہی جو ہمارے مکان کے صحن میں اپنی عمر کے تین سو سال پورے کرچکا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ لیجانے کے لئے بانس کی ایک پتلی سی شاخ کاٹی اور داؤدی کے آٹھ گملے انتخاب کئے۔ اس وقت داؤدی کے پھول پورے حسن و شباب پر تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ان کا سُرخ، سنہرا رنگ شاید میرے مکان کی اُداسی کو دور کرسکے گا۔

الغرض میں اپنے شوہر کے گھر واپس آگئی، لیکن وہ موجود نہ تھا۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ بہت صبح کسی کام سے باہر چلا گیا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں کہ کہاں؟ میں نے داؤدی کے گملے چھوٹے کمرے میں رکھوا دئے اور سوچتی رہی کہ انھیں کس طرح سجاؤں کہ میرا شوہر جب واپس آئے تو دیکھ کر حیران رہ جائے۔ میں نے بہت کوشش کی، لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ میرے میکہ میں تو ان کے پھول دیواروں کے سیاہ نقوش کے سامنے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے، لیکن یہاں سفید دیواروں کے پاس وہ بہت اُداس سے نظر آتے تھے!

یہی حال میرا بھی تھا۔ میں نے فیروزی رنگ کا ریشمی لباس پہنا اور بغیر آستین کی سیاہ مخملی جاکٹ۔ میں نے اپنے بالوں کو بھی فیروزی رنگ کے زیوروں سے سنوارا اور کانوں کے آویزے بھی اسی رنگ کے پہنے۔ جوتے سیاہ مخمل کے تھے جن میں سونے کی چھوٹی چھوٹی گھنڈیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر میں نے سرخی ملی، ہتھیلیوں کو گلاب سے معطر کیا، الغرض اپنے شوہر سے ملنے کے لئے پوری طرح بن ٹھن کر بیٹھ گئی، اور تھوڑی دیر بعد ہی میں نے ڈیوڑھی پر اس کے قدموں کی آواز سنی۔ اگر میں اس وقت قدیم چینی وضع کے مکان میں ہوتی، تو میں فوراً پردہ سرکا کر سامنے آسکتی تھی، لیکن مشکل یہ تھی کہ میں کوٹھے پر تھی اور مجھے سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے آنا تھا، اس لئے میں مجبور ہوگئی اور میری حالت بھی انھیں گل داؤدی کے پودوں کی سی ہوگئی، جو صرف خوبصورت ہیں اور کچھ نہیں۔

میرا شوہر دیر میں آیا تھا اور تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تک میری تازگی بھی ختم ہوچکی تھی۔ ہر چند اس نے مہربانی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا، لیکن اس نے مجھے غور سے دیر تک دیکھا نہیں۔ اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ نوکر سے جلد کھانا طیار کرایا جائے کیونکہ وہ دن بھر ایک مریض کے علاج میں مصروف رہا تھا اور کھانا کھانے کا موقعہ اسے نہ ملا تھا۔

ہم دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، اس حال میں کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور میں انھیں پی جاتی تھی۔ لیکن اس نے جلدی سے

[illegible]

اس نے میرے ماں باپ کا حال دریافت کیا، لیکن میری طرف وہ زیادہ متوجہ نہ تھا اس لئے میں بھی خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ جھکا اور معذرت کے انداز میں بولا۔ "مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی کہ تم آگئیں۔ میری خاموشی پر تم کچھ اور گمان نہ کرنا۔ افسوس ہے کہ آج سارا دن میں نے واہمہ پرستی کا مقابلہ کرنے میں صرف کر دیا اور مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتا تھا، مگر پھر بھی ناکام رہا۔ تم تو خاندان کو تو جانتی ہوگی۔ انھیں کی دوسری بیوی نے آج گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کر لی۔ وہ اپنی ساس کی بد زبانی سے بہت عاجز آگئی تھی۔ انھوں نے مجھے بلایا اور وہ یقیناً بچ جاتی کیونکہ اسے رسی سے لٹکے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اور میں وقت پر پہونچ گیا تھا، لیکن جس وقت میں دوائیں بنا رہا تھا کہ بڑھا پجاری آیا اور اس نے کہا کہ یہ سب فضول ہے، وہی پرانے طریقے استعمال کئے جائیں، چنانچہ اس نے پجاریوں کو بلایا تاکہ وہ ڈھول بجا بجا کر برہم شدہ روح کو پھر واپس بلائیں۔ انھوں نے اس کی ناک، منھ میں روئی ٹھونس دی چہرہ پر چاروں طرف کپڑا لپیٹ دیا اور ——"

میں نے کہا۔ "یہ تو ہمیشہ کیا جاتا ہے تاکہ جتنی روح اندر رہ گئی ہے وہ باہر نکلنے نہ پائے"۔ وہ یہ سنکر کمرے میں ٹہلنے لگا، اور پھر میری طرف گھور کر بولا "کیا تم بھی —— !" ۔ میں سکڑ کر پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے دریافت کیا کہ "کیا وہ مرگئی"۔ اس نے حیرت سے کہا "مرگئی! — وہ کیا تم بھی مرجاؤ اگر یہ عمل تمہارے ساتھ کیا جائے"۔

یہ کہکر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور دوسرے ہاتھ سے میری ناک پر رومال کس کر لپیٹ دیا۔ میں نے گھبرا کر اسے نوچ پھینکا۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر اپنا سر ہاتھوں پر رکھ کر دیر تک خاموش بیٹھا رہا گویا اس کا سر درد کر رہا تھا۔ میں بھی اسے خاموش دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کیا واقعی وہ سچ کہتا تھا

اس رات میں نے اپنے تمام زیور اتار کر بکس میں رکھدئے۔ میں افسردہ تھی اور سوچ رہی تھی۔ مجھے اسوقت تک جو تعلیم دی گئی ہے کیا وہ واقعی غلط ہے۔ میرا شوہر ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کے لئے عورت ہونے کے لحاظ سے کوئی دلچسپ چیز ہے۔ وہ مجھ کو صرف اس کی خوشبو کی وجہ سے پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مجھے اسے خوش کرنے کے لئے دوسرے طریقے استعمال کرنا چاہئے، اور مجھے یاد آگیا کہ میری ماں نے کہا تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ میں خود آسانی سے اپنے جکڑے ہوئے پاؤں کو نہیں کھول سکتی تھی۔ اس باب میں مسز تیو نے میری مدد کی۔ یہ ایک معلم کی بیوی تھی جو ایک غیر ملکی اسکول میں پڑھاتا تھا اور میرا شوہر اسے اپنا دوست کہتا تھا۔ جس دن میں واپس آئی تھی اسی دن مسز تیو نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ اگلے دن ملنے آئے گی۔ چنانچہ میں نے اس کی پذیرائی کے لئے بڑی طیاریاں کیں، میں نے نوکر سے کہا کہ چند قسم کے کیک خرید کر لائے اور تربوز کے بیج بھی۔ چائے کا بھی خاص اہتمام کیا، میں نے ارغوانی ریشم کا لباس پہنا اور کانوں میں موتیوں کے آویزے بھی ڈال لئے۔ چونکہ میں سمجھتی تھی میرا شوہر اسوقت گھر پر رہے گا، اس لئے میں نے خیال کیا کہ مکان کا فرنیچر اپنے ذوق کے لحاظ سے آراستہ کروں، لیکن وہ گھر ہی پر رہا اور جس وقت گھنٹی بجی تو خود دروازہ کھولنے گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک عورت کے استقبال کے لئے مرد کیونکر جا سکتا ہے۔ میں نے کمرہ کے اندر جھانک کر دیکھا تو میں نے ایک عجیب و غریب بات دیکھی۔ میرا شوہر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے اسے جھٹکے دے رہا تھا اور دونوں بہت خوش تھے۔ میں حیران تھی کہ اس وقت اس کے چہرہ پر جس خوشی کے آثار پائے جاتے تھے وہ کبھی مجھے دیکھ کر پیدا نہیں ہوئے اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس کو خوش رکھنے کی کیا صورت اختیار کروں۔

جب تک وہ میرے مکان پر رہی میں نے بہت غور کیا کہ اس کے چہرہ میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ یقیناً مجھ سے زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ اس کا چہرہ چوڑا چکلا تھا اور آنکھیں چھوٹی۔ وہ معمولی ریشمی قمیص کے اوپر نیلے رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کے پاؤں میں مردوں کا سا جوتا تھا۔ اس کی آواز البتہ دلکش تھی، گفتگو بھی جلد جلد کرتی تھی اور اس کی ہنسی میں ایک خاص قسم کی گرمی پائی جاتی تھی۔

وہ دیر تک میرے شوہر سے باتیں کرتی رہی اور میں سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، انھوں نے ایسی ایسی باتیں کیں جو میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ غیر ملکی الفاظ ان کی زبان سے نکلتے تھے اور دونوں بہت خوش نظر آتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد میں اپنے شوہر کے پاس خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر مجھے دن کا خیال آرہا تھا جب مسز تیو ملنے آئی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا وہ اس سے اس طرح باتیں کرتا تھا گویا وہ مرد تھی۔

[illegible] بیان کرو، جو آج ملنے آئی تھی۔"

وہ کرسی سے ٹیک لگاکر بیٹھ گیا اور مجھ کو غور سے دیکھ کر بولا کہ " وہ یوروپ کے ایک بڑے کالج کی گریجویٹ ہے، وہ بڑی ہوشیار و ذہین ہے جیسا کہ ایک عورت کو ہونا چاہئے۔ وہ اس وقت تین لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کر رہی ہے جو بہت ذہین، صاف ستھرے اور سلیقہ مند ہیں، میں جب انھیں دیکھتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں

میں نے یہ سُنا تو اس عورت کی طرف سے اور زیادہ نفرت دل میں پیدا ہوئی، لیکن کیا کر سکتی تھی۔

میں نے پوچھا :۔ "کیا تم اسے خوبصورت خیال کرتے ہو"

اس نے کہا :۔ "کیوں نہیں، وہ تندرست ہے، ذی فہم ہے اور اپنے مضبوط و توانا قدموں پر چلتی ہے"۔ یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کے دل میں کیا تھا۔ اگرچہ میں بہترین شفتالو کے رنگ کے ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی اور کان میں موتیوں کے آویزے بھی تھے۔ میرے سیاہ چمکیلے بال بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ گندھے ہوئے تھے اور میں اس سے اتنی قریب کھڑی تھی کہ اس کے جسم کی ذراسی جنبش میرے جسم سے مس کر سکتی تھی، لیکن وہ میری طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنے ماضی کو فراموش کرکے کہا کہ "میں اپنے بندھے ہوئے پاؤں کھولنے کے لئے طیار ہوں"۔

جس وقت میں پچھلی باتوں کا خیال کرتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے شوہر کی دلچسپی میرے ساتھ اسی شام سے شروع ہوئی۔ اس سے پہلے ہم دونوں کے پاس گفتگو کرنے کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھا کرتی تھی اور وہ مجھے دیکھتا ہی نہ تھا۔ جب ہم باتیں کرتے تو اس طرح گویا ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔ لیکن اب وہ مجھے دیکھتا بھی تھا، میری سنتا بھی تھا اور اپنی کہتا بھی تھا۔ میری محبت جو اس وقت تک دل ہی دل میں کپکپایا کرتی تھی اب اس میں ٹھیراؤ پیدا ہوگیا تھا۔ میں کبھی وہم بھی نہ کر سکتی تھی کہ ایک مرد عورت کی طرف اتنا جھک سکتا ہے۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ "اپنے پاؤں کیسے کھولوں" تو میں نے خیال کیا کہ وہ مجھے اس کی ترکیب بتا دے گا، لیکن میں حیران رہ گئی، جب وہ خود اُٹھکر طشت، گرم پانی اور سفید کپڑے کی پٹی لایا! مجھے شرم معلوم ہوتی تھی، میں یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ میرے پاؤں دیکھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا اسوقت سے اب تک کسی نے میرے پاؤں نہ دیکھے تھے۔ اس لئے جب زمین پر طشت رکھ کر وہ میرے پاؤں کی طرف جھکا، تو میرا جسم کانپ رہا تھا۔

میں نے کہا :۔ "میں خود کھول لونگی"۔ اس نے جواب دیا :۔ "تم خیال نہ کرو، تمھیں معلوم نہیں، میں ڈاکٹر ہوں"۔

میں نے پھر انکار کیا تو اس نے میرے چہرہ کو غور سے دیکھا اور بولا "مجھے معلوم ہے کہ تمھیں اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ میں تمھارے پاؤں چھوؤں لیکن میرا فرض ہے کہ تمھاری مدد کروں۔ کوئی لین، میں تمھارا شوہر ہوں"۔ یہ سُنکر میں خاموش ہوگئی۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر آہستہ سے جوتا موزہ اُتارا اور کپڑا علحدہ کیا۔ اس نے نہایت نرم و افسوس کے لہجہ میں کہا "تمھارا لڑکپن بھی کیسی مصیبت میں بسر ہوا اور پھر کوئی نتیجہ نہیں!"

یہ سنکر میری آنکھ میں آنسو آگئے۔

جب میرے پاؤں کھول کر دوبارہ ان پر ڈھیلی پٹی باندھی گئی تو مجھے سخت تکلیف شروع ہوئی۔ یعنی جو تکلیف اول اول پاؤں کے باندھنے میں ہوئی تھی وہی اب کھولنے کے بعد بھی محسوس ہونے لگی۔ میرے پاؤں آہستہ آہستہ پھیلنے لگے اور خون کی گردش شروع ہوئی۔

دن میں کسی وقت گھبرا کر میں پٹی کھول لیتی اور پھر تنگ کرکے باندھتی تاکہ تکلیف کم ہو جائے، لیکن پھر شوہر کے خیال سے ڈھیلی کر دیتی۔ اب مجھے نہ آئینہ دیکھنے کا ہوش تھا اور نہ اس بات کا کہ میں اپنے شوہر کے سامنے بن سنور کر آؤں۔

رات کو میری آنکھیں روتے روتے سوج جاتی تھیں اور میری آواز بھرّانے لگتی تھی، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ میں اپنے حُسن سے وہ چیز حاصل نہ کر سکی تھی جو اب رنج و تکلیف سے حاصل ہوئی۔ کیونکہ اب میرا شوہر مجھے ہر وقت تسکین دیا کرتا اور بعض اوقات میں بچوں کی طرح اس سے لپٹ کر رونے لگتی۔

اس نے کہا :۔ "کوئی لین، ہم دونوں ملکر تمھاری اس تکلیف کو برداشت کریں گے۔ بیشک تمھیں سخت تکلیف ہے، لیکن یہ تو سوچو کہ تمھاری یہ قربانی دوسروں کے لئے ہے، ساری قوم کے لئے ہے اور پُرانی ذلیل رسموں کے خلاف احتجاج ہے"۔

میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا :۔ "نہیں، میں یہ سب کچھ صرف تمھارے لئے برداشت کر رہی ہوں"۔ وہ یہ سنکر ہنسنے لگا اور اس کے چہرہ پر وہی چمک آگئی جو مسز لیو سے بات کرتے وقت نظر آتی تھی۔ یہ تھا میری تکلیف کا انعام اور اس کے بعد مجھے کوئی مصیبت نہ رہی۔

اب میرے پاؤں زیادہ مضبوط ہو چلے تھے اور میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی تھی۔ چونکہ میں جوان تھی اس لئے میرے پاؤں جلد ٹھیک ہو گئے۔ بوڑھی عورتوں کے پاؤں تو بعض اوقات خشک ہو کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اب میرے جسم میں بھی توانائی پیدا ہو چلی تھی اور زینہ پر بے تکلف آ جا سکتی تھی۔ ایک شام جب میں زینہ سے اُتر کر دوڑتی ہوئی اپنے شوہر کے کمرہ میں چلی گئی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ بہت خوش تھا۔ مگر میں نے افسردہ ہو کر کہا کہ "میرے پاؤں ابھی مسز لیو سے بہت چھوٹے ہیں، اتنے بڑے کب ہوں گے"۔ اس نے کہا: "اتنے بڑے نہیں ہو سکتے، لیکن تمہارے پاؤں بھی کافی بڑے ہیں"۔ مجھے یہ سُنکر افسوس تو ہوا، لیکن میں نے ایک ترکیب اور سوچی۔ میرے پُرانے زربفت کے جوتے تو اب بیکار تھے اس لئے دوسرے دن میں نوکر کو ساتھ لیکر دوکان پر گئی اور مسز لیو کی طرح چمڑے کا جوتا خریدا لیکن اپنے پاؤں سے دو انچ بڑا اور اندر نوک کی طرف میں نے روئی ٹھونس دی۔ ان کے پہننے کے بعد کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ میرے پاؤں کسی وقت جکڑ دئے گئے تھے۔ اب میں مسز لیو سے ملنے کے لئے بیتاب تھی، میں نے پوچھا "ہم کب چلیں گے"۔ اس نے کہا "کل ہم تم دونوں ساتھ چلیں گے"۔

یہ سنکر مجھے تعجب ہوا کہ وہ گلی میں میرے ساتھ ساتھ چلے گا، لیکن میں اب اس قسم کی باتوں کی عادی ہو چلی تھی۔ دوسرے دن ہم دونوں وہاں گئے اور بعض باتیں اس نے بہت عجیب کیں۔ جب میں گھر واپس آئی تو میں نے پوچھا کہ "مسز لیو کے کمرہ میں داخل ہوتے وقت تم نے مجھے آگے کیوں کر دیا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مغرب میں مرد، عورتوں سے کم درجہ کے سمجھے جاتے ہیں"۔ اس نے کہا: "یہ بات نہیں، بلکہ یہ بہت پُرانی تہذیب ہے جو قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے"۔

یہ سنکر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ ہم لوگوں سے زیادہ قدیم مہذب قوم کوئی دوسری ہوئی نہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ مغربی باشندے بھی اپنی تاریخ رکھتے ہیں اور بالکل وحشی نہیں ہیں۔

میں جب رات کو اپنے بستر پر گئی تو بہت خوش تھی، کیونکہ میں نے زیور وغیرہ بھی نہ پہنے تھے اور بہت کچھ مسز لیو کی طرح معلوم ہوتی تھی۔

اب مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ میرا شوہر روز شام کو مجھ سے دوران گفتگو میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتا اور میں سُنکر حیران رہ جاتی۔ ایک بار جب میں نے اہلِ مغرب کے عادات و اطوار کا حال سُنکر بہت حیرت کی تو اس نے کہا "وہ بھی ایسی حیرت کرتے ہیں۔ ہمارے لباس پر، ہماری غذا پر اور ہماری زندگی پر"۔ ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ہماری معاشرت کس پہلو سے حیرت کے قابل ہو سکتی ہے، لیکن میں یہ سُنکر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے مغرب کی بہت سی ایجادات کا ذکر کیا۔ میں یہ سنکر حیران رہ گئی کہ وہ سمندر کے اندر اور ہوا کے اوپر بھی آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ: "یہ سب جادو کے زور سے کرتے"۔ اس نے کہا: "نہیں یہ جادو نہیں ہے، بلکہ اسے سائنس کہتے ہیں"۔ یہ لفظ سنکر مجھے خیال آیا کہ میرا بھائی بھی اسی چیز کے لئے ملک سے باہر غیروں میں پڑا ہوا ہے اور میں نے کہا کہ "میں بھی سائنس کو دیکھنا چاہتی ہوں"۔ وہ یہ سُنکر ہنس پڑا اور بولا کہ:- "وہ کوئی کھلونا نہیں ہے، جسے تم ہاتھ میں لیکر دیکھ سکو"۔ اور یہ کہکر وہ الماری سے کتابیں اُٹھا لایا اور تصویریں دکھا دکھا کر مجھے سمجھانے لگا۔ مجھے ان باتوں سے اتنی دلچسپی ہوئی کہ میں چاہتی تھی خود بھی کسی سے ایسی باتیں کروں اور چونکہ سوا کھانا پکانے والی کے اور کوئی نہ تھا جس سے میں ایسی باتیں کر سکتی اس لئے ایک دن میں نے اس سے کہا: "تمھیں معلوم ہے کہ دُنیا گول ہے اور ہمارے ملک کے سوا اور بھی بہت سے بڑے بڑے ملک دنیا میں موجود ہیں"۔ وہ ٹوکری میں چاول دھو رہی تھی، یہ سنکر اس نے ٹوکری زمین پر رکھ دی اور بولی "کون کہتا ہے؟"۔ میں نے کہا: "تمہارا مالک کہتا ہے"۔ وہ یہ سُنکر چُپ ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد بولی کہ "ہاں، مالک تو بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن یوں دیکھنے میں تو زمین گول نہیں معلوم ہوتی۔ کسی پہاڑی یا منارہ پر چڑھکر دیکھو تو دور تک میدان ہی میدان نظر آتا ہے اور گولائی کا کہیں پتہ نہیں"۔ میں نے کہا: "صرف یہی نہیں بلکہ زمین اتنی بڑی ہے کہ اس کے دوسری طرف پہونچنے کے لئے چاند کو پورا چکر لگانا پڑتا ہے اور جب یہاں اندھیرا ہوتا ہے تو زمین کے دوسرے حصہ میں روشنی ہوتی ہے"۔

اس نے کہا:- "ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا، یہ بالکل غلط ہے۔ اگر چاند کو دوسرے ملکوں تک پہونچنے میں اتنے دن لگتے ہیں تو سورج ایک گھنٹہ میں کیونکر وہاں پہونچ سکتا ہے، جبکہ یہاں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک پہونچنے میں پورا دن صرف ہو جاتا ہے"۔

وہ تو یہ کہکر پھر چاول دھونے میں مصروف ہو گئی، لیکن میں یہ سوچ میں پڑ گئی کہ واقعی یہ کیسے ممکن ہے کہ مغرب کا بھی وہی چاند سورج ہو، جو ہمارا ہے۔

(ادارۂ نگار)

سائنس کے گھریلو شعبدے

ہوا کے دباؤ سے دھماکا —— یہ چیزیں فراہم کیجئے:۔ ایک تسلا —— ایک بوتل کشادہ منھ کی —— پتلا ربڑ غبارے کا —— انگیٹھی یا گیس کا چولھا —— ربڑ کا فیتہ یا بندھن۔

بوتل میں چوتھائی انچ پانی بھر کر تسلے کے درمیان رکھ دیجئے اور تسلے میں ایک انچ پانی بھر کر انگیٹھی یا گیس کے چولھے پر رکھ کر گرم کیجئے یہاں تک کہ تسلے کا پانی اُبلنے لگے ـــ اس کے بعد رومال یا صافی سے پکڑ کر بوتل ہٹا لیجئے اور اس کے منھ پر ربڑ کا ٹکڑا فیتہ سے باندھ کر کسی ٹھنڈی جگہ رکھ دیجئے۔ تھوڑی دیر میں ایک بلند آواز پیدا ہوگی اور ربڑ کا ٹکڑا پھٹا ہوا نظر آئے گا۔



ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بوتل چونکہ اسٹیم یا بھاپ سے بھر گئی تھی اس لئے اس کی ہوا نکل گئی تھی۔ جب اس کا منھ ربڑ سے بند کر دیا گیا تو اسٹیم ٹھنڈی ہو کر پانی میں تبدیل ہو گئی اور تھوڑا سا خلا (Vacuum) پیدا ہو گیا۔ پھر چونکہ بوتل کے اندر ہوا نہ جا سکتی تھی اس لئے ربڑ پر اس کا دباؤ پڑا اور وہ پھٹ گیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ ہوتا ہے!

ہوا کے دباؤ سے کنستر کا پچک جانا —— یہ اشیا فراہم کیجئے:۔ دو گیلن والا ٹین کا کنستر —— ڈاٹ —— صافی —— گیس کا چولھا یا انگیٹھی۔

کنستر میں چوتھائی انچ پانی بھر دیجئے اور اسے چولھے پر رکھ دیجئے یہاں تک کہ پانی اُبلنے لگے۔ اس کے بعد اتار کر فوراً ڈاٹ لگا دیجئے لیکن ڈاٹ ایسی لگائے کہ ہوا اندر نہ جا سکے۔ اب کنستر کو کسی ٹھنڈی جگہ میں رکھ کر اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالئے۔ تھوڑی دیر میں کنستر پچک جائے گا

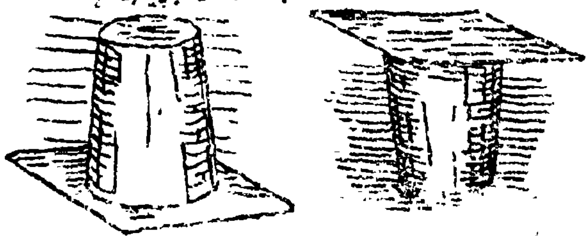


ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی اور چونکہ کنستر کا رقبہ تقریباً ۲۵۳ مربع انچ تھا اس لئے اُس پر [illegible] کا دباؤ پڑ گیا اور وہ پچک گیا۔

جادو کا گلاس

— یہ چیزیں فراہم کیجئے :۔ ایک گلاس — ایک موٹی دفتی چار انچ مربع ۔

گلاس کو لبالب پانی سے بھر دیجئے اور دفتی کو دونوں طرف تر کر کے گلاس کے منھ پر اس طرح رکھ دیجئے کہ ہوا اندر نہ جا سکے ۔ اس کے بعد دفتی پر ہاتھ رکھ کر گلاس کو اُلٹ دیجئے تاکہ پیندا اوپر ہو جائے اور اسے کسی برابر جگہ رکھ کر آہستہ آہستہ دفتی کھسکانے کی کوشش کیجئے ۔ دیکھئے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے ۔



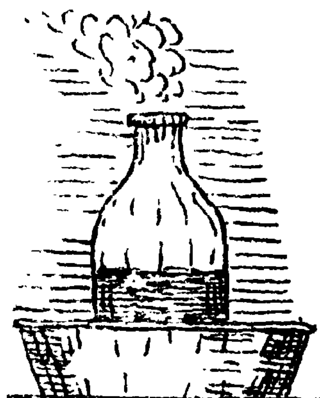
کیوں ؟ — پانی اور دفتی دونوں ہوا کے دباؤ سے اپنی اپنی جگہ قائم ہو جاتے ہیں ۔ آپ کسی طرف سے پانی نہیں اُنڈیل سکتے جب تک ہوا اس کے اندر نہ جا سکے ۔ چونکہ گلاس کے اندر دفتی کی وجہ سے ہوا نہیں جا سکتی اس لئے پانی بھی بہہ کر باہر نہیں نکل سکتا ۔

ٹھنڈے پانی سے اُبال

— یہ چیزیں فراہم کیجئے :۔ ایک بوتل — ایک ڈاٹ — ایک گلاس — ایک تسلا — تام چینی — گیس کا چولھا یا انگیٹھی ۔

نصف بوتل پانی سے بھر دیجئے اور تسلے میں ایک انچ پانی بھر کر بوتل اس کے درمیان رکھ دیجئے اس کے بعد انگیٹھی پر رکھ کر گرم کیجئے ۔ یہاں تک کہ بوتل کا پانی قریب قریب اُبلنے پر آ جائے ۔ پھر بوتل الگ کر کے فوراً ڈاٹ لگا دیجئے اور اُلٹا کر کے پیندے کی طرف ٹھنڈا پانی ڈالتے رہیے تھوڑی دیر میں بوتل کا پانی کھولنے لگے گا اور اگر ڈاٹ خوب مضبوط لگی ہے تو کئی منٹ تک کھولتا رہے گا ۔





کیوں ؟ — پانی اسی وقت اُبلتا ہے جب اس کی بھاپ ہوا کے دباؤ پر غالب آ جائے ۔ اس لئے جتنا کم دباؤ ہوا کا ہو گا اتنی ہی کم بھاپ اور کم حرارت کی ضرورت ہو گی ۔ پھر چونکہ ٹھنڈے پانی سے بوتل کے اندر کی بھاپ بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور بوتل میں کچھ خلا پیدا ہو گیا تھا اس لئے ہوا کا دباؤ بھی کم ہو گیا اور پانی میں صرف اتنی حرارت باقی رہی جو ہوا کے اتنے کم دباؤ کی حالت میں اُبال لانے کی کافی تھی ۔

غوطہ خور شیشی

— یہ چیزیں فراہم کیجئے :۔ کشادہ منھ کی بوتل ۔ چھوٹی سی شیشی — غبارہ کا ربڑ — ربڑ کا بندھن ۔

بوتل کو لبالب اور شیشی کا چوتھائی حصہ پانی سے بھر دیجئے ۔ شیشی پر ڈاٹ لگا کر منھ نیچے کی طرف کر کے بوتل میں ڈالئے ۔ اگر وہ تیرتی ہے تو خیر ورنہ پانی کم زیادہ کر کے اس کو اس قابل بنا دیجئے کہ وہ بوتل کے پانی کی سطح تک تیرتی رہے ۔ اس کے بعد آپ بوتل کے منھ پر بندھن سے ربڑ باندھ دیجئے اور ہتھیلی یا انگلی سے ربڑ کو

دبایئے تو شیشی نیچے چلی جائے گی اور جب آپ دباؤ ہٹا لیں گے تو پھر اوپر ابھر آئے گی۔ اگر آپ اس دباؤ کی کمی یا زیادتی کو اچھی طرح سمجھ لیں گے تو آپ شیشی کو جہاں چاہیں پانی کے اندر تیرتا ہوا قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ بوتل پانی سے بالکل لبریز ہونا چاہیے۔

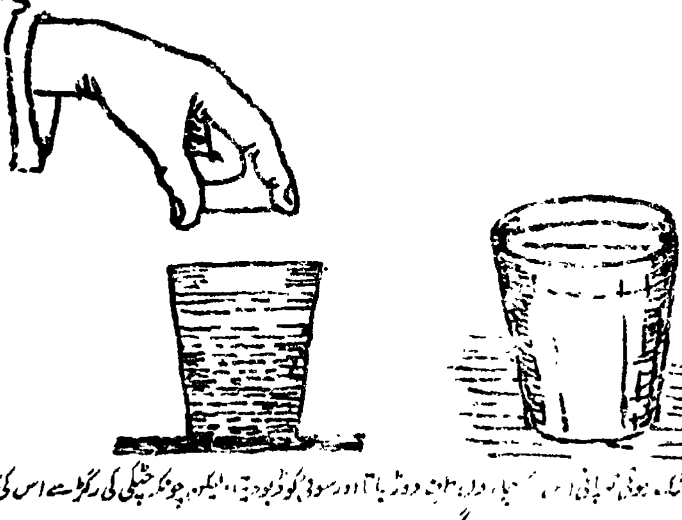


ایسا کیوں ہوتا ہے؟ — شیشی پانی میں اس لئے تیرتی ہے کہ اس کے اندر ہوا کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ جگہ جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ تیرنے کی کیفیت اس میں پیدا ہوگی اور جب یہ جگہ بہت کم رہ جائے گی تو ڈوب جائے گی۔

جب کوئی رقیق چیز کسی ظرف میں بھری جاتی ہے تو اس پر دباؤ ڈالنے سے رقیق مادہ اور ظرف دونوں پر برابر کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے جب آپ نے انگلی سے اس پر دباؤ ڈالا تو شیشی کے اندر کی ہوا پر بھی دباؤ پڑیگا اور شیشی ڈوب جائے گی، اسی طرح جب دباؤ ہٹا لیا جائے گا تو شیشی پھر ابھر آئے گی۔

تیرنے والی سوئی — کیا چاہئے: سینے کی بڑی سوئی — پانی کا گلاس

سوئی کو چٹکی سے اپنی طرح دبایئے اور پھر انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی درمیان رکھ کر آہستہ سے بھرے ہوئے گلاس کی سطح پر چھوڑ دیجئے، سوئی تیرنے لگے گی۔

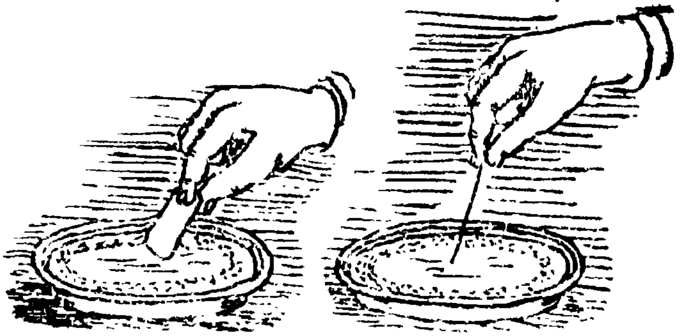


کیوں؟ — اگر سوئی کی سطح صاف ہوتی تو پانی اس کے چاروں طرف دوڑ جاتا اور سوئی کو ڈبو دیتا لیکن چونکہ چٹکی کی رگڑ سے اس کی سطح پر ہلکی سی چکنائی پیدا ہوگئی اس سے پانی اس کے چاروں طرف نہ دوڑ سکا اور وہ تیرنے لگی۔

دفع و جذب کا تماشہ — کیا چاہئے: ایک پلیٹ کی تھالی — موم بتی — ہنڈی کی سلائی — صابون — شکر کے چوپہل ٹکڑے — ابرق کا سفوف۔

تھالی میں گرم پانی لبالب بھر دیجئے اور موم بتی کھرچ کر ابرک ذرا سا پانی میں چھڑک دیجئے۔ اب شکر کے ٹکڑے کو آپ پانی کے پاس لیجایئے تو آپ دیکھیں

موم بتی کے اجزا اس کی طرف کھنچتے آرہے ہیں — اب آپ صابون کو تر کرکے اس کا ذرا سا حصہ چھیل کر سلائی کی نوک پر لگائیے اور پانی کے پاس لے جائیے تو موم کے ذرات دور ہٹنے لگیں گے — اس کے بعد آپ تھالی کا پانی پھینک کر اسے پھر تازہ پانی سے بھر دیجئے اور ابرق کے ذرات اس پر چھڑک دیجئے۔ اب جو آپ صابون لگی سلائی پانی کے پاس لے جائیں گے تو اس میں حلقے سے پیدا ہونے لگیں گے -



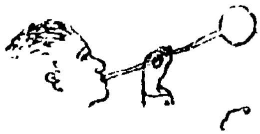
کیوں ؟ — شکر کے ٹکڑے میں مسامات ہوتے ہیں اس لئے پانی اس کے اندر جذب ہونے کے لئے کھنچتا ہے اور اسی کے ساتھ موم کے ذرات بھی کھنچتے ہیں لیکن چونکہ صابون سے پانی کی سطح پر چکنائی پھیلتی ہے اس لئے موم کے ذرات دور ہونے لگتے ہیں -

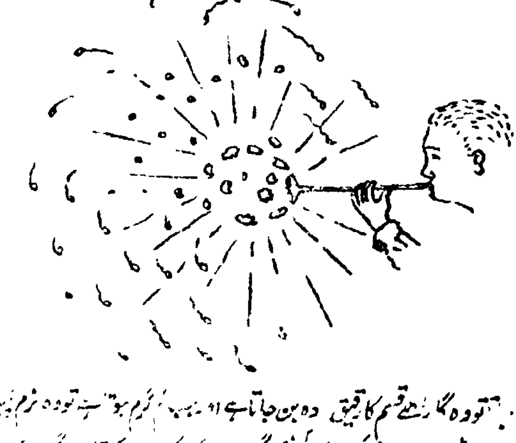
---

شیشے کا دورا اور بُلبلا

فراہم کیجئے : کانچ کی لمبی نلکی ایک فٹ — گیس کا چولھا -

شیشے کی نلکی کا درمیانی حصہ گیس کے چولھے پر گرم کیجئے اور گرم ہوتے وقت اسے چاروں طرف گھماتے رہئے۔ جب وہ سُرخ ہو جائے تو جھٹ سے دونوں ہاتھ پھیلا کر نلکی کے دونوں سرے علٰحدہ علٰحدہ پکڑ کے اِدھر اُدھر کھینچئے، تو جو حصہ سُرخ ہو گیا ہے وہاں سے نلکی دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی، لیکن ساتھ ہی باریک ڈورا کانچ کا پیدا ہو جائے گا۔ جسے آپ توڑ کر علٰحدہ کر سکتے ہیں — اب آپ دیکھیں گے کہ نلکیوں کے دونوں ٹکڑوں کے سرے بند ہو گئے ہیں۔ ایک نلکی لیکر سرا گیس کے چولھے پر گرم کیجئے جب سُرخ ہو جائے تو چولھے سے ہٹا کر نلکی کا ایک سرا مُنھ میں لیکر آہستہ سے پھونکئے تو کانچ کا بلبلا پیدا ہو جائے گا۔ اگر آپ ذرا سی پھونک اور دیں گے تو پر کی طرح کانچ کے بہت سے ورق ہوا میں منتشر ہو جائیں گے





کیوں ؟ — کانچ جب خوب گرم کیا جاتا ہے تو وہ گاڑھے قسم کا رقیق مادہ بن جاتا ہے اور جب اور گرم ہوتا ہے تو وہ نرم لچیلا ہو کر نئی شکل میں تبدیل ہو سکتا ہے جب آپ نے نلکی کے دونوں سروں کو کھینچا تو وہ لچیلا مادہ ٹھنڈا ہو [illegible] کے سرے بند ہو گئے [illegible] اسی طرح [illegible] نلکی میں ہلکی پھونک ماری تو [illegible] بلبلے کی شکل اختیار کر لی اور جب زور سے پھونک ماری تو [illegible] وہ بلبلا ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

(باقی)

مکتوبات نیاز

محترمہ ۔ "خطاب" کی اجنبیت پر آپ کو حیرانی ہوگی، لیکن معاف کیجئے آپ کا تازہ خط پڑھنے کے بعد تو مجھے "رابعۂ دوراں" لکھنا چاہئے تھا! آپ کی ذہنیت کے اس انقلاب کو دیکھتا ہوں اور حیرت کرتا ہوں!

"ختم نبوت" کے متعلق آپ میری رائے دریافت کرتی ہیں۔ میں اس سے پہلے بھی کبھی ظاہر کر چکا ہوں اور پھر اسی کا اعادہ کرتا ہوں کہ رسول اللہ بیشک نبی آخر الزماں تھے۔ کیونکہ اب اگر واقعی کوئی نبی آئے بھی تو اسے کون مانتا ہے

پچھلا زمانہ ہوتا تو گاندھی جی بھی رسول ہو سکتے تھے، علامۂ مشرقی بھی دعوائے نبوت کر سکتے تھے ــ اور وہ تو وہ۔ میں بھی نبی بن سکتا تھا (مسیلمہ ہی کی قسم کا سہی) اور آپ بھی نبیہ ہو سکتی تھیں (سجاح بنت اوس ہی کی سہی) ــ گو اُن دونوں کی شادی ہو گئی تھی اور ــــــ"

میں پوچھتا ہوں کہ آپ یہ کس خبط میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ مذہب کو سمجھنے کی کوشش چھوڑیئے۔ مذہب کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو پہلے خدا کو سمجھے اور خدا کو سمجھنے کے باب میں بیدل کا فیصلہ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ

چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسید نہا!

پھر جس چیز کے سمجھنے کی ابتدا و انتہا "اعترافِ جہل" کے سوا کچھ نہ ہو اس پر غور کرنا حماقت ہے

آپ کے لئے اصل مذہب بچوں کی صحیح تربیت اور فرائض نسوانی کا ادا کرنا ہے۔ ان سے کسی وقت فراغت نصیب ہو اور خدا کو سمجھنے کا جی چاہے تو کائنات کی Comedies کو نہ دیکھئے، بلکہ اس کی Tragedies پر غور کیجئے۔ اور عہدِ حاضر کی سب سے بڑی ٹریجڈی موجودہ جنگ ہے ــ اس وقت مذہب سے زیادہ ضروری سیاسیات کا مطالعہ ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ہماری آپ کی اقتصادی و معاشی زندگی سے بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہو کہ صبح کو آپ کے بچے کیا کھائیں گے، عشا و تہجد کی نماز بھی آپ سے اچھی طرح ادا نہ ہو گی!

بندہ نواز ۔ گرامی نامہ کا شکریہ ۔ آپ نے بیدل کا ذکر کر کے مجھے بے چین کر دیا۔ جی تو میرا بھی وہی چاہتا ہے جو آپ فرماتے ہیں، لیکن عُرفی کا شعر آپ نے سنا ہوگا

من کہ باشم عقل کل را نازک اندازہ ادب
مرغ او صاف ترا از اوج بال انداختہ

پھر سب سے بڑا سوال وقت و فرصت اور صحت و توانائی کا بھی ہے۔ اگر آپ کے پاس کایا پلٹ کا کوئی نسخہ ہو تو بھیج دیجئے تاکہ اسے استعمال کرکے پہلے جوان ہو جاؤں، پھر ملک الموت سے وعدہ لیجئے کہ وہ کسی ناگہانی حادثہ کی صورت میں بھی کم از کم ۵۰ سال تک میرے سامنے نہ آئیں گے — سچ کہتا ہوں کہ بیدل پر ریسرچ کرنے کے لئے اتنے ہی وقت و اطمینان کی ضرورت ہے۔

آج کل کے بعض نوجوان جو فارسی میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی طیاریاں کر رہے ہیں، میرے پاس آئے، اور مجھ سے پوچھا کہ وہ کس موضوع پر ریسرچ کریں، میں نے اُن میں سے ہر ایک کے سامنے بیدل کا نام لیا اور اُن میں سے کسی نے سانس تک نہ لی — وہ غریب کیا کریں، خود اُن کے اساتذہ میں بیدل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں!

آپ کے حلقہ میں اگر کوئی سر پھرا نوجوان ایسا نظر آئے تو اسی کو آمادہ کیجئے، جہاں تک مشورہ کا تعلق ہے میں ہر وقت حاضر ہوں!

حضرت۔ آپ مستقبل کی تاریکی سے گھبرا رہے ہیں اور میں اس کی روشنی ابھی سے محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کا یہ اعتراض یا استفسار بالکل درست ہے کہ

نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں اس کے توسن کو ؟

لیکن کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ

پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

قبلہ، فطرت جتنی فیاض ہے اتنی ہی کھانڈری بھی ہے، جو خدا عاد و ثمود کو تباہ کر سکتا ہے، جو بابل و نینوا کی سربلند عمارتوں کو کھنڈر بنا سکتا ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے! محفل کا دستور ہی یہ ہے کہ جام دست بدست چلے!

یقیناً نہ آپ کا خون جوان ہے، نہ میرا۔ لیکن بقول غالب

آنکھوں میں تو دم ہے!

پھر یہ اور بات ہے کہ آپ اُن میں اشک پاتے ہوں اور میں شرار!

تو از آتش دُخاں بینی، من آتش از دخاں بینم!

ہاں میں اُن سے ملا اور اس میں شک نہیں اگر انہیں کسی کو مار ڈالنا آتا ہے، تو مجھے مر جانا چاہئے تھا — لیکن زندہ ہوں اور اپنی زندگی پر حیران! جس نے آپ کی تمام شرطیں پیش کیں اور ایک ایک کر کے انھوں نے سب رد کر دیں — میں نے یہ سب کچھ نہایت نیازمندانہ لہجہ میں عرض کیا تھا۔ شروع سے آخیر تک میں ان کی پیشانی کی ایک شکن بھی کم نہ کر سکا وہ بپھرتے ہوئے تیور، وہ کھنچی ہوئی ابرو، وہ غصہ سے تمتایا ہوا چہرہ! — بس یوں سمجھئے کہ سراپا وہ تصویر تھی جو ان کی سامنے تھی۔

شکر ہے کہ موسیٰ نہ تھا ورنہ خاتمہ ہی ہو جاتا

سنئے صاحب، اگر آیندہ یہ خطرناک خدمت آپ نے میرے سپرد کی، تو بجائے پیامبر ہونے کے آپ کا رقیب بن جاؤں گا، پھر شکایت نہ کیجئے گا

یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ "دُنیا میں کسی چیز کا میں قایل بھی ہوں یا نہیں"۔۔۔ اے حضرت، آپ کا قایل ہوں، آپ کی پارسائی کا قایل ہوں، اور آپ کی اُن شب زندہ داریوں کا قایل ہوں جو صبح سے شام تک آپ کے چہرہ کی شکنوں کو دور نہیں ہونے دیتیں اور ان سب سے زیادہ آپ کے اس قول کا قایل ہوں کہ "جو ہم میں سے نہیں وہ کہیں کا نہیں!"

کائنات کے معمہ کو اس ایجاز کے ساتھ صرف ایک فقرہ میں حل کر دینا، ایسا کھلا ہوا اعجاز ہے کہ میں کیا، دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی آپ کے سامنے سرِ نیایش جُھکا دینے پر مجبور ہے۔ سچ ہے۔۔۔۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

اس سے زیادہ خراجِ تحسین آپ چاہتے ہوں تو دریا یا دیا اعظم گڈھ جایئے، ہوسکتا ہے کہ اس سومناتھ میں بُت کی حیثیت سے آپ کو بھی کوئی نمایاں جگہ مل جائے! مجھ پر آپ کیوں بار بار اپنا وقت ضایع کرتے ہیں،

مسلماں کافرم، کافر مسلماں
نہ دینم رونقے دارد نہ دُنیا

اگر اسلام کا مفہوم واقعی وہی ہے جو آپ لوگوں نے قرار دے رکھا ہے تو۔۔۔ ہزار خندۂ کفر ست بہ مسلمانی

اگر جنت احمق بننے کے بعد ہی مل سکتی ہے تو آپ کو مبارک ہو، مجھے جہنم دیجئے کہ وہاں لاکھ تکلیف سہی لیکن کم از کم صحبتِ ناجنس کا عذاب تو نہ ہوگا۔ یہ اطمینان تو ہوگا کہ آپ وہاں نہیں ہیں! ۔۔ یہ راحت کیا کم ہے!

نیاز نوازا، ایک زمانہ کے بعد کل آپ کا خط ملا۔ لیکن اس قدر اظہار "بیگانگی" کی کیا ضرورت تھی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں زخم بننے سے پہلے ہی "داغِ دل" محو ہو چکا تھا۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ مبادا "پندارِ محبوبیت" میں کوئی ایسی ادا آپ سے سرزد ہو جائے جو "نمایش تقدس" یا "پردہ داری" کے منافی ہو۔ خیر مومن کی طرح میں آپ سے یہ فرمایش تو نہیں کر سکتا کہ میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

لیکن زیادہ احتیاط سے۔۔۔۔ "اور دوں پہ کھل نہ جائے کہیں راز"۔۔۔ اس رمز سے تو آپ کو بھی واقف ہونا چاہئے۔

جن صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے، افسوس ہے کہ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں، ایک زمانہ سے میرے اُن کے درمیان مراسلت بند ہے۔ اگر کبھی مل گئے تو کہدوں گا کہ "کوہِ ندا"، پر آپ کو کوئی بلا رہا ہے!

آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا۔ اب کیا عرض کروں کہ یہ سانحہ کیوں اور کس طرح پیش آیا آہ! ـــــ

مظہر ز ما بُرید و دگر یاد ما نہ کرد،
شاید کہ خوش نہ بود ز وضعِ کرخت ما

ہاں، وہ یہاں سے چلے گئے اور اب شاید کبھی نہ آئیں گے۔ چونکہ غلطی میری تھی، اس لئے جب خیال آجاتا ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے، پھر قیامت یہ ہے کہ اگر تلافی کی کوشش کروں تو شاید اُس سے زیادہ خطرناک غلطی ہوگی۔

صورت ہی کچھ ایسی پیچیدہ ہوگئی تھی کہ میں اُس غلطی کے ارتکاب پر مجبور تھا اور وہ یہاں سے چلے جانے پر ـ ـ ـ طویل داستان ہے۔ خط میں کہاں تک لکھوں گا، کبھی ملئے گا تو سناؤں گا!

قبلہ۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے، یعنی "خدائے غیر باطل" کے وجود یا عدم وجود پر تو میں گفتگو کرسکتا ہوں لیکن آپ کو "الٰہ باطل" باور کرنے میں کبھی میں نے تامل نہیں کیا۔ اگر اب بھی آپ کو میری بندگی و نیازمندی کا یقین نہیں تو سوائے اس کے کہ غالب کی طرح "نمرود کی خدائی" کا رونا روؤں اور کیا کرسکتا ہوں

اس سے زیادہ بدنصیبی میری اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں دن کو دن کہوں تو آپ کے نزدیک غلط، دوسرے دن کو رات کہہ دیں تو صحیح! آخر ایسا کیوں ہے؟ آپ ہی بتائیے، میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ کیا "بندگی" و "بندہ پروری" کی دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے؟

بہرحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اگر آپ کو اپنے "ملائکہ مقربین" کے کہنے پر اتنا ہی اعتبار ہے تو بیشک آپ اپنی "بارگاہِ الوہیت" سے مجھے نکال دیجئے۔ لیکن یہ مطالبہ نہ کیجئے کہ میں ان کے آگے سر جھکا دوں۔ کوئی نہ کوئی "موحدِ اعظم" کہنے والا مل ہی جائے گا

گرامی عزیز ـ افسوس ہے کہ میں تمھاری خوشی میں جسمانی شرکت نہیں کرسکتا، لیکن میری روحانی تمنائیں اور دلی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں ـ خدا کرے یہ اقتران مبارک و مسعود ثابت ہو

اپنے والد محترم سے میرا سلام عرض کرو، اور کہہ دو کہ میں سب سے پہلی فرصت میں ان کی فرمائش پوری کردوں گا، لیکن "فرصت" کب ملتی ہے، اس کی خبر مجھے بھی نہیں ہے۔

جنگ کے دہشت انگیز مصارف

(ایک امریکی ماہرِ جنگ کے اندازہ سے)

مشہور ہے کہ اس وقت لڑائی میں ہر فریق کروڑوں روپیہ روزانہ صرف کر رہا ہے اور بعض لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا، لیکن سچ پوچھئے تو ہم "کروڑوں روپیہ" کہکر بھی مصارف کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے -

آپ کو یہ سنکر شاید حیرت ہوگی کہ جس وقت ایک ڈویژن اپنے مرکز سے ۵۰ میل آگے بڑھتا ہے تو وہ صرف ٹینکوں اور جنگی موٹروں کی حرکت کے لئے ۵۰،۷ گنی کا پٹرول صرف کر رہا ہوتا ہے — اسی طرح جب کوئی آبدوز نظر آجاتی ہے اور اس پر تارپیڈو چلائے جاتے ہیں تو صرف چار تارپیڈو چلانے کا صرف دس ہزار گنی ہوتا ہے !

اب ہوائی مصارف کو دیکھئے کہ ۸۰۰ طیاروں کی قیمت تین کروڑ گنی ہوتی ہے اور ایک حملہ میں وہ جتنے بم گراتے ہیں ان کی لاگت ۸۰ ہزار گنی ہوتی ہے۔ زیادہ تفصیل کے ساتھ ان مصارف کا اندازہ کرنے کے لئے آپ صرف انگلستان کو سامنے رکھکر ان کی یوں تقسیم کیجئے: (۱) شہری مدافعت کے مصارف - (۲) لشکری مصارف (یعنی فوجی سپاہیوں اور افسروں کی طیاری روزینہ کھانے کپڑے وغیرہ) کے مصارف — (۳) آتش بار اسلحہ کے مصارف (۴) ٹینکوں، موٹروں وغیرہ کے مصارف (۵) ہوائی جہازوں کے مصارف اور (۶) پٹرول وغیرہ -

(۱) - پہلے "شہری مدافعت" کو لیجئے - ہر چند اس کا تعلق براہ راست جنگی سپاہ سے نہیں، لیکن چونکہ مقاصدِ جنگ سے اس کا خاص تعلق ہے اسلئے یہ مصارف بھی فوجی بجٹ میں شامل ہوتے ہیں - اس سلسلہ میں آپ صرف ایک چیز یعنی زہریلی گیس کے نقابوں ہی کو لیجئے کہ یوں تو اس کی قیمت چند آنہ سے زیادہ نہیں، لیکن جب چار کروڑ کی آبادی کو آپ سامنے رکھیں گے تو صرف ان نقابوں کی قیمت ۰۰ لاکھ گنی تک پہونچ جائے گی - پھر اسی کے ساتھ آپ ان احتیاطی تدابیر پر بھی غور کیجئے جو بموں، توپ کے گولوں سے بچنے اور اشیاء خوردنی و پٹرول وغیرہ کے ذخیروں کو محفوظ رکھنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں تو چار پانچ سال کے لئے کم از کم ۲۵ کروڑ گنی اس مد میں بھی رکھ لیجئے - اسی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو خطرہ کے مقامات سے نکال کر دوسری جگہ لیجانے کے لئے کم از کم ساڑھے بارہ کروڑ گنی رکھئے اور اسی قدر اسپتالوں وغیرہ کے لئے - اس طرح ایک ایسے ملک کے لئے جو آبادی میں انگلستان کے برابر ہے صرف شہری مدافعت کے لئے کم از کم ۵۰ کروڑ گنی کی رقم صرف کرنا پڑے گی

(۲) اس تقسیم میں فوج کی وردی، سامان خورد و نوش اور رہائش وغیرہ شامل ہیں - ہر سپاہی کی وردی، کمبل اور تمام لوازمہ پر ۲۰ گنی صرف ہوتی ہے (اس میں) سالانہ ۴ گنی کا اضافہ لوازمہ کی تبدیلی کے لئے کیجئے اور گیس سے بچنے کے لئے نقاب کی قیمت بھی شامل کیجئے (فوجیوں کا نقاب زیادہ قیمتی ہوتا ہے) اس طرح سالانہ ہر سپاہی کی وردی وغیرہ کا صرف ۵ گنی ہوتا ہے - اب فوجی تعلیم، راشن اور دوا علاج کو بھی اس میں شامل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر سپاہی پر سالانہ ۵۰ گنی اس مد میں صرف ہوتا ہے - افسر اس میں شامل نہیں ہیں، جن پر بہت زیادہ مصارف آتے ہیں - الغرض ۱۰ لاکھ فوج کا سالانہ خرچ (صرف وردی اور راشن وغیرہ کے لحاظ سے) ۵۰ کروڑ گنی ہوتا ہے -

(۳) اب بندوقوں، توپوں اور ریوالور وغیرہ کو لیجئے - ہر سپاہی کو ایک بندوق دیجاتی ہے جس کی قیمت ۵½ گنی ہوتی ہے اس لئے ۱۰ لاکھ فوج کے لئے جس میں کم از کم نصف کے پاس بندوق ہوتی ہے - ۵۰ لاکھ گنی سے زیادہ کی بندوقیں درکار ہوں گی - اب ریوالوروں، مشین گنوں اور ٹینک شکن بندوقوں کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی قیمت ۷۰،۲½ لاکھ گنی ہوتی ہے بڑی بڑی توپیں ان سے علحدہ ہیں جن کی قیمت ۷۰۰ گنی سے لیکر ۵۰ ہزار گنی تک ہوتی ہے -

الغرض دس لاکھ فوج کو بندوق، مشین گن اور ریوالور وغیرہ مہیا کرنے کے لئے کم از کم ڈھائی کرور گنی چاہئے۔ لیکن یہ خرچ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ لڑائی میں جو بندوقیں، توپیں یا اور چیزیں ضایع ہو جاتی ہیں ان کو پھر فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے لئے سالانہ کم از کم ۲۰ لاکھ گنی چاہئے۔

اب گولوں اور بموں وغیرہ کو لیجئے تو ان کے مصارف اور زیادہ حیرتناک نظر آئیں گے، کیونکہ طیارہ شکن توپ سے جو گولے پھینکے جاتے ہیں ان پر ۴۰ گنی فی منٹ لاگت آتی ہے اور اگر بیک وقت ۴۰ توپیں سر کی جائیں تو دس منٹ میں ۲۵ ہزار گنی کے گولے پھینکے جائیں گے۔

بڑی بڑی توپوں کے گولوں کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایک ایک گولے کی قیمت ۶۰ گنی سے ۲۱۰۰ گنی تک ہوتی ہے۔ پچھلی جنگ میں ایسی تین ہزار توپیں کام میں لائی گئی تھیں جن کے گولوں کا روزانہ خرچ ۳۰ ہزار گنی تھا اور اس جنگ میں تو کہیں زیادہ توپیں کام میں لائی جا رہی ہیں۔

الغرض اس تقسیم کے تحت ۱۰ لاکھ فوج کے سالانہ مصارف ۳۲ کرور ۵۰ لاکھ گنی تک پہونچتے ہیں۔

(۴) چونکہ اسوقت تمام فوجیں میکانکی ذرایع سے حرکت کرتی ہیں، اور اس کے لئے موٹروں، سائکلوں، موٹر سائکلوں اور ٹینکوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے مصارف کی یہ مد بھی بہت بڑی مد ہے۔

۱۰ لاکھ فوج کے لئے موٹر سائکلوں اور موٹروں کی قیمت کا اندازہ چار کرور ۴۰ لاکھ گنی کیا جاتا ہے۔ ٹینکوں کی قیمت مختلف ہوتی ہے یعنی ۲۵۰۰ گنی سے لیکر ۲۵۰۰۰ گنی تک، اس لئے ایک ہزار ٹینکوں کی قیمت (جو ۱۰ لاکھ کی سپاہ کے لئے ضروری ہیں) ۵۰ لاکھ گنی ہوتی ہے۔ ان میکانکی مرکبوں کی عمر بہ حالت امن چھ سات سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن لڑائی کی حالت میں ایکسال سے زیادہ یہ کام نہیں دے سکتیں، پھر بہت سے ضایع ہو جاتے ہیں، چھین جاتے ہیں اس لئے مقررہ تعداد پوری کرنے کے لئے بھی کافی روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اس مد میں پہلے سال کے مصارف کا اندازہ ۹ کرور ستر لاکھ گنی کیا جاتا ہے۔

(۵) اس لڑائی میں ہوائی جہازوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے جن کی قیمت فی جہاز ۵۰۰ گنی سے ۵۰ ہزار گنی تک ہوتی ہے۔ پھر اگر ہم صرف تین ہزار جہازوں کی فوج کو سامنے رکھیں جس کے لئے پندرہ ہزار ہوا باز درکار ہوں گے تو سات کرور پچاس لاکھ گنی اس مد میں رکھ لیجئے، لیکن اگر جہازوں کے نقصانات اور بموں کی قیمت کو بھی سامنے رکھئے تو پھر یہ مقدار ۸۷ کرور ۵۰ لاکھ گنی تک پہونچ جاتی ہے۔

(۶) اب پٹرول کے مصارف کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اوسط وزن کا ٹینک ایک گیلن میں ایک میل سے زیادہ نہیں چل سکتا اس لئے تمام چھوٹے بڑے ٹینکوں، موٹروں، موٹر سائکلوں اور رسد رسانی کی موٹروں کے لئے جن کی مجموعی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے پٹرول کی غیر معمولی مقدار درکار ہے چنانچہ اس لڑائی میں جس وقت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا ہے تو تین ہفتوں میں ایک کرور گنی کا پٹرول صرف ہوا تھا، اس لئے ۱۰ لاکھ فوج کے لئے اوسط خرچ سالانہ اس مد میں ۸ کرور ۵۰ لاکھ گنی سے کم نہیں ہوتا۔

اس طرح اب ان تمام مدات کو یکجا کیجئے تو نتیجہ یہ نکلے گا:-

۱- شہری مدافعت کے لئے	۵۰ کرور گنی
۲- لشکری طیاری کے لئے	۵۰ کرور گنی
۳- توپوں اور گولوں کے لئے	۳۰ کرور ۵۰ لاکھ گنی
۴- موٹروں اور ٹینکوں کے لئے	۱۹ کرور ۷۰ لاکھ گنی
۵- ہوائی جہازوں کے لئے	۸۷ کرور ۵۰ لاکھ گنی
۶- پٹرول وغیرہ کے لئے	۸ کرور گنی

یعنی یہ مجموعی مقدار دو ارب سینتالیس کرور ستر لاکھ گنی تک پہونچتی ہے اور اگر گنی کی قیمت اس کو سکۂ رائج قرار دیکر صرف تیرہ روپیہ رکھیں تو دوسرے الفاظ میں یہ رقم ۲۹ ارب سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر سونے کے موجودہ نرخ کو سامنے رکھئے تو اس سے تگنی!

پھر لطف یہ ہے کہ ان مصارف میں بحری طیاریوں اور بحری جہازوں کے مصارف شامل نہیں ہیں جو لڑائی کی بہت بڑی مد ہے اور اگر آپ انھیں بھی شامل کر لیں تو پھر یہ رقم ۶۰ ارب تک پہونچ جاتی ہے!

باب الاستفسار

کس کا شعر ہے

(جناب عبداللطیف خانصاحب - لاہور)

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا - مندرجۂ بالا شعر کس کا ہے براہ نوازش مطلع فرمایئے اور یہ بھی دریافت طلب ہے کہ "پروردگار" کی دال متحرک ہے یا کیا۔ اگر براہ راست جواب میں تکلف ہو تو بذریعہ نگار مرحمت فرمایئے اور کیا اچھا ہو تاکہ مولانا نیاز صاحب بھی آپ استصواب رائے فرمایئے۔

مجی مولانا نیاز۔ یہ کارڈ میرے نام آیا ہے لہذا جواب عرض کرتا ہوں اگر مناسب ہو تو باب الاستفسار میں شایع فرما دیجئے - ا۔ف

یہ شعر شیدا فتحپوری کے قصیدۂ خمریہ کا ہے چنانچہ مولف خزانہ عامرہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :-

فتحپور از توابع اکبرآباد است .... شیدا چندے رفاقت خانخاناں اختیار کرد وایامے ملازمت شہریار بن جہانگیر در عہد صاحبقران ثانی در ذیل بندگان بادشاہی در آمد وآخر مستعفی شدہ در کشمیر گوشہ گیر گشت و .... ہماں جا شربت ممات چشید خمریہ گفتہ کہ مطلعش اینست چیست دانی الخ — انتہی خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۷۱ -

پرور دگار، بدال موقوف، خداوند تعالےٰ کہ پرورندہ ہمہ است و بمعنی پرورندہ نیز آمدہ و اظہار حرکت دال غلط محض است

(ابوالکمال) اُمید امیٹھا

(نگار) مولانا امید امیٹھوی نے جو جواب تحریر فرمایا ہے وہ تاریخ ولغت کے اعتبار سے بالکل درست ہے۔

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (سنہ ۳۰ء) اگست عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) مئی عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ (سنہ ۳۲ء) فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ ۳۳ء) فروری عہ ر۔ (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری عار۔ فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (سنہ ۳۸ء) جنوری سے ر۔ فروری ۸ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ — (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا ستمبر عہ ر۔ اکتوبر۔ نومبر ۸ ر فی پرچہ — (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر (سنہ ۴۱ء) جنوری، فروری عار۔ مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۲ء) جنوری، فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی ۸ ر

منیجر نگار۔ لکھنؤ

جاسوسی کے علمی طریقے

جب سے امریکہ نے ملکی مدافعت اور اتحادیوں کی مدد کے سلسلہ میں اپنی اسلحہ سازی اور جنگی طیاروں کو وسیع کیا ہے، وہاں کے محکمۂ خفیہ کو ایک ایسے خطرناک طبقہ سے واسطہ پڑ رہا ہے جس کا وجود کھلے ہوئے دشمنوں سے زیادہ اندیشہ ناک ہے!

یہ جماعت اُن جاسوسوں اور غیر ملکی ایجنٹوں کی ہے جو امریکہ کی آبادی میں ملے جلے یہاں کے تمام حالات معلوم کرتے رہتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ امریکہ کی جنگی طیاروں کو سخت سے سخت نقصان پہونچایا جائے۔

اس جماعت کے مقابلہ کے لئے امریکہ کا محکمۂ پولیس کے علاوہ ایک ادارۂ تفتیش ہے جسے Federal Bureau of Investigation کہتے ہیں اور یہ دونوں محکمے اس جماعت کی جستجو کے سلسلہ میں عجیب و غریب علمی طریقے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اس وقت امریکہ میں نازیوں کی ہمدرد جماعت کافی پائی جاتی ہے اور نازی ایجنٹوں کے زیر اثر یہ لوگ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ اسلحہ سازی کے کارخانوں، میگزینوں اور بحری و فضائی اڈوں کو نقصان پہونچایا جائے۔

اب پریسیڈنٹ امریکہ نے اس جماعت کے کھوج لگانے کا کام اسی بیورو کے سپرد کر دیا ہے جس کے ڈائرکٹر اڈگر ہوور ہیں۔ اس بیورو کے پاس دو لاکھ انگوٹھوں کے نشانات کے علمی تجربہ گاہیں بھی ہیں، جہاں خوردبینوں، تصویر کشی کے آلات اور دوسرے کیمیاوی ذرائع سے مجرموں کا پتہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ علاقۂ ریڈ فورڈ کے کسی مکان میں ایک چور داخل ہوا اور بہت سا مال چرا کر لے گیا، اس نے احتیاطاً گھر کے ٹیلی فون کا تار بھی چاقو سے کاٹ دیا تھا تاکہ اگر گھر والے جاگ جائیں تو فوراً پولیس کو اطلاع نہ دے سکیں۔

پولیس نے ایک شخص کو شبہ میں گرفتار کیا جس کے پاس سے ایک چاقو بھی نکلا۔ یہ چاقو محکمۂ بیورو کے پاس بھیجا گیا۔ یہاں کے کیمیاوی معمل میں بجلی سے گرم کیا گیا یہاں تک کہ اس کی حدت سفیدی کی حد تک پہونچ گئی اور اس سے روشنی پیدا ہونے لگی۔ اس کے بعد (Spectrograph) کے ذریعہ سے اس روشنی کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ چاقو کی دھار پر کچھ ذرات اس مرکب دھات کے بھی تھے جس سے ٹیلی فون کا تار طیار کیا جاتا ہے، علاوہ اس کے ایک باریک سا ریشہ بھی ملا جو اسی مرکب دھات کا تھا۔

ایک بار طیارہ سازی کے کارخانہ میں ایک جہاز کا پائپ جس سے پٹرول جاتا ہے آری سے کٹا ہوا نظر آیا۔ چونکہ کارخانہ سے باہر کا کوئی آدمی اندر نہ آسکتا تھا اس لئے معلوم ہوا کہ کام کرنے والوں ہی میں سے کوئی شخص نازی جماعت سے ملا ہوا ہے، چنانچہ کارخانہ کی تمام آریاں اور پائپ کیمیاوی معمل میں جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ وہاں بجلی اور اسپکٹوگراف کے ذریعہ سے چھ آریوں پر پائپ والی دھات کے ذرات نظر آئے اور اس طرح وہی چھ آدمی گرفتار کر لئے گئے جو ان آریوں سے کام کرتے تھے۔

حال ہی میں انھوں نے موم اور راجن سے ملا کر ایک ایسا مادہ طیار کیا ہے جس سے اُن نشانات کا بھی سانچہ طیار کیا جا سکتا ہے جو قائم نہیں رہ سکتے مثلاً ریت پر نشان قدم، نرم مٹی پر موٹر کے پہیوں کے نشانات، کسی پھل پر دانت کے نشانات۔ ان سب کا سانچہ اس مادہ کے ذریعہ سے طیار ہو سکتا ہے اور پھر نشانات کے مٹ جانے کی پروا نہیں کی جاتی۔

نشان قدم کا سانچہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ پہلے اس پر باریک چھلنی سے Talcum پاؤڈر چھڑک دیتے ہیں پھر پلاسٹر

پھیلا کر سانچہ بنا لیتے ہیں۔ یہ پوڈر اس لئے چھڑکتے ہیں کہ پلاسٹر کی گرمی نشان تک نہ پہونچے اور سانچہ ٹھیک طیار ہو جائے۔

اگر دروازوں، یا کھڑکیوں پر کسی اوزار کی خراش کا نشان پایا جاتا ہے تو اس کے قیام کے لئے ایک اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جسے [illegible] کہتے ہیں۔ اسی ذریعہ سے مردہ انسان کے کچلے ہوئے یا کٹے ہوئے اعضا کی اصلی ساخت کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

ہر چند آگ کے خلاف احتیاط مشکل ہے، لیکن اب اس کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں جب امریکہ باوجود [illegible] سامان حرب نہایت تیزی سے طیار کر رہا تھا تو ایک مقام بلیک ٹام پر بموں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور تمام سامان گاڑیوں میں بھر بھر کر [illegible] پر لاد دیا گیا تھا۔ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء کو رات کے دو بجے دفعتاً ایک کشتی سے شعلہ بلند ہوا اور بموں کے پھٹنے کی آواز آنے لگی [illegible] اور میلوں تک آتشبازی سی چھوٹتی نظر آنے لگی، یہاں تک کہ چند منٹ میں پورا بلیک ٹام خاک سیاہ ہو گیا۔

اس کے بعد کامل ۲۰ سال تک تفتیش جاری رہی کہ آگ لگنے کا سبب کیا تھا اور آخر کار حکومت اس نتیجہ پر پہونچی کہ یا تو [illegible] رکھ دیا گیا تھا یا کوئی Fire Pencil — فائر پنسل ایک چھوٹی سی نلکی ہوتی ہے جس میں بھڑک اٹھنے والا [illegible] خاص درجۂ حرارت پر پہونچکر اس میں آگ پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اب اس قسم کے تمام خدشات کو سامنے رکھ کر ان کے دفعیہ کی تدابیر سوچ لی گئی ہیں اور محکمہ کی احتیاطی کارروائیوں نے [illegible] کو ناممکن سا نہیں تو دشوار ضرور بنا دیا ہے۔

بیورو کے دفتر میں اس وقت ایک کروڑ ۲۳ لاکھ نشانات انگشت کے کارڈ موجود ہیں اور ۶۸۰۰ قسم کی بندوقوں کے مختلف نمونے [illegible] بعض اوقات قاتل یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی بندوق توڑ پھوڑ ڈالیں گے تو گرفتاری سے بچ رہیں گے، لیکن چونکہ یہاں ہر قسم کے نمونے [illegible] ٹوٹی ہوئی بندوقوں کے اجزاء اکٹھا کر کے اُن سے بندوق کی اصل ہیئت کا پتہ چل جاتا ہے اور پھر قاتل کا سراغ آسان ہو جاتا ہے۔

پچھلے دس سال کے اندر موٹروں کی لالٹین کے لئے جتنے قسم کے شیشے طیار ہوئے ان سب کے نمونے یہاں موجود ہیں اور اسی [illegible] بھی کہ کس قسم کی موٹر میں کس قسم کا شیشہ استعمال ہوا تھا۔ چنانچہ اگر جائے وقوع پر شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے مل جائیں تو وہ ان کو [illegible] یہ کس قسم کی موٹر میں لگا ہوا تھا۔

علاوہ ان کے اور جو کچھ اس دفتر میں موجود ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :— ۲۲۸۶۴ قسم کے واٹر مارک جو مختلف او[illegible] پر نقش کئے گئے ——— ۵۴۸۳ ٹائر کی قسمیں ——— ۲۰۴۹ نمونے مختلف قسم کی رسیوں کے ——— ۱۸۸۱ نمونے ——— ۱۹۰ قسم کی ٹائپ رائٹر مشینوں کے نمونے ——— ربڑ کے جوتوں کی ۵۸۸ قسمیں ——— ۴۳ قسم کی وہ فوٹوگراف مشینیں جو چیک لکھنے میں استعمال ہوتی ہیں۔

"پامپور[۱] اور ——"

(نذر انشا)

پہلا منظر

مطرب خوشنوا سنا نغمے کچھ ایسی شان کے
چھٹکی ہو جیسے چاندنی کھیت میں زعفران کے

ہلکی اُداہٹ، اُس میں ہیں ڈورے حسین سُرخ سُرخ
دانے الگ الگ رہیں جیسے "مدوں میں تان" کے

ان کی ادائے دلربا حشر تلک نہ پائیں گے
رہنے دو آسمان پر تاروں کو آسمان کے

شیام کے رنگ روپ میں رادھا براجنے لگیں
شیام کو آگئی ہنسی، پھول تھے زعفران کے!

اور کہاں یہ چمکتیں، اتنی لطافتوں کے ساتھ
پھول نہیں، صحیفے ہیں دیدۂ پاپران کے

وہ جو بھری بھری کلی منھ جو اُدھر کو پھیرے ہے
بیٹھی ہیں "روٹھی رادھاجی"، گوپیوں کو کھان کے!

دوسرا منظر

تیر نظر چلائیے شوق سے سینہ تان کے
کھیل نہ جائے جان پر کوئی شکست مان کے

اتنے سے وہم پر انھیں دیکھ کے مسکرا دئے
غنچوں سے سرگرانیاں، صدقے اس آن بان کے

نرگس خود فروش سے کہتی ہیں اُن کی شوخیاں
آنکھ ملا کے بات کر، دن ہیں ابھی اُٹھان کے

آنکھیں چڑھی چڑھی سی ہیں پلکیں جھکی جھکی سی ہیں
تم نے پی اور نشر دی پی، بات گلوں کی مان کے

دیکھ کے طرز خواب ناز، پھولوں نے لیں جماہیاں
باد شمال سوگئی چادر شب تان کے

چاندنی رات، پامپور، سامنے کشت زعفراں
چاہئے شرم کچھ اثر، شعر ہیں اسکی شان کے؟

تیسرا منظر

شاعری اک طرف رہی، میری تھی رائے اور سے
اس سے کہیں ہیں خوشنما بُندے کسی کے کان کے

ہائیں یہ کیا طلسم ہے، اور ہے رُت، سماں ہے اور
پھُول تھے زعفران کے، یا ہیں اب ارغوان کے!

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔اے

۱؎ پامپور، کشمیر کا وہ قطعہ جہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ چاندنی رات میں زعفران زار کی سیر ایک مسحور کن منظر پیش کرتی ہے، عام طور پر خیال ہے کہ زعفران کا پھول سرخ ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہلکے اودے یا کاسنی رنگ کا ہوتا ہے اور اندر سُرخ ریشے یا ڈورے ہوتے ہیں، یہی زعفران ہے۔ خود پھول کی پتیوں میں رنگ نہیں ہوتا۔

تجدید

نغمۂ ہوش سے پھر دل مرا گھبرا ہی گیا
آج پھر تیری محبت کا خیال آ ہی گیا

پھر وہی ابرِ گہربار تمناؤں کا
کیف و مستی دلِ رنجور پہ برسا ہی گیا

تھی جو پیمانۂ ہستی میں نظر سے مستور
دیدۂ شوق سے تا[illegible] چھلکا ہی گیا

غمِ دوراں سے ذرا ہوش تو آیا تھا مگر
پھر تری مست نگاہوں کا [illegible] گیا

شورشِ زیست سے کچھ دل نے سکوں پایا تھا
پھر تری یاد کا عالم مجھے [illegible] گیا

کھو دیا تھا دلِ بے ہوش نے تجھکو لیکن
پھر تصور ترے دامن [illegible] گیا

دل سے ہرچند فراموش کیا تیرا خیال
ہائے پھر لب پہ مگر [illegible] گیا

موت آجائے مجھے راس یہ ممکن ہی نہیں
میں بھلا دوں ترا احساس یہ ممکن ہی نہیں

مسعود اختر جمال

تمثیلِ شباب

جس طرح سورج کی کرنوں پر نکھرتی ہے سحر
جنبشِ مضراب پر نغموں میں جیسے ارتعاش

دامنِ گلشن میں جس صورت سمٹ آئے بہار
جس طرح اٹھکھیلیاں کرتی چلے بادِ سحر

دامنِ کہسار پر جس طور سے آئے بہار
موجِ دریا جس طرح ساحل سے ہم آغوش ہو

برق کردے جس طرح تارِ نظر تابندہ تر
چشمِ نم جس طرح کردے ضبطِ دل کا راز فاش

موجِ بوئے تو خیز غنچوں سے ہو جیسے ہمکنار
جس طرح پھولوں سے لد جائے جوانی میں شجر

جس طرح نغموں میں ڈھل جائے صدائے آبشار
جس طرح موجِ ترنم ساز سے ہمدوش ہو

[illegible] ہائے پیچ و تاب
[illegible] مضطرب رعنائیاں
[illegible] ات میں جیسے چھوا [illegible]

مظفر فاروقی فتحپوری

غزل: اثر رحمانی

اب عالم خیال کا نقشا ہی اور ہے
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ دُنیا ہی اور ہے

کیا دیکھے کوئی دیکھنے والا بہ چشمِ شوق
اُن بے پناہ جلووں کا نشا ہی اور ہے

وہ بے نیازِ دولتِ دیدار کیوں نہ ہو
آسودۂ خیال کی دنیا ہی اور ہے

ذوقِ نگاہِ ساقیٔ محفل کے سامنے
دیکھا تو رنگِ ساغر و مینا ہی اور ہے

میں جستجوے دوست میں کھویا ہوا سا ہوں
اب میری زندگی کا سہارا ہی اور ہے

اب دلنواز بھی ہے جو وہ حُسنِ دل فریب
میں دیکھتا ہوں اب مری دنیا ہی اور ہے

جو ماورائے سرحدِ ادراک ہے ۔ اثر
وہ دل فریب صورتِ زیبا ہی اور ہے

مطالعہ فطرت

چاند تاروں سے مجھکو اُلفت ہے
کہساروں سے مجھکو اُلفت ہے

کہکشاں کو سلام کرتا ہوں،
میں گلوں سے کلام کرتا ہوں،

تیرے چشموں کو چومتا ہوں میں،
ان کے گیتوں پہ جھومتا ہوں میں،

ٹھنڈی ٹھنڈی سفید جھیلیں ہیں،
جگمگاتی ہوئی سبیلیں ہیں،

دیو ہیں یہ ستنے کھجوروں کے
یا محافظ ہیں بن کی حوروں کے

ہائے کیا پیارے پیارے منظر ہیں
بے زباں نیچرل پیمبر ہیں

جھٹ پٹے میں صفیں پرندوں کی
جیسے پرچھائیاں فرشتوں کی

حُسن فطرت مطالعے میں ہے
روح گویا مراقبے میں ہے

میرے اللہ یہ کیا کرشمہ ہے
ذرّہ ذرّہ مقام سجدہ ہے

پاک آیات پڑھ رہا ہوں میں
بام عرفاں پہ چڑھ رہا

جی میں آتا ہے جذب ہو جاؤں
ان مناظر میں جاکے کھو ۔۔

پر افسانہ اور سحر مقالات ہیں...

شہاب کی سرگزشت : حضرت نیاز کا وہ عدیم المثیل ...
پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، اسکی تخییل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء، عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایکروپیہ (عہ) علاوہ محصول

مکتوبات نیاز : اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے۔ جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد : نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے (۸؍)

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات : اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی ... [illegible]

[illegible]

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ ... کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ... پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام ... قیمت بارہ آنہ (۱۲؍) علاوہ محصول۔

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ ... قدیم کی روحوں کے ساتھ —— ۲۔ مادئین کا مذہب۔ —— نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

علاوہ محصول ایک روپیہ (عہ)

شاعر کا انجام : جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی —— قیمت دس آنے (۱۰؍) علاوہ محصول

فراست الید : مولفہ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز : یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالی کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ... اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ؍) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن ... [illegible]

قیمت ... [illegible]